



پنج کہاں آپ تیاں جگ تیاں

سگرزشت

2017 مبر

عمران علی
معراج وصال



A contact loved ones.

ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.

پاکستانی پوائنٹ

www.PakistaniPoint.Com

صاحب جی: سنہری خواب دیکھنے والی ایک دوشیزہ کی عبرت بھری سچ بیانی
خفن ساز ہار دو کے ایک بڑے شاعر کا زندگی نامہ جسے لوگوں نے کوئی مقام نہیں دیا
بھیٹر نے یورپ کے اس مسلمان ملک میں وہ چین چین کر مسلمانوں کو ذبح کر رہے تھے



آپ کی باتیں، آپ کے
مشورے اور آپ کے سوال

ایک صفحے میں مکمل ایک
نادر روزگار کا تعارف خاص



صدر مملکت کی
تاریخ و علم کا احوال



علاقے کی روایت کو توڑ کر اس
نے عالمی اعزاز حاصل کیا



ایک باکمال شاعر کا زندگی
نامہ جسے اس کا مفت مہلا



پاکستان کی ایک معروف
فلمی شخصیت کا تذکرہ



اس ملک میں مسلمانوں
کو چین چین کر قتل کیا گیا



دنیا بھر میں رائج
شادی کے انوکھے رسوم کا تذکرہ



حبابی کی ہاشم کا ایک
الگ انداز کی داستان



وہ شہزادی تھی مگر
اپنوں سے بچھڑ گئی تھی



صرف ذہنی آسودگی کی خاطر لوگوں
کی جان لینے والوں کی کہتا

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور
تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر
آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔



ایک معصوم نوجوان کی خون
رنگ لہو گر مائے والی داستان

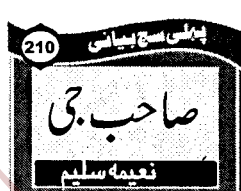
آلہ تصویر کشی کی
مختصر سی تاریخ



سچ کہہ گیا ہے کہ دولت
عورت کی قسمت سے آتی ہے



دو بہنوں کی فتر بانیوں
سے جہنم لینے والی روداد



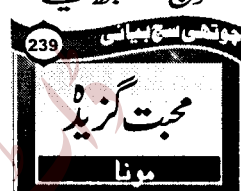
اس نے سراب
کو سچ سمجھ لیا



دو سہیلیوں کی روداد کہ
محنت ہی کامیابی دلاتی ہے



اس لڑکی کی روداد جس نے
محبت کے معنی بتائے



وہ محبت کی چاہ میں
دشمن محبت بن گئی



زن زر زمین کے
گرد گھومتی سچ بیانی



وہ سہانے خواب کے
پیچھے خود کو برباد کر رہی تھی



اس نے ثابت کیا کہ
محبت ستر بانی مانگتی ہے

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر جریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ماہنامہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
● تمام اشتہارات ٹیکسٹ کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح سے ذمہ دار نہ ہوگا۔

قارئین کرام!
السلام علیکم!



مدیر اعلیٰ: عذرار رسول

مدیر: پرویز بلگرامی

نائب مدیر: نبیلہ ظہیر

منیجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

سرکولیشن منیجر

سید منیر حسین

0333-3285269

قیمت فی پرچہ 60 روپے • زر لانڈ 800 روپے



پبلشر پروپرائٹرز: عذرار رسول

مقام اشاعت: C-63 فیئر II ایسٹیشن

ڈیفنس کٹرل ایریا میں کوئٹہ روڈ

کالونی 75500

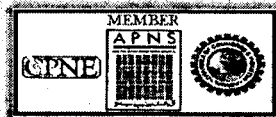
پرنٹرز: جیل حسن

مطبوعہ: این جی پرنٹنگ پریس

ہالی اسٹیمپ کراچی

خط کتابت کا پتہ • پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone : 35804700 Fax : 35802551
E-mail: jdggroup@hotmail.com



”اس گھر میں آئے ہوئے انہیں ایک باہ ہو چکا تھا۔ گھر اب تک چمک رہا تھا۔ نھا کا شان ڈرائیونگ روم میں بیٹھا ہوم ورک کر رہا تھا کہ اسے کچھ یاد آیا اور اس نے ہاتھ میں کپڑی پینسل سے دیوار پر پھول پتی بنانا شروع کر دیا۔ ماں کی نظر پڑی تو وہ غصے میں بھری اس کے پاس آئی ہاتھ سے پینسل چھینی اور اسے دور پھینک دیا۔ کا شان حیرت بھری نظروں سے ماں کو دیکھنے لگا پھر بولا ”امی میں پرانے والے گھر میں بھی تو دیوار پر نقشے بنایا کرتا تھا مگر آپ جب تو منع نہیں کرتی تھیں۔“

”بیٹا وہ گھر کرائے کا تھا یہ ہمارا اپنا گھر ہے۔“ ماں نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”یہ مٹی کہانی ہماری آپ کی، ہم سب کی کہانی ہے۔ ہماری سوچ اسی قسم کی سطحی ہو چکی ہے۔ ہم وطن کی محبت بھول کر صرف اپنا مفاد دیکھ رہے ہیں۔ ہر روز فی دی پر ٹاک شوز میں جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے۔ اداروں کے درمیان دوریاں پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ یہ سب دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ یہ وطن ہمارا گھر ہے اور کرایہ کا بھی نہیں ہے۔ اسی کی تعمیر و ترقی کے لیے ہم سب کو سوچنا ہے۔ اس کی ترقی بھی ممکن ہے جب ہم مفاد سے بالاتر ہو کر سوچیں گے۔“

معراج رسول

بکریاں چرانے والا

سیالکوٹ کی تحصیل نارووال کے گاؤں کالا قاور۔ میں صاحبزادہ خان رہا کرتا تھا۔ دو وقت کی روٹی بھی اسے میسر نہ تھی۔ ہر صبح وہ گاؤں والوں کی بکریاں چرایا کرتا۔ اس کڑی مشقت کے بعد اسے صرف اتنا سانا جوتا ملتا جو اس کے گھروالوں کی بھوک کو کم کر دیتا۔ اس آدمی سے پیٹ کھانے میں سلطان محمد خان بھی شریک تھا وہ کچھ اور بڑا ہوا تو صاحبزادہ خان نے اسے بھی بکریاں ہانگنے پر مامور کر دیا۔ جب وہ مدرسے کے برابر سے گزرتا تو اس کا دل تڑپ اٹھتا اور وہ ایک بار اندر جھانک کر ضرور دیکھتا۔ قطار در قطار بیٹھے بچے اسے بہت اچھے لگتے۔ ایک دن اس نے اپنے باپ سے کہا کہ میں بھی مدرسے میں پڑھوں گا۔ باپ نے پڑھنے کی اجازت دے دی۔ پرائمری پاس کرنے کے بعد سلطان محمد خان نے بدو کے اسکول میں داخلہ لے لیا۔ وہ خوب محنت کرتا دن رات کی محنت رنگ لائی اور اس نے مڈل کا امتحان بھی امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا پھر آگے کی پڑھائی کے لیے وہ لاہور آ گیا۔ رات گزارنے کے لیے اس نے ایک مسجد کو چن لیا اسی مسجد میں افغانستان کے سفیر بھی نماز پڑھنے آتے تھے سلطان محمد کے بارے میں امام صاحب نے انہیں بتایا کہ یہ لڑکا بہت اچھی انگلش جانتا ہے تو انہوں نے فرمائش کر دی کہ سلطان ہر روز ان کے بیٹھے پڑھ کر انہیں انگریزی کی تعلیم دے اور اس طرح وہ ایک معترض کا نو جوان معلم بن گیا۔ اسی دوران 1906ء کا خوش نصیب سال آ گیا۔ شہنشاہ افغانستان نے سفیر سردار امیر محمد خان کو واپس کابل بلا لیا جب وہ جانے لگے تو انہوں نے سلطان محمد خان کو بھی ساتھ لے لیا۔ کابل کے بادشاہ امیر عبدالرحمن نے اسے بحیثیت مترجم اپنے یہاں مقرر کر لیا۔ اسی دوران اس کی ملاقات حکومت برطانیہ کی سفیر ڈاکٹر ٹیلر ہملٹن سے ہوئی لیڈی ٹیلر ہملٹن نے بھی اس کی ہم ودائش کا نوہا مان لیا۔ دونوں میں خوب نیچے لگی۔ ٹیلر ہملٹن نے ایک دن سلطان کو شورو دیا کہ وہ ہوشیار ہو جائے۔ کچھ لوگ بادشاہ کو اس سے بدظن کرنے کی سازش میں لگے ہوئے ہیں۔ اس نے فوراً ہی یوریا بستر ہانڈ لیا اور رات کی تاریکی میں کابل سے فرار ہو گیا۔ وہ لاہور پہنچا ہی تھا کہ حکومت برطانیہ نے اسے لندن طلب کر لیا لندن پہنچنے پر اس کے استقبال کو لیڈی ٹیلر ہملٹن خود بند گاڑی پر آئی۔ وہ اس کے گھر میں ٹھہرا لیکن جلد اسے احساس ہو گیا کہ یہاں اس کے لائق کوئی کام نہ تھا اس لیے وہ دوبارہ حصول علم میں کوشاں ہو گیا۔ اس نے کیمبرج میں داخلہ لے لیا تھا۔ طلب علم کی لگن نے اسے جلد ہی فیو آف رائل جیو گرافیکل سوسائٹی کی سند دلا دی۔ سلطان محمد نے کیمبرج میں دو سال تک تعلیم حاصل کی، پھر اس نے لاء کالج میں داخلہ لے لیا۔ پیرسز ی پاس کرنے کے بعد وہ واپس برصغیر آ گیا۔ پہلے اس نے جہلم میں پریکٹس کی لیکن وہاں جسم نہ سکا اور واپس اپنے آبائی شہر سیالکوٹ آ گیا۔ وہاں آ کر اس نے ایک بہت بڑی حویلی خرید لی جس اس نے یکے بعد دیگرے پانچ شادیاں کی تھیں سب سے چھوٹی بیوی کے نو بچے ہوئے۔ طفیل احمد، عنایت اللہ، بشیر احمد، بیگم بی بی گل، بیگم نجیب اللہ خان، بیگم اعظم علی، بیگم حیدرہ، رشیدہ سلطانہ اور فیض احمد خان۔ بکریا چرانے والے سلطان محمد خان نے اپنے عزم و حوصلے سے تعلیم کا سہارا لے کر ثابت کر دیا کہ تعلیم ہی انسان کو اردو پر پہنچاتی ہے۔ شہرت دلاتی ہے۔ یہ وہی سلطان محمد خان تھے جن کے بیٹے فیض احمد فیض نے اردو ادب میں ایک بڑا مقام پایا۔

☆☆☆

شہر خیال

مدیر اعلیٰ



☆ نثر ہمت افتخار نے ساہیوال سے پہلی بار تمبرہ ارسال کیا ہے لیکن اتنا بھر پور ہے کہ ایک لفظ بھی اضافی نہیں ہے۔ انہوں نے لکھا ہے۔ ”پہلی بار محفل میں آئی ہوں۔ کون کون ویں کم کرے گا۔ اس بار کا شمارہ بروقت آیا تو سوچا میں بھی تمبرہ کرنے کی کوشش کر لوں۔ گو کہ یہ میرے لیے ایک مشکل امر ہے۔ کبھی تمبرہ کیا نہیں، دوسروں کا پڑھتی رہی ہوں اس لیے صرف کوشش کی ہے۔ اگر انداز یہاں پسند نہ آئے تو خدا را مذاق مت اڑا دے گا۔ نئی آمد سمجھ کر درگزر کر دیجیے گا تو جناب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ زویا اجاز کی رہائی نے مجھ پر جادو سا اثر دکھایا۔ قیام پاکستان کے وقت کی سیکڑوں کہانیاں پڑھی ہیں، امرت سر جل رہا ہے، کھول دو، خوشی سے سنی ریل، اور انسان مر گیا۔ نہ جانے کتنے ناول، کتنی کہانیاں پڑھی ہیں۔ پڑھ پڑھ کر روئی ہوں کہ کس طرح مسلمانوں کا خون اڑاں ہو گیا تھا۔ کتنی قربانیوں کے بعد یہ وطن حاصل ہوا جسے یہ آج کے سیاست دان کتر کتر کر کھا رہے ہیں۔ لیکن اس سچ بیانی نے تو دہلا دیا۔ ایسی کہانیاں کبھی کبھی ہی جنم لیتی ہیں۔ (ویڈیو زویا اجاز) ”رہائی“ کے بعد جو ج بیانی پسند آئی وہ ”کی جانان“ ہے۔ زبردست، قلم کا شاہکار کہلا سکتی ہے۔ ”محافت“ کو محافت کہہ کر میں نے پڑھنے کے بعد نظر انداز کر دیا۔ ”نزیات“ بس گزرا ہے لائق تھی۔ ”شیر کی خالہ اور زہر کا پیالہ“، نکو اس کی جانے گی۔ فرشتہ اور تیراب افسانوی انداز کی ہے ”دل مشکل“ کچھ پڑھی پڑھی گی تو ذہن پر زور دیا پھر اپنا سر پٹا کہ اتنی جلدی بھول گئی۔ یہ ابھی ایک ماہ قبل ہی تو ایک ڈائجسٹ میں پڑھی ہے۔ مدیران سے التماس ہے کہ ایسی کہانیوں سے اجتناب کریں۔ (حسیب اشرف نے یہ ایک غلط حرکت کی ہے۔ ہم چاہے کہانی لکھنے والوں پر پابندی لگا دیتے ہیں۔ مصنف کی اس حرکت پر ہم محذرت خواہ ہیں کہ قارئین کو سہواً ایسی کہانی پڑھنے کو ملی)۔ اب کچھ باتیں باذوق قارئین کے لیے لگائی جانے والی تحریر پر بھی ہو جائے۔ علامہ ابن جوزی پر ضیائیم بکرا کی نے خوب لکھا، اب تک مختلف تحریروں میں بطور حوالہ ان کا نام پڑھتی رہی ہوں پہلی بار ان کی حالات زندگی پڑھی۔ راشدی برادران سندھ کے ماتھے کا مجموعہ ہیں۔ انہوں نے وسائل نہ رہتے ہوئے بھی جو تخلیقات پیش کیں ان کا جواب نہیں۔ تنقید نگار بھی خامے کی چیز ہے۔ محترم فکیل صدیقی اور فکیل اوریس دونوں کی تخلیق قابل تحسین ہے۔ سلی اعلان کا کیا کہنا، وہ جو کچھ لکھتی ہیں دل کی آنکھوں سے میں پڑھتی ہوں، شاعر انقلاب خوب لکھا ہے۔ چرکی بہت مختصر تھی، شاید لطیف کو اسے مزے طویل کرنا چاہیے تھا۔ آواز کا جادو گر، واہ جناب میرے پسندیدہ اناؤنسر پر تحریر، وہ صرف اناؤنسر نہیں ایک بڑے محقق بھی ہیں اور ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ”مرد بحران“ بھی پسند آئی لیکن دھرتی کا یو جھ مرحوم کاشف زہیر کی تحریر بہت عمدہ بہت اعلیٰ، زبردست تحریر ہے۔ اب آتی ہوں اپنی پسندیدہ تحریر کی طرف یعنی جس کا انتظار بڑی بے صبری سے کرتی ہوں۔ کہتے کو ”ششال سے ٹورنٹو“ ایک سفر نامہ ہے لیکن حقیقت میں وہ ایک طویل تحریر ہے۔ اگر نسرین کے کردار کو اور آگے بڑھایا جائے تو مزہ آجائے گا۔ تلقین شاہ بھی پسند آئی۔ اب ذرا ناسوری بات... بھی کی جائے۔ یہ نویں قسط ہے اور کہانی ایک انچ بھی نہیں پڑھی۔ کرداروں کا جود بازار ہے۔ اگر براندہ نامیں تو کہہ دوں کہ مجھے یہ کہانی بالکل پسند نہیں آ رہی ہے۔“

☆ امجد علی سید لاہور سے قطر آ رہے ہیں۔ ”میں کہانی لکھنا چاہتا ہوں طریقہ کار بتا دیں“ یہ میرا پہلا سوال ہے۔ اب تمبرہ حاضر ہے پہلے ہی بتا دوں کہ میں بہت سارے رسالوں میں تمبرہ لکھتا رہتا ہوں۔ علامہ ابن جوزی پر ضیائیم بکرا کی نے اچھا لکھا ہے۔ ایک تحقیقی مضمون ہے راشدی برادران پر فکیل صدیقی نے انصاف نہیں کیا یہ تحریر مزید تحقیق مانگتی ہے۔ تنقید نگار بھی اسی زمرے میں آتی ہے،

شاعر انقلاب سہلی اہوان کی بھی ادھوری ادھوری تھی۔ یہ چرکی تو بالکل سمجھ نہیں آتی۔ ”آواز کا جادوگر“ اتنی طویل تحریر ہے سعید احمد سلطان نے صفات خالص کیے۔ مرد بخران بھی بس ایسے ہی تحریر ہے۔ اب کہانیوں پر بھی باتیں ہو جائیں۔ تیزاب اور فرشتہ جیسی کہانیاں بالکل پسند نہیں آئیں۔ ”کی جاناں“ سے اچھی کہانی تو ”رہائی“ تھی لیکن یہ کہانی بھی افسانوی سی تھی۔ زہر کا پیالہ بہت پسند آئی۔ (خدا کا شکر ہے کہ آپ کو کوئی کہانی پسند آئی۔ کہانی لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ سفید کاغذ اور قلم لیں ایک ایک لائن چھوڑ کر صاف صاف لکھیں، کہانی میں پلاٹ کا ہونا ضروری ہے۔ جملے دلچسپ ہوں، کہانی میں روانی ہو اور کہانی جچی ہو ہم افسانے شائع نہیں کرتے۔“

☆ سحرش سحر کا ای میل ”میں رائٹر ہوں، ایک مکمل ناول لکھ چکی ہوں جو کتابی شکل میں آنے والا ہے، ایک اور ناول بھی آن لائن شائع ہو رہا ہے۔ میں سرگزشت میں سلسلہ دار ناول لکھنا چاہتی ہوں۔ لاپ اس ناول کا مکمل مرکزی خیال اور ایک قسط پہلے بھیج دیں۔ اگر اعداد تحریر اچھا ہوا تو کہانی ضرور چمپ جائے گی۔“

☆ نادہ عزیز لودھی، ایڈیٹر خبریں مانچسٹر یو کے لکھتی ہیں۔ ”میں عرصہ دراز سے آپ کے رسالوں کی قاری ہوں، اور لکھاری بھی ہوں نیز اخبارات میں بھی لکھتی ہوں۔ اس رسالے سرگزشت کے لیے مرزا اسد اللہ خاں غالب کی سرگزشت لکھنا چاہتی ہوں۔ (غالب پر طویل تحریر شائع ہو چکی ہے)“

☆ خالد محمود کی آمد ملتان سے، اس دفعہ سرگزشت 25 تاریخ کو مل گیا۔ بے حد خوشی ہوئی۔ محرم کی چھٹیوں کی بدولت کافی وقت مل گیا تھا۔ محترمہ زویا اعجاز کی کہانی ”رہائی“ پڑھ کر کچھ پھٹ گیا۔ کہاں وہ وقت تھا کہ محمد بن قاسم کو چند خواتین کی رہائی کے لیے فوج کشی کے لیے آنا پڑا اور اب ہم جیسے کروڑ اور بڑوں مسلمانوں کو ایسے برے دن دیکھنا پڑ رہے ہیں۔ بعض لوگوں کو شاید یہ کہانی سمجھ نہ آ سکے مگر میرے جیسے لوگوں کے لیے مقام عبرت ہے کیونکہ میں نے پاکستان بننے دیکھا ہے۔ جن لوگوں کو کبھی پکائی مٹی ملی ہے ان کو پاکستان کی کوئی قدر نہیں ہے۔ ان کو صرف دولت سے پیار ہے۔ بعض اوقات میں سوچتا ہوں کہ اگر اللہ نے ہمیں کشمیر دے دیا اور جب وہاں کوئی دولت مند بے وقوف سیاست داں حاکم بن کر عیاشی کرنے لگے گا تو وہ لوگ سوچیں گے کہ آیا انہوں نے ایسے پائوں کے لیے اتنی قربانیاں دی تھیں۔ یہی حال موجودہ پاکستان کے حاکموں کا ہے۔ اشعر جمال صاحب کی کہانی ”کی جاناں میں“ ایک اچھوتی کہانی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسی حقوق کو معاشرہ میں جائز مقام ملنا ضروری ہے۔ میرے علم میں بات نہیں ہے کہ ایسی حقوق تو چین، روس، یورپ اور امریکا میں کیا مقام دیا جاتا ہے۔ آخر وہاں بھی ایسے لوگ پیدا ہوتے ہوں گے۔ اگر کوئی صاحب علم روشنی ڈالیں تو ممنون رہوں گا۔ حماقت بالکل حماقت ہی ثابت ہوئی۔ ”مزایق“ بھی سبق آموز کہانی ہے۔ ”شیر کی خالہ“ واجبی سی کہانی تھی۔ فرشتہ ایک لا جواب حقیقت ہے۔ عہد اللہ صاحب نے ہمارے سیاست دانوں کی چڑی ادھیڑ دی ہے۔ مبارک ہو، ہم سوچتے تھے کہ آفاقی صاحب کے جانے کے بعد قلم گھری کا کیا ہوگا لیکن انور فاہ صاحب نے کمال کر دیا۔ ان کے مضامین بے حد عذبت رکھتے ہیں اور خاص طور پر حقیقتیں وہ نکال کر لاتے ہیں لا جواب ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے قلم میں اور طاقت دے۔ ندیم، وحید مراد، چاد بدین پراں کی کہانیاں پڑھ کر پرانی یادیں تازہ ہوئیں۔ ”ناسوز“ کی سلسلہ وار قسط میں کریکٹر بڑھتے جا رہے ہیں جو مجھ جیسے بوڑھے کی یادداشت سے مطابقت نہیں رکھتے۔ شیشال سے نورنؤاب کی سیاست کا شکار ہے مگر دلچسپ ہے۔ باقی مضامین ابھی زیر مطالعہ ہیں۔“

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کراچی سے لکھتے ہیں ”چیف صاحب! اجتماعیت کا اسلامی پیغام ہرگز ہرگز انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے طوفان بدتمیزی کی نذر نہیں ہوگا۔ ہر نئی چیز اور ایجاد کا وقتی اہل ضرور ہوتا ہے۔ آج کی ماں ضرور اس سے متاثر ہے لیکن اگلی نسل کی ماں اس کی عادی ہو کر وہ اس کی مہارت اپنے ساتھ لے کر اپنے بیٹے اور بیٹیوں کے درمیان شیخی ہوگی۔ لاؤڈ اسپیکرز اور ٹیلی ویژن سے بھی ابتدائی طور پر یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ یہ سب ہماری اسلامی اقدار کو متاثر کریں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ آج ہماری نوجوان نسل میں اپنے مذہب سے رغبت پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہے اور رہ گئی اجتماعیت کی بات تو آج بھی آجی جیسے مشعل راہ لوگ ہمیں بھینکنے نہیں دیں گے۔ عثمان جاسمی کی خوبصورت نظم پران کا شکر یہ۔ ہاجرہ سرور نے ہمیں واقعی سرور کر دیا۔ تنقید مگر سے زیادہ ہم ڈاکٹر جمیل جالبی کو ایک مشفق استاد کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ان کے ادبی احسانات اپنی جگہ لیکن کراچی یونیورسٹی کی خدمت ان کا عظیم اثاثہ ہے۔ راشدی برادران بھی قوم کا روشن چہرہ تھے۔ اپنے اپنے نفس کو مرغوبات سے جس نے بھی روکا وہ اللہ کا دوست بن گیا، علامہ ابن جوزی بھی ان میں سے ایک تھے۔ سہلی اہوان صاحبہ کی تحریریں ہماری نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔ شاعر انقلاب بھی اچھی تھی۔ شاہد لطیف کی چرکی مناسب تھی۔ آواز کا جادوگر ریلوے کے لیے صرف رضا علی عابدی نہیں بلکہ ان جیسے جادوگروں کی ایک فوج تھی جس ماہنامہ سرگزشت

نے ریڈیو کو طلسماتی بنا دیا تھا۔ رضاعلی عابدی کو صف اول کے لکھاری میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ عراق کے پس منظر میں دھرتی کا بوجھ انتہائی شاندار تھی۔ حارث جیسے خدار ہر جگہ موجود ہیں اور انہیں جیسی حب الوطن عورتیں بھی، کاش مدام سین عراق کی اس حالت کے ذمہ دار نہ بننے، عظیم اقبال صاحب ”شمال سے نور نژد“ تک میں اپنے وطن سے دور پہلی عید کی رودار سنا رہے تھے۔ انداز تو ہے ہی دل بھانے والا، اس مرتبہ کچھ افسانوی رنگ غالب تھا خاص کر پری جمال والا واقعہ۔ تعلقین شاہ کی شخصیت کو بلا تمبر بھی رہنے دیا جائے تو اس کی شان میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ نو ماہ بعد اپنے حقیقی عمل سے گزر کر اپنے معاشرتی تا سوروں کو عملی شکل دینے میں جناب عبدالرب یعنی کامیاب ہو گئے لیکن کہانی جہاں کی تھا ان کھڑی ہے اب اسے آگے بھی بڑھنا چاہیے۔ ہر ماہ کی طرح انور فرہاد اس مرتبہ بھی چھانکے۔ مرد بجران جاوید شیخ کی ایسی سرگزشت ہے جو نہ صرف پڑھنے کے لائق ہے بلکہ اس میں بہت سی غلطیوں سے بچنے کا سبق بھی ہے۔ جناب ابن صفی کا عمران بلاشبہ جاوید شیخ ہی ہو سکتا تھا۔ کاش دھماکا کی بے قدری نہ ہوتی تو آج ہم بھجوا باند کی طرح عمران سیر پڑ بھی کئی فلمیں دیکھ چکے ہوتے۔ خدا کرے ذہنیت منکھی جاوید شیخ کو اپنی ٹیکنیکس معاف کر دیں یہ سوچ کر کہ اگر وہ دکھ نہ اٹھائیں تو ہمیں جاوید شیخ بھی نہ ملتا۔ شہر خیال میں حاصل تمبر رضا احمد اعوان کا تھا انہوں نے تو آئینہ دکھا کر افسردہ ہی کر دیا۔ اعجاز حسین سٹار، رانا محمد شاہد، سدرہ بانو ناگوری، قیسر خان، کلیم اللہ ایڈوکیٹ، ہزانت اشٹال، عبدالجبار رودی، سیف اللہ اور عظیم اقبال صاحب کا شکر یہ کہ انہیں ہمارا تمبر پسند آیا۔

☆ آرٹسٹ محمد عامر سائل کی تشریف آوری۔ ”سب سے پہلے شہر خیال میں حاضری دی۔ جناب رضا احمد اعوان کا طویل خط بہت زبردست تھا۔ اس کے علاوہ دوستوں میں قیسر خان، بکسر اور عظیم بھائی ڈیرے وال کا خلوص نامہ بہت پسند آیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مرد بجران پڑھی اس میں جاوید شیخ کے بارے میں تفصیل سے واقعات بیان ہوئے ہیں، بہت اچھا لگا۔ جاوید شیخ نے ذہنیت منکھی کے ساتھ جو سلوک کیا بہت ہی دکھ کی بات ہے۔ ایک تجربے کی بات ہے کہ جو شخص کسی اچھے انسان کی قدر نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس بے قدرے شخص کو زندگی میں بڑے انسانوں سے بھی ٹکراتا ہے تاکہ وہ اچھے اور برے میں تمیز کر سکے۔ شمال سے نور نژد میں عظیم بھائی نے نسرین کے بیٹے کی سالگرہ میں شرکت کر کے ان دونوں کو دلی خوشی عنایت فرمائی۔ نہ جانے اب نسرین بے چاری مستقبل میں کیا فیصلہ کرنے والی ہے۔ ایران جانے کی کہ وہیں رہ جائے گی۔ عظیم بھائی زبردست۔ تا سوروں میں محسوس برقرار رہ گیا کہ نہ جانے زہرہ ایڈوکیٹ کی کوئی کی زد میں کون آگیا۔ سچی آپ بیتیوں میں ”رہائی“ ایک مکمل دکھ بھری داستان تھی۔ بلد بولنگھ اور گلاب کو اپنے کیے کی سزا بھگت چکے مگر اگلے جہاں یعنی جہنم میں اس سے کئی گنا زیادہ تر ہیں گے۔ اس آپ بیتی سے یہ بھی سبق حاصل ہوتا ہے کہ والدین کو اپنی اولاد پر اور ان کے دوستوں پر یوں اندھا اعتماد بالکل نہیں کرنا چاہیے۔ تریاق بہت ہی انوکھی عبت کی داستان تھی۔ دیم نے واقعی اپنی عبت کی سچائی کا ثبوت دیا۔ یہ سچ ہے کہ جو انسان کسی سے سچی عبت کرتا ہے تو وہ ہر حالت میں صرف اپنے محبوب کو خوش دیکھنا چاہتا ہے اور یہاں اس کے محبوب کی خوشی اس کے اپنے شوہر کے ساتھ ہی تھی۔ جب محبوب خوش ہوا تو ایک عاشق کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ ویلڈن ویم بھائی۔ زہرہ کا بیٹا اپنے آپ میں منفرد تجربہ تھی۔ ملک نور کا بے اقدام سر اسر غلط تھا اور رطلما بھی خود کشی کر کے گمناہ کبیرہ کی مرکب ہوئی۔ فرشتہ میں بے خودی سی نے ہماری بیوقوف عوام کو بالکل ہی اٹو کے اور نرالے انداز میں بیوقوف بنایا۔ اللہ تعالیٰ کی پاک ذات تمام مسلمانوں کو ایسے بہرہ دہ سے بچائے (آمین ثم آمین)۔ تیزاب میں رافقہ کے ساتھ واقعی بہت ظلم ہوا۔ یہ ٹھیک ہے کہ قانون نے اپنا کردار ٹھیک طور پر نہیں نبھایا مگر پھر بھی کوئی بھی شہری ہوا ہے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ اس دکھ اور زائش پر صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتی۔ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر کون سا فائدہ حاصل ہوا؟

☆ سدرہ بانو ناگوری نے طیر کراچی سے لکھا ہے۔ ادارہ میں عثمان جامی کی نظم پڑھ کر یوں سے ایک آہ سی نکلی، ہم عجیب تذبذب کا شکار ہیں۔ ایک طرف ہماری موجودہ نسل کی انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا میں حد سے زیادہ بڑھتی ہوئی دہشت گردی دوسری طرف روہنگیا مسلمانوں پر توڑے جانے والے ظلم و ستم۔ ابھی تو کشمیر کے مسلمانوں کو کھٹکھٹا نہیں ہوا تھا کہ پھر سے امت مسلمہ پر ایک اور وار، ایک نیا دکھ، ایک نئی اذیت۔ خدا پاک ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ ”شہر خیال“ کے سبھی ساتھیوں کا تمبر لے کر پسنہ دی کی پشکر یہ۔ کلیم ایڈوکیٹ صاحب آپ کا یہ مختصر خط پڑھ کر مجھے دل سے اعتراف ہے کہ آپ جیسے اچھے اور سچے لوگ ابھی بھی ہیں جو واقعی وطن عزیز کے دکھ کو سمجھتے ہیں۔ آپ اپنا کام اسی طرح جاری رکھیے۔ شہر خیال کے سبھی ساتھی آپ کا حوصلہ بڑھانے کے لیے آپ کے ساتھ ہیں۔ عظیم اقبال اچھی تحریر اپنی جگہ ضرور بناتی ہے لیکن اس تحریر نے تو مسرور کر دیا ہے۔ میں امریکا سمیت بہت سے ملکوں کے حلف نامے پڑھ چکی ہوں۔ آپ نے ٹھیک فرمایا کہ آپ جس ملک میں بھی رہیں وہاں کے قانون کا احترام کرنا ضروری ہے۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ آپ

نے ایسا کیوں کہا۔ آپ کا بھی شکریہ کہ آپ شہر خیال کے لیے بھی وقت نکالتے ہیں۔ لکھتے رہا کریں۔ اچھا لگتا ہے۔ ”تلقین شاہ“ جناب اشفاق احمد صاحب کا مختصر تذکرہ اچھا لگا۔ ”ناسور“ میں نعمان بڑی مشکوٰۃ سے اپنی بہن کو بچا پایا تھا اب ہم کی گمشدگی سوالیہ نشان کی مانند آکھری ہوئی ہے۔ ”مرد بخیران“ موجودہ دور کا ایک بڑا اداکار مگر جب میں نے اس کے گزربے شب دروز کا احوال پڑھا تو میں حیران رہ گئی کہ اس نے موجودہ مقام پانے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ اس نے سب کچھ پایا مگر زینت منہی کو چھوڑنا اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ کاش کہ وہ یہ غلطی نہ کرتا تو کوئی غلطی کوئی کی اس کے دل میں نہ رہتی۔ ”شمشال سے روزنو“ ہمیشہ کی طرح دلوں میں اتر گئی۔ ندیم بھائی مفتی کی بہن کی بدولت آپ کی حید تو خوب گزری مگر مومن نے تازے بے نے سرجی کی حید کا سارا مزہ کر کر اکر دیا۔ سلی ایوان ہمیشہ کی طرح اپنے منفرد انداز میں آئیں اور اپنی خوبصورت تحریر کے ذریعے ایک بار پھر اپنا کردیدہ کر گئیں۔ بہت اچھے سلی جی۔ ذویا اعجاز جی اس دفعہ تو رلا دیا آپ نے۔ پاکستان کی بچی کا درد اور کرب پڑھ کر دل دہل گیا۔ کتنے انفسوں کا مقام ہے کہ انہی خالوں کو ہم سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ ہمارے گھروں میں خوشیاں اس وقت تک ادھوری رہتی ہیں جب تک ہم ان کے گائے ہوئے گانوں کو نہ بجالائیں۔ کتنے بے حس ہیں ہم، وطن کی ہزاروں بیٹیاں اسی طرح ظلم و ستم کا نشانہ بنتی ہیں۔ ”تریاقی“ میں دسم کے اقدام کو سراہنا چاہیے کہ اس نے محبوبہ کی خوشی کے لیے محبوبہ سے دستبردار ہونا ہی بہتر سمجھا۔ اس نے جو کیا بہت اچھا کیا۔ محبت کا یہ انداز ہمیں بہت بھایا۔ ”فرشتہ“ اچھی تحریر ہے مگر بے خود صاحب کی خودی کے کیا کہنے، سیاست کا حصہ بننے کے لیے نیکی اور اچھائی کی آڑ لیتا انتہائی غلط عمل ہے۔

☆ نذیر احمد راجپوت نے شہدادپور سے انور فرہادی کی تحریف کی ہے۔ لکھتے ہیں ”میں ماہنامہ سرگزشت کا مستقل خریدار ہوں۔ آپ نے ادا کار سدیر، ادا کار محمد علی، ادا کار ندیم، ادا کار وحید مراد اور اس میں جے جاوید شیخ پر مفصل مضمون لکھا۔ یہ مضامین بہت دلچسپ اور معلوماتی ہیں، پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ غالباً دسمبر 2015ء کے شمارے میں باقاعدہ سیارہ پوش پر معلوماتی اور مفصل مضمون آپ نے تحریر کیا تھا۔ ایسا مضمون تو آج تک مفت روزہ نگار میں بھی شائع نہیں ہوا جیسا آپ نے لکھا ہے۔ میری آپ سے التجا ہے کہ براہ کرم اب آپ بچانی قلموں کے فنکاروں پر دلچسپ معلوماتی اور مفصل مضمون تحریر کریں۔ مثلاً ادا کار اکمل مرحوم، ادا کارہ شیریں، ہدایت کار حیدر چوہدری، گلوکارہ تنیم نذیر، موسیقار، ہدایت کار ایم جے رانا، ہدایت کار اسلم ایرانی، نغمہ نگار وارث لدھیانوی وغیرہ پر ان فنکاروں پر معلوماتی دلچسپ اور مفصل مضمون پڑھنے کا بے حد شوق ہے۔ امید ہے کہ آپ میری خواہش پوری کر دیں گے۔“

☆ رانا محمد شاہد کا ظلم نامہ پورے وال سے۔ معراج رسول کے ادارے میں دو باتیں پڑھ کر اپنی ماں کی بہت یاد آئی۔ جب تک وہ زندہ تھیں ہم سب شادی شدہ بھائیوں اور بہنوں کے اکٹھے ہونے کی وجہ وہی تھیں۔ جب عید یا کسی بھی خاص موقع پر دوسرے شہروں سے بھائی آتے تو سب کا اکٹھے دیکھ کر ماں کی خوشی سنہالے نہ سنبھلتی۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ماں ایک ایسا مرکز ہے جو اولاد کو جوڑے رکھتا ہے۔ ظلم کا دوسرا پہلو بھی وردناک ہے کہ آج کی دنیا میں انٹرنیٹ نے ہر شخص کی الگ دنیا بادی ہے۔ گویا ایک ایک ہی گھر میں رہنے والے انجبی ہیں اور ان کی آپس میں ایک دوسرے سے کم ہی گفتگو ہوتی ہے جو بھینچا بول معراج رسول، اسلامی اور ہماری تہذیبی اقدار کے لیے لحوہ لگ رہی ہے۔ ایک نئی سرگزشت میں معروف افسانہ نگار ہاجرہ سرور کی بچپن میں ادبی دنیا میں داخل ہونے کی کہانی بہت دلچسپ لگی۔ ایک کندہ بہن بچی نے کس طرح ادبی دنیا میں نام پیدا کیا۔ میرے خیال میں بھینچا مطالعہ اور خوب مطالعہ ہی اس کی وجہ بنی۔ اس دفعہ کئی صدارت پر موجود رضا احمد اعوان کا طویل خط تبصرے سے زیادہ مختلف مسائل کا احاطہ کرتا کالم لگ رہا تھا۔ تبصرہ تو آخر میں چند لائنوں پر مشتمل تھا۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی بھی اچھا لکھ رہے ہیں۔ سلیم رشید کی بات سے اتفاق ہے کہ اتحاد و اتفاق ایک ایسی قوت ہے جس سے بڑے سے بڑے مسائل سے نمٹا جاسکتا ہے۔ سدرہ بانو ناگوری! یہ مقام انفسوں ہی ہے کہ ہم دنیاوی کاموں کے لیے تو ایک دوسرے کو لوٹنے اور دھوکا بھی دیتے تھے۔ اب جیسے مقدس فریضے میں بھی ایسی کام کرنے لگے ہیں۔ لحوہ لگ رہی تو یہ بھی ہے کہ جب دھوکے اور فراڈ کو ہم زندگی کا معمول بنالیں گے تو پھر نیچے کی صورت کیسے اور کیوں کر بنے گی۔ کلیم اللہ اللہ و دیکھ آپ نے صحیح لکھا، ہم تاریخ کو جتنا مرضی مسخ کرنے کی کوشش کریں وہ کسی نہ کسی صورت حقیقت سامنے لا کر آ کر رہتی ہے۔ آپ تو ہی معاملات پر لکھیں اور قارئین تک صح ضرور پہنچائیں۔ نزات افشار، علامہ اقبال کے حوالے سے آپ نے جو لکھا اس حوالے سے تو بس یہی کہیں گے کہ جو قوتیں اپنے محسنوں کو فراموش کر دیں، زوال ان سے زیادہ دور نہیں رہتا۔ اس زوال کا سامنا ان کی کئی قسطوں کو کرتا پڑتا ہے۔ عبدالباقی روری گزشتہ تبصرے کے آخری نصف میں لاہور میں تھا۔ آپ سے ملنے کا سوچا، پھر یاد آیا کہ آپ تو قصور میں ہوتے ہیں۔ ندیم اقبال اردو سے محبت کرنے والے جہاں بھی ہوں وہ اردو کی ترقی و ترویج کے لیے ہمہ وقت کام کرتے ہیں کہ زندہ قوموں کا بھی شیوہ ہے۔ اسلامی تاریخ کی ایک عظیم ہستی مفسر اور مورخ علامہ ابن جوزی کی شخصیت پر ضیاء تنیم بکراہی نے بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ حقیقت تو

یہ ہے کہ ان مہتیوں کی زندگیوں تمام انسانوں کے لیے روشنی ہی روشنی ہیں۔ سندھ کے قابل فریبتوں پر کھیل صدیقی کی تحقیق قابل ستائش تھی۔ راشدی برادران کی ادب کے لیے خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی زندگی کی کہانی پڑھی۔ ڈاکٹر صاحب نے بچوں کے لیے بہت لکھا۔ بچوں کے لیے لکھی ان کی کہانیاں اپنے بچپن میں خوب پڑھی تھیں۔ رضاعلی عابدی اردو زبان کا ایک معترف نام۔ جرنیلی سڑک پشاور سے کلکتہ کانس پر سفر کیا گیا، سفر جہاں بیش قیمت معلومات فراہم کرتا ہے وہیں رضاعلی عابدی نے اس خطے کی تہذیب و ثقافت کو بھی بخوبی اجاگر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پڑھنے و قوتوں کی سادگی، رواداری اور وضع داری کا آج کی نفسی اور تیز رفتار زندگی سے بھی خوب موازنہ کیا ہے۔ جاوید شیخ کا شمار بھی پاکستان فلم انڈسٹری کے بڑے اور نامور اداکاروں میں ہوتا ہے۔ انور فراہانے ان کی زندگی کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کیا۔ خصوصاً والدہ کے انتقال کے دو دن بعد سیٹ پر آنا بھٹنا ایک کرب ناک اور آزمائشی مرحلہ تھا۔ ”دھڑکی کا بوجھ“ کے ساتھ مریم اے کا شرف کی آمد اچھی ہے۔ دلچسپ باتوں سے مزین ندیم اقبال کا سفر نامہ بھی اچھا جا رہا ہے۔ افتخار مجازی کی تلقین شاہ یعنی اشفاق احمد پر مختصر تحریر اچھی لگی۔ اشفاق احمد جیسے پٹھانی لوری جیسی باتیں کرنے والے صوفی اور درویش بھی معاشروں کو صدموں بعد ملتے ہیں۔“

☆ فاضل محمد عزیز مئے کا تبصرہ لندن و ہاؤسی سے ”ادار یہ تازہ ترین حالات کا بہترین عکاس ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ موبائل اور انٹرنیٹ نے فاصلے ختم کر دیے ہیں لیکن اس سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ اس ایجاد نے انہوں کے درمیان بہت فاصلے پیدا کر دیے ہیں۔“ یکم مئی داستان باجرہ سرور کا مختصر تعارف تھا۔ شہر خیال کی صدارت رضا احمد خان اعلان کے نام تھی۔ آپ نے تبصرہ کم کیا لیکن جن حالات کی طرف اشارہ کیا ہے شاید ہم سب مجموعی طور پر اس سے کیوتری طرح آنکھیں چرا رہے ہیں۔ آفتاب نصیر اشرفی، اعجاز سحر، رانا محمد شاہد، سدرہ بانو ناگوری اور سیف اللہ نے بھی بھرپور تبصرے کیے۔ نزابت افشار، فرائی اکین۔ شہر خیال میں ندیم اقبال سر کی آمد بھلی لگی۔ احمد خان توحیدی، بشری افضل کے علاوہ وحید ریاست بھی کئی عرصے سے غیر حاضر ہیں اور وحید صاحب کی معروضیات کے پیش نظر میں سرگزشت کا ”سالانہ تجزیہ“ مرتب کر رہا ہوں۔ انشا اللہ اپنے وقت مقررہ پر بشرط زندگی بیچ دوں گا۔ علامہ ابن جوزی پر محترمہ ضیائیم بکرا کی نے خوب مضمون لکھا ہے۔ راشدی برادران کا ذکر بھی خوب تھا لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز نگار نے دیا۔ جمیل جالبی حیرت انگیز شخصیت کا نام ہے۔ شاعر انقلاب پڑھ کر محروم حبیب جالب یاد آئے۔ آواز کا جاوید گر، رضاعلی عابدی پر سید احمد خان نے بھرپور لکھا۔ انور فراہانے میر سے پسندیدہ اداکار جاوید شیخ کے حالات زندگی کا بڑی باریک بینی سے احاطہ کیا۔ دھڑکی کا بوجھ اس ماہ کی بہترین کہانی تھی۔ انہیں کی بے بسی کا پڑھنے ہوئے آنکھیں بار بار بھیگ جاتی تھیں۔ جس کم جہاں پاک، ابن اپنے ساتھ کئی درندوں کو کینٹر کر دیا کہ پتھانے کا سبب بنی۔ اس کی عظمت کو سلام۔ شمال سے ٹورنٹو کی یہ قسط کو گویا روٹھک سی قسط تھی۔ سرین اور اس کے بچے سے ملاقات اور پھر ان کے گھر قیام۔ واہ جی واہ! کیا بات ہے۔ تلقین شاہ میں بابا اشفاق احمد کی رحم دل فطرت کا ایک اور پہلو اجاگر کیا گیا تھا۔ نا سو رکی اس قسط کا انجام سوا لپہ نشان چھوڑ گیا ہے۔ سرور قی کی کہانی ”ربانی“ پڑھ کر دل غموں کے اٹھارہ سندھ میں ڈوب گیا۔ اف خدا یا! کتنی لاچار، مجبور اور بے بس تھی زبیر اور اس جیسی نہ جانے کتنی پاکستانی بیٹیوں کو قیقت چکانی پڑی ہے پاکستان بننے کی۔ اس بات کا اعتراف آج کی نسل کو شاید بلکہ بھینا نہیں ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ آج کی نسل کو اس قیمت سے آگاہ کیا جائے تاکہ دوست اور دشمنوں میں تیز پیدا ہو۔ آخری سچ بیانی میں ماں کی عظمت کو بیان کیا گیا ہے۔ ماں تیری عظمت کو سلام۔ کتنا خوش نصیب ہے محبت جسے انتہا محبت کرنے والی ماں ملی ہے۔ سچ بیانیاں تو ساری پڑھ چکا ہوں لیکن جلد کی کمی ہے، سوائے حافظہ۔“

☆ خواجہ حنیف ادیب کا خط لاہور سے۔ ”اکتوبر کا شمارہ پیش نظر ہے۔ ابھی ابھی رسالہ پڑھ کر اٹھا ہوں۔ سرگزشت کے مطالعہ کے سلسلے میں میں سب سے پہلے ”شخصیات“ کے صفحات کو ترجیح دیتا ہوں۔ یکم مئی سرگزشت میں ممتاز افسانہ نگار باجرہ سرور کا ذکر تھا۔ باجرہ سرور اور غدیہ مستور دو بہنوں نے اپنے وقت میں دنیائے ادب بالخصوص افسانے کی صنف میں بڑا نام پیدا کیا۔ انہیں ادبی دنیا میں ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ ان سے متعلق ایک اچھی تحریر پڑھ کر پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ قلم و قراٹھ کے ایسے وحشی لوگوں کا ذکر جب بھی آجائے وہ نیا ہی ہوتا ہے، پرانا نہیں ہوتا۔ حرف و لفظ کے کھلاڑی امر ہوئے وہ بھلا سکی کو کب بھولتے ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ تاریخ کا ایک حصہ ہوتے ہیں تو غلط نہیں۔ دیگر شخصیات کے ذکر میں اشفاق احمد جیسے عظیم دانشور، قلم کار، ڈراما نویس اور مصنف سے متعلق بھی پڑھنے کو ملا۔ اشفاق احمد میر سے پسندیدہ دانشور، مصنفین اور ادیبوں میں سے وہ منتخب شخصیت ہیں جن کا میں دلچسپی ہوں۔ یوں تو ان کی کئی کتابیں ہیں البتہ اس وقت میرے گھر کی الماری میں ”زادہ“ (نمبر 3) ”پڑی ہے جسے میں کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ اس عظیم مصنف کی یہ تحریریں ہی کچھ ایسی ہیں کہ متعدد بار پڑھنے کے باوجود ہر دفعہ نئی معلوم ہوتی ہیں اور تالیف قلب کا باعث بنتی ہیں۔

بھر جیل جالبی اور اقبال نزار کے متعلق پڑھا۔ یہ سب مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ محترمہ سلسلی اعوان نے ایک ایسے عظیم شاعر سے تعارف کرایا جس کے متعلق پہلے کسی پڑھنا نہ تھا۔ محترمہ سلسلی اعوان کے قلم کا یہ اعجاز ہے کہ وہ ہر دفعہ ایک نئی طرز کی تحریر یا مضمون لے کر سامنے آتی ہیں جو اپنے اندر ایک نیا انداز رکھتا ہے۔ اب کچھ اپنے متعلق۔ محترمہ رضا اشرف اعوان صاحب نے میرے تجربے کے شمارے میں شامل خط پر پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ ایک اور مراسلہ گھرانے میں میرے خط کا توصیلی انداز سے حوالہ دیا ہے جس سے خط کی پسندیدگی کا اظہار ہوتا ہے۔ ان دونوں کا شکریہ۔ کسی بھی لکھنے والے کی تحریر کی پسندیدگی کا اظہار اس کے قلم کا ہمیز دیتا ہے اور اس کی قلمی کاوش کو مزید اجاگر کرتا اور صلاحیت بخشتا ہے۔ دونوں کی ذرہ نوازی ہے جس کے لیے مشکور ہوں۔ گزشتہ ماہ ایک تحریر ”غالبیات“ کے عنوان سے بھیجی تھی جس میں کچھ گفتہ باتیں تھیں مگر مایوسی ہوئی کہ شائع نہیں ہوئی شاید آپ اسے آئندہ شمارے میں شائع کرنا چاہتے ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ آئندہ ماہ اسے جگہ دیں گے، بصورت دیگر شہر خیال کے صفحے پر جواب دیں۔ (غالبیات میں آپ نے مشہور واقعات کو سنجایا ہے لیکن وہ سنجایا ہونیکس پائی۔ تسلسل ٹوٹا رہا ہے۔ اس لیے ان واقعات کو اقتباس بنا کر وقتاً فوقتاً شائع کیا جائے گا) اب ذکر ہے اس شمارہ کی ایک کہانی ”حماقت“ کا۔ یہ کہانی ہمارے معاشرے کے ایسے نقص کی عکاسی کرتی ہے جسے دولت کے بے جا ہوس کا نام دیا جاسکتا ہے۔ پیسے کی طلب اپنی جگہ جو زندگی کی سہولتوں اور آسائشوں اور ایک خود قبیل زندگی بسر کرنے کی سہولت مہیا کرتی ہے۔ وہاں دولت کی بے جا طلب کی تباہ کاریوں سے بھی سرف نظر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ہاں بیشتر لوگ خدا جانے پیسے کی طرف کیوں تے تباہ شدہ دڑتے پھرتے ہیں۔ بانی سب کچھ بھول کر ان لوگوں نے محض دولت کو ہی ”محل المشکلات“ سمجھ رکھا ہے۔ ایک بے وقاشے کی اتنی لگن نہ کیجیے کہ سب کچھ پیچھے رہ جائے۔ روشن پہلو کو مد نظر رکھا جائے۔ اس شمارہ کی مزید کہانیاں ابھی پڑھی نہیں۔ جو کچھ اب تک پڑھ سکا اس کے متعلق ہی لکھ رہا ہوں کہ قبول اقتدر ہے عز و شرف۔“

✽ راحت و قنار اچھوت نے لاہور سے لکھا ہے۔ ”خبریت بہ عافیت نیک مطلوب۔ ایک نئی کہانی ”شریف آدمی“ ارسال کر رہی ہوں، اُمید ہے کہ آپ کو پسند آئے گی۔ زعمہ کرداروں کی کہانی ہے۔ آپ کے لیے بہت دعاگو۔ (کہانی مل گئی ہے۔ اس پرچے سے فارغ ہو کر دیکھ لیں گا)“

✽ سیف اللہ کی آمد ملک وال سے۔ ”معراج رسول صاحب کی نثری کہانیوں کی طرح نظم کہانی بھی اپنے اندر بہت کچھ سمیٹے ہوئے ہے۔ نئی نسل کی مصروفیات، انداز زندگی، تبدیلی شدہ معاشرتی اخلاقی قدریں وہیں پرانی نسل کی فکر مند، بے بسی، حسرت اور تـ جانے کیا کیا ہے اس نظم کہانی میں۔ اللہ وارث ہے آنے والے وقت کا۔ ایک نئی کہانی معنیہ ہاجرہ سرور کے بارے میں اچھی ہے۔ علامہ ابن جوزی اچھی کوشش ہے۔ تاریخی معروف ہستی کی سوانح عمری پڑھنے کو مل رہی ہے۔ سلسلی اعوان صاحب کی تحریر شاعر انقلاب نزار قناری پڑھی۔ اچھی لگی لیکن ایسے محسوس ہوتا ہے کہ سلسلی اعوان صاحب کا قلم غیر ملکی شخصیات پر زیادہ لکھتا ہے۔ صفحہ 58 پر لکھا ہے کہ ”جواب کہتے ہیں وہ دعا نماز ہیں جو سوچے ہیں کہ انہوں نے عورت ختیج کی اپنی پسلیوں میں ایک سے عورت مرد کی پسلی سے نہیں نکلی تھی۔“ لیکن اب تک تو یہی سنتے آئے ہیں کہ عورت پسلی سے ہی نکلی ہے۔ سلسلی صاحب جانتی ہوں گی اصلیت کیا ہے کیونکہ انہوں نے جو صحیح سمجھا وہ لکھ دیا۔ (دوبارہ پڑھیں، وہ سلسلی اعوان کے الفاظ نہیں نزار کی نظم ہے نزار کی شاعری معاشرے سے جنگ ہے اسی وجہ سے تو نزار کی شاعری پر پابندی لگتی تھی)۔ شاید لطیف صاحب کا چرچہ پر لکھا دلچسپ لگا اور اگر یہ سب کچھ ایسے ہی ہے جیسے لکھا گیا ہے تو خیر ان کن حد تک عجائبات زمانہ ہے۔ سعید احمد خاں صاحب، آواز کا باد و گردشا عابدی صاحب کو ڈھونڈ لائے ہیں۔ آج سے تیس چالیس سال پہلے لوگ ریڈیو سے منسلک تھے خاص طور پر بی بی سی سنتے تھے اور عابدی صاحب کے پروگرام کا انتظار کرتے تھے۔ سعید احمد صاحب نے عابدی صاحب کی زندگی کو احاطے میں لیے ہوئے کچھ اپنی طرف سے اور کچھ عابدی صاحب کی زبانی بتاتے ہوئے اچھی تحریر لکھی ہے اور آخر میں پتا چلا کہ وہ رجبہ تو خاندان سمیت برطانیہ میں ہیں لیکن ان کے دل میں پاکستان کے شہر کوچے پر تھے گاؤں اور دیہات وصال ڈالتے رہتے ہیں۔ ندیم اقبال صاحب کا سفر نامہ جواب صرف سفر نامہ نہیں رہا بلکہ ادب پارہ بننا چاہا ہے کہ کور گزشت کی تحریروں میں پہلا نمبر کہنا پڑے گا کیونکہ سرسری شہبازی نوک جھوک کینیڈا معاشرے کی اچھائیاں اور نئے لوگوں کی مشکلات بتانے کے ساتھ ساتھ اب ندیم اقبال صاحب کو سرین کا سہارالے کر قاری کو پوری طرح تحریر میں بھیجنے کا اگر آگیا ہے۔ آنے والی قسطوں میں ہو سکتا ہے ندیم صاحب کی ڈائری سے اور نثریں بھی نکل آئیں۔ تفتیش شاہ تحریر میں شروع کی دس لائیں ہی اشفاق صاحب کو بھیجنے میں کافی ہیں۔ کیا بات ہے جی پہلے آپا نو قدسیہ صاحبہ اور اب اشفاق صاحب۔ عبدالرب یعنی صاحب کی ناسور آہستہ روی سے چل رہی ہے۔ کبھی تو تیزی آنے کی۔ مرد و خمران ذکر ہے جاوید شیخ کے قلموں تک پہنچنے کے لیے کوشش، نا کامیاں، مقدر کی سختیاں پھر قلموں تک پہنچنا۔ پچاس سے ماہنامہ مسرگزشت

زانہ قلاب قلمیں لیکن ساتھ ہی نگار ایوارڈ، کوڈک گولڈ میڈل ایوارڈ، کریموینٹ قلم ایوارڈ، پینسل قلم ایوارڈ، وحید مراد میموریل ایوارڈ۔ جاوید شیخ خصوصی ایڈیشن، پرائز آف پرفارمنس، جاوید شیخ کی کام سے لگن اور منزل تک پہنچنے کا عزم ظاہر ہوتا ہے۔ ساتھ ہی انور فرہاد صاحب کی کوشش اور علم بھی قابل ستائش ہے۔ اس کے ساتھ ذہنیت لکھنے سے علیحدگی، سلیٹی آغا کے پیچھے بھاگنا، نیکی سے قربت، شاعری تعلقات کا ناقابل غلطی لوگوں کی زندگیوں میں یہ چیز داخل ہے۔ ان باتوں کو یہ لوگ برائیاں سمجھتے۔ یہ سب کچھ ان کی زندگی میں ہونا ضروری ہے اسی لیے تو معاشرہ ان کو اچھا نہیں سمجھتا۔ آخر میں عرض ہے کہ بیت بازی صفحہ کے انچارج صاحب دو تین ماہ سے ناراض ہیں مجھ سے اور میری نالائقی دیکھیں کہ مجھے ہنسی بھی نہیں کہ کیوں۔ ان سے میری سفارش کر دیں پلیز۔ (آپ شعر تو اچھا منتخب کرتے ہیں لیکن کس شعر کا جواب ہے۔ یہ نہیں لکھتے)“

☆ نزہت انشاں، مہورہ، فتح جنگ سے رقم طراز ہیں۔ ”اکتوبر کا شمار بہترین سرودق کے ساتھ 27 ستمبر کو ملا۔ ادارہ یہ پڑھ کر مجھے مشہور انگریزی ناول نگار جیمز ہیلے چیز کا ناول ”دنیامیری جیب میں“ یاد آ گیا۔ گو کہ آج ہدیہ دینا لوجی کی بدولت اساتذہ فن کی وجہ سے دنیا ہماری جیب میں ہے لیکن وہ اخلاقی قدریں جو کہ ہمارے اسلاف کا خاصا حصہ تھیں وہ آج مٹ رہی ہیں۔ اقبال نے مدقوں پہلے یہ حقیقت بیان کر دی تھی کہ ”ہد کے لیے موت مینوں کی حکومت، احساس مروت کو کھل دیتے ہیں آلات“ ہاجرہ سرور کا ذکر پڑھ کر اچھا لگا۔ ان کے شوہر پرو فیسر احمد علی بھی نامور لکھاری تھے۔ فیاضیت بکراہی نے اس بار علامہ ابن جوزی کی سوانح حیات بیان کرنے میں بہت ہی جتنی عرق اور نفاست سے کام لیا۔ علامہ ابن جوزی نے حصول علم کے لیے جو مشقت برداشت کی اس سے ان کی علم سے بھی لگن کا پتا چلتا ہے۔ راشدی برادران کا تذکرہ بھی دل کو بھایا۔ کھیل صدیقی سے گزارش ہے کہ اسی طرح خیری برادران، بلی برادران اور بخاری برادران پر بھی لکھیں۔ کھیل اور لیس اس ماہ کی سب سے بہترین اور بھرپور تحریر لائے اور وہ بھی ڈاکٹر جمیل جالبی کے بارے میں۔ جمیل جالبی، سید جالب دہلوی کے قریبی رشتے دار تھے۔ یہ جان کر خوش ہوئی، جوش شیخ آبادی جیسے مدہ پھٹ آدی نے بھی اپنے سوانح حیات ”یادوں کی برات“ میں سید جالب دہلوی کا ذکر بہت محبت اور عقیدت سے کیا۔ ان کی وفات پر سید سلیمان ندوی نے مختصر مگر بھرپور مضمون لکھا تھا جواب ان کی کتاب ”یاد و فکراں“ میں شامل ہے۔ سلیٹی اعوان اس بار عرب شاعر زرقانی کے ساتھ حاضر تھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اہل اقتدار ہمیشہ اہل علم اور اہل قلم سے خوفزدہ اور بیزار رہے ہیں۔ رضاعلی عابدی کا ذکر بھی موثر انداز میں لکھا گیا، پڑھ کر خوش ہوئی۔ تفتیش شاہ، اشفاق احمد عرف بابا جی پر مختصر تحریر تھی مگر مضمون بھی سوانحی لگی۔ شمشال سے ٹورنٹو بہترین موڈ پر ہے۔ ایرانی نسرین کی شہتی کے خدا بننے سے عدم صاحب نے معذرت کر لی۔ یہاں مجھ کو۔ ناسور میں اب بارو حجاز بڑھتی جا رہی ہے۔ ”رہائی“ اس ماہ کی بہترین کہانی تھی، فرشتہ دوسرے نمبر پر رہی اور آج کی سیاست کو عیاں کرتی ایک سبق آموز کہانی تھی۔ حماقت میں سائرہ کو اس کے لالچ کی سزا ملی اور اس کا فیصلہ اس کے اپنے گلے کا پھندا لگا۔ تیزاب بھی سبق آموز کہانی تھی۔ رافہ نے سکندر نامی درندے کے ساتھ بائبل ٹیک کیا۔ شیر کی خالد اور دل مشکل بھی بہترین کہانیاں تھیں۔ شہر خیال کی صدارت رضا احمد اعوان بھکر کے نام تھی۔ طویل مگر دلچسپ تمبرہ تھا۔ آفتاب نصیر اشرفی، رانا محمد شاہد، عبد الجبار رووی اور میری ایلڈر سسٹر سدرہ بانو ناگوری سب بھرپور تبصروں کے ساتھ حاضر تھے۔ بہاد پور کے حکیم اللہ ایڈووکیٹ نے جس حقیقت کو بیان کیا اس پر وہ خراج تحسین کے مستحق ہیں، اللہ کرے زور قلم زیادہ ہو۔ باجی بشری افضل اور ڈاکٹر روبینہ نعیم انصاری اللہ جانے میری یہ دونوں بیٹیں کدھر گئیں۔ اللہ پاک انہیں قلم اٹھانے کی توفیق دے۔ (ادارہ کی بھی قلم کار کا فرق انہیں کبھی دوسرے کو نہیں دیتا اس لیے معذرت خواہ ہیں)“

☆ انور سلطان کی کراچی سے آمد ”رضا احمد اعوان اپنے بے لاگ تمبرے کے ساتھ کرسی صدارت پر فائز تھے۔ ممتاز احمد شاہد خوش نصیب نمبر ہے کہ ان کی ساتھیوں سے کی گئی علیک سلیک ہم تک پہنچی۔ سدرہ بانو اور آفتاب احمد نصیر اشرفی کے تمبرے بہت پسند آئے جبکہ نزہت انشاں نے شیخ یانیٹو کو اچھی طرح پرکھا۔ اعجاز حسین سیٹھار کا خط دوسروں کی نسبت زیادہ قیمتی ہے۔ روبینہ نعیم اور قرۃ العین غیر حاضر ہیں۔ یہ سفر نامے نہیں پڑھتے اس ضمن میں مشورہ ہے کہ کبھی ندیم افغانی کو پڑھ کر دیکھیں۔ سلیم اللہ کے خط کی زبان کافی تیز ہے۔ فہیم خان آپ کی بے جا تنقید اچھی نہیں لگی۔ یوٹیوب گھنایا یا بڑھایا نہیں، استعمال پر منحصر ہے۔ قیصر خان خوش آمد یہ آپ کا برسر خط سب پر ہادی لے گیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہمت نہیں ہارتے۔ کھیل اور لیس نے لیے وقت کے بعد شاعرانہ حقیقی مضمون کا تختہ دیا۔ دس صفحات کے اس مضمون نے طویل زندگی کا خوبی سے احاطہ کیا کہ۔ جرکی، کے ساتھ شاہد لطیف نے بھی سکوت توڑا، مضمون ناقابل جلدی میں لکھا تھا لیکن پراسرار ذخائر کے شیدائیوں کے لیے اچھا تختہ ہے۔ کھیل صدیقی کی پچھلی تحریر دل کو نہیں لگی تھی لیکن اب کی بار صاحب نے کمال کر دیا۔ باتوں ہی باتوں میں حالات زندگی اور جد مسلسل بیان کر گئے۔ آج جب بائیک پر روزانہ پچاس کلومیٹر کا سفر

طے کرتا ہوں تو دل سے دعا کرتی ہے کہ کاش کراچی میں ٹرانسپورٹ کا مسئلہ ہو جائے۔ روشنیاں واپس آ جائیں۔ یہ مضمون امی کو بھی بہت پسند آیا۔ انہوں نے مجھ سے بھی پہلے پڑھ لیا تھا۔ گھٹیل اور لیس نے مخصوص انداز میں جمیل جاہلی کے فن کا حق ادا کیا۔ ضیاء علی الدین کی شخصیت پر تدریس پر تیار کی مانند ہے جس کی گھٹیل لیکن گری برآمد نہ ہوئی۔ کہہ نہیں سکتے ضیاء علی الدین اصل میں ہیں کیا۔ کاشف ادب کی تحریر سب پر ہادی نے لے جانے یہ جو نہیں سکتا۔ تلقین شاہ مختصر اور جامع تحریر ہے۔ بلا وجہ کی تفصیلات سے مگر یہاں صفحات کو نہایت ہارٹ بٹوایا۔ انور ہادی قلم نگار پسند آیا کچھ ادا کارا لیے ہیں جن کی کثرت سے تکرار ہو رہی ہے۔“

☆ عظیم افضل کا جہلم سے شکوہ ”کسی سے صاحب نے پوچھا کہ کہاں کھو گئے تو واقعہ یہ ہے کہ ہمارا تیسرا تبرہ بھی جھک ڈاک کی کارکردگی کی نذر ہو گیا۔ بڑے ارمان کے ساتھ سرگزشت دیکھا تھا کہ لا زار ہو گا لیکن افسوس۔ یہ تبرہ بھی امید اور ناامیدی میں لکھ رہے ہیں کہ شائع ہو جائے۔ رضا احمد اعوان اور آفتاب احمد نصیر اشرفی صاحب سے شروع میں ہی ملاقات ہو گئی تبرہ پسند آیا۔ سدرہ بانو ناگوری صاحب کیا حال ہے آپ کا اور آپ کے بلکہ ہمارے شہر قائد کا کچھ تبدیلی کے آثار نظر آئے یا نہیں؟ نصرت احمد بہت مبارکباد۔ اللہ آپ کی حاضری کو شرف قبولیت بخشے، آمین۔ ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ عمر شریف کے بارے میں تو کئی بار ذکر ہوا ہے اس لیے انکشاف تو مت کیے۔ ناصر حسین کا مکتوب بھی اپنا رنگ بھانے میں کامیاب ہوا۔ باقی ساتھیوں کے تبرے بھی ایسے تھے۔ باقی اس کے علاوہ قلم نگری ہمیشہ کی طرح خوبصورت رہی۔ حماقت میں بیوقوفی پر ماتم کرنا چاہیے اور کچھ نہیں۔ ربانی اور کی جاناں پڑھ کر احساس ہوا عرصہ دراز کے بعد اساتذہ خوبصورت موضوعات کے ساتھ سرگزشت حاضر ہوا۔ اور سب سے بڑھ کر ناگہانی موت نمبر شائع کرنے کا اعلان کر دیا۔ یہ تو ہمارے لیے واقعی حیران کن بات تھی۔ بہر حال شدت سے اس گھڑی کا انتظار رہے گا۔ برائے مہربانی زیادہ انتظار مت کروائے گا۔“

☆ علی حساس لاہور سے لکھتے ہیں ”واہ بھئی واہ، کمال ہو گیا، ہمارا پیارا سرگزشت بروقت ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ شہر خیال کی مصلح مروج پر ہے کئی نئے دوست محفل میں شامل ہو رہے ہیں۔ دلچسپی بڑھنے کے ساتھ نئے انکشافات ہو رہے ہیں۔ بشری افضل نے عمر کی سعادت حاصل ہونے پر مبارک باد دی ہے۔“ ”خاص نمبر“ کا اعلان پڑھ کر اندازے سے لگا رہے ہیں کہ اس بند بپاری سے ہمارے ذوق کی تسکین کے لیے کیا کچھ لکھا ہے، ابھی چند مہینے انتظار کرنا ہو گا۔ رضاعلی عابدی، غیر معمولی شخصیت ہیں، انہوں نے ناممکن کو بھی ممکن بنالیا ہے جرنیلی سڑک گواہ ہے۔ دعا کیجیے کہ اللہ ہمیں بھی ہمت اور بپاری سے لڑنے کا جذبہ عطا اور ہم بھی کچھ لکھ سکیں۔ مختلف کرداروں اور قصے کہانیوں نے معلومات میں اضافہ کیا۔ سچ بیانوں میں ”دماغی توازن“ زیادہ دھوم دھڑکے والی کہانی نہیں ہے۔ جب کسی کام کا وقت ہوتا ہے تب لوگ اپنی ہمت دھری سے معاملہ بگاڑ دیتے ہیں اور ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن سے جان لوں جھڑائی جاسکتی ہے۔ اپنے مزاج کی ضد اور انفرادی فیصلوں سے دوسرے کی اذیت کا سامان کرتے ہیں۔ جب ہاتھ سے چمچی اڑ جاتا ہے تب افسوس سے سر پینے کے سوا چارہ نہیں ہوتا لیکن حالات میں تبدیلی نہیں آتی۔ ”شیر کی خالہ“ کی رقیہ ایثار میں بے مثال ہیں۔ وہ سب کچھ کھودینے کے باوجود دھیمی پر عمر اور مطمئن ہیں لیکن میرا یقین ہے ان کو کبھی جینن نصیب نہ ہوگا۔ ”تریاق“ میں مرکزی اپنے وزن سے زیادہ اپنے دکھوں کا بھارا ڈھانچے بھر تا ہے جب چند یوں کو دودل کے ترازو پر تول جائے تو عجب جرم بن جاتی ہے۔ ”حماقت“ اپنے لالچی مزاج سے مجبور تھی لیکن جب وہ اپنی خواہشوں کی قبر تلے دب گئی ہے تو اس کو یہ قصہ بھلا کر اپنے اعلیٰ ظرف ہونے کا ثبوت دینا چاہئے تھا۔“

☆ طاہر مجاہد کا غلوس نامہ میا نوال رانجھ سے ”ڈاکٹر ساجد احمد صاحب کی بجائے تاریخی اور تصوف کی نامور شخصیت ضیاء نسیم کی کہانی شامل اشاعت تھی جس میں انہوں نے علامہ ابن جوزی کی شخصیت پر ان کے تعلیمی خدمات کے حوالے سے بڑی تفصیل بیان کی ہے جس کی تعریف نہ کرنا بھی راسخ کی حق تلفی میں شمار ہوتا ہے۔ ویسے تو پورا ڈائجسٹ ہی ماشاء اللہ بہت خوبصورت تھا مگر مجھے سب سے اچھی کہانی جو میرے دل کو چھو گئی ہے وہ تھی ”کی جاناں میں“ کا عنوان شاید بیسے شاہ کے کلام سے لیا گیا۔ ”قلم نگار“ میں اس مرتبہ جاوید شیخ سے متعلق خوبصورت تحریر سامنے آئی۔

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط:

راحیلہ شعیب، ملتان۔ سحرہ فرراز کراچی۔ نعمان اشرف، ظہیر احمد تبسم، حیدرآباد۔ ثاقبال، ایہ۔ مسلم علی خان، پشاور۔ ارباز بڑی، فیصل آباد۔ راجا رحیم، کوئٹہ۔ محمد اقبال، سرگودھا۔ نجم الدین، پشاور۔ راحیل اسلم، میرپور آزاد کشمیر۔ عنایت علی زیدی، فیصل آباد۔

حالات کا موافق نہ ہونا اور زمانے کی بے ثباتی بھی اسے آگے بڑھنے سے روک نہ سکی۔ وہ ادب کی دنیا میں اپنا مقام تعمیر کرتا ہوا ترقی کے مدارج طے کرتا چلا گیا۔ وہ متلاشی تھا ان ستاروں کا جو ادب کی دنیا میں ضیا پاشی کر سکے جبکہ اسے علم تھا کہ اس جھولی میں سو سو چھید ہیں۔ یہ گروہ بندیاں ادب کو دیمک بن کر چاٹ رہی ہیں پھر بھی وہ خدمتِ ادب میں کوشاں رہا۔ اس کی محنت اس کی تحریر میں، اشعار میں بول رہی تھیں مگر اسے وہ مقام نہ مل سکا جس کا وہ متلاشی تھا۔

اردو ادب کے ایک اہم شاعر کا زندگی نامہ

”آپ بغداد ہی سے تشریف لارہے ہیں ناں۔“

”ہاں آؤ وہیں سے رہا ہوں۔“

”پھر تو آپ وہی ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”میرا نام شریف الدین ہے۔ میں بغداد میں آپ کے کارخانے میں کام کرتا تھا۔ پھر میں بمبئی آ گیا۔ اب میں یہیں ہوں۔“

”معاف کرنا بھائی۔ میں نے تمہیں پہچانا نہیں تھا اب پہچان لیا۔“

”کمال الدین صاحب، یہ سوال پھر بھی اپنی جگہ رہ گیا کہ بمبئی آپ کس سلسلے میں آئے ہیں۔“

”ایک باجرتجارت ہی کی غرض سے آسکتا ہے۔“

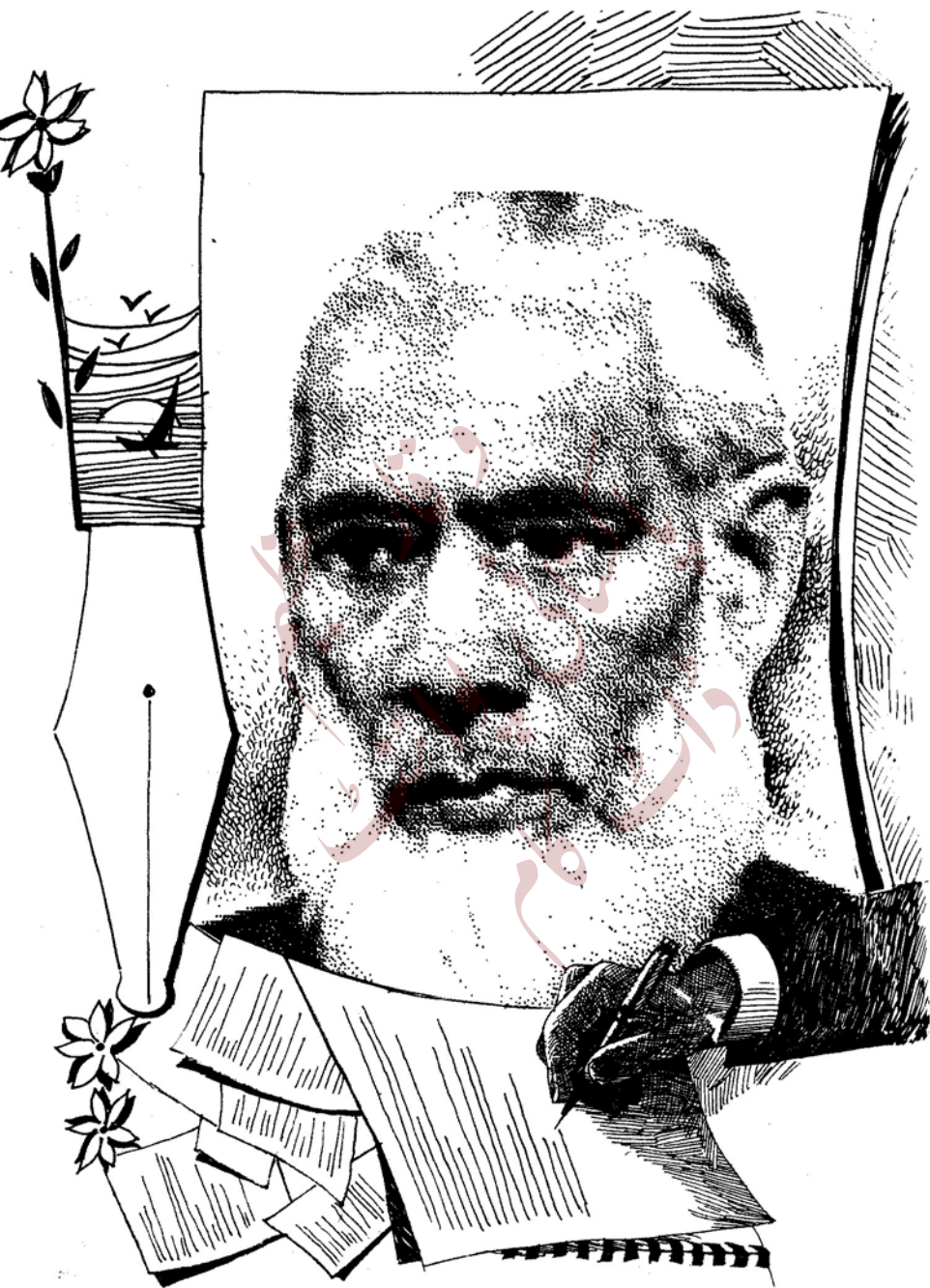
”آپ کا کاروبار تو بغداد میں خوب چمک رہا تھا۔“

”بس کچھ حالات ایسے ہو گئے تھے کہ مجھے بغداد چھوڑنا پڑا۔ مال و متاع سیٹ کر یہاں آ گیا ہوں۔“

عراق سے آنے والا جہاز منزلیں طے کرتا ہوا بمبئی کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ مسافروں کے جھوم نے خشکی پر قدم رکھنا شروع کیا۔ اسے کوئی جلدی نہیں تھی لیکن پھر بھی اترتا تو تھا۔ وہ کچھ دیر جہاز سے باہر جانے والوں کا تماشا دیکھتا رہا پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کیا۔ وہ جیسے ہی جہاز سے باہر آیا ایک آواز نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذولی۔ کوئی اس کا نام لے کر اسے پکار رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس انجی ملک میں اس کا شناسا کون نکل آیا، اس نے ایک مرتبہ پیچھے پلٹ کر دیکھا بھی تھا لیکن اسے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ پھر یہ آواز قریب سے آئی۔ اس آواز نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”اگر میں پہچاننے میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو آپ کمال الدین ہی ہیں ناں۔“

”ہاں میں کمال الدین ہی ہوں۔ آپ مجھے کیسے جانتے ہیں۔ میں نے تو آپ کو نہیں پہچانا۔“



”اچھے برے وقت سب اللہ کے بنائے ہوئے

ہیں۔ تم ہمیشہ میرے بیٹے رہو گے۔“

کمال الدین مطمئن ہو گئے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس اجنبی ملک اجنبی شہر میں رہنے کا ٹھکانا مل گیا، اچھے لوگ مل گئے۔ لیکن وہ کسی پر بوجھ بننے کے لیے نہیں آئے تھے۔ تجارت کا تجربہ تھا۔ اچھی خاصی رقم بھی ساتھ لائے تھے۔ چھوٹا موٹا کاروبار تو کر ہی سکتے تھے۔ دوسرے ہی دن سڑکیں تاپنے، حالات دیکھنے نکل کھڑے ہوئے۔ شروع میں کئی چھوٹے موٹے کاروبار کیے۔ پھر کپاس کا کارخانہ کھول لیا۔ اس کارخانے میں خدا نے برکت دی۔ شریف الدین کے گھر کو خیر باد کھڑا کرانے لیے الگ مکان خرید لیا۔ ایک شریف گھرانے میں شادی بھی کر لی۔ خدا نے ایک بیٹا بھی دیا جس کا نام انہوں نے سید جمال الدین رکھا۔

وقت کا پتہ اگروش کرتا رہا۔ سید جمال الدین جوان ہو کر باپ کا ہاتھ بٹانے لگا۔ کاروبار ترقی پر تھا۔ دولت کی ریل تیل تھی۔ سید کمال الدین کے بڑے بھائی بھی بمبئی آ گئے۔

سید جمال الدین کی اپنی تایا سے نہیں بنتی تھی۔ یہی تنازع اسے باپ کے سامنے لے آیا۔ باپ بیٹے آنے سامنے آ گئے۔ بات گھر کی تھی کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ تنازع کیا ہے۔ سید جمال الدین کی سعادت مندی نے بھی جھگڑے کو طویل دینا مناسب نہیں سمجھا اور ایک دن خاموشی سے بمبئی چھوڑ دیا اور ہندوستان کے دوسرے بڑے شہر دہلی آ گئے۔ جوانی تھی، حوصلہ تھا۔ اس شہر میں روزگار کے ذرائع بہت تھے۔ پہلے ریلوے میں ڈرائیوری کی۔ پھر ٹھیکے داری کو روزگار بنایا۔ زندگی آرام سے گزرنے لگی۔ باپ سے تعلقات بالکل منقطع نہیں ہوئے تھے لیکن دوبارہ بمبئی جانا مناسب نہ سمجھا۔ دہلی ہی کو وطن بنا کر بیٹھ گئے۔ اس شہر میں انہوں نے نہایت معزز خاندان کے ایک فرد مولوی حفیظ اللہ کی صاحبزادی سے شادی کر لی۔ مولوی حفیظ اللہ کے مرید پنجاب تک پھیلے ہوئے تھے۔

سید جمال الدین صاحب ان دنوں مکی شاہ تارا اجیری گیٹ دہلی میں رہائش پذیر تھے۔ اسی یادگار مکان میں 17 جنوری 1906ء کی صبح ان کے گھر میں فرزند دلہا پرے جنم لیا۔ اس بچے کا نام انہوں نے سید جلال الدین رکھا۔ یہی بچہ آگے چل کر حیدر دہلوی کہلا یا۔ شاعری کی دنیا میں ایسا باکمال ہوا کہ خیام الہند کے لقب سے مشہور ہوا۔

”کیا بالکل۔“

”یہی سمجھو اگر کاروبار جم گیا تو یہیں کا ہو جاؤں گا۔“

”کاروبار کیونکر نہ جسے گا۔ یہ بمبئی ہے۔ ہندوستان کا

سب سے بڑا تجارتی شہر۔ بشرطیکہ آپ کی تجارتی حلقوں میں جان پہچان ہو۔“

”میں تو اللہ کے بھروسے پر یہاں آیا ہوں۔ جو کچھ کروں گا اپنے زور بازو پر کروں گا۔ یہاں کے دو تین لوگوں سے بغداد میں ملاقات ہوئی تھی۔ انہیں بھی تلاش کر لوں گا۔“

”ابھی کہاں قیام کریں گے؟“

”کسی بھی سرائے میں ٹھہر جاؤں گا۔“

”سرائے میں کیوں، میرا غریب خانہ حاضر ہے۔“

”نہیں بھائی میرے لیے آپ کیوں تکلیف میں

پڑتے ہیں۔“

”تکلیف کیسی انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔“

سید کمال الدین نہیں چاہتے تھے کہ اس کے گھر جائیں لیکن وہ شخص پیچھے ہی پڑ گیا۔ قلی کو بلا کر سامان بھی اٹھوا لیا۔ سواری بھی آگئی۔

”شریف الدین تم یہاں کیا کرتے ہو۔ کوئی کاروبار

ہے یا نوکری۔“

”کاروبار ہی سمجھو۔ جہاز پر سامان لادنے والے قلیوں کا ٹھیکے دار ہوں۔“

”یہ تو بہت اچھا ہے۔“ سید کمال الدین نے کہا اور خاموش ہو گئے۔ وہ شاید آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

بمبئی کی چوڑی سڑکوں اور بلند عمارتوں سے گزرنے کے بعد ان کی سواری ایک اوسط درجے کے مکان کے سامنے رک گئی۔ یہی شریف الدین کا مکان تھا جہاں وہ اپنی والدہ اور دو بہنوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے گھر میں پردہ کرنے کو کہا اور کمال الدین کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔

ابھی کچھ دیر گزری تھی کہ ایک اوسط عمر خاتون کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں مشروب کے گلاس تھے۔ کمال الدین انہیں دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا۔

”یہ بھئی والدہ ہیں۔ پردہ کرنی ہیں مگر آپ تو ان کے بیٹوں کی طرح ہیں۔“

”اس میں کیا شک ہے۔ کبھی اچھا وقت آیا تو بیٹا بن کر بھی دکھا دوں گا۔“

روز سید کمال الدین کی باتیں ہوتی رہیں۔ یہ ذکر بھی ہوتا رہا کہ اب ان یتیم بچوں کا کیا ہوگا۔ پھر بتایا نے یہ پیشکش بہو کے سامنے رکھ دی۔

”اب آمدنی کا کوئی ذریعہ تو رہا نہیں۔ ان بچوں کی تعلیم پرورش تہارے لیے مشکل ہو جائے گی۔ بیٹیوں کی شادی کے دن بھی پلک جھپکنے آجائیں گے۔“

”بھائی صاحب سب اللہ کر دے گا۔ میں محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کو پال لوں گی۔“

”لو بھئی، جنہیں ہمارے ہوتے محنت مزدوری کرنے کی کیا ضرورت۔ ان بچوں کو ہم پالیں گے۔ ہم انہیں بسنی لے جاتے ہیں۔ تم سے ملوانے کے لیے لاتے رہیں گے۔“

”بھائی صاحب، آپ ایک ماں سے اس کے بچوں کو جھین رہے ہیں۔“

”تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ہم تو ان بچوں کے مستقبل کے لیے کھڑے ہیں۔“

”مجھ سے زیادہ ان کے مستقبل کی فکر کون کرے گا؟“

”کیوں کیا ہم غیر ہیں؟“

”یہ میں نے کب کہا۔“

جب والدہ کی طرح نہ مائیں تو انہوں نے یہ کوشش کی کہ کچھ رقم دے کر بچے حاصل کر لے جائیں۔ دادا کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ چاہتے تھے ترے کی رقم جو تقریباً چار لاکھ روپے بنتی تھی والدہ کو دے کر بچے حاصل کر لیں لیکن والدہ نے اتنی بڑی رقم ٹھکرا کر بچے دینے سے انکار کر دیا۔ دادی اور تایا نے یہ صاف انکار سن کر سامان باندھ لیا۔

حیدر دہلوی کی والدہ نے وہ تھوڑی سی رقم جو شوہر نے چھوڑی تھی ایک بچے میں سی کر محفوظ کر دی کہ کسی آڑے وقت کام آئے گی اور خود سلائی پر کپڑے سی کر گھر کا خرچ چلانے لگیں۔

اس طرح گھر کا چولہا جل رہا لیکن حیدر دہلوی کی تعلیم پر برا اثر پڑا۔

☆.....☆

دلی میں ایک بڑا طبقہ کارخانوں کے مزدوروں کا تھا۔ لوگ اعزاز انہیں کر خدار کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ کارخانے کیا گھریلو صنعتیں تھیں۔ مختلف قسم کی دستکاریاں تھیں۔ یہی وہ لوگ تھے جو دن بھر کی مزدوری کے بعد شام کے وقت

یہ وہ دور تھا جب برصغیر پاک و ہند میں انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی تحریکیں جنم لے چکی تھیں۔ اسی سال 1906ء میں سر آغا خان کی قیادت میں ایک وفد نے ہندوستان کے وائسرائے سے ملاقات کی اور مسلمانوں کے مطالبات پیش کیے۔ اس کے چند دنوں بعد ہی ڈھا کا میں علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس نواب وقار الملک کی صدارت میں منعقد ہوا۔ وہیں مسلمانوں کے لیے ایک الگ سیاسی جماعت بنانے کے لیے تحریک پیش کی گئی اور اس کے نتیجے میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ دلی کی تہذیب ان دنوں ایک نئی کرٹ لے رہی تھی۔ سیاسی و سماجی تبدیلیوں نے لوگوں کے اذہان و قلوب میں نیا شعور جا کر کیا۔

دلی کے شب و روز میں اگرچہ سیاسی اور تہذیبی ماحول میں قدرے تبدیلی آ رہی تھی مگر علمی و ادبی ماحول میں کچھ زیادہ فرق نہ آیا تھا۔ راتوں کو علمی و ادبی محافل جتنی تھیں شاعری کی محفلیں سناٹے دہلی، جینود دہلوی اور ساحر دہلوی کے دم قدم سے آباد تھیں۔ ان اساتذہ سخن کے میگزینوں شاعر تھے جو ان کی محفلیوں کی رونقیں برقرار رکھے ہوئے تھے۔ شرفا اپنے بچوں میں علم و ادب کا لگاؤ پیدا کرنے کے لیے باقاعدہ کتابوں کے ساتھ ساتھ ان کے ہمراہ علمی، ادبی مجالس اور مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔

یہ وہ ماحول تھا جس میں اس بچے نے آنکھ کھولی۔ ایک مہذب اور پڑھے لکھے گھر میں پرورش ہو رہی تھی۔ والدہ ایک صاحب شریعت بزرگ مولوی حفیظ اللہ کی صاحبزادی تھیں لہذا لڑکیوں میں دینی تعلیم ہوتی رہی۔ پڑھنے کی عمر کو پہنچا تو ابتدائی تعلیم گھر پر ہوتی رہی۔ پھر زمانے کے دستور کے مطابق مولوی کرامت سے عربی اور مرزا حیرت دہلوی سے فارسی کی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

تعلیم کا یہ سلسلہ مزید آگے بڑھتا لیکن ایک روز ایسی آندھی چلی کہ گھر کا سب سے روشن چراغ بجھ گیا۔ گھر کا اجالا اندھرا اگلنے لگا۔ سید کمال الدین تین بیٹیوں اور اکلوتے بیٹے سید جلال الدین (حیدر دہلوی) کو ماں کے سہارے پر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔

سید کمال الدین کی موت کا صدمہ کم نہیں ہوا تھا کہ تایا اور دادی بیٹی سے دلی پہنچ گئیں۔ سید کمال الدین کی بیوہ کی احوال سب بندھی کہ ان کے آنسو پونچھنے کے لیے سرال کی طرف سے بھی کوئی آیا۔ وہ ساس کے کندھے پر سر رکھ کر ہی ایک روٹی رہیں۔ تایا نے بھی بہت کچھ سہلی دی۔ چند

ناشنا کرنے کے بعد اس نے سلع ہوئے کپڑے اٹھائے اور گھر سے نکل گیا۔ اس نے جان بوجھ کر ایک لمبا چکر کاٹا اور جامع مسجد کے سامنے پہنچ گیا۔ اس وقت سیزھیوں پر کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ وہ یہاں کھڑے ہو کر دیر تک رات کے خواب پر غور کرتا رہا اور پھر فردوس خالہ کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں کچھ دیر بیٹھا۔ خالہ سے باتیں کیں اور پھر گھر کے لیے نکل پڑا۔

وہ عجیب سی الجھن اور سرخوشی لیے گھر لوٹا تھا۔ شام ہوئی تو پھر حسب معمول جامع مسجد کی طرف چلا گیا۔ ابھی پوری طرح محفلیں بھی نہیں تھیں۔ شاید وہ گھبراہٹ میں جلدی گھر سے نکل آیا تھا۔ یہاں پہنچ کر اسے ساحر دہلوی کا نام یاد آیا جو اس نے خواب میں سنا تھا۔ شکل تو دیکھی نہیں انہیں پہچانوں گا کیسے۔ وہ بھی سوچتا ہوا ایڈورڈ پارک کی طرف چلا گیا جو جامع مسجد کے سامنے ہی تھا۔ یہاں بھی بے فکران کی محفلیں جتنی تھیں۔ یہاں اسے اس کے محلے کا ایک دوست مل گیا۔

”تم کیا یہاں روز آتے ہو۔“ حیدر نے اس سے پوچھا۔

”ہاں یہاں اچھے اچھے شاعر آتے ہیں۔ ان کے شعر سنتا ہوں۔“

”پھر تو تم شاعروں کو جاننے بھی ہو گے۔“

”جو یہاں آتے ہیں انہیں تو جانتا ہی ہوں۔“

”ساحر دہلوی نام کے شاعر کو جاننے ہو۔“

”نہیں کون نہیں جانتا۔“

”کیا وہ یہاں آتے ہیں۔“

”وہ استاد شاعر ہیں۔ وہ یہاں تھوڑی آتے ہیں۔“

”پھر تم انہیں کیسے جانتے ہو۔“

”ان کے گھر مشاعرہ ہوتا ہے۔ میں وہاں جاتا ہوں تم بھی وہاں جایا کرو۔“

”اب مشاعرہ ہو تو مجھے بتانا۔“

”اس میں بتانا کیا ہے۔ ان کے گھر تو کل ہی مشاعرہ ہے۔ میرے ساتھ چلنا۔ ساحر دہلوی تمہیں نظر آجائیں گے۔“

جامع مسجد کی سیزھیوں پر جمع ہوتے تھے۔ یہاں ہر قسم کے لوگ ٹولیوں میں نظر آتے تھے۔ شاعر بھی جمع ہوتے تھے۔ شاعری کے دور چلتے تھے۔ ایک دوسرے کو شعر سنائے جاتے تھے۔ داد کے ڈونگرے برستے تھے۔ واہ واہ اور سبحان اللہ کی آوازیں گونجتی تھیں۔ حیدر دہلوی کا گھر جامع مسجد کے قریب تھا۔ وہ بھی شام کے وقت گھر سے نکلا اور ان تفریحات میں شریک ہو جاتا۔ کہیں تقریریں ہو رہی ہیں، کوئی مدس حالی اوچی آوازیں مار رہا ہے۔ کسی نے میر حسن کی مثنوی چھیڑ رکھی ہے۔

یہ وہ ماحول تھا جس میں اس کا بچپن ٹہل رہا تھا۔ جامع مسجد کی سیزھیوں پر بیٹھے ہوئے شاعر اس کی مرکز نگاہ تھے۔ وہ جب ان شاعروں میں بیٹھتا، ان کے شعر سننا تو اس کے دل میں ایک شور سا رہا ہو جاتا۔ کبھی کبھی تو یہ شور اسے اتنا پریشان کرتا کہ وہ گھبرا کر وہاں سے اٹھ جاتا۔ وہ اس شور کو کوئی نام بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اسی رات اس نے خواب میں خود کو جامع مسجد کی سیزھیوں پر بیٹھے دیکھا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ روز ہی وہاں جاتا تھا۔ نئی بات تو یہ تھی کہ اس کے چاروں طرف شاعر جمع تھے اور وہ انہیں اپنے شعر سننا رہا تھا۔ اس نے کبھی ایک شعر نہیں کہا تھا لیکن خواب میں وہ شعر سن رہا تھا۔ بڑے بڑے شاعر اس کے شعروں کی تعریف کر رہے تھے۔ جب وہ شعر سن چکا تو کسی شاعر نے اس سے کہا۔ تم تو بہت اچھے شعر کہتے ہو۔ ساحر دہلوی کے مکان پر منتقد ہونے والے ماہانہ مشاعروں میں کیوں شریک نہیں ہوتے اور پھر اس کی آنکھ کل گئی۔ اس کے دل میں اٹھنے والا شور ختم کیا تھا جیسے دل کی میز اس نکل گئی ہو لیکن اب ایک دوسری حیرت اس کے سامنے تھی۔ مجھے وہ شعر کیسے یاد آگئے تھے جو میں سن رہا تھا۔ پھر وہ ہنس دیا، ارے خواب میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اس نے ذہن پر زور ڈالا۔ اسے ایک شعر بھی یاد نہیں آیا جو وہ کالی پر اتار لیتا۔ اس نے ایک بھر پور انگڑائی لی اور بستر سے اتر گیا۔ باہر محسن میں سلائی مشین چلنے کی آواز آرہی تھی۔ اس کا مطلب ہے اماں اٹھ چکی ہیں۔ وہ محسن سے ملحق دالان میں آیا۔ اس کی والدہ ہی نہیں اس کی دو بہنیں بھی کام میں مصروف تھیں۔ والدہ کپڑے سی رہی تھیں اور دونوں بہنیں دو پنوں پر گونا گونا رہی تھیں۔

”اٹھ گئے تم، میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ میں تمہیں چائے پر اٹھا دے دوں۔ چائے پی لو تو یہ کپڑے فردوس خالہ کے گھر دے آؤ۔ وہ پیسے دیں گی وہ لے آنا۔“

”مجھے بھی اچھا نہیں لگتا مگر کیا کروں مشاعرے تو رات ہی میں ہوتے ہیں۔“

”آخر ضرورت کیا ہے مشاعرہ سننے کی۔“

وہ سن کر خاموش ہو گیا۔ ماں سے زیادہ بحث کرنا اسے اچھا نہیں لگا بلکہ اس وقت تو اس نے یہ فیصلہ ہی کر لیا تھا کہ ماں ٹھیک کہتی ہیں مجھے رات کو گھر سے باہر نہیں جانا چاہیے۔

جامع مسجد کے آس پاس ہر روز کہیں نہ کہیں مشاعرہ ہوتا تھا کوچہ پنڈت میں ساحر دہلوی کی رہائش گاہ سے ہی کیا منحصر اور بھی کئی ٹھکانے تھے جہاں مشاعرے برپا ہوتے تھے۔

جلال الدین نے کئی دن تو ماں کی نصیحت پر عمل کیا لیکن اس کا شوق نصیحتوں سے دبنے والا نہیں تھا۔ ایک روز اپنے دوست کے ساتھ پھر ایک مشاعرے میں جا پہنچا۔ والدہ نے پھر اسے ٹوکا۔ پھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ نہ اس نے مشاعروں میں جانا چھوڑا نہ والدہ نے نصیحت کرنا چھوڑی۔

مشاعروں کی باقاعدہ شرکت نے اسے بھی شعر کہنے پر اکسایا۔ اس نے کوشش کر کے کچھ اشعار کہے۔ وہ یہ دیکھ کر خود حیران رہ گیا کہ اس میں شعر کہنے کی صلاحیت ہے۔ اس کی دانست میں یہ اشعار بالکل درست تھے۔ اسے معلوم تھا کہ ہر شاعر کا کوئی نہ کوئی تخلص ہوتا ہے۔ پنڈت امر ناتھ کا تخلص ساحر ہے اور دہلی کی مناسبت سے دہلوی لکھتے ہیں۔ اس نے بھی اپنا تخلص حیدر رکھا اور اپنی کا پی پر جلی حروف سے حیدر دہلوی لکھ دیا لیکن وہ سید جلال الدین سے حیدر دہلوی ہو گیا۔

وہ چھپ چھپ کر غزلیں کہتا رہا۔ ماں کے خوف سے مشاعروں میں جانا چھوڑ چکا تھا۔

ایک روز اس کے ماموں اس کے گھر آئے۔ وہ گھر پر نہیں تھا۔ اس کے ماموں کے ہاتھ وہ کا پی لگ گئی جس پر اس نے اپنے اشعار لکھ رکھے تھے۔ وہ بہت دیر تک اس کا پی کو الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ اسے اندازہ تو ہو گیا کہ یہ اشعار جلال الدین کے ہیں لیکن کچھ ٹھیک بھی تھا۔ یہ ٹھیک اس وقت دور ہو گیا جب اسی وقت وہ بھی گھر آ گیا۔

”یہ شعر تم نے لکھے ہیں؟“

”جی ماموں جان۔“

”ان اشعار میں تو حیدر تخلص لکھا ہوا ہے اور تم جلال !“

”ہو۔“

پہلے۔ یہاں پہنچ کر تو اس کی آنکھیں ہی کھل گئیں۔ اس نے یہاں نہ صرف ساحر دہلوی کو دیکھا بلکہ یحیٰو دہلوی اور ساکلی دہلوی کو بھی دیکھا۔ دہلی میں شاعروں کی کمی نہیں تھی۔ یہاں بھی شاعر پرے جمائے بیٹھے تھے۔ وہ بھی اپنے دوست کے ساتھ ایک کونے میں دبک گیا۔

مشاعرہ شروع ہوا۔ کسی نے اس سے بھی پوچھا، صاحبزادے! کیا آپ بھی شعر فرماتے ہیں۔ اس نے نفی میں گردن ہلا دی لیکن عجیب شرمندگی کا احساس ہوا۔ کاش! میں بھی شعر کہتا ہوتا تو اس وقت یہ شرمندگی اٹھانی نہ پڑتی۔

مشاعرہ پوری آب و تاب سے جاری تھا۔ وہ ایک ایک شعر سے اس طرح لطف اندوز ہوتا رہا جیسے ہر شعر اس کی سمجھ میں آ رہا ہو۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ یہ شاعر کتنے خوش قسمت ہیں جو ایک ساتھ اتنے لوگ ان کی تعریف کر رہے ہیں۔ یہ شعراء اس کو کسی دوسری دنیا کی مخلوق نظر آ رہے تھے۔ کتنا ہی وقت گزر گیا۔ وہ تو اس وقت چونکا جب اس کے دوست نے اس سے چلنے کے لیے کہا۔ ”جلال رات بہت ہو گئی ہے اب چلنا چاہیے۔“

”ساحر دہلوی کو تو پڑنے دو۔ انہیں تو سن لوں۔“

”ان کا نمبر آئے تک تو جمع ہو جائے گی۔“

”تھوڑی دیر اور بیٹھتے ہیں۔“

”تم بیٹھو زیادہ دیر ہو گئی تو میری ماں میری کھال کھینچ لیں گی۔“

حیدر دہلوی چاہتا تو یہی تھا کہ اسے جانے دے لیکن اکیلے جاتے ہوئے اسے ڈر لگ رہا تھا۔ اسے مجبوراً اٹھنا پڑا لیکن یہ افسوس رہا کہ وہ ساحر صاحب کو نہ سن سکا۔

اس کے گھر کا دروازہ کچھ اس طرح کا تھا کہ باہر سے ہاتھ ڈال کر کڑی کھل جاتی تھی۔ اس نے کڑی کھولی اور دبے پاؤں چلا ہوا اپنے بستر پر آ گیا۔

وہ خوش تھا کہ اس کا راز کھل نہ سکا لیکن صبح ہوتے ہی اس کی غلط فہمی دور ہو گئی۔

”تم رات گئے تک گھر سے باہر تھے۔ کہاں گئے تھے؟“

”وہ..... اماں..... قریب ہی ایک مشاعرہ تھا۔ ایک دوست کے ساتھ مشاعرہ سننے چلا گیا تھا۔“

”غضب خدا کا! یہ عمر اور مشاعرے سننے کا شوق۔ مجھے ہرگز یہ پسند نہیں ہے کہ تم راتوں کو گھر سے غائب“

”۔۔۔“

”میں نے حیدر شخص اختیار کر لیا ہے۔ حیدر دہلوی۔“
 ”بہتر شاعری کے لیے کسی کا شکر دہونا ضروری ہوتا ہے۔“
 ”مجھے تو ساحر دہلوی اچھے لگتے ہیں مگر ان تک میری رسائی نہیں ہے۔“

”رسائی کا کیا ہے۔ ان سے ہماری اچھی دوستی ہے۔ کسی دن لے چلیں گے تمہیں۔ یہ کاپی ساتھ لے چنا دیکھو وہ تمہارے شعروں کو دیکھ کر کیا کہتے ہیں۔“
 ”بہتر کیوں آج ہی چلے۔“

حیدر کے ماموں اسے لے کر ساحر کے گھر کی طرف چلے۔ خوشی کے اس احساس سے اس کا دل اچھل رہا تھا کہ کچھ دیر بعد ہی وہ اپنے محبوب شاعر کے سامنے ہوگا۔ اس کے شعروں کی کاپی اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی اور ماموں کے قدم بہ قدم چلا جا رہا تھا۔ اس وقت اس کی عمر صرف تیرہ سال تھی۔

ساحر اس وقت گھر پر تھے اور تنہا بھی تھے ورنہ دو چار شاگرد انہیں ہر وقت گھیرے ہی رہتے تھے۔

حیدر کے ماموں نے اس کا تعارف کرایا اور آنے کا مقصد بیان کیا۔ ساحر نے سر سے پاؤں تک اس چمچے بدن اور سانولے رنگ کے لڑکے کو غور سے دیکھا اور کچھ سنانے کی فرمائش کی۔

حیدر نے چند غزلوں کے حصہ حصہ اشعار پیش کیے۔
 جس کو دنیا بہار کہتی ہے
 ترجمہ ہے میری جوانی کا
 یا ستارے فلک پہ روشن ہیں
 یا دوپٹا ہے کامانی کا
 ☆

یاد میں تیری عمر اگر گزرے
 خوب کیا بلکہ خوب تر گزرے
 چلتے بادل تھے دن جوانی کے
 بس ادھر آئے اور ادھر گزرے
 ☆

عشق کا ترجمان ہے پیارے
 دل بھی گویا زبان ہے پیارے
 اس پس پردہ جلوہ ریزی پر
 مجھ کو تیرا گمان ہے پیارے
 ☆

ایسے بے داغ اشعار ایک بچے کی زبان سے سننے تو ساحر صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے۔
 ”میاں صاحبزادے کوئی مکمل غزل سنائیے جس میں آپ کا شخص بھی موجود ہو۔“
 ”پیش کرتا ہوں۔“

بنیاد وفا پہلے پہل کس نے رکھی تھی
 یہ کون تھا کلم بخت یہ کس کی غلطی تھی
 خلقت کا سبب میری نظارہ طلبی تھی
 جینے سے بھی پہلے مجھے مرنے کی خوشی تھی
 جب آنکھ تری سمت سر بزم اٹھی تھی
 کچھ اور ہی عالم تھا، الم تھا نہ خوشی تھی
 پیار محبت جو نہ دنیا سے سدھارا
 شاید ترے اعزاز تقاضا میں کسی تھی
 خود لے گئی اک موج ہم حسن بہا کر
 اللہ رے کیا چڑھ مری تشنہ لبی تھی
 ڈھونڈا اسے ہر سمت مگر خود میں نہ ڈھونڈا
 حیدر یہ ہماری ہی نظر کی غلطی تھی
 ایک غزل اور ملاحظہ کیجیے۔

کیوں پریشان و خوار ہیں ہم لوگ
 کس کے دل کا غبار ہیں ہم لوگ
 ہم سے دنیا کی زیب و زینت ہے
 اس چمن کی بہار ہیں ہم لوگ
 عظمت دو جہاں نگاہ عشق
 حسن کا اقتدار ہیں ہم لوگ
 ہم کو ساقی سے خاص نسبت ہے
 فطرتا بادہ خوار ہیں ہم لوگ
 اب بھی موقع ہے استفادے کا
 کہ ابھی برقرار ہیں ہم لوگ
 ہم سے تعبیر جزو کل حیدر
 منظر کر دگار ہیں ہم لوگ

اس کے بعد ساحر صاحب نے اسے چند مصرعے دیئے کہ ان مصرعوں پر شعر کہو۔ حیدر نے اسی وقت ان مصرعوں پر شعر کہہ دیئے۔

اپنی دشواری کو کر لیتا ہوں میں دشوار تر
 مشکل میں جس شخص کی سنتا ہوں آساں ہوئیں
 ☆

حیدر ہوس سے پاک ہیں اہل نظر کے دل

یہ قطرے خود ہیں قصبہ دریاء لیے ہوئے

☆

ہالآخر پھوٹ نکلیں سب گل آتش بکف ہو کر
چمپادی ہمیں کسی نے بجلیاں خاک گستاں میں
اب اس میں کوئی کلام نہیں تھا کہ وہ خود شعر کہتا ہے۔
اس نے ساحر صاحب کے سامنے فی البدیہہ یہ اشعار کہہ
دیئے تھے۔ ساحر صاحب کا قائل ہونا لازمی تھا۔
”میاں تم تو بنے بنائے شاعر ہو۔ آتے جاتے رہا
کرو۔“ ساحر صاحب نے حیدر سے کہا۔

ساحر دہلوی نے اس سے ایک دو نہیں تیرہ غزلیں
سنیں اور کہا تو صرف یہ کہا کہ آتے جاتے رہا کرو۔ یہ مشورہ
دوستوں کو دیا جاتا ہے شاعر کو دوں کو نہیں۔

”حیدر نے اس مشورے پر پوری طرح عمل کیا اور وہ
باقاعدگی سے ان کے پاس حاضر ہونے لگا۔ یہ معیار آخر تک
معیار رہا کہ ساحر نے اس کے کلام پر اصلاح دی یا نہیں۔
حیدر ہمیشہ یہ کہتا رہا۔ میں استاد کے پاس یہ آرزو لے کر گیا
تھا کہ ان کی شاگردی پر فخر کروں اور اصلاح لوں۔ انہوں
نے مجھ سے تیرہ غزلیں سنیں اور کہا کہ ان میں اصلاح کی
کوئی ضرورت نہیں۔“ ساحر صاحب بھی ہمیشہ یہی کہتے
رہے۔ ”حیدر سے قسم لے کر پوچھو کہ میں نے بھی اس کے
ایک شعر کی بھی اصلاح کی ہے۔“

یہ دور استادی شاگردی کا تھا۔ شاگرد کی عزت استاد
کی عظمت سے ہوتی تھی۔ اس دور کے مشاعروں میں حصہ
لینے والے نوجوان شعرا پہلے اپنے استاد کے اشعار سناتے
تھے۔ حیدر دہلوی بھی ابتدائی مشاعروں میں ایک رہا
پڑھا کرتے تھے جس کے دو مصرعے یوں ہیں۔

حیدر مری اعجاز بیانی معلوم

ان ہونٹوں نے ساحر کی جبین چوی ہے

وہ ساحر دہلوی کی محفلوں میں آتا رہا۔ اس نے

پنڈت جی کے ہاں ہونے والے ماہانہ مشاعروں کے علاوہ
دیگر ادبی تنظیموں کے مشاعروں میں بھی حصہ لینا شروع
کر دیا۔

ایک بار حیدر کے ماموں نے ساحر دہلوی سے
پوچھا۔ ”استادہ فوجوان (حیدر دہلوی) جو آپ کے سپرد کیا
تھا کیسا جا رہا ہے۔“

پنڈت جی نے بے ساختہ کہا۔ ”یارت تم اسے میرا شاگرد
بنانے لائے تھے یا استاد۔ وہ تو کچھ زیادہ ہی استاد ہے۔“

خدا جانے یہ طوطا، ننگی تھی یا تعریف لیکن یہ حقیقت
ہے کہ اس نے اپنی شاعری اور پڑھنے کے اعزاز سے فوری
توجہ حاصل کر لی۔ اس کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی
اچھے اچھوں کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ مشاعروں میں اس کا
خوب رنگ جم رہا تھا لیکن اساتذہ وقت اس سے ناخوش
تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ اس کی شاعری میں ایک
نئی زبان اور جدید فکر نمایاں تھی۔ تمام اساتذہ دلی کو روایتی
زبان تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ وہ زبان میں کسی قسم کی
تبدیلی کے حق میں نہیں تھے جب کہ وہ دلی کی روایتی
کلاسیک کا باغی بن کر سامنے آ رہا تھا۔

حیدر دہلوی نے جس دور میں شعر کہنا شروع کیا وہ
داغ اور امیریتا کی تربیت یافتہ نسل کا دور تھا اور اس وقت
دلی میں استاد شعراء کی گونج تھی۔ ان اساتذہ کے درمیان
اپنی آوازیں انفرادیت پیدا کرنا کسی معرکے سے کم نہیں تھا۔
وہ اسی معرکہ آرائی میں مصروف اور مشاعروں کی فضا تبدیل
کرنے میں مشغول تھا۔

یہ کیا دست اجل نے کام سونا ہے مشیت نے
چمن سے توڑنا پھول اور دیرانے میں رکھ دینا

☆

اب سے نہیں آؤں سے ہوں مشتاق نظارہ
آنکھوں سے نہیں نیند مقدر سے اڑی ہے

☆

وہ دن گئے کہ صرف گریبان پہ زور تھا
اب ہاتھ میں ہوں دامن صحرا لیے ہوئے

☆

وہ یہ تازہ اور نئے مگر مختلف اشعار لے کر مشاعروں
میں پہنچا تو تیرہ یوں پزل پڑ گئے۔ مخالفوں کی آنکھیں اٹھ
کھڑی ہوئیں۔ اسے نیچا دکھانے کے لیے نئی نئی منصوبہ
سازیاں کی جانے لگیں۔ وہ بھی دینے والا بک تھا۔ اس نے
بہ زبان شعر اعلان کیا۔

یہ ہم صیغہ کیا مری وسعت کو پاسکیں

سب سے زیادہ طاہر رفعت پسند ہوں

ایک تو اس کی کم عمری دوسرے اس کی مختلف شاعری

تیسرے اس کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی۔ ان سب

نے مل کر مشاعرہ بازوں کو اس کا سخت مخالف بنا دیا۔ اسے

مشاعروں میں نظر انداز کیا جانے لگا۔ اس کے کلام کی پختگی

کے باوجود اسے غلط مقام پر پڑھوایا جاتا۔ اساتذہ کے نوعمر

ہوتا تو ہمیں سب جمع ہوتے اور مشاعرہ گاہ کی طرف روانہ ہوتے۔

شاگردوں کی تعداد بڑھی تو اس نے اپنا حلیہ بھی استادوں کی طرح بنا لیا۔ چہرے پر داڑھی رکھ لی تاکہ عمر زیادہ معلوم ہو۔ شیر والی پہننے لگا۔ ترکی ٹوپی سر پر رکھ لی۔ ہاتھ میں چھتری لے لی حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ مشاعرے میں اکڑ کر بیٹھتا۔ یہ بھی ایک انداز استادوں کا تھا۔ یہ عالم ہوا تو اساتذہ وقت سے نوک جھوک لازمی تھی البتہ سائل دہلوی سے اس کی دوستی یا اچھے تعلقات ہمیشہ رہے۔ اسی بے تکلف تعلق کا فائدہ اٹھا کر ایک روز سائل نے اس سے پوچھا۔

”میاں تم مشاعرے میں ہماری شاعری پر زیادہ توجہ نہیں کرتے نہ ہی داد دیتے ہو۔ ہماری شاعری تمہیں پسند نہیں یا کوئی اور وجہ ہے۔“

حیدر دہلوی نے جواب دیا۔ ”یہ بات نہیں آپ استاد شاعر ہیں مگر دونوں کی شاعری ایک جیسی ہے جب کہ میں ذرا الگ اور مختلف شاعری کرتا ہوں۔“

”میاں یہ کیا بات ہوئی۔ کوئی تو جیہہ پیش کرو۔“

حیدر دہلوی نے جواب میں فی البدیہہ یہ شعر پڑھ دیا۔

پڑا ہوں میکہ سے کے در پہ اس انداز سے حیدر کوئی سمجھا کہ بیخود ہے کوئی سمجھا کہ سائل ہے اس شعر میں رعایت لفظی کا جو ہنر دکھایا گیا تھا اس کی سائل نے داد تو دی لیکن دل سے قائل نہ ہوئے کیونکہ اس کے بعد محاصرہ نہ چمکنیں جاری رہیں۔

حیدر دہلوی اب کل وقتی شاعر تھا۔ گھر میں بہت کم نکلتا تھا۔ حافظ ہوئی اس کا ڈیرا بنا ہوا تھا۔ وہ دن کے کسی حصے میں گھر سے نکلتا اور حافظ ہوئی پر آکر بیٹھ جاتا۔ جسے بھی اس کی تلاش ہوتی حافظ ہوئی پہنچ جاتا۔ مشاعروں کی سیاست پر بحثیں ہوتیں، اساتذہ کے اشعار پر تنقیدیں کی جاتیں، شاگردوں کے کلام پر اصلاحیں ہوتیں وغیرہ وغیرہ۔

اس عرصے میں بہت سی سماجی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ دلی کی سڑکیں موٹروں سے مانوس ہو گئی تھیں۔ رتھ غائب ہو گئے تھے۔ بالکی پس منظر میں چلی گئی تھی۔ ٹرامیں چل رہی تھیں۔ تاکے جمی چل رہے تھے۔ بجلی کی روشنی سے راستے منور تھے۔ لباسوں میں فرق آ گیا تھا۔

ان تبدیلیوں کے باوجود دلی کے ادبی ماحول میں کچھ

شاگردوں کے بعد پڑھوایا جاتا تو اسے سخت دکھ ہوتا۔

اٹھارہ بیس سال کا نو جوان جب پختہ غزلیں لے کر مشاعروں میں پہنچتا اور مشاعرہ لوٹ لیتا تو اساتذہ کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے۔ ان کے شاگرد اکیلے حیدر دہلوی کو طرح طرح سے تنگ کرنے لگے۔ وہ نہ کسی دولت مند خاندان سے تعلق رکھتا تھا نہ اثر رسوخ رکھتا تھا۔ اس کا نہ کوئی بااثر استاد تھا جو اس کی حمایت میں بولتا۔ ان حالات میں اس نے خود استاد بننے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اپنے ارد گرد نو جوان شعراء کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ ان میں وہ بھی تھے جو اس کی شاعری سے متاثر ہو کر اس کے پاس چلے آئے اور وہ بھی تھے جو خود شعر نہیں کہہ سکتے تھے لیکن شاعری کے شوقین تھے۔ حیدر دہلوی انہیں خود شعر لکھ کر دیتا اور انہیں مشاعرے میں اپنے ساتھ لے کر جاتے۔ ویسے بھی وہ دور طرعی مشاعروں کا دور تھا۔ وہ مصرعہ طرح پر سوسو شعر کہہ لیتا۔ کچھ خود کہہ لیتا اور باقی شاگردوں میں تقسیم کر دیتا۔ اس کا پہلا فائدہ یہ ہوا کہ اسے مشاعرے میں دوسرے نمبر پر پڑھوایا جاتا تو ان شاگردوں کی بدولت اس کا نمبر خود بخود بارہواں یا چودھواں ہو جاتا۔

مشاعروں میں اس کی گرم بازاری دیکھ کر دوسرے استادوں کے شاگردوٹ کر اس کے پاس آنے لگے۔ ان میں ایک نام نازش حیدری کا بہت نمایاں تھا۔ نازش حیدری بیخود دہلوی اور پنڈت امر ناتھ ساحر دہلوی کے شاگرد تھے اور ان سے ٹوٹ کر حیدر دہلوی کے حلقہ ارادت میں شامل ہوا۔ نازش حیدری صحافت سے متعلق تھے۔ انجام اور جنگ وغیرہ میں کام کرتے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ حیدر دہلوی کا کلام ان اخبارات کی زینت بننے لگا ان کے ساتھ نازش کے چھوٹے بھائی انور دہلوی بھی اس کے شاگرد ہو گئے۔ پھر تو جیسے نو جوان شعراء کا جہوم اس کے گرد جمع ہو گیا۔ یہ سب اس کے تلامذہ میں شامل تھے۔

اس کی اصلاح کا اندازہ بھی انوکھا تھا۔ وہ بلا ٹکٹن اپنے کئی شاگردوں کی اصلاح بہ یک وقت کیا کرتا تھا۔ ادھر شاگرد نے شعر پڑھا ادھر اس نے مناسب حال اصلاح دی۔ اصلاح کے دوران دو ایک شعر تبریک کے طور پر بھی عطا کر دیتا جس سے غزل پختہ تر ہو جاتی۔

جامع مسجد کے سامنے حافظ ہوئی تھا۔ وہ یہاں باقاعدگی سے بیٹھنے لگا۔ ہمیں احباب و شاگرد جمع ہوتے شاعری کے دور چلتے، اصلاح کے دفتر کھلتے، کہیں مشاعرہ

فرق نہ آیا تھا۔ بیخود دہلوی، سائل اور ساحر کے رنگ شاعری کا دور دورہ تھا۔ روایتی شاعری کے اس تالاب میں پہلا پتھر حیدر دہلوی نے پھینکا جس کی سزا بھی اسے لی۔ اسے مانا کسی نے نہیں، اس نے خود کو منوایا۔ اس کے لیے جس جدوجہد کی ضرورت تھی۔ وہ اپنا وقت اس جدوجہد میں خرچ کر رہا تھا۔ اس کی قادر الکلامی کا سکھ اس وقت دلوں پر جم گیا جب اس کی ایک غزل نے سارے ہندوستان میں دھوم مچا دی۔

جنون عشق کی گہوارہ جیاتی نہیں جاتی
نہیں جاتی طبیعت کی پریشانی نہیں جاتی
ہمیشہ دامن اشک خوں سے لالہ زار رہتا ہے
یہ فطرت کے تبسم کی گل افشانی نہیں جاتی
نظام دہر اگر میرے لیے بدلا تو کیا بدلا
کسی گھر سے بھی شام غم بہ آسانی نہیں جاتی
جنوں میں ہوش کیا جاں بھی بسا اوقات جاتی ہے
نہیں جاتی تو طرز چاک دامانی نہیں جاتی
شاہے شوخ جلوے بھی تحیر خیز ہوتے ہیں
گزر جاتی ہے ساری عمر حیرانی نہیں جاتی
میں خود اپنی محبت میں کمی محسوس کرتا ہوں
مری صورت سے دل کی بات پہچانی نہیں جاتی
چمن والوں سے مجھ صحرائیں کی بود و باش اچھی
بہار آکر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی
ابھی ماحول عرفان و ہنر میں پست ہے حیدر
یہ ایک ہر بلند آواز پہچانی نہیں جاتی

وہ شہرت کی میز جیوں پر قدم رکھ رہا تھا۔ اس انتظار میں تھا کہ بلند آواز پہچانی جائے لیکن گھر میں بیٹھنے والی اس کی ماں کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو یہ دیکھ رہی تھی کہ اس کا اکلوتا بیٹا راتوں کو دہرے گھر آتا ہے۔ ہر ماں کی طرح انہوں نے بھی یہی چاہا کہ اس کے پیروں میں شادی کی زنجیر ڈال دی جائے۔

اس روز وہ رات گئے گھر پہنچا تو اس کی ماں خلاف معمول جاگ رہی تھی۔ حیدر کا ہاتھ ٹھکا۔ اللہ خیر کرے، اماں کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟

”اماں جان! خیر تو ہے آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں۔“

”جاگ نہیں تو اور کیا کروں جس کا ایک ہی بیٹا ہو اور وہ بھی راتوں کو گھر سے غائب رہے تو اس کی بد نصیب ماں ہاگے لٹس تو اور کیا کرے۔“

”خدا نہ کرے آپ بد نصیب ہوں۔ آپ کا بیٹا ابھی زندہ ہے آپ کا مقدر بدل دوں گا۔“
”یہ شاعری داعی مجھے ہرگز پسند نہیں۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ میرا بیٹا کم از کم رات کو گھر میں رہے۔ بیٹیوں بیٹیوں کی شادیاں ہو گئیں۔ میرے بچے اب میں تنہا رہ گئی ہوں۔“

”اماں جان، میں غلط لوگوں میں نہیں بیٹھتا۔ شاعری کے میدان سر کر رہا ہوں۔ بڑے بڑے اساتذہ سے محرم آرائی ہو رہی ہے۔ بس ذرا یہ میدان فتح کر لوں۔“
”یہ سلسلہ قصے والا نہیں اور نہ تو میری بات مانے گا۔ اب ایک ہی صورت ہے کہ میں تیری شادی کر دوں۔ میں تو تجھے سدھار نہیں سکی۔ اب وہ ہی تجھے سدھارے گی۔“
”اماں کچھ تو مہلت دیں۔“

”کوئی مہلت نہیں میں نے لڑکی دیکھ لی ہے بس اب میں بات آگے بڑھاؤں گی۔“ حیدر نے سر جھکا لیا۔
والد کی وفات کے بعد گھر کا چولہا جلانے کے لیے حیدر نے شانہ بشانہ کام کیا تھا۔ وہ حد درجہ ذہین اور محنتی تھا۔ جو کام ایک مرتبہ اس کے ہاتھ سے گزر جاتا بھولتا نہیں تھا۔ اس نے بہت سے ہنر سیکھ لیے تھے۔ گھڑی سازی، بانڈنگ، کمپوزنگ لیتھو پریس کی چھپائی، سنگ سازی اور پریس لائن سے جس قدر بھی تعلقات رائج تھے سب اس کی دسترس میں تھے۔ شادی کرنا اس کے لیے جو بھ نہیں تھا۔ اسے اگر خوف تھا تو یہ کہ یہ شادی کہیں اس کی شاعری میں رکاوٹ نہ بنے۔ وہ شادی کے لیے تیار نہ تھا لیکن ماں کے حکم پر سر جھکا پڑا۔

اجازت ملنے ہی حیدر کی والدہ نے تیاری شروع کر دی۔ حیدر نے بھی سوچا کہ بہنوں کے رخصت ہو جانے کے بعد اس کا شادی کر لینا ہی بہتر ہے گھر کے کام کاج کے لیے کسی عورت کا ہونا ضروری ہے۔

حیدر دہلوی نے والدہ کے کہنے پر شادی کر لی۔ اس نے والدہ کے کہنے پر شادی کی تھی لیکن آنے والی خاتون ایسی سلیقہ مند ثابت ہوئی کہ اس نے پورا گھر سنبھال لیا۔ شاعر پیشہ شوہر کو سنبھالنا کسی بیوی کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے لیکن اس نے آنے والی نے بھی اس سے شکایت نہیں کی۔ راتوں کی غیر حاضری اسی طرح جاری رہی۔

حیدر کی قسمت میں سکون لکھا ہی نہیں تھا۔ ایک بیٹی کی ولادت کے بعد اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا اور بعد ازاں وہ

بچی بھی چل بسی۔

گھونگھٹ کی اوٹ سے ایک آواز ابھری۔ ”مجھے ہاتھ لگانے سے پہلے میری ایک التجاس لیں۔“
یہ ایسی غیر متوقع آواز تھی کہ حیدر کے کان سن ہو گئے۔

”کیسے آپ کیا کہتا چاہتی ہیں۔“
”آپ شاعر ہیں۔ دوسروں کے دلوں کا درد خوب سمجھتے ہیں۔ میں کسی اور سے محبت کرتی ہوں اس لیے آپ کے ساتھ بھی ہمہ اندر کسوں گی۔ آپ کے لیے میں ایک مردہ جسم سے زیادہ نہیں۔“
”جب آپ کسی کی محبت میں گرفتار تھیں تو شادی پر تیار ہی کیوں ہوئیں۔“

”میں نے اپنی ماں کے کانوں میں بات ڈال دی تھی لیکن انہوں نے ہاتھ پاؤں جوڑ کر مجھے خاموش کر دیا۔ میں اس امید پر یہاں چلی آئی کہ آپ شاعر ہیں۔ میرے دکھ کو سمجھیں گے اور مجھے آزاد کر دیں گے۔“
”اس آزادی کا تمہیں کیا فائدہ ہوگا۔“

”ایک طلاق یافتہ عورت سے شادی کرنے پر کوئی تیار نہیں ہوگا۔ میرے والدین مجبور ہو جائیں گے کہ اسی شخص سے میری شادی کرادیں جسے میں چاہتی ہوں۔“
اب کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ دونوں طرف خاموشی تھی۔ حیدر بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اس وقت کمرے سے باہر نکلنا مناسب نہ سمجھا۔ کمرہ مہانوں سے بھرا ہوا تھا۔ کس کس کو کیا کیا بتاتا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور تکیہ زمین پر رکھ کر لیٹ گیا۔ گھونگھٹ سے آواز پھر ابھری۔

”آپ زمین پر کیوں لیٹ گئے۔ آپ مسہری پر لیٹ جائیں۔ میں رات بھر جاگ کر گزارا کروں گی۔“
”نہیں، یہ مسہری تمہارے بیٹے کی ہے۔ اس پر تمہارا حق ہے۔ میں بھی جاگتا ہی رہوں گا۔ نیند میری آنکھوں میں بھی کہاں۔“

”آپ سوچ رہے ہوں گے، میں نے آپ کو کس الجھن میں ڈال دیا۔“
”یہ الجھن میری ہی نہیں تمہاری بھی ہے۔“
”پھر آپ نے کیا سوچا؟“
”سوچ بتاؤں گا۔“

”مجھے امید ہے آپ بات کو اس خوب صورتی سے بتائیں گے کہ کوئی ہنگامہ نہ کھڑا ہو۔“

حیدر شاعر تھا۔ اس صدمے کو کمرے تک فراموش نہ کر سکا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان بڑے سے بڑا صدمہ فراموش کر دیتا ہے۔ اس کی اداسی دور ہوتے ہی والدہ نے دوبارہ گھر بسانے پر مجبور کیا۔ والدہ کا کہا بھلا کیسے ٹالنا۔ وہ پھر تیار ہو گیا۔ پہلا تجربہ جتنا خوشگوار تھا دوسرا تجربہ اتنا ہی تلخ نکلا۔ بیوی بھٹنڈا لگتی، دن رات بھٹنڈے سر اٹھانے لگے۔ اس کی نرم خوشی ان بھٹنڈوں کو بھی برداشت کر رہی تھی لیکن اس بیوی نے تو حد ہی کر دی۔ اسے پراشوں میں زہر دینے کی کوشش کی۔ اتفاق سے یہ راز کھل گیا۔ حیدر نے اسے اسی وقت طلاق دے دی۔

وہ تو اس واقعے کو بھلا کر شاعری اور کاروبار کی دنیا میں واپس چلا گیا لیکن والدہ اس کی قسمت سے افسردہ ہو کر بستر سے لگ گئیں۔ وہ دن رات ان کے بستر سے لگا بیٹھا رہا۔ پریس مشین لگائی ہوئی تھی۔ مالی آسودگی، والدہ کے علاج پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا لیکن اس روپے سے وہ ان کی زندگی نہ خرید سکا۔

والدہ کی وفات اس کے لیے ایسا صدمہ تھا جس سے وہ مہینوں باہر نہ آسکا۔ اتنا دل برداشتہ ہوا کہ وہ گھر ہی چھوڑ دیا اور اپنی بہن کے گھر رہنے لگا۔ اس کے بہنوئی علیم اللہ خان اس سے بہت محبت کرتے تھے اسی لیے وہ ان کے گھر آ گیا تھا بلکہ وہ خود اسے لے آئے تھے کہ والدہ کے انتقال کے بعد اکیلے گھر میں کیسے رہ سکے۔

یہاں آئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ بہن نے تیسری شادی پر زور دینا شروع کر دیا۔ وہ ابھی پہلی بیوی کی وفات اور دوسری بیوی کی بے وفائی کو بھولا نہیں تھا۔ اب تو جیسے شادی کے نام سے چڑی ہو گئی وہ کسی صورت تیار نہیں ہوتا تھا۔ ٹال مٹول سے کام لیتا رہا۔ اس بہن نے دوسری بہنوں کو بھی ساتھ ملا لیا۔ بہنوئی علیم اللہ خان نے بھی زور دینا شروع کر دیا۔ وہ ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ دوست احباب بھی زور دے رہے تھے۔ وہ مجبور ہو گیا۔ بہنوں سے کہہ دیا کہ وہ لڑکی دیکھ لیں۔ بہنوں نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے اور ایک جگہ بات چکی کر دی۔ حیدر دھڑکی سے ایک مرتبہ پھر سر اباغہ لیا۔ شاگردوں کے جوش میں رات لے کر پہنچ گیا اور وہاں لے کر بہن کے گھر آ گیا۔

رات گئے تک گھر میں خوب ہنگامہ مچا رہا۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ ابھی بستر پر بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ

اولاد میرے اشعار ہیں جو زندہ رہیں گے اور مجھے زندہ رکھیں گے۔ اس نے اپنے آپ کو کاروبار اور شاعری میں پوری طرح غرق کر لیا۔

اس کے بہنوئی نے اس کی دلچسپی دیکھتے ہوئے کاروبار وسیع کرنے کا مشورہ دیا۔ انہی کے مشورے سے اس نے پریس مشین کا کاروبار ختم کر کے ہیٹ بنانے کا کارخانہ قائم کر لیا۔ یہ کارخانہ جامع مسجد کے سامنے تھا۔ اس کے پہلو میں حافظ ہوٹل تھا جہاں ہمیشہ سے اس کی بیشک تھی۔ کارخانے سے فارغ ہوتے ہی وہ ہوٹل پر آکر بیٹھ جاتا۔ یہاں اس کے ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ یہ مجلس آرائی رات گئے تک جاری رہتی۔

اس ہوٹل پر بیٹھنے والے شاگردوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا تھا۔ سب نے مل کر یہ طے کیا کہ ایک ادارہ بنایا جائے جس کے تحت ماہانہ طرحی مشاعرے منعقد کیے جائیں کہیں کی دیر تھی۔ ممبر سازی ہو گئی۔ مشاعروں کے انعقاد کے لیے رقم جمع ہو گئی۔ اس ادارے کے ممبران میں صرف اس کے شاگرد نہیں دیگر احباب بھی شامل تھے۔

دلی کے مشاعرے بڑے خاصے کی چیز تھے اور اس دور کی تہذیبی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتے تھے۔ بخود دہلوی، سائل دہلوی اور ساحر دہلوی کے شاگردوں کی ٹولیوں کے دم سے ادبی ماحول میں ایک گہما گہما تھی۔ ان مشاعروں میں اساتذہ دلی کے تلامذہ کے گردہ اپنے اپنے گردہ کی پاسداری میں پیش پیش رہتے تھے۔

اب ان مشاعروں میں ادارہ حیدری کی جانب سے ہونے والے ماہانہ طرحی مشاعروں کا بھی اضافہ ہو گیا۔ یہ مشاعرے حافظ ہوٹل کی بالائی منزل پر منعقد ہوا کرتے تھے۔ ان مشاعروں کے روح رواں حیدر دہلوی تھے۔ یہ مشاعرے اسی کی زیر صدارت منعقد ہوتے تھے۔ مشاعروں کی اکثریت اس کے تلامذہ پر مشتمل ہوتی تھی۔ ان مشاعروں میں دوسرے شعراء کم ہی شرکت کرتے تھے لیکن ان مشاعروں نے ایک پھلجلی ضرور پیدا کر دی تھی۔ اس کی کاروبار حیدری نے اس طرح پورا کیا کہ باہر سے شعراء کو مدعو کرنا شروع کر دیا۔ کبھی جگہ آ جاتے کبھی سیما۔ کبھی کوئی اور اس اقدام سے ان مشاعروں کی وقعت بڑھنے لگی۔ باہر کے شعراء کو سننے اور دیکھنے کے لیے دوسرے شعراء بھی آنے لگے۔

دلی کی تہذیب افراد ضرور تھی لیکن آن بان، شان و

”تم آرام سے سو جاؤ۔ میں سنبھال لوں گا۔“
دووں طرف خاموشی پھر طاری ہو گئی۔ یہ خاموشی صبح اس وقت ٹوٹی جب دروازے پر کسی نے دستک دی۔
”کسی کو کچھ نہ بتانا۔ میں خود ہاتھوں گا۔“ حیدر نے کہا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ہمیشہ اندر آگئیں اور حیدر کمرے سے باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے تینوں بہنوں کو ایک کمرے میں جمع کیا اور اندر سے کنڈی لگا دی۔

”خیریت تو ہے حیدر، ہوا کیا۔“

”جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنتا۔ لڑکی نے مجھے بتایا ہے کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ مجھے قبول نہیں کر سکتی۔ میں زبردستی اسے اپنی بیوی نہیں بنا سکتا۔ میں نے اسے طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”ایسے کیسے فیصلہ کر لیا ہے۔ ہمارا اتنا پیسا خرچ ہوا ہے۔ بدنامی الگ ہوگی۔ ہم تو ابھی جاتے ہیں اس خرافہ کے گھر۔ اس کی ماں سے تو جا کر پوچھیں اس ادارہ کو ہمارے سر کیوں منڈھ دیا۔“

”اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ طلاق تو اس کے بعد بھی دینی ہوگی۔ کسی لڑکی کو زبردستی گھر میں نہیں رکھا جاسکتا۔ ان شریف لوگوں کو بے عزت کرنے کا کیا فائدہ۔“

”شریف کہاں سے ہو گئے۔“

”کسی کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں اکیلا جاؤں گا اور اس کی ماں کو اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا دوں گا اور یہ درخواست بھی کروں گا کہ اس کی شادی اس لڑکے سے کر دی جائے جس سے وہ محبت کرتی ہے۔“

”حیدر، یہ تمہارا ہی طرف ہے۔ کوئی اور ہوتا تو ہنگامہ کر دیتا۔“

”ہر کوئی حیدر دہلوی نہیں ہوتا۔ بس اب اس لڑکی سے کچھ مت کہنا۔“

اس نے اسی وقت اس لڑکی کو ساتھ لیا اور اپنی سسرال پہنچ گیا۔ اس کی ماں کو اعتماد میں لے کر تمام باتیں گوش گزار کر دیں۔ ہاتھ پاؤں جوڑ کر یہ قسم بھی دے دی کہ بس اب بات کو ختم کر دیں اور اگر کبھی کی زندگی چاہتی ہیں تو اس کی شادی وہیں کر دیں جہاں یہ چاہتی ہے۔ خاموشی سے طلاق دے دی اور گھر آکر اس کا فریجہ واپس بھجوا دیا۔

ایک مرتبہ پھر تکلیف دہ آزادی اسے مل گئی تھی۔ اس نے بھی سمجھ لیا کہ شاید شادی میرے مقدر ہی میں نہیں میری

شوکت اب بھی وہی تھی۔ ہر کام میں سماجی میر تھے کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ فرد کی نہیں خاندانوں کی عزت تھی۔ شاعری کی دنیا بھی اس سے خالی نہیں تھی۔ یہاں بھی ان شعراء کی کرم بازاری تھی جو اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتا تھا کوئی نواب تھا کوئی نواب زادہ۔ حیدر دہلوی میں ایسی کوئی ظاہری خوبی نہیں تھی۔ اس کا تعلق تو ایک کر خندار گھرانے سے تھا۔ وہ اب بھی دھنیے پر نہیں اپنی محنت پر بل رہا تھا۔ پھر بھلا جانشیر داراندہ ذہنت کے حامل استاد شعراء اس کی صلاحیتوں کا لوہا کیوں مانتے۔ شعراء اس کے معترف ہونے کی بجائے اس سے حسد کرنے لگے۔ خود اسے بھی احساس ہونے لگا تھا کہ اسے جان بوجھ کر نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اسی لیے اس نے ضروری سمجھا تھا کہ اپنے گرد شاگردوں کو جمع کرے اور ان کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہو۔ ادارہ حیدری کا قیام بھی اسی ضرورت کا حصہ تھا کہ اگر کوئی مجھے مشاعروں میں نہیں بلاتا۔ تو میں اپنے مشاعرے خود منعقد کروں گا۔ میں صدارت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں لیکن مجھے ابتداء میں پڑھوایا جاتا ہے۔ میرے مقام تک کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ اب میں اپنے مشاعروں کی خود صدارت کروں گا۔

مشاعرے خوب چل پڑے تھے لیکن اس وقت کے جراند مخالفین کے ہاتھ میں تھے۔ ان مشاعروں کی روئداد چھاپنے سے گریز کیا جا رہا تھا۔ حیدر دہلوی کا کلام بھی نہیں چھاپا جا رہا تھا۔ اس کے لیے یہ مشورہ کیا گیا کہ ایک رسالہ ادارہ حیدری کے زیر اہتمام شائع کیا جائے۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ مخالفین پر تنقیدی مضامین بھی شائع کیے جائیں گے اور اپنے لوگوں کے کلام کی اشاعت کا ذریعہ بن جائے گا۔ نازش حیدری صحافت کا تجربہ رکھتے تھے لہذا اس جریڈے کی دیکھ بھال کے لیے ان کا نام تجویز ہوا۔ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتا تھا اسے کر کے دکھاتا تھا۔ چند دن غور و فکر کرنے کے بعد اس نے اعلان کر دیا کہ ہم ماہنامہ الہام جاری کریں گے۔ یہ اعلان اس لیے ضرورت سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا کہ دہلی ادبی ماہناموں کا گزرتھا۔ بڑے بڑے نامور صحافی اور ادیب ان جراند سے وابستہ تھے۔ اس ماحول میں کسی نئے ماہنامے کا اعلان دل گردے کا کام تھا۔

اس نے ادارہ حیدری کے تحت ماہنامہ الہام جاری کرنا شروع کر دیا۔

ماہنامہ الہام ابتداء میں خلعت ادبی جلد تھا اور اس میں نظمیں، غزلیں، افسانے اور علمی و ادبی مضامین کے علاوہ

مشاعروں کی کارروائیاں بھی شائع ہوتی تھیں۔ تقریظ و تنقید کے عنوان سے تنقیدی مضامین بھی الہام میں شائع ہوتے تھے۔

حیدر دہلوی کا دور دراصل طرحی مشاعروں کا دور تھا۔ ادارہ حیدری میں ہر ماہ طرحی مشاعروں کا انعقاد ہوتا تھا جہاں حیدر دہلوی کے تلامذہ اور دیگر شعراء طرحی غزلیں پیش کرتے تھے۔ اب ایک پلیٹ فارم مہیا ہو گیا تھا ان مشاعروں کی مکمل روئداد الہام میں شائع ہوتی تھیں۔

الہام چونکہ دہلی سے باہر بھی جاتا تھا اس لیے ان مشاعروں کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ خود حیدر دہلوی کو بھی اس کا فائدہ ہوا۔ اسے ریڈیو کے مشاعروں میں بلایا جانے لگا۔ دہلی سے باہر کے مشاعروں میں بھی مدعو کیا جانے لگا۔ اسے ریاست ٹونک کے مشاعرے میں بلایا گیا تھا۔ دہلی کے اکثر شعراء اس سے جل بھن گئے۔ اس مرتبہ بھی طرح طرح سے رکاوٹیں ڈالی گئیں کہ وہ اس مشاعرے میں شریک نہ ہو سکے لیکن وہ دبے والا کب تھا۔ شاگردوں کا ہجوم اسے ریلوے اسٹیشن تک چھوڑنے گیا اور وہ اس مشاعرے میں شرکت کے لیے روانہ ہو گیا۔

یہ مشاعرہ نظر بانگ ریاست ٹونک میں منعقد ہوا۔ سرکار ٹونک نواب محمد سعادت علی جان نے بھی نہ صرف خود شرکت کی بلکہ ریاست کے عمال صاحبزادگان بھی موجود تھے۔ ریاست ٹونک کے تمام قابل ذکر شعراء اس مشاعرے میں موجود تھے۔ یہ طرحی مشاعرہ تھا۔ مصرعہ طرح یہ دیا گیا تھا۔

عدم تک بے وقا چاہے تیری بے وفائی کا
حیدر دہلوی نے اس مصرعہ طرح پر یہ غزل نکالی۔
اثر آنکھوں پہ کیا ہو گا تیری جلوہ نمائی کا
کہ میں نے منہ ٹکا ہے مدتوں شام جدائی کا
متاع دل لٹا کر قدر دل معلوم ہوتی ہے
میں رستہ رہزنوں سے سیکھتا ہوں رہنمائی کا
ذرا گھر سے نکل گھر میں ذریعہ ڈھونڈنے والے
ذریعہ خود نکل آتا ہے منزل تک رسائی کا
قصص کی تیلیاں حیدر رگ تن ہوتی جاتی ہیں
لرز جاتا ہوں جس دن ذکر آتا ہے رہائی کا
اس کا دینگ لہجہ، تحت اللفظ مگر کراہی آواز اس پر یہ
پختہ کلام مشاعرہ ٹونک کیو تر بن گیا۔ دوسرے دن ہر زبان پر
اس کے اشعار تھے۔

بھارت میں پیسوں کیلئے بوڑھوں

کو شیرکانوالہ بنایا جانے لگا

بھارت میں ایک خطرناک اور پریشان کن رجحان دیکھنے میں آیا ہے جہاں غریب افراد پیسوں کے لیے اپنے خاندان کے بزرگوں کو شیروں کا نوالہ بنا رہے ہیں۔ بھارتی ضلع پہلی بھیت میں ٹائیگر ریزرو کے اطراف دیہات میں غریب خاندان اپنے بزرگوں کو جان بوجھ کر شیروں کی کھجور کی جانب بھیجتے ہیں جو ان کو نوالہ بن جاتے ہیں جس کے بدلے میں متاثرہ خاندان کو چند لاکھ کا معاوضہ مل جاتا ہے جب کہ موت کے اس تکلیف دہ کھیل میں خاندان کے بزرگوں کی مرضی شامل ہوتی ہے۔ حالیہ چند ماہ میں ایسے کئی واقعات دیکھنے میں آئے جہاں انتہائی غربت کے شکار خاندانوں نے معاوضے کی رقم کے عوض اپنے بزرگوں کو خود بخود شیروں کی جانب بھیجا اور ان کی برباد لاش ملی اور خاندان والوں نے متعلقہ وائلڈ لائف ڈیپارٹمنٹ سے ہرجانے کی رقم لاکھوں میں وصول کی۔ ٹائیگر ریزرو کے قانون کے مطابق اگر کوئی دیہاتی حادثاتی طور پر شیروں کا شکار بن جاتا ہے تو بھارتی حکومت انہیں معاوضہ دینے کی پابند ہے۔

مافیا“ اس کے خلاف ہو گیا۔ اس کی ربا عیوں کا مجموعہ بھی اسی غفلت کا نتیجہ رہا۔ اس کے عقیدت مندوں نے اسے ”خیام الہند“ قرار دیا لیکن ادنیٰ جرائد خاموش رہے۔

ربا عیات حیدر میں مختلف موضوعات کے تحت ربا عیاں شامل تھیں جن میں شراب و شباب، بھڑی، حقانیت، انسان، حقانیت و معارف، شاعر، برکات وطن اور آثار وطن وغیرہ تھیں۔

مجموعے کا آغاز شراب و شباب کے موضوع پر ربا عیوں سے کیا گیا تھا۔

ساتی ربخ پر نور دکھائے تو سہی
پردے سے ذرا سامنے آئے تو سہی
کیا حرمت بادہ سے میں آگاہ نہیں
آنکھوں سے پیوں کوئی پلائے تو سہی

☆

مشاعرے کی روایت سے ہٹ کر غیر طرعی غزل بھی اس سے سنی گئی۔

نہ دیکھو چشم فطرت سے مجھے حال پریشان میں
مثیت کا مجسم کھلتا ہے میرے دامن میں
لبو کا قطرہ قطرہ ہو گیا جب جذب پیکاں میں
جلی کر نہیں لینے لگی آخر رگ جاں میں
بالآخر پھوٹ نکلیں سب گل آتش بکف بن کر
چھپا دی میں کسی نے بجلیاں خاک گلستاں میں
مجھے آوارہ کو میری منزل مقصد نہ پہچانے
کوئی ایسی بھی کر دے کہ الہی چرخ گرداں میں

☆

یہ ہنگامے سحر کس نے وفا کا نغمہ چھیڑا تھا
کہ جتنے گل ہیں سب جاے سے باہر میں گلستاں میں

ازل میں اس سراپا حسن کو بے پردہ دیکھا تھا
ابھی تک بجلیاں ہی کوئی ہیں قلب سوزاں میں
شعری اصناف میں ربا بھی ہمیشہ سے مشکل صنف رہی

ہے کہ اور کسی شاعر کی قادر الکلامی کا ثبوت رہی ہے۔ یہ صنف نئی بھی نہیں لیکن گنتی کے شاعر ہیں جنہوں نے اس صنف کو اتھ لگایا۔ حیدر دہلوی نے بھی جب خود کو استاد ثابت کرنا چاہا اور مرعوب کرنے کی خاطر اس نے غزل کے ساتھ ساتھ اس صنف کو بھی اپنایا۔ ”بادہ عرفان“ کے عنوان سے اس کی ربا عیاں الہام میں شاخ ہونا شروع ہوئیں اور جلد ہی اپنی فنی اور فکری صلاحیتوں کو تسلیم کرانے کے لیے ربا بھی جیسی مشکل صنف سخن میں پہلا مجموعہ ”ربا عیات حیدر“ پیش کیا تاکہ اس کے حریف استاد شعر اس کی قادر الکلامی کا اندازہ کر سکیں۔ وہ ایک اہم غزل گو تھا۔ سینکڑوں غزلیں کہہ چکا تھا لیکن پہلا مجموعہ ربا بھی کا پیش کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے بھینبا یہ جذبہ موجود تھا کہ وہ اپنی قادر الکلامی سے مخالفین کو واقف کرانا چاہتا ہے۔

ربا عیات حیدر شائع ہونے کے بعد ہوتا تو یہ چاہیے تھا کہ ادبی حلقے پذیرائی کرتے اور جھپٹے گناہوں کا ازالہ کرتے لیکن ہوا اس کے برعکس۔ اس کی قادر الکلامی سے خائف ہو کر اس کے خلاف سازشیں شروع کر دیں اور اسے شاعروں میں نظر انداز کرنے کی روش تیز کر دی۔ اس دور میں سب سے بڑا میڈیم مشاعرہ ہی تھا اور یہی مشاعروں کی دیکھن کا ذریعہ تھے مگر اس کی توانا شاعری سے ”ادبی

مارا اس کم بخت چلن نے مجھ کو
میں نے تو ردايات سخن زعمہ کیں
پامال کیا اہل وطن نے مجھ کو

☆

مقصد یہ ہے برباد سخن ہو میرا
دل مخزن صدمات وطن ہو میرا
دجال کے بارے میں بھی اب شک ہے مجھے
ممکن ہے کوئی اہل وطن ہو میرا

☆.....☆

اہل ہنر سے مخالفت اپنی جگہ لیکن اس کا نیا کاروبار،
ہیٹ بنانے کا کارخانہ خوب چل پڑا اور اسے مالی آسودگی
حاصل ہوگئی۔ انگریزوں کا دور تھا اور وہ انگریزوں کے لیے
ہیٹ بنا رہا تھا۔ اس کے بنائے ہوئے ہیٹ کلکتہ اور آس
پاس کے شہروں میں بھیجے جاتے تھے۔ آمدنی خوب ہو رہی
تھی۔ کام اتنا چیل گیا کہ کئی کارمگر رکھ لیے اور کاروبار کی
دیکھ بھال کے لیے کارخانے ہی میں رہائش اختیار کر لی۔
ان کارمگروں میں دو کارمگر بھائی سیج اور طاہر بھی تھے جو
اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔ دل سے چاہتے تھے کہ
حیدر شادی کر لے۔ بار بار اصرار کر چکے تھے لیکن حیدر کو تو
جیسے شادی کے نام سے چڑ ہوگئی تھی۔ کئی مرتبہ سختی سے منع کر
چکے تھے۔ آخر دونوں بھائیوں نے مشورہ کر کے اسے اپنے
گھر مدعو کیا۔ مقصد یہی تھا کہ شادی کی بات آگے بڑھانی
جائے۔ حیدر نے ان کی دعوت قبول کر لی اور ان کے گھر
چلے گئے۔ وہاں اس کی ملاقات ان دونوں بھائیوں کی
والدہ سے ہوئی۔ ان کی والدہ میں حیدر کو اپنی والدہ کی
جھلک دکھائی دی۔ وہی لب و لہجہ وہی انداز گفتگو۔ حیدر ان
سے بے حد متاثر ہوا اور انکراشن کے گھر جانے لگا۔ اس نیک
دل خاتون نے انہیں شادی پر آمادہ کر لیا۔

”میرے بھائی کی بیٹی ہے امت النبی، بہت پیاری
بچی ہے۔ ابھی کم عمر ہے تمہارے رنگ میں آسانی سے ڈبل
جائے گی۔“

انہوں نے حیدر کو لڑکی کے باپ سے بھی ملوایا۔ ان
کا نام شجاع الدین خان تھا۔ دلی میں جوتوں کا کاروبار
کرتے تھے۔ حیدر ان سے مل کر بے حد متاثر ہوا۔ یہ سن کر تو
ان سے ہمدردی ہوگئی کہ ان کی بارہ بیٹیاں ہیں وہ سوچنے لگا
کہ اگر میں شادی کر لوں تو ان کا کچھ تو بوجھ ہلکا ہوگا۔ اس
زمانے میں لڑکی دیکھنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اس نے طاہر کی

بے لطف ہی دنیا میں جیے جاتا ہے
بے کیف یہاں سانس لیے جاتا ہے
زاہد سے گل رنگ سے انکار تجھے
کیوں خون جوانی کا کیے جاتا ہے

☆

دنیا کی اداؤں پہ مٹے جاتے ہیں
سامان تباہی کے کیے جاتے ہیں
بھڑی سے خیدہ کہیں ہوتی ہے کمر
ہم بوجھ سے عصیاں کے جھکے جاتے ہیں

(بھڑی)

☆

آئے ہیں ترے کتب دنیا میں قدم
انساں ہے یہاں اپنے عمل سے موسوم
اک لفظ نو ایجاد ہے تیری ہستی
تو آپ ہی تجویز کر اپنا مفہوم
(انسان)

☆

ہر منکر حق صدق نوا ہو نہ سکا
منکر ہی رہا مجھ ٹا ہو نہ سکا
اللہ وہ تلفظ ہے زبان دل پر
جو بعض زبانوں سے ادا ہو نہ سکا
(حقائق و معارف)

☆

اس دہر کو جس رخ سے جدھر سے دیکھا
محروم حقائق کی نظر سے دیکھا
جب سامنے آیا کوئی دولت کا غلام
شاعر نے حقارت کی نظر سے دیکھا
(شاعر)

وہ ایک باصلاحیت فنکار تھا لیکن اس کی وہ پذیرائی نہ
ہو سکی جس کا وہ مستحق تھا۔ زندگی بھر سازشوں اور دشمنیوں کا
شکار رہا۔ وہ خود کو شاعری کے بلند منصب پر فائز دیکھتا تھا
لیکن اس کے برعکس ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ناروا سلوک کیا
جا رہا تھا۔ وہ کچھ نہیں تو اس ناروا سلوک پر شکایت تو کر سکتا
تھا۔ یہ شکایتیں اس نے رہائی کی زبان میں کیں اور جب
مجموعہ ربا عیات شائع ہوا تو ”برکات وطن“ کے عنوان سے
اس مجموعے میں شامل کر دیں۔

محسود کیا طرز سخن نے مجھ کو

نے اسے اس کے گھر بھیج دیا۔“

”تو کیا غلط کیا۔“

”جب وہ چلی ہی گئی تو کیا رکاوٹ رہ گئی۔“

”میں نے اسے طلاق نہیں دی ہے اور نہ دیتا چاہتا ہوں۔“

”اس کے ہوتے ہوئے بھی شادی ہو سکتی ہے۔ ظفر جہاں آپ کو پسند کرتی ہے وہ آپ کا ہر طرح خیال رکھے گی۔“

بہت بحث مباحثہ ہوا اور آخر یہ طے ہوا کہ کسی کے علم میں لائے بغیر یہ شادی کر لی جائے۔ جب بات کھل گئی اس وقت دیکھا جائے گا۔

سرور جہاں نے حیدر دہلوی کی والدہ اصغری بیگم سے بات کی تو انہوں نے فوراً قبول کر لیا کیونکہ وہ اپنی بیٹی کی پسند کو جانتی تھیں۔

اس شادی کو خفیہ رکھا گیا۔ حیدر نے نئی بیوی ظفر جہاں کو کارخانے کے ایک حصے میں رکھا جہاں وہ رہائش پذیر تھے۔ یہ شادی اس وقت تک خفیہ رہی جب تک اس کا پہلا بیٹا پیدا نہیں ہو گیا۔ بیٹے کی پیدائش کی خبر کسی نہ کسی طرح امت النبی کے گھر پہنچی گئی۔ وہاں تو روٹا پھینٹا شروع ہو گیا۔

امت النبی کی والدہ تو سخت چراغ باہوئیں اور قانونی چارہ جوئی کرنے کی دھمکیاں دینے لگیں لیکن اس کے سر نہایت سمجھدار شخص تھے۔ انہوں نے کوئی قدم اٹھانے سے چشمہ حیدر کو بولا بھیجا اور ساری بات سن کر اسے تسلی دی۔

”آپ کی دوسری بیوی بھی ہماری بیٹی کی طرح ہے۔ آپ اسے بھی یہاں لے آئیں۔ دونوں ہمیں ساتھ مل کر رہیں گی۔“

حیدر اپنی بیگم ظفر جہاں کو بھی دیں لے آیا۔ اس طرح لمبی خوشی رہتے ہوئے دو سال ہوئے تھے کہ تحریک پاکستان نے زور پکڑا اور ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ سائل دہلوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ بیٹو دہلوی مشاعروں سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ ایسے میں حیدر دہلوی ہی دہلی سے مانے ہوئے استاد شاعر کے طور پر مشہور تھے۔ اس کی غزلیں ہر طرف دھوم مچا رہی تھیں۔ ریڈیو کے ادبی پروگراموں میں اسے مدعو کیا جا رہا تھا۔ ہر طرف اس کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ہندو شعرا کو اس کی یہ شہرت قطعی پسند نہیں تھی۔ وہ مذہبی تعصب کی بیخست چڑھ گیا۔ ان تمام تعصبات اور اذیتوں کو اس نے اپنی غزلوں کا حصہ بنالیا۔

والدہ پر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ امت النبی اس کے گھر بیاہ کر آگئی لیکن حیدر اسے دیکھ کر بے حد آزرہ ہوا۔ اس کے سامنے دلہن کے روپ میں نو سالہ بچی تھی۔ اسے ظاہر کی والدہ پر غصہ تو بہت آیا لیکن وہ یہی کر سکتا تھا کہ اس نے اپنی نئی نوٹی دلہن کو اس کے گھر بھیج دیا اور یہ گلہ بھی کیا کہ اتنی کم سن لڑکی کی شادی آپ کو نہیں کرنی چاہیے تھی۔

اس نے اس لڑکی کو طلاق نہیں دی لیکن گھر میں بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ پھر اکیللا رہ گیا۔

پھر وہی شب و روز وہی شاعری وہی کاروبار۔ اُمید پہ دنیا قائم ہے۔

کافر حقیق ہی اس وقت بھلے ہیں حیدر کبھی اللہ نے چاہا تو مسلمان ہوں گے اسی دوران وہ اپنی بھانجی سرور جہاں کے گھر بیٹھا تھا کہ ایک لڑکی لپک چپک گھر میں داخل ہوئی کمرالئے قدموں بھاگ بھی گئی۔

”کون تھی یہ لڑکی؟“ حیدر نے پوچھا۔

”اچھی مٹی نا۔“ سرور جہاں نے شوشی سے کہا۔

”میں نے تو اس غریب کو دیکھا تک نہیں۔ میں تو صرف یہ پوچھ رہا ہوں کہ کون تھی۔“

”بھئی آپ کی ایک عاشق زار، آپ کا نام سن کر آپ ہنسنے لگی ہیں۔“

”اکثر میرے پاس آکر بیٹھ جاتی ہے اور آپ کی باتیں کرتی ہے۔ آپ کے سینکڑوں شعر اسے یاد ہو گئے ہیں۔“

”کمال ہے بھئی، ہماری اتنی قدردان اور ہمیں معلوم تک نہیں۔“ حیدر نے اذراہ مذاق کہا۔

”اب تو معلوم ہو گیا۔ اپنے مریض کا کچھ تو علاج کیجیے۔“

”افسوس کہ ہم شاعر ہیں ڈاکٹر نہیں۔“

”اس کا علاج شاعری کے پاس ہے۔“

بات مذاق سے شروع ہوئی مگر مذاق پر ختم ہو گئی۔ حیدر اسے مذاق سمجھ رہا تھا لیکن یہ مذاق سنجیدگی اختیار کر گیا۔ تمام باتیں بھی اس میں شامل ہو گئیں۔ ایک مرتبہ پھر اس پر زور دیا جانے لگا کہ وہ اس لڑکی یعنی ظفر جہاں سے شادی کر لے۔

”میری شادی امت النبی سے ہو چکی ہے۔“

”آپ خود ہی کہتے ہیں وہ نو سال کی بچی تھی۔ آپ

1949ء میں وہ اپنے عزیز و اقارب کے ہمراہ رات کے اندھیرے میں غازی آباد کے راستے کلکتہ روانہ ہوا۔ خیال یہ تھا کہ یہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز کراچی چلا جائے گا۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز سے کراچی جانے کے لیے اسے دوبارہ دلی جانا پڑے گا لیکن اب دوبارہ دلی میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کیا کرتا ہندوستان میں کہیں بھی رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس نے ڈھا کا جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ڈھا کا کچھ کر اس نے حسبِ حال یہ رباعی کہی جو خاصی مشہور ہوئی۔

جو کچھ تھا میر وہ گنوا کے آئے
ارباب سیاست پہ لٹا کے آئے
اک قلعہ اعزاز و طرب بھی دلی
اس قلعے کو ہم توڑ کے ڈھا کے آئے
یہ بالکل وہی ماجرا تھا جس نے میر تقی میر کی زبان سے کہلایا تھا۔

جس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دہار کے
ڈھا کا پہنچے ہی سب سے پہلا مرحلہ ہائش کا درپیش تھا۔ ڈھا کا میں اس کے بہت سے چاہنے والے موجود تھے۔ ان میں منظور اشعر بھی تھے۔ ہوٹل میں سامان رکھ کر وہ انہیں ڈھونڈنے نکلا۔ مختلف چائے خانوں میں تلاش کرتا رہا۔ جو شاعر صورتِ نظر آئی اس سے پوچھتا بالآخر اس نے منظور اشعر کو تلاش کر لیا۔ استاد کی پتاسن کر وہ دیکھی تو ضرور ہوا لیکن حالات سے پوری طرح واقف نہ ہونے کی وجہ سے وہ یہ کہنے پر بھی مجبور ہو گیا۔

”حیدر صاحب، اگر آپ دلی ہی میں رہتے تو زیادہ اچھا تھا۔ یہ ڈھا کا ہے۔ یہاں آپ کو وہ ادبی ماحول نہیں مل سکے گا۔“

یہ سنتے ہی حیدر جلال میں آگیا۔
”تمہیں خبر ہے وہاں میری جان کو کتنا بڑا خطرہ ہو گیا تھا۔ اپنے بچانے سب میرے دشمن بنے ہوئے تھے۔ میں کبھی نہ آتا لیکن جب مجھ پر حملہ ہوا تو مجھے اپنی عزت و آبرو خطرے میں تھی۔“

”حملہ! کیسا حملہ؟“
”میں حسبِ معمول صبح کی سیر کے لیے ایڈورڈ پارک گیا ہوا تھا کہ چند غنڈوں نے مجھ پر ہاتھوں سے حملہ کر دیا۔“

بہت ہی تنگ ہے حیدر فضائے دہلی سے
خدا پناہ میں رکھے بس اب یہاں سے مجھے

☆
اس برے وقت میں مجھے حیدر
حق نے کس جرم میں کمال کیا

☆
غالب کے بعد دلی کی حیدر سے لاج تھی
وہ بے نوا فقیر بھی گوشہ نشین ہے آج

☆
کیا سوچ کر ہیں درے آزار ہم وطن
حیدر سے ان کو ضد ہے کہ علم و ادب سے ضد

☆
حیدر برا ہے مکملہ علم و فن کا حشر
زندہ مثال سامنے مجھ ناتواں کی ہے
وہ ایک نامور استاد شاعر کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا
مگر وہ ہندو شعراء کی آنکھ میں کلکتا تھا۔ وجہ صرف اتنی تھی کہ
اس کے ہوتے ہوئے مشاعروں میں کسی اور کا چراغ نہیں
جل سکتا تھا۔

پاکستان کا قیام دلی کے مسلمانوں کے لیے موت کا
پیغام بن گیا۔ بے دریغ قتل عام ہونے لگا۔ محلے کے محلے
اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ بڑے پیمانے پر ہجرت ہونے لگی۔
جو بھاگ سکتے تھے بھاگ گئے جو رہ گئے تھے تنہا کر دیئے
گئے۔ حیدر دہلوی پر ہاتھ ڈالتا آسان نہیں تھا بلکہ اسے
ٹھکانے لگانے کے لیے خفیہ سازشیں ہونے لگیں۔ ان
سازشوں کا علم جب اس کے دوستوں کو ہوا تو سخت فکر مند
ہوئے اور اسے مشورہ دینے لگے کہ وہ پاکستان چلا جائے۔
اس کے کئی عزیز شاگرد اور رشتہ دار ہجرت کر چکے تھے لیکن وہ
کسی قیمت پر دلی چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ اس نے نئی دوستوں
کو اپنی نگرانی میں یہ حفاظت لال قلعہ پہنچایا جہاں سے وہ
دیگر مسلمانوں کے ساتھ ہجرت کر گئے لیکن وہ خود جما بیٹھا
تھا۔ اس کا خیال تھا کہ حالات سدھر جائیں گے لیکن دلی کی
دشمن اس پر تنگ کر دی گئی۔ خبریں عام ہیں کہ یا تو اسے قتل
کر دیا جائے گا یا پھر گرفتار کر لیا جائے گا۔ اب عزت و آبرو
خطرے میں تھی۔ اس نے بادل خواست دلی چھوڑنے کا فیصلہ
کر لیا۔

اس فیصلے پر عملدرآمد اتنا آسان نہیں تھا۔ حریفوں
سے بچ کر کلکتا آسان نہیں تھا۔ دشمن اس کی تلاش میں تھے۔

میری ٹانگ ٹوٹ گئی۔ کئی مہینے بستر پر پڑا رہا۔ کیا اس کے بعد بھی دلی نہ چھوڑتا۔

”یہ غنڈے کون تھے۔“

”جیتنے منہ اتنی باتیں مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ میری ٹانگ ٹوٹی تھی۔ ابھی زندگی کی ڈور نہیں ٹوٹی تھی اس لیے یہاں چلا آیا۔“

”اتنی بڑی خبر تھی لیکن کسی ذریعے سے ہم تک نہیں پہنچی۔“

”میرا کلام تک دنیا سے چھپایا جاتا ہے یہ خبر کیسے پہنچتی۔“

منظور اشعر کی کوشش سے اسے مہاجن پور لائن میں کرائے پر مکان مل گیا اور وہ ہوٹل سے اس مکان میں دونوں بیویوں کے ساتھ ٹھہل ہو گیا۔

دوسرے دن شہر میں کھونسے کے لیے نکلا تو منظور اشعر کا کہا ٹھیک معلوم ہوا۔ کہاں دلی کہاں ڈھاکا۔ عجیب عجیب صورتیں نظر آئیں۔ ایسی اردو سننے کو ملی کہ کوفت کے سوا کچھ نہ ملا۔ اسے پھر میر تقی میر یاد آگئے جودلی سے لکھنؤ گئے تھے اس پر بھی بات کرنے سے گریز کرتے تھے کہ صاحبو تمہارا کچھ نہیں جائے گا میری زبان بگڑے گی۔ وہ تو لکھنؤ گئے تھے حیدر تو ڈھاکا آ گیا تھا۔

اس نے اپنی عادت کے مطابق یہ بھی سوچا ہوگا کہ کچھ دن رہ لوں سب کی اردو ٹھیک کر دوں گا۔

شاعری کی سلطنت فتح کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ روزگار کا کوئی ذریعہ پیدا کیا جائے۔ نوکری زندگی بھر نہیں کی تھی اب کیا کرتا۔ اس کی پیغم ظفر جہاں نے کلکتہ اسٹیشن پر جامہ تلاشی لینے والوں کی نظر بچا کر کچھ رقم اپنے برقعے کی ٹوپی میں رکھ لی تھی یہ رقم انہوں نے حیدر کے آگے رکھ دی۔ اسی رقم سے اس نے کپڑے اور جوتوں کی بہت بڑی دکان بنائی دکان پر ایک ملازم بھی رکھ لیا۔ دکان کے اوپر ہی رہائش کا بندوبست کر لیا۔

کاروبار بجم جانے کے بعد اس نے مشاعروں کا رخ کیا۔ چند مشاعروں میں شرکت کے بعد اسے اعزاز ہو گیا کہ یہاں کی فضا کچھ اور ہے۔ اس کا خیال تھا کہ یہاں بھی وہ کوئی حافظ کا ہوٹل تلاش کر لے گا۔ ایک مرتبہ پھر دلی والا ماحول بن جائے گا لیکن دریا میں اترنے کے بعد معلوم ہوا دریا کتنا گہرا ہے۔ ڈھاکا کے ادبی حلقوں کی حکمرانی عندلیب شادانی کے ہاتھ میں تھی۔ عموماً انہی کے ہاں

مشاعرے منعقد ہوتے یا پھر مشاعروں کی نظامت کے فرائض انجام دیتے۔ یہ فریضہ اس لیے بھی وہ انجام دیتے تھے کہ ہر شاعر کو بلانے سے پہلے پچھلے شاعر کی زمین میں فی البدیہہ شعر پڑھ کر بلاتے تھے گویا منظوم نظامت ہوتی تھی جس سے مشاعرے کا رنگ دو بالا ہو جاتا تھا۔ اس فن میں انہیں مہارت حاصل تھی اور داد کے حق دار بننے تھے۔ تمام شاعران سے ڈرتے رہتے تھے کہ نظامت ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے اگر ناراض ہو گئے تو غلط مقام پر پڑھوا دیں گے۔ ان سے بنا کر رکھی جائے۔ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے لہذا طلبہ کی طاقت بھی ان کے ساتھ تھی۔ رام پور کے رہنے والے تھے پٹھانوں کی اکثریتی ان میں تھی۔ غمہ ایسا کہ ناک پر کبھی نہ بیٹھنے دیں۔ استاد کی کاغذ بھی تھا۔ حیدر دہلوی کی آمد سے ایک نیام میں دو ٹکڑوں والا معاملہ ہو گیا۔ نہ یہ دے بنے والے نہ وہ جھکنے والے۔ چھوٹی موٹی جھڑپیں شروع ہو گئیں۔

یوم اقبال کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ حیدر دہلوی بھی اس مشاعرے میں مدعو تھا۔ حسب معمول عندلیب شادانی نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ عندلیب شادانی نے اسے غلط مقام پر بلایا لیکن حیدر نے دل پر جبر کیا اور غزل پڑھی۔

دل مست، فضا مست، مباحث، نظر مست
سب لطف سے ساقی کے یکے بعد وگرم مست
اللہ دے جوانی کا دل آویز زمانہ
ہر چند کہ تاریک ہے یہ رات مگر مست
رفقار تری سے کا بدستا ہوا بادل
جس راہ سے تو گزرے وہی راہ گزرم مست

مشاعرے میں حیدر دہلوی کو خوب داؤ ملی۔ جب غزل پڑھ کر وہ اسے اتر گیا تو عندلیب شادانی نے اس کی زمین میں یہ شعر پڑھا

کیا مست غزل حضرت حیدر نے سنائی
دس ہیں ادھر مست ہیں دس ہیں ادھر مست

اس شعر میں اگرچہ حیدر دہلوی کے خلاف کوئی بات نہیں تھی لیکن اس جیسے نازک طبع کے لیے بھی بہت تھا کہ اس کے سنجیدہ کلام کو بے دردی میں ڈھال کر مزاحیہ رنگ دیا جائے۔ اس نے اس تنقید کو محسوس کیا اور عندلیب شادانی کی طرف سے اس کے دل میں ایک گرہ کا اضافہ ہو گیا۔ انہی دنوں ڈھاکا ریڈیو کے ایک مشاعرے میں

مندیب شادانی نے کچھ ایسی ہی چوٹ کی توحیدر دہلوی ضبط نہ کر سکا اور اس کا جواب ایک رباعی میں دیا۔

ہر چند کہ ہجرت زدہ انسان ہوں میں
مستوب سیاست ہوں پریشاں ہوں میں
اے ابنِ ادب تنگ نگاہی سے نہ دیکھ
اس عہد کی تاریخ کا عنوان ہوں میں
اساتذہ دہلی کی صف میں نمایاں شخصیت نواب سائل
دہلوی نہایت وضع دار بزرگ تھے۔ چلنے سے محذور ہونے
کے باوجود دہلی میں حافظ ہوٹل پر رکشا میں بیٹھ کر تشریف
لاتے تھے اور حیدر دہلوی سے گفتگو مصروف گفتگو رہتے
تھے۔ ایک روز حسب معمول تشریف لائے۔ حیدر دہلوی
اتفاق سے تشریف نہ رکھتے تھے۔ نازش حیدری اور ایک
دوسرے شاگرد نے انہیں سہارا دے کر رکشا سے اتارا اور
بٹھایا۔ سائل دہلوی دونوں سے مخاطب ہو کر بولے۔
”میاں! تم جانتے ہو تمہارے استاد کیا ہیں؟“

دونوں نے نواب صاحب کے اس سوال کی
وضاحت چاہی۔ سائل دہلوی نے اپنا ہاتھ ناک پر لے جا کر
فرمایا، تمہارے استاد یہ ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ میرے اور بیجو
کے بعد ولی مر جائے گی مگر حیدر ولی کی ناک ہیں ہمیں
اطمینان ہے کہ ولی نہیں مر سکتی۔

یہ تھا وہ حیدر دہلوی جسے سائل دہلوی ولی کی ناک کہہ
رہے تھے۔ وہی حیدر دہلوی تھا جو ڈھاکہ میں بے نوا ہونا ہوا تھا
اور زبان حال سے کہہ رہا تھا

قالب کے بعد ولی کی حیدر سے لاج تھی
وہ بے نوا فقیر بھی گوشہ نشین ہے آج
اسے اپنی قدر و منزلت کا شدت سے احساس تھا مگر
ولی کی طرح یہاں بھی اس کی شعری صلاحیتیں اس کی دشمن
بن گئیں۔ ولی میں بھی حریتوں کا سامنا تھا یہاں بھی عندلیب
شادانی سے ٹھن گئی۔ شادانی سے مخالفت کا مطلب پورے
ڈھاکہ کی مخالفت تھا۔ ڈھاکہ کی ادبی فضا عندلیب شادانی
کے اثر میں تھی اور عندلیب شادانی سے اس کی بن نہیں رہی
تھی۔ اس کی فطرت میں ایک فنکارانہ نامی جس کا مظاہرہ
اکثر ہو جایا کرتا تھا۔ لوگ اس انا کو اس کا غرور سمجھتے تھے
حالانکہ اس کی طبیعت میں غرور نہیں تھا ہاں جب اسے اپنی
ناقدری کا احساس ہوتا تھا تو پھر اس کا بھڑک جانا لازمی تھا
اور چونکہ مشکل سے مشکل وقت میں وہ جھکا نہیں جانتا تھا
اس لیے مغرور سمجھا جاتا تھا۔ عندلیب شادانی اس کے اس

آپ نے پیرس اگر دیکھا نہیں تو اس
شہر کی تصویریں ضرور دیکھی ہوں گی۔ آپ
کو واضح طور پر دکھائی دے گا کہ پیرس میں
یوں تو بہت اونچی اونچی عمارتیں ہیں لیکن
وسطی پیرس میں ایسی اونچی اونچی عمارتیں
نہیں بنائی گئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے
کہ پیرس کے حسن کو برقرار رکھنے کے لیے
ایسی پلاننگ کی گئی ہے۔ بلکہ اس کی وجہ
ایک خطرناک غلطی ہے۔ تیرہویں صدی
میں (جہاں اب پیرس آباد ہے) جسم اور
چونے کے بہت بڑے بڑے ذخائر تھے
اور کان کنی کی جاتی تھی۔ اس مقصد کے
لیے لاتعداد سرنگیں بنائی گئی تھیں۔ جو
بہت دور تک پھیلی چلی گئی تھیں۔ وہاں ایک
طرف تو سرنگوں سے کام لیا جا رہا تھا۔ اور
دوسری طرف پیرس شہر کی بنیادیں رکھی
جاری تھیں۔ عمارتیں بنائی جا رہی تھیں۔ لیکن
کسی نے یہ جاننے کی زحمت گوارا نہیں کی
کہ ان سرنگوں کے جال کہاں تک پھیلے
ہوئے ہیں۔ لہذا ان سرنگوں کے اوپر ہی
عمارتیں بنی شروع ہو گئیں۔ پھر وہی ہوا جو
ہوتا تھا۔ جب شاخ نازک پر آشیانہ بنایا
جائے گا تو ایسا ہی ہوگا۔ عمارتیں دھڑا دھڑ
گرنے لگیں اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پھر
کنگ لوکس کو تشویش ہوئی۔ اس نے
ماہرین کی ایک فیم مقرر کی کہ دیکھو یہ کیا
معاملہ ہے۔ انہوں نے رپورٹ دی کہ
بادشاہ سلامت پورا پیرس ہی خطرے میں
ہے۔ اب اس عظیم الشان غلطی کی اصلاح
نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی لیے یہ طے پایا کہ
سینٹرل پیرس یعنی وسطی پیرس میں اونچی
عمارتیں نہ بنائیں جائیں۔

مرسلہ: ندیم مرزا، حیدر آباد

فطرت کو نہ سمجھ سکے یا انہیں یہ احساس ہوا کہ حیدر ان کے لیے خطرہ بن سکتا ہے لہذا وہ انہیں بچا دکھانے پر تل گئے۔ عندلیب شادانی بہت پہلے سے ڈھا کا میں تھے۔ ان کا ایک خلیق اثر تھا جب کہ حیدر کے قدم ابھی یہاں نہیں جتے تھے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ حالات سازگار ہو جائیں گے لیکن نقصان کے خلاف ہوتی چلی گئی۔ یہاں کے مشاعرے معرکہ آرائیاں بنتے گئے۔

اگر اہل فن کی نہیں قدر حیدر تو پھر کیا رہے گا کوئی فن سلامت وہ ان معرکہ آرائیوں سے گھبرانے والا نہیں تھا۔ ان حالات سے لڑتا رہا۔ مشاعروں میں شریک ہوتا رہا۔ اپنے اس عزم پر قائم رہا۔

یہ ہم صغیر کیا مری وسعت کو پاسکیں
سب سے زیادہ طائر رفعت پسند ہوں
اس ڈھا کا میں اس نے لیاقت علی خان کی شہادت کی خبر سنی۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اب پاکستان گیا۔“ اس روز وہ گھر میں داخل ہوا تو اس نے بچوں کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ دونوں بیویوں نے مفتی خیر نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آخر چھوٹی بیگم نے ہمت کی۔ ”سرتاج خیریت تو ہے۔ باہر کسی سے کوئی بات ہوئی ہے؟“ آپ اس سے پہلے اس طرح تو بھی گھر میں داخل نہیں ہوئے۔ وقار آپ کو دیکھ کر آپ کی طرف لپکا اور آپ نے اسے جھڑک دیا۔ تجھ کو بھی آپ نے منہ نہیں لگایا۔ کیا بات کیا ہے۔“

”جانتی ہوں آج کیا ہو گیا ہے۔“

”کیا ہو گیا ہے؟“

”آج وہ ہو گیا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیاقت علی خان کو بھرے جلے میں گولی ماری گئی اور یہ کام ہندوستان کی سرزمین پر نہیں پاکستان میں ہوا ہے اور دکھ کی بات یہ ہے کہ یہ محسن کسی اپنوں کے ہاتھوں سرزد ہوئی ہے۔ مفتی قربانیاں دے کر ہم نے یہ ملک حاصل کیا تھا۔ سازشیں یہاں بھی سرگرم ہو گئی ہیں۔ اب اس ملک کا کیا ہوگا۔“

دونوں بیویاں خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے جذبے کو دیکھ رہی تھیں۔ آخر بڑی بیگم نے اسے تسلی دی۔ ”واقعی یہ تو بہت برا ہو گیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس ملک کو کچھ نہیں ہوگا جس اللہ نے یہ ملک دیا ہے وہی اس کی حفاظت بھی کرے گا۔“

اس حادثہ جاں کاہ نے اسے کئی دن بے حال رکھا۔ وہ اب تک ڈھا کا میں جیسے تھے دن گزار رہا تھا لیکن اب اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ اس نے یہاں سے رخصت ہونے کی ٹھان لی۔ بڑی وجہ عندلیب شادانی سے کھٹ پٹ تھی۔ لاہور میں اس کی بھانجی اور بعض سسرالی رشتہ دار ہاشم پندیر تھے۔ بعض شاگرد بھی تھے۔ لاہور کے ادبی ماحول سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا تھا۔ لاہور ادبی جراند اور اخبارات کا گڑھ تھا۔ نامور ادیب و شاعر یہاں موجود تھے چائے خانے آباد رہا کرتے تھے۔ پاک ٹی یاؤس کی شہرت ڈھا کا تک سنائی دے رہی تھی۔ یہ سب باتیں تھیں جس نے اس کی توجہ لاہور کی طرف مبذول کر دی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ہجرت کی اور ڈھا کا چھوڑ کر لاہور آ گیا۔

لاہور آیا تو اپنی بھانجی کے شوہر احمد بخاری کے گھر ٹھہرا۔ یہ دولتانہ کی وزارت کا دور تھا۔ احمد بخاری ان دنوں مسلم لیگ کے صدر تھے۔

جب وہ چند روز کی مہمان داری کا لطف اٹھا چکا تو احمد بخاری نے دولتانہ کی خوشنودی کے لیے اپنی بیگم سے کہا وہ اپنے ماموں سے درخواست کریں کہ وہ دولتانہ کی شان میں ایک قصیدہ لکھ دیں۔ حیدر نے یہ فرمائش قبول کر لی۔

جب آٹھ دن گزر گئے تو احمد بخاری نے اس سے قصیدے کے بارے میں پوچھا۔ حیدر نے انہیں سچائی کر لیں۔

”مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔ آپ میرے داماد ہیں آپ جو حکم کریں میں ماننے کو تیار ہوں لیکن قصیدہ لکھنا میری طبیعت کے خلاف ہے۔“

احمد بخاری یہ صاف جواب سن کر مایوس تو ضرور ہوئے لیکن ہمت نہیں ہاری۔ انہوں نے اپنی بیگم سے ایک مرتبہ پھر کہا۔

”تم حیدر صاحب پر پھر زور دے کر دیکھو۔ انہوں نے اگر قصیدہ لکھ دیا تو میری بڑی بات بن جائے گی۔ ممکن ہے حیدر صاحب کو بھی کوئی اگر انقدر انعام مل جائے۔ بھئی ہمارے سر اگر شاعر ہیں تو ہمیں کوئی فائدہ بھی پہنچنا چاہیے۔“

اس کی بھانجی نے من و عن بھیجی حیدر کے کان میں ڈالیں اور اسے قصیدہ لکھنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ حیدر طیش میں آ گیا اور وہ باتیں کہہ کر راجہ احمد بخاری سے نہیں کہہ سکا تھا۔

مجھے اگر دولت کمانا ہوتی تو حیدر آباد اور ٹونک کی ریاستیں کم نہیں تھیں۔ ان ریاستوں کی طرف سے کئی بار پیشکش ہوئی کہ وہ ان کے پاس آجائیں مگر میرے نزدیک شاعری ایک شریف فن ہے۔ میرے اشعار میری اولاد کی طرح ہیں میں انہیں فروخت کر کے بدہ فروشی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ آئندہ مجھ سے تقاضا مت کرنا۔

اس کے بعد سرور جہاں کو اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اس سے تقاضا کرنی۔ حیدر دہلوی ایسا فیور تھا کہ سخت تنگدستی کے عالم میں بھی کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا یا۔ اس وقت بھی وہ ضرورت مند تھا۔ ڈھاکا میں کاروبار ختم کر کے آیا تھا۔ لاہور میں سر چھپانے کی جگہ کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وہ قصیدہ لکھ کر دولت نہ سے کسی کاروبار کی خواہش کر سکتا تھا لیکن اس کی خودداری نے یہ موقع نہ دیا۔

اس کا چیتا شاگرد شہاب دہلوی بہادر پور میں تھا۔ کئی سرکاری عہدوں پر رہ چکا تھا۔ نہایت اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ وہ نہ صرف حیدر کا شاگرد تھا بلکہ احسن پر اس کے احسانات بھی تھے۔ جب وہ دہلی میں تھا حیدر دہلوی نے کئی شاگردوں کی ناراضگی مول لے کر اسے اپنے رسالے الہام کا ایڈیٹر بنا دیا تھا جب کہ وہ اس وقت محض اٹھارہ سالہ طالب علم تھا۔ شہاب دہلوی ان احسانات کو قبول نہیں تھا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ اس کے استاد لاہور میں ہیں اور کمپری میں ہیں تو وہ خود لاہور آیا اور حیدر دہلوی کو اپنے ساتھ بہادر پور لے گیا۔

شہاب دہلوی کا خاندان لکھی وادی روایات کا امین تھا۔ ان کے والد بھی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کے دادا بھی ادیب و صحافی تھے۔ شہاب دہلوی کے نصابی بزرگ بہادر پور میں تقریباً ایک سو سال سے مقیم تھے۔ یہی کشش تھی جو شہاب کو 1947ء میں بہادر پور لے آئی۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے ماہانہ الہام کا دوبارہ اجراء کیا۔ صحافت کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ بہادر پور میں بلدیاتی انتخاب ہوئے تو ایک نشست پر مسلم لیگ گروپ کی طرف سے شہاب دہلوی کو الیکشن میں گھڑا گیا گیا اور شہاب دہلوی بلدیہ بہادر پور کے ممبر منتخب ہو گئے۔ اس فتح کے بعد شہاب دہلوی کو احساس ہوا کہ وہ سیاست کے مرد میدان نہیں۔ اس کے بعد وہ پوری طرح صحافت کی طرف مائل ہو گئے۔ وہ ادب و صحافت میں سرگرم ہو گئے مختلف جرائد و اخبارات کی نمائندگی کرتے رہے۔ وہ پریس کلب کے بانی اراکین میں شامل تھے۔ انہیں حکومت کی طرف

اپنسر کورنگ برنگے کاغذ پر لکھنے کا شوق تھا۔ اس کے پاس ہر رنگ کے کاغذ تھے۔ جن کے اس نے رنگین پیڈز بنار کھے تھے۔ اور وہ اپنی یادداشتیں رنگین کاغذوں پر تحریر کیا کرتا۔ ایک بار وہ ایک ایسا گوند بنانے کی کوشش کر رہا تھا جس سے چیزوں کو بہت مضبوطی کے ساتھ جوڑا جاسکے۔ اس کی میز پر نہ جانے کیسی کیسی اشیاء بچھلی ہوئی تھیں۔ طرح طرح کے کیمیکلز اور نہ جانے کیا کیا۔ وہ گوند بنانے کے مرحلے میں تھا۔ اس کی انگلیاں گوند سے لٹھری ہوئی تھیں۔ اس کیفیت میں اس کی انگلیاں قریب رکھے ہوئے رنگین کاغذوں سے مس ہو گئیں۔ اور ان خوبصورت رنگین کاغذات پر گوند لگ گئے۔ اسے اپنی اس غلطی پر بہت افسوس ہوا۔ اور غصہ بھی آیا۔ کیونکہ وہ ان کاغذات کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس نے جب ان کاغذات کی طرف دھیان دیا تو گوند لگے ہوئے کاغذات آسانی سے الگ بھی ہو گئے۔ پھر اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے ان رنگین کاغذات کی پرچیاں بنالیں اور ان کے کناروں پر وہی گوند لگا کر ایک دوسرے کے ساتھ چپکاتا چلا گیا۔ اور اس طرح جو ایجاد سامنے آئی وہ آپ کے سامنے ہے۔ جی ہاں اسے پوسٹ اٹ نوٹ کہتے ہیں۔ ہر اسٹیشنری کی دکان پر مل جائے گی۔ رنگین کاغذات کی بے شمار پرچیاں۔ ایک دوسرے کے ساتھ چپکی ہوئی۔

کسی کو اپنا فون نمبر یا کچھ اور لکھ کر دینا ہو تو ایک ایک پرچی الگ کرتے جائیں اور اپنا کام کرتے رہیں۔ بظاہر معمولی سی ایجاد لیکن کتنی اہم ہے۔

مرسلہ: زاہد خان، ویبہ

سے ترقی خدمت بھی ملا تھا۔ انہوں نے الہام کے علاوہ ایک ادبی مجلہ الزیر بھی شروع کیا۔

شہاب دہلوی نے اپنے استاد کی نہایت شاندار مہمان داری کی۔ ان کے اعزاز میں ایک عظیم الشان مشاعرے کا انعقاد کیا۔ اس مشاعرے میں بہاولپور اور اردگرد کے شعراء اس عظیم شاعر کو سننے کے لیے آئے۔

حیدر نے ایک ساتھ کئی غزلیں پیش کیں۔

اگر ذرا بھی شب بھر لطف خواب اٹھا
ترپ کے بستر مشرق سے آفتاب اٹھا
ذرا سی فرصت ہستی پہ سرکشی اتی
خودی کے نشے میں ڈوبا ہوا حجاب اٹھا
میں جام و بادہ یہ صحن چمن یہ ابر بہار
میں تنہا کے بیٹھ مغنی ذرا رباب اٹھا
امید دید خیال حیات، خوف مہمات
یہ سب حجاب ہیں حیدر یہ سب حجاب اٹھا

☆

نمو کے جوش میں ذوق فنا حجاب بنا
شریک بحر جو قطرہ ہوا حجاب بنا
تو آپ اپنے ہی جلوؤں میں رہ گیا گھر کر
ترا ہی عکس ترے حسن کا جواب بنا
پھڑکے تجھ سے ترا سایہ جہاں افروز
سحر کو مہر بنا شب کو ماہتاب بنا
نہ مٹ سکے گا ترا نقش لوح فطرت سے
نہ بن سکے گا نہ اب تک ترا جواب بنا

☆

اپنے گمروں پہ احباب کے مشکل سے چلا
میں جنازے کی طرح کوچہ قاتل سے چلا
کبھی رویا کبھی ہر نقشبند قدم پر تڑپا
میں تری راہ میں آنکھوں سے بھی دل سے چلا

☆

تیرے جلوؤں کو اس انداز سے مستور کیا
ہر فرشتے نے طوافِ دل رنجور کیا
اپنی مے کا تو آغاز نہ انجام کوئی
ختم اک لفظ پہ افسانہ منصور کیا
شاعروں کی طرف سے اصرار کے بعد حیدر نے چند

رباعیاں بھی سنائیں۔ یہ وہ رباعیاں تھیں جو اس کے مجموعہ رباعیات میں شامل نہیں تھیں۔

چھٹکارا غم داغ سے ہو گا کیونکر
منہ دیکھیں گے اب مرگ و لحد کا کیونکر
پیری میں سکت بھی نہیں دندان بھی نہیں
کاٹیں گے ہم اب عصر کا رشتہ کیونکر

☆

اب دن ہیں تھیش کے نہ عہد ظلی
ہر وقت ہے درپیش عذاب پیری
کافور ہوں سبزہ خط کی صورت
اللہ رے جوانی تری طوطا چشتی

☆

کیوں اتنے پس ترک وطن شاق ہیں ہم
اس مملکت پاک کے خلاف ہیں ہم
ماضی کی روایات ہیں زندہ ہم سے
تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق ہیں ہم

اس مشاعرے کی صبح ہوئی تو بہاولپور کے شعرا شہاب دہلوی کے مکان پر جمع ہوئے۔ یہاں بھی شاعری کے دور چلے۔ اٹھائے گفتگو یہ بھی اصرار ہونے لگا کہ حیدر کو اب مستقل بہاولپور میں رہنا چاہیے۔ بہاولپور میں رہیں تو کریں کیا۔ شہاب دہلوی انہیں لائے تھے۔ تو کچھ سوچ کر ہی لائے تھے۔

بہاولپور میں ان کے نام کچھ زمینیں الاٹ کر دی گئیں جن کی فصلوں سے ہونے والی آمدنی سے ان کا بہت اچھی طرح گزارہ ہو سکتا تھا۔

ڈھاکا، لاہور اور کراچی کے مقابلے میں بہاولپور ایسی جگہ نہیں تھی جہاں ان کا دل لگتا۔ چند ماہ بعد ہی وہ اکتانے لگا کراچی میں ایسے بہت سے شاعر جمع ہو گئے تھے جنہیں وہ حافظ ہونٹ دہلی میں چھوڑ کے آیا تھا۔ انہی دنوں جب ایک مشاعرے میں اس کا کراچی آنا ہوا اور چند روز قیام کا موقع ملا تو اسے یہاں کی ادبی فضا نے اپنا اسیر بنا لیا۔

اس وقت کراچی میں ادبی محافل عروج پر تھیں۔ بہت سے بزرگ اساتذہ سخن کراچی میں موجود تھے جن میں جوش ملیح آبادی، سیما اکبر آبادی، حیدر دہلوی، اسد شاہ جہاں پوری، سید آل رضا، سید ہاشم رضا، ارم کھنوی، جمیل الدین عالی، ادیب سہارن پوری اور کئی دوسرے نامور استاد شاعر شامل تھے۔

اس کے شاگردوں میں نازش حیدری، انور دہلوی، فتنہ دہلوی، فیض دہلوی، بیدل حیدری، عالم حیدری، شیدا

کھراچی، کراٹوری وغیرہ موجود تھے۔

وہ کراچی کے قیام کے دوران اس وقت کے سجان اللہ ہوٹل میں جا کر شاگردوں کے ساتھ بیٹھا تو اسے دہلی کا حافظ ہوٹل یاد آ گیا۔ اس نے تصور میں دیکھا کہ سامنے دہلی کی جامع مسجد ہے اور کچھ فاصلے پر ایڈورڈ پارک، حیدر کا ڈیرا آباد ہے۔ ادارہ حیدری اپنا کام کر رہا ہے۔ ”لہام“ کے پرچے دھڑا دھڑ شائع ہو رہے ہیں۔ وہ کراچی سے بہاولپور کی طرف روانہ ہونے لگا تو اس کا عالم ہی دوسرا تھا۔

لجأت کو بھری و جوانی کے مزار
برعکس اس آشفۃ بیانی کے مزار
کیا سوچتا ہے رنج کے اسباب و علل
ہنس بول کے دن ہستی فانی کے مزار
ہنس بول کے مزار نے سے اس کا مطلب یہی تھا کہ
جودن زندگی کے رہ گئے ہیں وہ بہاولپور میں نہیں کراچی میں
گزارے جائیں۔ کراچی میں ایک کشش اس کے لیے یہ
بھی تھی کہ اس کی بھانجی اپنے شوہر کے ساتھ کراچی میں رہ
رہی تھی اور بھی دوسرے رشتہ دار کراچی آگئے تھے۔ کراچی کا
عام ماحول بھی اردو سے قریب تھا۔

بہاول پور پہنچتے ہی اس نے مستقل طور پر کراچی
جانے کا فیصلہ کر لیا۔ دونوں بیویوں سے مشورہ کیا۔ انہوں
نے بھی رضا مندی ظاہر کر دی۔ شباب دہلوی نے بہت
کوشش کی کہ وہ اپنا فیصلہ تبدیل کر دیں لیکن وہ فیصلہ کر چکا
تھا۔ وہ آنکھوں میں قدر و منزلت کے خواب بجائے کراچی
آ گیا۔

کسی شہر میں مگھونے کے لیے آنا الگ بات ہے اور
مستقل رہنا الگ بات ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ تو رہائش کا
تھا۔ اس نے کچھ دن تو بھانجی کے گھر گزارے اور پھر مستقل
رہائش کی فکر ہوئی۔ سرچھپانے کی جگہ چاہیے تھی۔ اس سے
بھی زیادہ کسی معقول کاروبار کی حاجت تھی۔

حیدر دہلوی کی بھانجی کے شوہر احمد بخاری کا اچھا
خاص اثر سوخ تھا۔ وہ کمشنر اے ٹی نقوی سے ملے تاکہ وہ
اس سلسلے میں ان سے مدد لیں۔ ان دنوں کراچی میں اے ٹی
نقوی کاروباری پرشوں کے انچارج تھے۔ وہ کئی اہل قلم
حضرات کو پرمٹ دے رہے تھے۔ احمد بخاری ان سے ملے
اور کہا حضرت آپ نے حیدر دہلوی کو چھوڑ دیا۔ انہوں نے

ملتان پر عربوں نے پہلی صدی ہجری میں قبضہ
کیا اور غزنوی عہد تک اس پر مسلمانوں کا قبضہ برابر
رہا۔ 132ھ (749ء) تک ملتان کا تعلق خاندان
بنی امیہ سے رہا مگر اموی حکمت کی بساط اٹنے کے بعد
اس کا تعلق بنو عباس سے ہوا۔ تیسری صدی ہجری یعنی
مستقیم کے زمانے تک ملتان عباسی حکومت کے تحت
رہا۔ بعد میں ملتان کی صورت یہ رہی کہ اگر مرکز میں
خلیفہ طاقت ور ہوتا تو دور دراز کے صوبے اس کے
ماتحت رہتے۔ اگر خلیفہ کمزور ہوتا تو دور دراز علاقوں
کے عامل خود مختار ہو جاتے۔ ایسے زمانوں میں بھی
ملتان، سندھ اور منصورہ کے تحت رہا مگر تیسری صدی
ہجری کے وسط میں ملتان، سندھ سے علیحدہ ہو کر ایک
خود مختار سلطنت بن گیا جس کی وسعت پچھتم میں کرمان
تک اور دکن میں منصورہ تک تھی اس زمانے کے اعداد
و شمار کے لحاظ سے ایک لاکھ بیس گاؤں اس سلطنت کے
حدود میں تھے۔

مرسلہ: سلطان اشرف، لاڈکانہ

کہا خیام الہند حیدر دہلوی کی بات کر رہے ہو۔ بھی وہ
میرے پاس آئے ہی نہیں۔ آپ انہیں لے کر آئیں۔ احمد
بخاری نے وعدہ کر لیا کہ وہ انہیں لے کر آئیں گے۔
حیدر دہلوی کو منانے اور راضی کرنے میں کئی دن
لگے۔ وہ بہ مشکل تیار ہوا اور داماد کے ساتھ اے ٹی نقوی
سے ملاقات کے لیے چلا گیا۔

”آپ یہیں ٹھہریں، میں نقوی صاحب کو آپ کے
آنے کی اطلاع دیتا ہوں۔“

احمد بخاری نے انہیں ویننگ روم میں بٹھایا اور خود
نقوی صاحب کے کمرے میں اطلاع دینے بلکہ اجازت
لینے اندر چلے گئے۔ اجازت کے لئے کروہ واپس آئے تو حیدر
دہلوی غائب تھے۔ ادھر ادھر دیکھا کہیں نظر نہ آئے۔ وہ ان
کے مزاج سے ذائقہ تھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ حضرت کو
انتظار گوارا نہیں ہوا اور گھر چلے گئے۔
احمد بخاری گھر پہنچے تو حسب توقع حیدر صاحب گھر پر
ہی تھے۔

”آپ چلے کیوں آئے، نقوی صاحب آپ سے
واقف بھی ہیں قدر دان بھی آپ کے لیے بہت کچھ کر سکتے

تھے۔ آپ نے اچھا موقع ضائع کر دیا۔“

حیدر دہلوی نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”میں لحاظ کی وجہ سے مردنا آپ کے ساتھ چلا گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر میری غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ان کے آگے دست طلب دراز کروں۔ معاف کرنا میں یہ نہیں کر سکتا۔“

”آپ کو دوسرا طلب دراز کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے سب بات کر لی تھی۔“

”پھر مجھ میں سائل تو ہوتا۔ اپنی یہ حیثیت مجھے پسند نہیں۔ آئندہ مجھ سے نہ کہیے گا۔“

بات ختم ہو گئی لیکن ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہاتھ پھیلائے گا عادی نہیں تھا لیکن رزق حلال کمانے میں سب سے آگے تھا۔ اس نے دلی میں بھی کئی کاروبار کیے تھے اور مالی آسودگی حاصل کی۔ سب کچھ چھوڑ کر پاکستان آ گیا اور اب شہر بہ شہر گھوم رہا تھا۔ ڈھاکا کے مختصر قیام میں بھی اس نے روزگار کی داغ بیل ڈالی اور اب وہ کراچی میں تھا اور کراچی سے آگے سمندر تھا۔ اب کراچی چھوڑ کر کہیں نہیں جانا تھا۔ اسے سرچھپانے کی جگہ کا بھی بندوبست کرنا تھا اور پیٹ بھرنے کے لیے کسی ذریعے کی تلاش بھی کرنا تھا۔ اس نے چند لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا اور ایک کارخانہ قائم کیا جس میں فکٹر اور لوہے کی بالٹیاں وغیرہ بنائی جاتی تھیں۔

بہن روڈ کے قریب سبحان اللہ ہوٹل تھا جسے اس نے اپنا ڈیرہ بنایا اور شاگردوں کو لے کر بیٹھ گیا۔ وہ جب حافظ ہوٹل دہلی میں بیٹھا کرتا تھا۔ دن رات چائے کے دور چلتے تھے۔ اس نے بھی کسی کو جب میں ہاتھ نہیں ڈالنے دیا۔ مل ادا کرنا اس کی ذمہ داری تھی۔ اس وقت مالی آسودگی تھی۔ اب وہ عالم نہیں رہا تھا لیکن اب بھی اس نے دہلی کی روایت کو قائم رکھا۔ رات گئے جب اغستا تو بل اپنی جیب سے ادا کرتا کسی کو زحمت نہ دینے دیتا۔ کوئی خوش حال شاگرد کو شش بھی کرتا تو اسے روک دیتا بلکہ جھڑک دیتا۔ کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوتا کہ چائے کا مل ادا کرنے کے بعد اس کے پاس واپسی کا بس کا کرایہ بھی باقی نہ بچتا اور وہ پیدل ہی گھر کی جانب روانہ ہو جاتا۔

کارخانے کے قیام کے بعد اس نے ڈرگ روڈ کالونی (شاہ فیصل کالونی) میں دو کوارٹر لٹ کرائے۔ اس وقت یہ کالونی کسی جنگل سے کم نہیں تھی اور شہر سے اتنی دور کہ آنا جانا کسی جہاد سے کم نہ تھا۔ چند بیس چلتی تھیں۔ اسی بس میں سے کسی بس میں بیٹھ کر وہ بلا ناغہ سبحان اللہ ہوٹل پہنچتا جو

اب حیدر کا ڈیرہ بن گیا تھا۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ ڈرگ روڈ منتقل ہونے کے بعد وہ سبحان اللہ ہوٹل آنا چھوڑ دے گا لیکن غلط فہمی اس وقت دور ہو گئی جب دوسرے ہی دن وہ چھڑی تھا سے ہاتھ میں چڑی بیک لیے ہوٹل میں داخل ہوا اور پھر اس کی وسیع داری نے تقاضا کیا کہ وہ کوئی ناغہ کیے بغیر یہاں آتا رہے۔

وہ خوش تھا کہ ڈرگ کالونی جنگل ہے مگر رہنے کا ٹھکانا تو مل گیا۔ اس کی دتوں کا احساس تو اس وقت ہوا جب شدید بارش ہوئی اور برساتی نالے بھر جانے کی وجہ سے اس کا مکان سیلابی پانی کی زد میں آ گیا۔ یہ پانی اتنا اچانک آیا کہ سنبھلنے سے پہلے ہی گھر کا سامان پانی میں بہنے لگا۔ مگر والے قیمتی سامان کو بچانے کے لیے بھاگے۔ اسی وقت اس کی نظر اپنے بیٹے خالد اور بیٹی سمیت پر پڑی جنہیں پانی اپنے ساتھ بہا کر لے جا رہا تھا۔ مدد کے لیے لوگ بھی آ گئے تھے۔ وہ چیخا۔ ”سامان چھوڑ دو صرف میرے بچوں کو بچا لو۔“ لوگوں نے مدد کی اور بچوں کو بچا لیا۔

سیلاب گزرا تو ایک دن اور ایک رات کا فائدہ ہو چکا تھا۔ سارا سامان بہہ گیا تھا۔ کھانے پینے کا بندوبست بیوی کے ہاتھ کی انگوٹھیاں بچ کر کیا گیا۔

امدادی ٹیموں کی طرف سے کھانا پانا جاتا تھا لیکن اس نے سختی سے کہہ دیا تھا کہ کھانا لینے کسی بچے کو نہ بھیجنا یہ ہمارا حق نہیں۔ کھل اور کپڑے تک بانٹے گئے لیکن اس نے کوئی امداد قبول نہ کی۔

وہ گھریلو ذمہ داریوں سے کماحقہ عہدہ برآ ہوتا تھا۔ بچوں کے آرام و آسائش کا مکمل خیال رکھتا تھا۔ بچوں کے لیے اچھے اچھے کپڑے خود خرید کر لاتا۔ اگر کوئی مشاعرہ نہ ہوتا تو آٹھ نو بجے گھر پہنچ جاتا۔ روایتی شعراء کی طرح رات رات بھر گھر سے باہر نہ رہتا۔ اسے اس بات کا شدت سے احساس رہتا کہ اس کے بچے گھر پر اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس کی اسی انصاف پسندی کا تقاضا تھا کہ اپنی دونوں بیگمات کو گھر پر ایک ہی گھر میں رکھا۔

وہ صبح جلدی بیدار ہونے کا عادی تھا۔ صبح اٹھتے ہی اسے چائے کی طلب ہوتی پھر لپکا ناشتا کرتا۔ چائے کے ساتھ عموماً سادہ روٹی کھاتا پسند کرتا، بیسن کی روٹی لہسن کی چٹنی کے ساتھ نہایت شوق سے کھاتا تھا۔ سگریٹ کی بجائے بیڑی استعمال کرتا تھا۔ لباس میں پاجامہ قمیص اور شیر وانی اس کا پسندیدہ لباس تھا۔ سیاست سے دلچسپی نہیں تھی لیکن

جس کا شکار وہ دہلی میں ہو چکا تھا۔ یہ افراتفری کا دور تھا۔ ہجرت کے مصائب ابھی کم نہیں ہوئے تھے۔ لوگوں کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ اس نے لوگوں کی بے رشتی کو اپنی ناقدری سے تعبیر کیا اور ان تہنیں کا تذکرہ اشعار میں وصال دیا۔

اک گوشہ نشین راہ گزر کیا جانے
کس سمت ہیں اربابِ نظر کیا جانے
شہرتِ طلبی بے ہنری کی ہے دلیل
جلیغِ ہنر اہل ہنر کیا جانے

☆

یہ بغض بھی یہ ظلم بھی ہنگامی ہے
انجام اس آغاز کا ناکامی ہے
اس بغض سے اس ظلم سے کیا ہوتا ہے
حیدر کا رسول اور خدا حامی ہے

☆

نیکی کا کہنے یہ بدل دیتے ہیں
کئی دقت ہے تو چل دیتے ہیں
استاد کو استاد بنانا تو کجا
یہ باپ بھی ہر سال بدل دیتے ہیں

☆

حیدر ہر اہل ہوش نے غربت کی راہ لی
تو کس لیے کشاکشِ رنج و دھن میں ہے
قدر ہنر نہ حفظ مراتب نہ سحر خلق
کس کا وطن کہاں کا وطن کیا وطن میں ہے

☆

لاکھ ہر صنفِ سخن پر ہے تسلط مجھ کو
اور جدت بھی ہے ہر معرعہ ترے مجھ کو
لیکن افسوس ہے حیدر کو تمول کے بغیر
عیب ہوتا ہے یہاں عرض ہنر سے پیدا
اس بے پناہ غربت اور تنگدستی کے باوجود اس نے
غیرت و حیثیت کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ وہ چاہتا تو اب بھی اپنے
لیے بہت سی راہیں تلاش کر سکتا تھا۔ کسی بڑے دروازے پر
جا کر اپنے کمال فن کا ڈھنڈورا پیٹ سکتا تھا لیکن وہ ہمیشہ یہی
کہتا رہا۔

حیدر یہ قدم اور اٹھیں جانب دنیا
دنیا انہی قدموں کی ہے ٹھکرانی ہوئی سی
کراچی میں اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ بہادپور کی
زمینوں کی فصلوں سے حاصل ہونے والی رقم تھی۔ اس زمین

اخبار باندی سے پڑھتا تھا۔ محلے داروں سے تعلقات بہت
اچھے تھے۔ جھوٹ سے سخت نفرت تھی۔ بعض اوقات بچ
بولنے کے لیے بڑے سے بڑا نقصان برداشت کر لیتا تھا۔
اسی حق گوئی نے دہلی میں بھی اس کے دشمن پیدا
کر دیے تھے۔ کراچی میں بھی بہت سے لوگ اس کے خلاف
ہو گئے۔ اس کے خلاف لوگوں میں ریڈیو پاکستان کے
ڈائریکٹر جنرل زیڈ اے بخاری بھی تھے۔ ریڈیو کے ایک
مشاعرے میں زیڈ اے بخاری نے نہ صرف اسے غلط مقام
پر پڑھوایا بلکہ کسی مصرعے پر اشارے سے طنز بھی کیا۔ حیدر
دہلوی اس طنز پر چراغ پا ہو گیا۔ اس نے غزل اور وری
چھوڑی اور زیڈ اے بخاری کی طرف خشکی نظروں سے
دیکھنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا: جمیل الدین حالی نے
زیڈ اے بخاری کو آڑے ہاتھوں لے لیا۔

”حیدر صاحب استاد شاعر ہیں۔ ان کے ساتھ یہ
سلوک مناسب نہیں۔“

یہ مشاعرہ ریڈیو سے براہ راست نشر ہو رہا تھا لہذا
اسے بند کرنا پڑا۔ اس واقعے کی گونج کئی دن تک بھان اللہ
ہوٹل میں سنائی دیتی رہی۔
اس کے بعد وہ ریڈیو کے کسی مشاعرے میں مدعو نہیں
ہوا۔

ریڈیو کے پروگرام اس سے چھن گئے تھے۔ بخاری
صاحب کو خوش کرنے کے لیے بہت سے مشاعروں میں بھی
اسے نظر انداز کیا جانے لگا تھا لیکن بھان اللہ ہوٹل کا ڈیرا
آباد رہا۔ جہاں دن کے دو بجے سے رات گئے تک محفل جمی
رہتی۔ شاگرد اور گرد و جمع رہتے۔ ادبی بحثیں ہوتیں، اصلاح
کے دور چلنے، چائے چلنے، رات گئے سب ہوٹل سے اٹھتے۔
اپنی جیب سے وہ ٹل ادا کرتا۔ دوست رخصت ہوتے، وہ
بھی بس میں بیٹھتا اور ڈرگ روڈ اپنے بچوں کے پاس پہنچ
جاتا۔

مشل مشہور ہے مفلسی میں آتا گیلا۔ ایک روز بس کے
حادثے میں اس کا پیٹ بیک گم ہو گیا جس میں بہادپور کی
زمینوں کے علاوہ کارخانے کی شراکت کے کاغذات بھی
تھے۔

کارخانہ اور زمینیں بھی چلی گئیں۔
وہ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکا۔ مالی آسودگی
نے منہ موزا تو دوست اور شاگرد بھی نظریں چرانے لگے۔
اب اسے اپنے وطن میں بھی اسی صورت حال کا سامنا تھا

کے کاغذات بھی گم ہو گئے تھے۔

ایک بار وہ بہاولپور گیا تاکہ فصلوں کی رقم لائے۔ وہاں ٹھہرنا بھی پڑا۔ خوب مشاعرے ہوئے دعوتوں کے سلسلے چلتے رہے۔ دوست دشمن سب شریک ہوئے۔

خوشی خوشی واپس ہوئے۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھا کراچی نہیں پہنچا تھا کہ گلے میں تکلیف شروع ہوئی۔ اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے گھلا پکڑ لیا۔ اس نے بھی سمجھا ہوگا کہ کھانے میں کوئی ایسی چیز آگئی ہوگی جس نے گلے میں تکلیف پیدا کر دی۔ مگر تک پہنچے پہنچے تکلیف میں کی آجائے گی لیکن کراچی پہنچنے کے بعد بھی تکلیف میں کی نہیں آئی۔ اس نے اسے معمولی تکلیف سمجھا کسی ڈاکٹر کو نہیں دکھایا۔ مگر پلو ٹوٹنے کا رہا۔ کبھی تکلیف میں کی آجائی کبھی پھر بڑھ جاتی۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا پھر اس تکلیف نے ایک نئی صورت اختیار کر لی۔ اس کی آواز بیٹھ گئی۔ اس کی آواز ہی تو اس کا تھیارتھی۔ اس کی آواز طراوے دار تھی۔ اس آواز سے وہ مشاعرہ لوٹ لیا کرتا تھا۔ اب وہی آواز خاموش تھی۔ بڑی مشکل سے بول پاتا تھا۔ البتہ تو یہ ہوا کہ جہاں اس کے چاہنے والوں کے لیے یہ صورت حال باعث تشویش تھی وہیں اس کے مشاعرہ باز حریف خوش تھے کہ اس کی آواز دب گئی ہے۔ اب مشاعروں میں ان کی جیت ہوا کرے گی حیدر دہلوی کی نہیں۔ اس نے اس صورت حال کو بھی اپنے شعروں میں ڈھال دیا۔

بیٹھی ہوئی آواز کو میری ناگاہ
سننے ہیں تو کہتے ہیں ماشاء اللہ
اس حادثے پر خوش ہیں بزم خود لوگ
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

☆

افسوس زباں نطق سے محروم ہوئی
بے گانہ ہر معنی و مفہوم ہوئی
حساد کا پھٹتا تھا کلیجہ جس سے
خوش ہیں کہ وہ آواز ہی معدوم ہوئی

☆

جب مجمع احباب میں مل بیٹھا ہے
حیدر نہ فردہ نہ نجل بیٹھا ہے
ماپوس نہیں ہے وہ گرفتہ آواز
آواز ہی بیٹھی ہے کہ دل بیٹھا ہے
اس نے اپنی تکلیف کی وجہ سے مشاعروں میں شرکت

چھوڑ دی تھی لیکن شاعری تو نہیں چھوڑ دی تھی۔

جذبات ہنر پر جو جوانی تھی وہ ہے
مرقوم جو اعجاز بیانی تھی وہ ہے
اظہار کمالات زبانی نہ سہی
پہلے جو طبیعت میں روانی تھی وہ ہے

اس کی دونوں بیماریات کا کہنا یہ تھا کہ وہ جب بہاولپور گئے تھے تو اسے کسی نے کھانے میں سیندر کھلایا تھا جس سے اس کی آواز بیٹھ گئی۔ کسی ڈاکٹر نے اس اندیشے کا اظہار نہیں کیا۔ ممکن ہے سیندر والی بات سچ ہو بہر حال حیدر نے اس تکلیف کو معمولی سمجھا اور یوں تقریباً سال بھر گزر گیا۔

گلے میں شدید تکلیف کے بعد اس کی بھانجی اسے اپنے کمرے لے گئی۔ ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ ڈاکٹر نے آپریشن تجویز کیا۔ وہ اپنے داماد احمد بخاری اور دوسرے گھروالوں کے ساتھ مقررہ وقت پر رسول اسپتال پہنچ گیا جہاں اس کا آپریشن تھا اور صبح دس بجے کا وقت دیا گیا تھا۔ اس کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ جب تک اس کی باری نہیں آگئی بیٹھا اخبار پڑھتا رہا۔ کچھ دیر بعد نپا ڈڈو وغیرہ آگئے اور اسے آپریشن ٹیبلر پہنچا دیا گیا۔ آپریشن شروع ہوا۔ آپریشن کے دوران چند منٹ کے لیے ڈاکٹر آپریشن کے دوران کسی اور مریض کی طرف متوجہ ہوا۔ حیدر کو چونک آگئی اور اس کا دم نکل گیا۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ آپریشن کے دوران اسے ہارٹ ایٹک ہوا تھا۔

10 نومبر 1958ء کو دس بج کر دس منٹ پر رسول اسپتال میں وہ خالقِ شقی سے جاملے۔ وفات کے وقت اس کی عمر صرف 52 سال تھی۔

اس کی ناگہانی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اسی روز ظہر کے بعد اسے سوسائٹی کے قبرستان میں دفن دیا گیا اگلے روز تمام اخبارات میں اس کی وفات کی خبریں شہر سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئیں۔

”خیام الہند حضرت حیدر دہلوی وفات پا گئے۔“

افسوس زباں نطق سے محروم ہوئی
بے گانہ ہر معنی و مفہوم ہوئی
حساد کا پھٹتا تھا کلیجہ جس سے
خوش ہیں کہ وہ آواز ہی معدوم ہوئی

ماخذات

حیدر دہلوی، ڈاکٹر اختر شمار
عنملیب شادانی، نظیر صدیقی



روایت شکن

زویا اعجاز

ماضی نے گر سنوارا نہیں تو کیا ہوا، اگر عزم و حوصلہ ہو تو خود بھی وقت کو سنوارا جاسکتا ہے۔ اس کی زندہ مثال سلیمہ بیگم ہے۔ یہ سلیمہ بیگم ہے کون اس بارے میں جان کر آپ بھی حیران رہ جائیں گے کہ اس نے ایسا کیا کیا جس کی وجہ سے بلتستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں کی رہنے والی کو پوری دنیا نے قابل تقلید مان لیا۔ اعلیٰ اعزاز سے نوازا۔ ایسی ہمت اور ایسا حوصلہ اللہ تعالیٰ پاکستان کی ہر بیٹی کو بخشے۔

برف پوش پہاڑوں کے دامن میں رہ کر بھی اس نے شہرت کی بلندیوں کو چھویا

فطرت آپ رواں ہے۔ اس کی روانی زندگی میں تحریک، تسلسل اور بقاء کی علامت ہے لیکن اگر یہی فطرت روایات، جمود اور ٹھہراؤ کا شکار ہو جائے تو کسی جوہر سے کم ثابت نہیں ہوتی۔

انسانی فطرت کو پروان چڑھانے اور اوج تک پہنچانے میں والدین کے علاوہ اساتذہ اہم ترین کردار ادا کرتے ہیں۔ انسانیت کے لیے میجا اور نسل نو کے لیے شخصیت ساز عمارت گر کی حیثیت رکھنے والے یہ افراد ازل ہی

نیا اپنے خواب فراموش کر کے روایات کی پیروی میں سر تسلیم خم کر دے۔ علاقہ میں لڑکیوں کی ثانوی تعلیم..... کا کوئی رواج نہ تھا، کالج میں داخلہ تو چھ مہینے دارو۔ والد پر بھی معاشی اور سماجی دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

سیلہ کے خلوص نیت اور لگن کی بدولت قدرت بھی اس پر بے حد مہربان تھی۔ اس کے والد پدرانہ شفقت سے مطلوب ہو کر اپنی برادری کی روایات کے سامنے سینہ سپر ہو گئے اور اسے گلگت میں انٹر کالج دیکھنے میں پڑھنے کی اجازت دے دی۔ اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے سیلہ نے بے انتہا کٹھنائیوں کا سامنا کیا۔ اسے کالج پہنچنے کے لیے روزانہ دو بسوں میں دو گھنٹے سفر کرنا پڑا لیکن تعلیمی جنون نے اس کے نازک وجود میں اتنی قوت پیدا کر دی تھی۔ ہر مشکل و رکاوٹ اس کے ارادے پر مزید میز کرتے۔

سائنسی مضامین میں انٹر کے بعد سیلہ نے اپنی ایک اور دیرینہ خواہش کی تکمیل کے لیے کمر کسلی۔

اسے بخوبی علم تھا کہ برادری کی روایات اور معاشی دباؤ سے نبرد آزما ہونا ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں ہے۔ اپنے والد کی محبت اور اساتذہ کی محنت کا قرض چکانے کا وقت آپکا تھا۔ اس نے اپنے ہی اسکول میں لڑکیوں کو نوئیں، دسویں جماعت کے سائنس مضامین پڑھانے کا آغاز کر دیا۔

آٹھ ماہ بعد ان طالبات کا امتحانی نتیجہ اس کی توقعات سے بڑھ کر ثابت ہوا۔ اس کی لگن بارگاہ ایزدی میں قبولیت کا شرف حاصل کر چکی تھی۔ راہیں خود بخود آسان ہونے لگی تھیں۔ اسی دوران محکمہ تعلیم کی جانب سے 'خواتین اساتذہ' کے لیے کچھ آسامیوں کا اعلان کیا گیا۔ سیلہ کے لیے یہ موقع کسی من و سلوکی سے کم نہ تھا۔ اس نے محکمہ جاتی ٹیسٹ پاس کرنے کے بعد انٹرویو میں بھی کامیابی حاصل کر لی۔

وقت کے دھارے میں تبدیلی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اوشی خٹا اس کے لیے 1992ء ایک تاریخی سال ثابت ہوا اور سیلہ اس گاؤں میں سرکاری معلمہ تعینات ہو گئی۔ اسی اسکول کے حالات بھی انتہائی دلگروں تھے۔ تین کمروں پر مشتمل عمارت میں صرف ششم جماعت تک طالبات موجود تھیں۔ ہر کمرے میں دو جماعتیں بٹھائی جاتیں۔ اساتذہ کا یہ عالم تھا کہ سیلہ سے قبل وہاں دو خواتین تھیں جن کی تعلیمی قابلیت 'مڈل' تھی۔ اسکول میں فرنیچر کا تصور ہی ناپید تھا۔ طالبات کونگی فرش یا گھاس پر بٹھا کر پڑھایا جاتا۔

سیلہ ان حالات پر بے حد افسردہ رہتی تھی لیکن اکیلا چلتا

سے معاشرتی نا قدری اور 17 سال کا شکار رہتے ہیں۔ جبر مسلسل کی بدولت آخر یہ سب اس کا اصل مقام فراموش کر کے روایت پرستی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور پھر معاشرہ تنزلی کے عبرتناک سفر کی جانب گامزن ہو جاتا ہے۔ اقدار کی چمک ماند پڑنے لگتی ہے اور منتہی کے معمار ملک و قوم کے لیے بوجھ بننے لگتے ہیں۔

لیکن قدرت کے خود کار منصفانہ نظام کے تحت کچھ روایت شکن ایسے بھی ہوتے ہیں جو تنگ آمد بچک آمد کے مصداق تین تہا اس روایت پرستی کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ ان کی جدوجہد ذاتی سطح سے شروع ہو کر عالمی پیمانے پر ایک مثال بن جاتی ہے۔ ان چندہ افراد کی کاوشوں کو سراہنے اور مزید وسائل کی فراہمی کے لیے کچھ دود مند اور با اختیار افراد نے 'گلوبل ٹیچرز پرائز' کا اجراء کر رکھا ہے جس میں فاتح معلم کو ایک ملین ڈالرز کی رقم متوازی اقساط کی صورت میں دس سال تک فراہم کی جاتی ہے۔ شعبہ تدریس میں 'گلوبل پرائز' کی حیثیت رکھنے والے اس انعامی سلسلہ میں فتح ہر معلم کا خواب ہے۔

رواں سال بھی دنیا کے ہر کونے سے چالیس معلمین کے انتخاب کے بعد دس بہترین افراد کو فائنل مقابلہ کے لیے نامزد کیا گیا اور یہ دسویں اساتذہ ہمت، لگن، جدوجہد اور روایت شکنی میں اپنی مثال آپ ہیں۔

ایسی ہی ایک شخصیت کا نام سیلہ بیگم ہے۔ سیلہ بیگم کا تعلق گلگت بلتستان کے ایک دور دراز شہر شری گاؤں اوشی خٹا سے ہے۔

اوشی خٹا اس میں بمشکل گیارہ سو گھر انے آباد ہیں جو بے حد روایت پسند ہیں۔ پہاڑوں کی اس بیٹی کے لیے زندگی کبھی بھی آہل نہیں رہی۔ اسے تعلیمی زبور سے آراستہ ہونے کا بے حد شوق تھا لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اس کی برادری میں تعلیم نسواں کی کوئی روایت ہی نہ تھی۔ لڑکیوں کی زندگی بنیادی دینی تعلیم، گھروں کی شادی اور پھر بچوں کی پرورش کے دائرے میں مقید تھی۔

گاؤں میں لڑکیوں کا واحد پرائمری اسکول محض دو کمروں پر مشتمل تھا۔ اس نجی اسکول میں صرف ایک معلمہ تھی۔ پرائمری کے بعد ثانوی تعلیم اس نے ہنزہ میں 'آغا خان اکیڈمی' سے حاصل کی۔ اس کے جنون کا سفر مشکل سے مشکل تر ہونے لگا۔ اس کے سامنے اب صرف دو ہی راستے تھے۔ اعلیٰ ثانوی تعلیم کے لیے گلگت یا کراچی اور شہر کے کالج میں داخلہ لے

بھاڑ پھوڑ تا بھی تو کیسے؟

تاجر یہ کاری و ساس کی شدید کی اور مشکلات سے زور آزمائی کرتے ڈیڑھ سال کا عرصہ بیت گیا اور پھر بالآخر تبدیلی کی ایک خوشگوار لہر ڈولڈ پنک کی صورت میں در آئی۔ اس نے تمام تر صورت حال اس 'دفد' کے سامنے بیان کیں۔ نہایت سنجیدگی اور عرق ریزی سے ان معاملات کا جائزہ لینے کے بعد وفد کے اراکین نے اسے 'اسکول مینجمنٹ کمیٹی' (SMC) کے قیام کی تجویز دی تاکہ انتظامی معاملات سے نمٹنے کے لیے اعانت میسر آ سکے۔

سلیسہ نے اپنے گاؤں کے نمبردار سے رابطہ کیا اور ایک صبر آزما مدلل گفتگو کے مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد کمیٹی کا قیام عمل میں آگیا۔ ابتدائی طور پر اس کمیٹی میں چھ افراد شامل تھے۔

انتظامی مشکلات کے حل کی راہیں متعین ہوئیں تو اسے اپنی تا تجریہ کاری اور تعلیمی قابلیت میں کمی کا احساس ستانے لگا۔ اعلیٰ تعلیم اور وسعت النظری کے بغیر وہ اپنے جنون کا یہ سفر جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے محکمہ تعلیم سے رابطہ کیا اور تعلیمی سلسلہ کے از سر نو آغاز کی درخواست پیش کر دی۔ محکمہ بھی اس کی لگن کا دوش اور خلوص کا قائل ہو چکا تھا اس لیے سلیسہ کو اسلام آباد منتقل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔

اسلام آباد میں بہترین تعلیمی اداروں سے بی ایس بی اور بی ایڈ کی ڈگری لیے ساڑھے تین سال بعد وہ ایک نیا عزم اور ہمت سینے اپنے 'اصل' کی جانب لوٹ آئی۔ سلیسہ اوشی خٹا اس کی وہ پہلی لڑکی تھی جو شہری تعلیمی اداروں سے مستفید ہوئی۔ اس کے لیے اپنی علاقائی اقدار اب بھی مسئلہ تھیں۔ مقامی لوگوں کی عزت و احترام میں بھی وہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی۔ نتیجتاً اس کے شخصی وقار میں اضافہ ہونے لگا۔ مقامی افراد کی نظر میں وہ بہت بلند مقام حاصل کر چکی تھی اور اسی تناسب سے ذمہ داریوں کا بار بھی بڑھنے لگا۔

گاؤں میں واپسی کے بعد اس نے میٹرک جماعت کا باقاعدہ اجراء کیا اور رضا کار اساتذہ کی بھرتی کا آغاز بھی کر دیا۔ اوشی خٹا اس میں وہ اب کسی سلیسہ کو دوسرے شہروں میں تعلیم حاصل کرنے کی اضافی مشقت سے جنگ آزما ہوتے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کا مطمح نظر اپنے علاقہ میں تعلیم نساں کا فروغ تھا۔ مقامی روایات کے مطابق لڑکیوں کو جماعت پنجم تک تعلیم دلوانے کے بعد ان کی شادی کر دی

قرآن الحکیم کی 2 آیت

کاتر جمہ اشعار میں

قرآن الحکیم کی سورۃ الف 61 کی آیت 9+8 کا ترجمہ مولانا نظیر علی خان نے اس خوب صورت شعر میں کیا ہے۔

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھوکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

قرآن کریم کی سورۃ الانفال 8 کی آیت 53 پارہ 9+10 کا ترجمہ علامہ اقبال نے اس خوب صورت شعر میں کیا ہے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ جوش کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا
مجی رحمن۔ یو ایس اے

جاتی۔ سلیسہ اس روایت میں تبدیلی کی خواہاں تھی۔ وہ اسکول میں بطور ہیڈ ٹیچر سائنسی مضامین کی تدریس کے ساتھ اس تبدیلی کے لیے شب و روز محنت میں جت گئی۔

سلیسہ نے اپنی طالبات کی والدہ کے ساتھ ہفتہ وار اور ماہانہ خصوصی ملاقات کا سلسلہ شروع کیا۔ ان خواتین کو قائل کرنا کسی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ علاقہ کے رہائشی سماجی اور معاشی دباؤ میں بے طرح پس رہے تھے۔ معاشی پسماندگی کا یہ عالم تھا کہ اسکول فیس کی مد میں سات آٹھ روپے کا انتظام بھی بے حد کٹھن تھا۔ اس نے وسائل مد نظر رکھتے ہوئے مسائل کا منطقی حل تلاش کر لیا۔

اس کی تیار دیکر کے مطابق مقامی خواتین نے سبزیوں کی کاشت، مرغیوں کی خریداری اور سلاخی کڑھائی کا آغاز کیا۔ دستکاری کی اشیاء بڑے شہروں میں بیس ڈیڑھ ہزار روپے کے نرخ پر فروخت ہونے لگیں۔ معاشی حالات میں بہتری آتے ہی طرز فکر میں بھی واضح مثبت تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔

معاشی استحکام کے بعد سلیسہ 'اسکول مینجمنٹ کمیٹی' میں تبدیلی کی جانب متوجہ ہوئی۔ اسے کمیٹی میں خواتین ارکان کی شمولیت درکار تھی لیکن وہ اس تلخ حقیقت سے بھی لاعلم نہیں تھی کہ اوشی خٹا اس کے روایتی نظریات اس معاملہ میں بہت کڑ ہیں۔ ان نظریات کے مطابق عورت ذات میں قوت ارادی کا عنصر مفقود ہوتا ہے۔ وہ کوئی بھی فیصلہ لینے کی اہل نہیں ہوتیں۔ اس صورت حال میں علاقہ کے لوگوں کو قائل کرنا ایک

لڑکیوں میں چند ایک نے نرسنگ کا شعبہ اختیار کیا تو نصف درجن نے اسی اسکول میں تدریس کا آغاز کر دیا۔ کچھ طالبات قانونی شعبہ سے وابستہ ہو گئیں۔ ان کے والدین کے سماجی و معاشی رتبہ بھی اسی لحاظ پر برتری پیدا ہوئی۔

غربت اور پس ماندگی اب بھی کسی عفریت کی طرح مقامی افراد کے لیے لاخجل مسئلہ تھی۔ سلیہ نے باہمی مشاورت سے ایک خصوصی گروہ تشکیل دیا جو اپنی آمدن کا چھوٹا سا حصہ غرب لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مختص کر دیتا۔ انہیں یونیفارم، کتاہوں اور سالانہ فیس کے اخراجات میں اعانت میسر آگئی۔ اس گروہ کی پُر خلوص کوششوں سے 1500 لڑکیوں کے خوابوں کی تئیں کو ایک نئی زندگی مل گئی۔ مستحق طالبات کی عزت نفس کا احترام ان کی اولین ترجیح تھی۔ انہیں مطلوبہ سامان بھی کسی ہم جماعت کے سامنے نہیں دیا جاتا تھا بلکہ علیحدگی میں ان کے والدین کے سپرد کیا جاتا۔

اوشی خٹا اس کے اس اسکول میں سائنس لیب کی عدم موجودگی بھی بے حد دشواری کا سبب تھی۔ سائنسی مضامین کے عملی امتحانات کی تیاری ان طالبات کے لیے ہمیشہ دوسر ثابت ہوتی جس میں رتی بھر کی بیشی بھی براہ راست ان کے سالانہ بورڈ امتحانات پر اثر انداز ہوا کرتی تھی۔ سلیہ نے اسکول ٹینمنٹ کمیٹی کے علاوہ علاقہ میں موجود طلبہ کے اسکول پرنسپل سے درخواست کی کہ انہیں ہر ماہ صرف ایک ہفتہ طالبات کے عملی امتحانات کے لیے لیب مستعار دے دی جائے۔

سلیہ کی پیشہ وارانہ زندگی میں اگر ایک جانب مسائل کے انبار تھے تو دوسری جانب دست نہیں سے اسے ایسی آسانیاں بھی میسر آرہی تھیں جن کا تصور ہی کچھ عرصہ پہلے ایک ناممکن امر لگتا۔ علاقہ کی وہ طالبات، جن کے لیے کمتر معاشی حیثیت اور برادری کے دباؤ کی وجہ سے اسکول میں پڑھنا ایک ”گناہ عظیم“ تھا اب اپنے خاندان کی مکمل رضامندی سے اس کی عملی معاون ثابت ہونے لگیں۔ اسی دوران دو سابقہ طالبات اسکول میں سائنسی مضامین کی تدریس کرنے لگیں۔ ان کے سابقہ تعلیمی ریکارڈز ذہانت اور جمیدگی کو مد نظر رکھتے ہوئے سلیہ نے حتی الامکان انہیں اپنی پیشہ وارانہ صلاحیتیں منتقل کر دیں تاکہ اس کی غیر موجودگی میں اسکول کی تدریسی سرگرمیوں میں کوئی رکاوٹ یا کمی نہ آئے۔

سلیہ بینکم کی انتظامی صلاحیتیں اور لگن اب کسی سے بھی پوشیدہ نہ تھیں۔ اعلیٰ تعلیمی ادارے اس کی ذاتی علمی قابلیت میں مزید اضافہ کے خواہاں تھے۔ 2002ء میں اسے آغا خان

ناممکن امر تھا۔ سلیہ نے کمیٹی ارکان کے ساتھ ان گنت باضابطہ ملاقاتیں کیں اور بالآخر انہیں کم از کم چار خواتین کی شمولیت کے لیے راضی کر لیا۔

بظاہر ناممکن نظر آنے والے مسائل کے احسن ترین حل نے اسے خاطر خواہ اعتماد بخشا اور وہ نئی لگن سے دیگر امور میں تبدیلی کے لیے کوشاں ہو گئی۔ اسکول کے اندرونی معاملات میں بھی بہت پیچیدگیاں تھیں۔ والدین بچپوں کو پڑھائی کے لیے زائد وقت دینے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ ہی نہ ہوتے۔ طالبات اپنے گھروں میں اسکول کی جانب سے تفویض کردہ کام مکمل کرنے سے قاصر تھیں۔ تعلیم سے بے بہرہ والدین ماہانہ اور ہفتہ وار میٹنگ میں ایک ہی بات دہرایا کرتے۔ ”ہم اپنی بچیوں کو اسکول بھیج دیتے ہیں۔ اب یہ اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ انہیں سب کچھ سکھا پڑھا کر بھیجا کریں۔ اس لیے کہ بچیوں کو گھر داری کے علاوہ کھیتوں میں بھی والدین کا ہاتھ بٹانا ہوتا ہے۔“

سلیہ نے بے پناہ مزاحمت اور ابتدائی ناکامی کے بعد والدین کو قائل کیا کہ طالبات کو گھروں میں اسباق کی دہرائی کے لیے دو تین گھنٹوں کی فراہمی ان کی ذمہ داری ہے جس سے وہ ہرگز کنارہ کش نہیں ہو سکتے۔ تعلیمی عمل مختص چھ گھنٹوں پر محیط نہیں ہوتا بلکہ یہ ہمہ وقت جاری رہتا ہے۔ والدین کے ساتھ بے شمار نشستوں اور بحث و مباحثہ نے اس مسئلہ میں جزوی تبدیلی پیدا کر دی تاہم یہ سوچ اور نظریہ آج بھی کسی نہ کسی صورت اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔

پیشہ وارانہ قابلیت اور لگن میں وہ اپنی مثال آپ تھی۔ طالبات کو ہلکے ہلکے اعزاز میں تدریس نے اسے بے حد مقبول بنا دیا۔ اس کی محنت اور سنجیدگی کے باعث اسکول میں میٹرک جماعت کے حالیہ آغاز کے باوجود تین سال تک سالانہ نتیجہ کی شرح ’نوے فیصد‘ سے بھی زائد رہی۔ ہرگز رتا سال ادارہ میں بچیوں کی تعداد میں اضافہ کرنے لگا۔ اس کی مثبت تعمیری محنت سے برادری کا اعتماد بھی راسخ تر ہوا۔

سلیہ نے پہلی بار اپنے علاقہ میں والدین اور اساتذہ کے باہمی تعامل کا باقاعدہ اجراء کیا۔ ان اقدام سے والدین کی دلچسپی بڑھنے لگی اور برادری کے وہ اساتذہ بھی اس کے ہم قدم بننے کے لیے راضی ہو گئے جو قبل ازیں سطح پر تنہا چراغ در چراغ جلانے کا بیڑہ اٹھاتے ہوئے تھے۔

اس کی انتھک کوششوں کی بدولت مڈل جماعت کے بعد تعلیمی شرح میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ میٹرک پاس

پاکینہ

شیریں حیدر اور رفعت سراج کے قلم کے جوہر..... قسط وار ناول کی صورت

سیما رضا ردا کا خوب صورت مٹی ناول..... ہم کو عبث بدنام کیا کا منطقی انجام.....

رفاقت جاوید نے کھلائے محبت کے رنگ..... فصل محبت میں.....

بچوں اور ان کی پرورش کے حوالے سے

ماؤں کی ذمے داریاں شائستہ زریں

کے تحقیقی سروے میں.....

اختر شجاعت اور ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے ایمان افروز مضامین.....

رائزنگ کی کہکشاں..... رخ چوہدری کے شوخ قلم سے احوالِ تقریب

سمیرا یونس ہارون کا پرلطف مکمل ناول..... کوئی تعویذ ہو ردِ بلا کا

دردانہ نوشین خان کی حیرت انگیز تحریر..... خواب گزیدہ.....

شہناز وسیم، حبابخاری اور نصرت یوسف کی مٹو کاوشیں.....

(اس کے علاوہ)

آم ایمان، شگفتہ شاہ، ہاجرہ ریحان، سیما بنت عاصم، شمیم فضل
خالق، ناہید چوہدری، ریحانہ آفتاب و دیگر مشاق تحریر نگاروں کی دکش کاوشیں.....

اس کے ساتھ ساتھ معلوماتی تراشے، متاثر کن مستقل سلسلے اور دل پر پڑے شاعری اور بہت کچھ آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر.....

یونیورسٹی فار ایجوکیشنل ڈویلپمنٹ (AKUED) نے MS ڈگری کی تکمیل کے لیے وظیفہ فراہم کیا۔ اس تعلیمی سفر میں اسے تکنیکی امور میں طاق کیا گیا۔ روایتی طریقوں سے قطع نظر تعلیمی عمل کے دوران طلبہ و طالبات کی دلچسپی برقرار رکھنے کے 'مگر' کیونٹی کی شمولیت کے جدید سائنسی اور منطقی طریقہ کار کے استعمال نے اس کی صلاحیتوں میں کئی گنا نکھار پیدا کر دیا۔ اپنے دیگر ہم جماعت اساتذہ پر سلیسہ کی ذہنی برتری واضح تر نظر آتی رہی تھی اس لیے یونیورسٹی انتظامیہ نے محکمہ تعلیم سے خصوصی اجازت نامہ حاصل کرنے کے بعد اسے گلگت بلتستان کے شبلی علاقوں میں 'آغا خان یونیورسٹی پروفیشنل ڈویلپمنٹ سینٹر' کے لیے متعین کر دیا۔ اس ترقیاتی منصوبہ کے تحت سلیسہ نے گلگت بلتستان کے چھ اضلاع میں سرکاری اسکولوں کے اساتذہ کی تربیت کا آغاز کیا۔ انہیں معیاری تعلیم فراہم کرنے کے تکنیکی انداز برادری کی شمولیت کے عملی طریقہ کار سے آگاہی، طلبہ کی سماجی و اخلاقی تعلیم کے علاوہ معلمین کی ذاتی بہبود پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی۔

یہ تربیتی و فلاحی منصوبہ پانچ سال جاری رہا اور اس دوران سلیسہ نے گلگت، ہنزہ، استور سمیت کئی اضلاع میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے ہوئے تقریباً سات ہزار سے زائد اساتذہ کی پیشہ وارانہ تربیت کی۔ اس کا ذہن منفرد تحقیقی صلاحیتوں سے مالا مال تھا۔ وہ مسائل ہی کی مدد سے منطقی وسائل تخلیق کرنے میں طاق تھی۔ گلگت بلتستان کا قدرتی حسن عوامی بے پروائی، کم علمی اور جہالت کی بدولت کوڑا کرکٹ کا ماحولیاتی آلودگی اور مختلف بیماریوں سے کہنا رہا تھا۔ سلیسہ نے بے حد غور و خوض کے بعد اس کوڑا کرکٹ کو بطور کھانا استعمال کرنے کا تاریخی قدم اٹھایا۔ علاقہ کے کسانوں کو یوریا اور اس قسم کی دیگر کھادوں کے استعمال سے پیدا ہونے والے مسائل سے آگاہی فراہم کی۔ ان روایتی طریقوں کا استعمال نسل در نسل محیط تھا لہذا انہیں نامیاتی کھاد کے استعمال پر قائل کرنا بلاشبہ ایک محض امر ہی نہیں، لیکن کامیابی ایک بار پھر سلیسہ کا مقدر ٹھہری۔

آغا خان یونیورسٹی کے معاہدہ کی مدت مکمل ہوتے ہی اسے 'قراقرم یونیورسٹی' نے دو سال کے لیے اپنے ساتھ تھیں کر لیا۔ اس کی قابلیت و صلاحیتیں اس بار بھی دیگر سماجی اساتذہ سے بہت ارفع ثابت ہوئیں۔

سلیسہ کی پیشہ وارانہ اہلیت کی گونج اب بین الاقوامی سطح پر بھی پہنچ چکی تھی۔ 2010 میں آغا خان پروفیشنل ڈویلپمنٹ نے

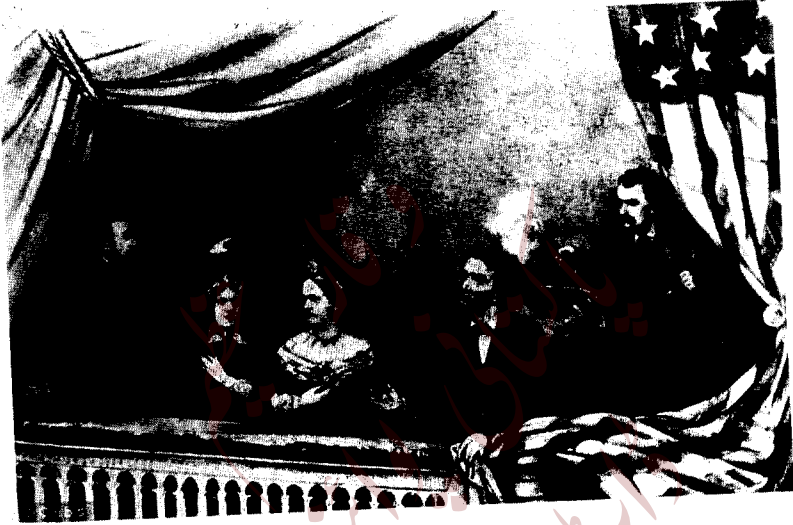
آسٹریلیو تعلیمی فنڈ کے اشتراک سے علاقائی اساتذہ کی تربیت اور تعلیمی معیار میں بہتری کے لیے ایک نئے معاہدہ کا آغاز کیا۔ اس معاہدہ میں سلیسہ کی شرکت بھی ناگزیر تھی۔ بعد ازاں اسے 'یو۔ ایس ایڈ' کے ساتھ کام کرنے کے مواقع میسر آئے۔

سلیسہ نے اس صورت حال سے بھرپور استفادہ کیا۔ ایڈوائس تعلیمی ڈیپلوما میں تدریس کے بعد اس نے مذکورہ ڈیپلوما کے لیے ایک کتابچہ بھی تصنیف کیا جس کا مطبع نظر اساتذہ میں غیر روایتی طریقہ تعلیم کی تحریک پیدا کرنے کے علاوہ ان کی ذاتی صلاحیتوں میں نکھار کی افزائش تھا۔ گلگت بلتستان انتظامیہ اور آسٹریلیین وفد کے بعد یو۔ ایس ایڈ بھی سلیسہ کے بلند ذہنی معیار کی قائل ہو گئی۔

2014 میں جرمن تعلیمی انتظامیہ نے گلگت بلتستان میں GIZ-GFA پروگرام کے تحت اساتذہ کی پیشہ وارانہ تربیت کا آغاز کیا تو ان کا پہلا انتخاب بھی سلیسہ ہی تھی۔ جرمن انتظامیہ اس کی صلاحیتوں سے اس قدر متاثر ہوئی کہ انہوں نے سیکریٹری محکمہ تعلیم سے سلیسہ کو سرکاری نوکری سے عہدہ برآ کرنے کی درخواست کر دی۔ جرمن حکومت اسے پاکستان میں اپنے قومی پروگرام کے لیے کوآرڈینیٹر متعین کرنا چاہتی تھی۔ سیکریٹری کی حوصلہ افزائی، شوہر سے مشاورت اور بے حد سوچ و بچار کے بعد وہ اسلام آباد منتقل ہو گئی۔ اگلے ڈیڑھ سال میں اس نے پاکستان کے طول و عرض میں 18,500 اساتذہ کو اپنے تجربات سے مستفید کیا۔

کہادت مشہور ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا عمل دخل ہوتا ہے لیکن سلیسہ کی کامیابی کے اس سفر میں دو مردوں، والد اور شوہر نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اوشی جڈا اس کے روایتی کٹر ماحول میں روایت شکنی سے خوشگوار تہذیبی لانے والی یہ خاتون اس وقت اسلام آباد میں ڈاکٹریٹ کی تعلیم حاصل کر رہی ہے قومی سطح پر اسے مختلف ایوارڈز دیئے گئے ہیں۔ سلیسہ بیگم پہلی پاکستانی نژاد خاتون ہیں جسے گولڈن ٹیچرز پرائز کے تحت دس بہترین عالمی اساتذہ میں شامل فہرست کیا گیا۔ (گذشتہ سال پاکستان کی جانب سے عقیدہ آصفی بھی نامزد تھی تاہم عقیدہ افغان نژاد ہے۔)

گولڈن ٹیچرز پرائز کے حصول میں سلیسہ بیگم کو کامیابی میسر نہیں ہوئی لیکن اس کی جدوجہد اظہر من الشمس ہے۔ گلگت بلتستان میں اس نے جو تعلیمی انقلاب برپا کیا اسے باقیات بھلا یا نہیں جاسکے گا۔



بھیاںک سازش

سید احتشام

امریکا کی تاریخ میں اس سے بڑی کسی اور سازش کا ذکر نہیں ملتا۔ بلاشبہ وہ سازش ایسی تھی جس نے امریکا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس سازش کے کئی کردار سامنے آئے جن کو سزا بھی سنائی گئی لیکن ان کا سرغنہ کون تھا یہ بات آج بھی پردہ راز میں ہے۔

ملک کے صدر اور کئی اہم افراد کے قتل میں کون کون شامل تھا؟

ہیری فورڈ نے اس چھپیں سالہ نہایت حسین و جمیل خوش پوش نوجوان کو یہ کہہ کر خیر مقدم کیا۔ ”یہ رہا واشنگٹن کا حسین ترین شخص۔“

پھر اس نے اپنے دفتر میں بوتھ کے پرستاروں کی

وہ 14 اپریل 1865 گڈ فرائی ڈے کاغذ ہی دن تھا۔ واشنگٹن ڈی سی میں دوپہر سے ذرا ہی پہلے آج کا مایہ ناز ایکٹر جان ولکس بوتھ اپنی ڈاک لینے فورڈس تھیٹر میں ٹھہلا ہوا داخل ہوا۔ جب وہ مزید قریب پہنچا تو تھیٹر کے مینیجر

طرف سے موصول ہونے والے خطوط اس کے حوالے کر دیئے۔ بوتھ جانے کے لیے مزاحیہ تھا کہ اسٹیج کے ایک بڑھئی نے مینیجر فورڈ سے پوچھا۔ ”کیا آپ اسٹیج باکس تیار چاہتے ہیں؟“

اسٹیج باکس سے مراد وہ باکس تھا جو صرف محترم صدر اور ان کی پارٹی کے لیے مخصوص تھا۔
”ہاں۔“ مینیجر فورڈ نے جواب دیا۔

انہیں وائٹ ہاؤس سے یہ پیغام موصول ہوا تھا کہ اس رات صدر انتی پارٹی وہاں ڈراما دیکھنے کے لیے آنے والی ہے۔ بوتھ نے جب یہ سنا تو فورڈ کی طرف دیکھا۔
”صدر لنگن اور یہاں؟“
”ہمارا کھیل دیکھئے؟“

ان دنوں ایک پرانا مزاحیہ کھیل ”امریکن کزن“ اسٹیج کیا جا رہا تھا جو تماشائیوں میں اپنی دلچسپی کو چمکا رہا تھا۔
”ہاں۔“ فورڈ نے چہک کر کہا۔ ”شاید اس طرح ہمارے اس باسی کھیل میں کشش پیدا ہو جائے اور یہ مزید بڑھ کر لے۔“

”ہاں شاید۔“ بوتھ نے اس سے اتفاق کیا اور باہر چلا گیا تاکہ تھیٹر کی داخلی میزبانیوں پر بیٹھ کر آرام سے اپنے پرستاروں کے تفریحی خطوط پڑھ سکے۔

کسی بھی معنی میں شاید کو یہ یاد نہیں کہ اس نے بوتھ کے رویے میں کسی قسم کی غیر معمولی بات محسوس کی ہو۔ وہ صحیح معنوں میں ایک شاعرانہ ایکٹر تھا کیونکہ اس کے ذہن میں فوراً ہی ریاست ہائے متحدہ کے صدر کو قتل کرنے کا منصوبہ تشکیل پامیگا تھا اور اس منصوبے کو اسے اگلے دس گھنٹے میں عملی جامہ پہنانا تھا۔

وہ اپنے خطوط پڑھنے کے بعد قصداً دوبارہ تھیٹر میں داخل ہوا، اور جڑھ کر ٹیلی ویژن میں گیا اور ایک بھٹی راہداری سے ہو کر صدر لنگن کے لیے مخصوص باکس میں جا کھسا۔ وہاں بیٹھ کر وہ رات میں پیش ہونے والے ڈرامے کی ریہرسل دیکھنے لگا۔ اس کھیل کے ایک منظر میں ایک مزاحیہ اداکارہ کو ایک جملہ ادا کرنا تھا۔ اس اداکارہ نے جوئی وہ جملہ اپنے مخصوص انداز میں ادا کیا، بوتھ چہکتا ہو گیا۔ وہ جملہ کچھ ایسے تر لطف انداز میں ادا کیا گیا تھا کہ بوتھ کو یقین ہو گیا کہ جب کھیل پیش ہوگا تو اس مزاحیہ جملے پر پورا ہال تماشائیوں کے تہمتوں سے گونج اٹھے گا۔

وہ تھوڑی دیر کے بعد تھیٹر سے نکلا اور تیزی سے چل

پڑا۔ اس مرحلے پر اس کی مصروفیات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ آپ ٹاؤن، ڈاؤن ٹاؤن اور کراس ٹاؤن میں درجنوں افراد نے اسے دیکھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو بہت اچھی طرح سب کو دکھایا۔ اس نے دوستوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا، خواتین کی طرف دیکھ کر احتراماً اپنا ہیٹ اتارا، راہ گیروں سے ہیلو ہائے کیا۔ اس وقت اس کے جسم پر بے داغ لباس تھا اور پیروں میں شہ سواری کے بوتھ تھے جن میں مہینے کی پھر کی لگی ہوئی تھی۔ وہ تھیٹر سے نکل کر سیدھے گھوڑوں کے ایک اصطبل پہنچا اور اس نے ایک صحت مند گھوڑی کرائے پر حاصل کر لی۔ اس کے بعد وہ فورڈس تھیٹر کے نزدیک ہی واقع ایک بورڈنگ ہاؤس گیا جہاں بھانت بھانت کے بد قماش لوگوں سے وہ گزرتا تھا۔ وہ گزرتے ہی ماہ سے میل جول بڑھائے ہوئے تھا۔ کچھ دیر ان کی محبت میں وقت گزارنے کے بعد وہ ایک بار میں گیا۔ وہاں ایک بوتھ براڈوی حلق میں اتاری اور کچھ بجے کے قریب کہیں غائب ہو گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ایک بار پھر گھوم کر تھیٹر میں داخل ہوا، جواب بالکل دیران تھا، وہ سیدھے اسٹیج باکس کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے چاقو کی مدد سے دروازے کے بالائی پینل میں ایک سوراخ کیا، پھر جبکہ کفرش پر سے پھیل سیتا اور وہاں سے کھسک گیا۔ گویا اس نے صدر کے قتل کی راہ ہموار کر دی تھی۔

وہ واپس پینل ہوئی پہنچا جہاں وہ رہتا تھا۔ اس نے کھانا کھایا، اس کے بعد اپنے کمرے میں گیا۔ وہاں اس نے ایک وگ، ایک نفلی واڈمی، ایک خنجر، دو پورا پورا سنگل شاٹ والا ایک مخصوص پستول اٹھالیا جس سے فائر کرنے پر ایک کچے کے برابر چھوٹا سا سوراخ ہو جاتا تھا۔ وہ رات کے لگ بھگ آٹھ بجے پینل ہوئی سے نکلا۔ ہوئی کے استقبال کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ٹکڑے سے پوچھا کہ کیا وہ اس رات فورڈس تھیٹر جائے گا؟

”نہیں۔“ ٹکڑے نے جواب دیا۔
”جہیں ضرور جانا چاہیے۔“ بوتھ نے اصرار کیا۔
”آج رات وہاں اداکاری کے بعض عمدہ نمونے دیکھنے کو ملیں گے۔“

ایسا وہ اس لیے کر رہا تھا کہ لوگ گواہ رہیں اس کے بعد وہ ایک بار پھر تقریباً ایک گھنٹے کے لیے غائب ہو گیا۔ شہادتیں اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اس دوران اس

نے اس بمیانک، گہری اور پیچیدہ تاریخی سازش میں ملوث اپنے دوستوں کے ساتھ حتیٰ اور فیصلہ کن صلاح و مشورے کیے جو اس رات کی سیاسی دھڑلے سے پہلے ہی منکشف ہونے والی تھی۔

رات کے ساڑھے نو بجے وہ فورڈس تھیز کے پچھواڑے بیسیٹ ایل میں اسٹج کے دروازے پر نمودار ہوا۔ پھر وہاں سے چلنا ہوا صدر کی منتظر بھی کے پاس سے گزرتا ہوا پیٹھ اسٹریٹ پہنچا جہاں ایک بار واقع تھا۔ وہاں بھی اس نے بے لوثی سے منتقل کیا اور پھر واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اس موقع پر بار میں موجود کئی شخص نے اس پر غور جست کیا۔ ”تم بھی اپنے باپ جیسے ایک نیشنل بن سکتے۔“
 بوتھ ایڈیوں کے بل مڑا۔ کچھ دیر تک لا جواب سا ہو کر خاموش کھڑا رہا۔ پھر اچانک مسکرایا اور مڑ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بہ آواز بلند کیا۔ ”جب میں اسٹج سے اتروں گا تو امریکا کا سب سے مشہور شخص ہوں گا۔“
 سننے والے اس بات کی گہرائی نہ سمجھ سکے اس نے کتنی بڑی بات کہہ دی تھی۔

جان بوتھ کا باپ جو نیس بروڈس بوتھ نیم پاگل شرابی تھا، جو اپنے وقت کا عظیم ترین ایکٹر تصور کیا جاتا تھا۔ اس کے دس بیٹے تھے جن میں جان بوتھ کا نواں نمبر تھا۔ جان بوتھ نے صرف سترہ سال کی عمر میں اسٹج پر اداکاری کے جوہر دکھانے شروع کر دیے تھے۔ دو سال کے بعد 1858ء میں اس نے ورچینیا کے شہر ریچمنڈ میں شیلیپٹر کے ڈرامے ”ہیلٹ“ میں ہیلٹ کا کردار ادا کیا اور وہ راقوں رات اسٹج کے افق پر چاند کی طرح چمکنے لگا۔ لڑکیاں اس کی دیوانی ہو گئیں۔ وہ بڑوں پر اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اس کے پیچھے بھاگیں۔ جب وہ اسٹج پر نمودار ہوتا تو وہ دھوڑ جذبات سے چمکنے لگتی اور اس کا آٹو گراف لینے کی غرض سے اس طرح ٹوٹ پڑتی جیسے عکاس مٹائی پر ٹوٹی ہیں۔

جان بوتھ فروری 1861ء تک جنوب ہی میں سکونت پذیر رہا لیکن چونکہ جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے، اس لیے اس نے شمال میں تھیزوں میں جنگ منظور کر لی کیونکہ وہ پیدا کنی جنونی نہیں تھا۔ وہ میری لینڈ میں پیدا ہوا تھا۔ اس لیے غلامی سے اس کی کوئی جذباتی یا مالی وابستگی نہیں تھی۔ جس وجہ سے بغاوت نے جنگ کی صورت اختیار کی تھی اور امریکا جنوب و شمال میں بٹ گیا تھا وہ وجہ غلاموں کی خرید و فروخت تھی۔ جان بوتھ نہ تو غلاموں کی تجارت سے وابستہ

تھا اور نہ اسے اس قسم کی تجارت سے نفرت تھی۔ وہ لاطین بندہ تھا مگر جب سمسٹر میں توپیں داغی جانے لگیں تو بوتھ نے ٹھہر کھلا کہا شروع کرو یا کہ یہ جدید دور کی سب سے دلیرانہ کارروائی ہے اور یہی بات اس کے مخالفین نے پکڑ لی۔ ایک گروپ نے تھیز کو تباہ کرنے اور اسے شہر چھوڑنے کی دھمکی دی لیکن وہ اپنی ہمدردی کے باوجود بھاگ کر جنوب کی باغی آرمی میں شامل نہیں ہوا۔ اس نے شہر چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

جب ہزاروں اتحادی محب وطن مر رہے تھے تو جان بوتھ اسٹج پر ہی رہا اور پانچ سو ڈالر فی ہفتہ کے عوض ہیلٹ، میکھیہ اور اوقیلو کے کردار کرتا رہا لیکن جلد ہی وہ اسٹج سے ہٹ کر ایک خطرناک کھیل میں ملوث ہو گیا۔ 1865ء میں وہ انڈر گر اڈنڈ باغیوں سے جاملتا تھا۔

کنفیڈریٹ سیکرٹ سروس انتہائی منظم تھی۔ یونین کے ہر بڑے شہر میں ان کے جاسوسوں کا جال پھیلا ہوا تھا لیکن بوتھ کا پیشہ ایک انتہائی عمدہ بہروپ تھا۔ وہ آزادی سے محاذوں پر اور ریاستوں کے درمیان آتا جاتا رہتا اور اسٹج کے پیچھے پیغام رسالوں اور سیکرٹ ایجنٹوں سے ملتا رہا۔ دستاویزی شہادتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ باغیوں کی اعلیٰ جنس سے کینیڈا تک میں اس کا رابطہ تھا۔ اس بیٹھ کے بارے میں اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک غیر ذمے دار جنونی تھاجس کی گردن پر امراہام لنگن کا خون ہے۔ مگر کیسے یہ بتاتا چلوں۔

☆.....☆

دسمبر 1864ء کے ادھر میں بوتھ ایک دن ایک بورڈنگ ہاؤس گیا۔ یہ بورڈنگ ہاؤس، مسز میری یوچینیا سرات نامی ایک خاتون کا تھا اور واشنگٹن میں فورڈس تھیز سے چار بلاک کے فاصلے پر 541 ایچ اسٹریٹ پر واقع تھا۔ وہاں دو باغی ایجنٹ کے علاوہ متعدد جعلی شخصیتیں اکٹھا ہوئی تھیں۔ بوتھ کے وہاں جانے کے کچھ ہی دیر کے بعد ایک میلا پھیلا کرایہ دار وہاں وارد ہوا اور ایک کمرے کے لیے اس نے درخواست کی۔ اس کا نام جارح تھا۔ اس کے بعد ہی ایک اور انجینی وہاں آ گیا۔ وہ ایک نیم خیم نوجوان تھا۔ اس نے ایک سبکی مین کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا۔ اس کا نام فادر لوکس پین تھا۔ اس کے ذرا ہی دیر کے بعد ایک اور مفلوک الحال شخص آ پہنچا۔ وہ ایک سابق ڈرگ اسٹور کلرک کیوڈو ہیر ولڈ تھا۔ یہ لوگ مرکزی سازش تھے۔

کو جوان کو پکڑتی جب کہ بین اور خود ہوتھ صدر لنگن کو دبوچتے۔

ذرا ہی دیر میں ایک چھپاتی ہوئی کبھی اپنے شیڈول کے مطابق نمودار ہوئی جسے گھوڑے پہنچ رہے تھے۔ کو جوان گھوڑوں پر چابک برسا رہا تھا۔ کبھی آئی اور گزر گئی لیکن کبھی میں بیٹھا ہوا محض صدر لنگن نہیں تھا۔ اس وقت وہ یونین کے فوجیوں کو تنے بانٹ رہا تھا جو غیر متوقع طور پر باغیوں سے حاصل کیا ہوا ان کا جھنڈا صدر کو پیش کرنے و اشتہار آئے تھے۔

انواء کی تیسری کوشش اس وقت پھر ناکامی سے ہمکنار ہوئی جب صدر لنگن نے آخری لمحوں میں تعمیر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ تیسری مرتبہ بھی ناکامی کا رخ مزہ چھیننے پر سازشیوں کا چیف ہوتھ غصے، جھنجھلاہٹ، مایوسی اور شکست خوردگی کے احساس سے دیوانہ ہو گیا۔ صدر لنگن کو ٹیپ کرنے کی ساری کوشش، ساری محنت، ساری بھاک دوڑ راہیوں مگنی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ اب تک ہوا میں جال پھینکتا رہا ہو۔ اسے اپنے انڈر گراؤنڈ ساتھیوں کی تحفگی اور ناراضگی کا بھی احساس تھا جنہیں اس نے الٹ کر دیا تھا۔ اب وہ اور تھکیک کا سامان کر رہے تھے۔ اپنی ذلت اور رسوائی وہ کیسے برداشت کرتا جو اس کی ناکامیوں کے باعث اس کی جھولی میں آ چکی تھی جب کہ وہ تو شہرت اور ناموری کے خواب دیکھ رہا تھا۔ بار بار کی ان ناکامیوں پر کڑھتے ہوئے اس نے انواء کا منصوبہ ترک کر کے اس سے کہیں زیادہ خطرناک قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔

☆.....☆

1865ء کے گڈ فرائی ڈے تک اس کا یہ ارادہ پختہ ہو چکا تھا۔ اس اطلاع نے کہ صدر لنگن اس رات فورڈس تعمیر میں اپنے ہاؤس میں ہوگا، جگہ اور وقت کا تعین کر دیا تھا۔ اس رات ہوتھ نے جارج کو نائب صدر اینڈر پو جاسن پر قاتلانہ حملے کی ذمہ داری سوہنی۔ چین اور ہیر ولڈ کو وزیر داخلہ ولیم ایچ سیوارڈ کو ہلاک کرنا تھا۔ گویا ایک ہی وار میں یونین کی سرکردہ ہتھیوں کا صفایا کرنا مقصود تھا۔

اس رات ہوتھ، فورڈس تعمیر کی اس راہداری میں نمودار ہوا جو صدر کے ہاؤس تک رہنمائی کرتی تھی۔ اس موقع پر اس نے خود کو لوگوں کی نگاہ سے چھپانے کی زحمت نہیں کی۔ کئی لوگوں نے اسے راہداری میں دیکھا۔ صدر کے ہاؤس کی داخلی گزرگاہ پر کوئی پہرہ نہیں تھا۔ اس حقیقت کے

☆.....☆

سازش کے ابتدائی مراحل میں ایک پلان بنایا گیا۔ اس پلان کے مطابق انہیں صدر کو انواء کر کے جنوب میں لے جانا تھا۔ صدر کے پکڑے جانے پر شالیوں کے حوصلے پست ہو جاتے اور جنوبیوں کے حوصلے بلند ہو جاتے۔ دوسرے یہ کہ یرغمال بنا کر ہزاروں قیدیوں کو رہا کرایا جاسکتا تھا لیکن بدقسمتی سے انواء کا منصوبہ جو ہیٹوں کی محنت اور سوچ و بچار کے بعد بنایا گیا تھا حقائق کا شاہکار ثابت ہوا۔ ہوتھ کا پہلا منصوبہ یہ تھا کہ صدر ابراہام لنگن کو فورڈس تعمیر ہی میں اس کے ہاؤس میں دبوچ لیا جائے۔ اس منصوبے کے مطابق ایک سٹیل طے پر گیس کے مرکزی والو کو آف کر دیا جائے گا جس سے پورا تعمیر اندھیرے میں ڈوب جائے گا۔ انواء کنندگان تیزی سے ہاؤس میں گھس جائیں گے اور صدر کو دبوچ کر پینچ پینچ تک لے آئیں گے۔ پھر اسے کھینٹے ہوئے باہر کھڑی کبھی میں سوار کر دیں گے اور کبھی تیزی سے رجسٹر روانہ ہو جائے گی۔ اس کا متبادل منصوبہ یہ تھا کہ کھینے درختوں کے درمیان سے ہو کر گزرنے والی اس ٹرل کھاتی سڑک کے ایک موڑ پر گھات لگا کر بیٹھ جائیں گے جو واشٹنگٹن سے باہر تین میل آگے ایک ملٹری اسپتال تک جاتی تھی۔ مددرا کٹر وہاں جاتا رہتا تھا اور دستور کے مطابق اخبارات میں پیشگی اس وزٹ کا اعلان ہوتا تھا۔

ہوتھ نے 18 جنوری کو اپنے پہلے منصوبے پر عمل درآمد کرنے کی کوشش کی۔ کوڈ سان، پاس ورڈز اور خفیہ آرڈر اس کے ساتھیوں تک پہنچ گئے۔ مختلف مقامات پر انڈر گراؤنڈ باغیوں کو جو کس کر دیا گیا۔ فورڈس تعمیر کے ایچ کے دروازے پر ایک کبھی بھی پہنچ گئی جس میں مناسب پردے لگے ہوئے تھے لیکن یہ منصوبہ بری طرح ناکام ہو گیا کیونکہ وہ ایک طوفانی رات تھی اور صدر ابراہام لنگن نے ایسے خوفناک موسم میں تعمیر کارخ کرنا پسند نہیں کیا۔ وہ گھر ہی میں رہا۔

اس کے دو ماہ کے بعد انواء کی دوسری کوشش اسپتال جانے والی سڑک پر کی گئی۔ اس موقع پر ایچ اسٹریٹ کے پورڈنگ ہاؤس کے سازشیوں کا پورا کردہ شراب پی کر گھوڑوں پر سوار ہو کر شہری حدود سے بہت آگے سڑک کے کنارے لکڑی کے بنے ہوئے ایک اسٹینڈ پر اکٹھا ہو گیا۔ اب ہوتھ نے آخری حکم جاری کیا۔ اس کے مطابق سرات

بلکہ لاکھوں سفید قام بھی اس کے حامی تھے۔ ایسے حالات کے باوجود صدر کے پاس کے دروازے کے باہر سول یا ملٹری پولیس کا کوئی پہرہ نہیں تھا۔

وائٹ ہاؤس کے ایک گارڈ کے مطابق صدر لنکن نے ذاتی طور پر وزیر دفاع ایڈون ایم اسٹینٹن سے اس رات باڈی گارڈ فراہم کرنے کو کہا تھا کیونکہ اس دن سہ پہر میں صدر کو جان سے مارنے کی دھمکی دی گئی تھی۔ صدر نے اسٹینٹن سے خاص طور سے اس کے ایک گارڈ کا کہا تھا جو ایک میجر تھا اور جس کا نام ایکرٹ تھا۔ لیکن اسٹینٹن نے صدر کو جواب دیا کہ اس رات ایکرٹ کو دوسرا اہم کام انجام دینا ہے لہذا وہ ایکرٹ کو اس کے ساتھ نہیں بھیج سکتا لیکن ریکارڈ سے ثابت ہوتا ہے کہ میجر ایکرٹ اس رات فارغ تھا اور اسے کوئی اہم فرض تفویض نہیں کیا گیا تھا۔ وہ شام سے گھر پر تھا اور رات دس بجے شیو کر رہا تھا۔

واشنگٹن کے ایک پولیس مین جان ایف پارکر کو صدر کے پاس کے دروازے پر پہرہ دینا تھا۔ اسے یہ ڈیوٹی سونپی گئی تھی لیکن وہ اپنی جگہ سے غائب تھا۔

اخبارات کئی دنوں تک شور مچاتے رہے کہ پارکر کے

باوجود کہ صدر کو اغواء کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور واشنگٹن ہائی ایجنٹوں اور جو شیلے حایوں سے بھرا ہوا تھا، دروازے کے باہر بھی ہوئی، محافظ کی کرسی خالی تھی۔ وائٹ ہاؤس میں لنکن کی میز پر ایک ایسا لٹاف تھا جو اسی خطوط پر مشتمل تھا۔ ان خطوط میں اسے جان سے مارنے کی دھمکیاں دی گئی تھیں اور ایک باغی نے اس پر گولی بھی چلائی تھی۔ اس کے علاوہ، ورجینیا کا ایک گروپ، جس میں معزز افراد شامل تھے، فنڈز اکٹھا کرنے میں مصروف تھا۔ تاکہ صدر لنکن کو قتل کرنے والے کو بطور انعام خطیر رقم دی جاسکے۔ جنوب کی ریاستیں صدر لنکن سمیت شمالی ریاستوں سے محض اس بناء پر بغاوت پر اتر آئی تھیں کہ سیاہ فاموں کو حاصل ہونے والے حقوق کے نتیجے میں شمالی ریاستوں کا غلبہ کسی بھی صورت میں ان کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔

1861ء سے 1865ء تک جاری رہنے والی یہ خانہ جنگی اسی نسلی منافرت کا شاخسانہ تھی جس کے بمیانیک شعلوں نے ہزاروں سیاہ فاموں کو چاٹ لیا اور ان کے گھروں کو پھونک ڈالا۔ صدر لنکن ان کا سب سے بڑا ہدف تھا کیونکہ وہ سیاہ فاموں کو ملنے والے حقوق کا سب سے بڑا باسبان تھا۔ شمالی ریاستوں کے نہ صرف سارے سیاہ فام

نومبر 2017ء کے شمارے کی ایک جھلک

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سپر سٹارز
ماہنامہ



شکست کی فتح
گھٹن زدہ حالات سے ایک حسینہ کی بغاوت..... آخری
صفحات پر **ظاہر جاوید مغل** کے قلم سے
ایک ایسی دلگذاز داستان جو سوچنے پر مجبور کر دے

دربان

پرتھوی راج کے عہد کے تیز و شیریں واقعات..... ایک بیٹی کا
باپ کے خلاف اٹھایا جانے والا قدم اسے عشق کی انتہا پر
لے گیا..... ابتدائی صفحات پر **علی اختر کی** سوغات

رنگ آسمان

ماضی کی دلغریب یادیں اور ایک فرنگی حسینہ کی دلداریاں.....
ای، آر، واجپوت کے قلم سے خوب صورت سلسلہ

وقت

وقت کی چالوں اور انسان کی مکاریوں کے درمیان
معرکہ آرائی..... **حسام بٹ** کے خیالات کی روانی

منظرِ امام: تنویر دھواض، شمس عباس، سلیم انور
اور محمد ہاسر اعوان کی خوب صورت تحریریں

اس کی حللہ

ماہنامہ مسرگزشت

ریٹنگ سے نیچے اسٹیج پر گر دیا۔ اس کوشش میں اس کا پایاں ٹخنہ مڑ گیا۔ وہ دروازے سے ہلکا اٹھا۔ تکلیف کی شہید لہر کو نظر انداز کرتے ہوئے کھڑا ہوا اور اپنا پیچھے لہراتا ہوا اسٹیج کے بازو میں جا گھسا۔ وہاں ایک ایکٹریس اپنا فقرہ بولنے کے انتظار میں کھڑی تھی۔ بوتھ نے اسے زور کا ایک طرف دھکا دیا اور بجلی کی سی تیزی سے اسٹیج کے نیم تاریک دروازے کی طرف لپکا۔ راہداری میں آرکسٹرا کا لیڈر موجود تھا۔ بوتھ نے اس پر پیچھے سے دوڑا اور اسے زور کا دھکا دیا۔ آرکسٹرا کی پہلی سیٹ پر متمکن دانشن انٹارنی مسٹر اسٹیوارٹ کو صدر کے باکس میں ہونی کڑ بڑا کا احساس ہو گیا تھا۔ اسی لیے جیسے یہی بوتھ نے اسٹیج پر چلا گیا لگا کی اسٹیوارٹ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور بوتھ کے پیچھے لپکا لیکن وہ جونہی اسٹیج کو عبور کر کے دروازے پر پہنچا، دروازہ باہر سے ایک دھماکے سے بند ہو گیا۔ اسٹیوارٹ دروازے کی تاب پڑنے کی کوشش میں اُدھر اُدھر ماٹھ مارنے لگا۔

باہر کی میں جو شخص بوتھ کا گھوڑا تھا اس کے انتظار میں کھڑا تھا، بوتھ کو دیکھ کر چپکا۔ ”مسٹر بوتھ دروازے سے باہر آ گئے۔“

اسی وقت اسٹیوارٹ بھی چیخا ہوا باہر آ گیا۔ ”رک جاؤ..... رک جاؤ۔“ لیکن بوتھ تب تک گھوڑے پر سوار ہو کر اسے ایڑ لگا چکا تھا۔

☆.....☆

بوتھ کا سب سے ذہین اور قابل اعتماد ساتھی ڈیوڈ ہیرولڈ، گڈ فرائی ڈے کا پورا دن اُدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ وہ اسلحہ چھپانے کے لیے جارح کے پاس بورڈنگ ہاؤس گیا، پھر بوتھ کی تلاش میں پینٹل ہوئی گیا۔ اس کے بعد مسٹر پچر کے اصطبل پہنچا جہاں سے اس نے ایک گھوڑی کرائے پر لی اور جب اس پر سوار ہونے لگا تو پچر نے اسے یاد دہانی کرائی کہ گھوڑی ہر صورت میں رات کے نو بجے تک واپس کرنی ہو گی لیکن ہیرولڈ رات کے نو بجے تک اصطبل نہیں لوٹا۔ دس بج کر دس منٹ پر وہ پین کے ساتھ تھا اور اس کی رہنمائی کرتا ہوا، ویران اسکوئرز کو عبور کر کے وزیر داخلہ سیوارڈ کے گھر کے سامنے پہنچا تھا۔ عظیم الجثہ پادری لوئس ٹین، لیووارڈ کے گھر میں داخل ہو گیا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی ہیرولڈ تیزی سے اپنی گھوڑی سے اترا، اس نے پین کا گھوڑا ایک درخت سے باندھ دیا۔ پھر اچھل کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور یہ جاوہ جا۔

خلاف تفتیش کی جائے۔ میٹرو پولیٹن پولیس ریکارڈ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پوری پولیس فورس میں یاہر کا کار ریکارڈ سب سے گنہگار تھا۔ اس میں وہ ساری برائیاں تھیں جو پولیس مین میں نہیں ہوتیں۔ وہ ڈیوڈی کے دوران شراب پیتا تھا، حکم عدولی کرتا تھا، انتہائی بد نظیر اور بد اخلاق تھا۔ اس کا پورا ریکارڈ سیاہ تھا۔ سب سے عجیب خیر بات یہ ہے کہ ایسے ناکارہ ترین پولیس مین کو خود مسز ٹنگن کی خصوصی درخواست پر وائٹ ہاؤس میں ڈیوڈی پر لگایا گیا تھا۔ آج تک کوئی نہیں جان سکا کہ ایسا کیوں ہوا تھا؟ جب مسز ٹنگن کی یہ اسپانسر شپ سامنے آئی تو اس پورے معاملے پر فوری سنسرشپ کی نقاب ڈال دی گئی۔

☆.....☆

بوتھ نے اس خالی کرسی کو آہستہ سے چھلانگ کر اس سوراخ سے باکس کے اندر جھانکا جو اس نے اسی دن بنایا تھا۔ صدر ٹنگن اپنا اودھ کوٹ پہنے، اپنی مخصوص ہلنے والی کرسی پر متمکن تھا۔ بوتھ نے اپنی پوزیشن بدل کر جھانکے۔ صدر کے پہلو میں مسز ٹنگن فردوس تھی۔ اس سے آگے ایک آرام کرسی پر ٹنگن کی ایک مہمان کلارا جیس بیٹی بھی تھی اور باکس کے اندرونی دیوار کے ساتھ ہی ایک دیوان پر اس خاتون کا محافظ بیٹھا تھا۔ وہ ایک نوجوان فوجی میجر تھا اور اس کا نام رچھ بون تھا۔

بوتھ نے اپنا سنگل شاٹ والا مخصوص ریوالور نکال لیا اور ڈرامے کے اس مزاحیہ فقرے کا انتظار کرنے لگا۔ بالآخر ڈرامے کی اداکارہ نے وہ فقرہ ادا کیا اور پورا ہال تہمتوں سے گونج اٹھا۔ بوتھ نے دروازے کا تاب ایک جھٹکے سے کھول لیا اور اندر کی طرف جھپٹا۔ اس کا پتہ تو لیا، دھماکا ہوا۔ صدر ٹنگن کی ٹھوڑی اس کے سینے سے لگ گئی۔ وہ یوں ساکت ہو گیا گویا بیٹھے بیٹھے اچانک سو گیا ہو۔

میجر رچھ بون نے چونک کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ اسے صدر کی کرسی کے پیچھے ایک انسانی سایہ نظر آیا۔ صدر کے سر سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ رچھ بون اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اسی لمحے بوتھ کا پیچھے لہرا ہوا اور رچھ بون کے بازو کو چیر گیا۔ میجر رچھ بون تیزی سے پیچھے ہٹا اور بوتھ پر جھپٹا۔ دونوں متحکم کٹھا ہو گئے۔ بوتھ اس سے چٹا ہوا، باکس کے گھر پر آ گیا۔ اس نے زور سے دھکا دے کر میجر کو ایک طرف گرا دیا اور ایک ٹانگ گھما کر ریٹنگ پر چڑھ گیا۔ میجر رچھ بون اسے پکڑنے کے لیے ایک بار پھر جھپٹا ہی تھا کہ اس نے خود کو

دار الخلافہ میں عیاشی کرنے کے بعد اپنے گھر لوٹ رہا ہے۔ اس نے چاروں طرف گھوم کر سوار کا جائزہ لیا۔ پھر پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ”ٹھیک ہے۔“ وہ سر ہلا کر بولا۔ ”آپ جاسکتے ہیں۔“
 بوتھ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تیزی سے پل عبور کرتا چلا گیا۔

محکمہ جنگ نے کبھی سارجنٹ سلاسل کے اس رویے کی نہ تو کوئی تحقیق یا تفتیش کی اور نہ ہی مذمت کرنے کی زحمت گوارا کی۔ اس کے افسران اعلیٰ نے اس کے فیصلے کو بد قسمتی سے تعبیر کیا اور قابل درگزر سمجھ کر قبول کر لیا۔ سارجنٹ کے پاس یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی کہ رات گئے وہاں سے گزرنے والے گھڑ سوار نے کچھ ہی دیر پہلے ریاست ہائے متحدہ کے صدر کا قتل کر دیا ہے۔

تاریخ کے ریکارڈ میں بہت سی بڑی بڑی کوتاہیاں نظر آتی ہیں اور اس رات صدر کا قاتل جان بوتھ ان میں سے ایک کوتاہی کا سہارا لے کر شہر سے نکل گیا تھا۔ کیا یہ اندازے کی غلطی تھی؟ یا کہ ایسی غلطیاں ڈیزائن کی گئی تھیں۔ اس رات بوتھ کو پل پر سے گزرنے کی اجازت دینا، تاریخ میں اکیلے سارجنٹ ہی کا حصہ نہیں ہے۔ بوتھ کے فراز ہونے کے کچھ ہی دیر کے بعد دوسرا گھڑ سوار اپنے گھوڑے کو سر پٹ بھگا تا ہوا وہاں پہنچا۔ وہ ڈیوڈ ہیر ولڈ تھا۔

”تم کون ہو؟“ سارجنٹ سلاسل نے اس سے شناخت کا مطالبہ کیا۔

”میرا نام قحاس ہے۔“ ہیر ولڈ نے منہ بنا کر جواب دیا۔

”تم اتنی رات گئے گھر سے باہر کیا کر رہے ہو؟“ سارجنٹ نے پوچھا۔

”میں ایک عورت سے ملنے گیا تھا۔“ ہیر ولڈ نے جواب دیا۔ ”اب میں واپس گھر جا رہا ہوں۔“

سارجنٹ کو وہ گھڑ سوار بے ضرر لگا۔ لہذا اس نے سنتری کو پچانک کھولنے کا اشارہ کر دیا ہیر ولڈ بڑی آسانی سے فرار ہو گیا۔ اسے گئے ہوئے صرف چند ہی منٹ گزرے تھے کہ تیسرا گھڑ سوار بھی اپنے گھوڑے کو جیٹ بھگاتا ہوا وہاں آن پہنچا۔ وہ اصطبل کا مالک فلچر تھا جس سے ہیر ولڈ نے گھوڑا کرائے پر لیا تھا اور فلچر نے گھوڑا رات 9 بجے واپس اصطبل پہنچانے کی تاکید کی تھی۔ ہیر ولڈ، وزیر داخلہ سیوارڈ کے گھر سے بھاگتے ہوئے اس اصطبل کے پاس

لہرا لہرا کر بیچ بھی رہا تھا۔ اس نے لٹری پولیس، سٹی کاسٹیلری، وفاقی سراغ رسانوں اور تمام گارڈز کو پبلک بلڈنگز کو تحفظ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ شہر کی تمام سڑکوں پر گشت کرنے کی ہدایات جاری کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی فورڈس تھیٹر کو سر بہ مہر کرنے اور اس ڈرامے ”آز“ امریکن کزن“ کے ایک ایک فنکار کو گرفتار کرنے کا حکم بھی جاری کر دیا۔

اس نے واشنگٹن سے قاتلوں کے راہ فرار کو مسدود کرنے کے لیے ریلوے ٹرینل پر پولیس فورس کی بھاری جھیت کو متعین کر دیا تھا۔ نیول فورسز کو بھی دریاے پونومیک کی ناکہ بندی کرنے کے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ آرمی فورس کو دار الخلافہ سے مشرق، شمال مشرق، شمال مغرب اور جنوب کی سمت نکلنے والی چھ سڑکوں کی ناکہ بندی کرنے کی ہدایات دے چکا تھا لیکن فرار کے دو راستوں کو بالکل کھلا چھوڑ دیا تھا جس سے سازش کرنے والے غوی یارڈ برج کے طویل جنگلات سے گزر کر دریائے ان کو بیٹا عبور کر کے بہ آسانی فرار ہو سکتے تھے۔ یہ دونوں سڑکیں زیریں میری لینڈ تک رہنمائی کرتی تھیں۔ یہ علاقہ انڈر گراؤنڈ باغیوں کا علاقہ رجمنٹ کی گزر گاہ تھا۔ یہ امر انتہائی ناقابل فہم ہے کہ واشنگٹن نے جب واشنگٹن سے باہر جانے والی ہر سڑک کی ناکہ بندی کر دی تھی تو قتل کی پوری رات یہ دونوں سڑکیں پوری کھلی کیوں چھوڑ دی تھیں؟

☆.....☆

چونکہ خانہ جنگی کا زمانہ تھا۔ حفاظتی اقدامات کے تحت نیوی یارڈ برج کا پچانک رات کے 9 بجے بند کر دیا جاتا تھا۔ 14 اپریل کی اس رات برج گارڈ کے کمانڈر سارجنٹ سلاسل کو رات دس بج کر پینتالیس منٹ پر تاریکی میں ڈوبی ہوئی کیا رہویں اسٹریٹ پر کبھی تیز رفتار گھوڑے کی ٹاپ سنا دی جو تیزی سے قریب آتی جا رہی تھی۔ اگلے چند ہی سیکنڈ میں ایک گھڑ سوار ان کے قریب آ کر رک گیا۔ ایک سنتری نے بڑھ کر گھوڑے کی اس تمام لیں۔

”جناب آپ کون ہیں؟“ سارجنٹ سلاسل نے پوچھا۔

”میرا نام بوتھ ہے۔“ گھڑ سوار نے جواب دیا۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔“

سارجنٹ نے سوچا کہ وہ کسی رئیس کا بیٹا ہو گا جو

سے گزرا تھا اور جارج فلچر کی نظر اس بھاگتے ہوئے گھڑسوار اور گھوڑے پر پڑ گئی تھی۔ وہ اچھل کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا تھا اور ہیرولڈ کا چھپا کر تا ہوا اس پل تک آگیا تھا۔
”مجھے پل کے اس پار جانا ہے۔“ اس نے سارجنٹ سلاس سے اصرار کیا۔ ”وہ شخص میرا گھوڑا چرا کر بھاگ رہا ہے۔“

لیکن سارجنٹ سلاس نے اس رات تیسری فاش غلطی کی۔ ”پل بند ہو چکا ہے۔“ اس نے بے رخی سے جواب دیا۔ ”تم نہیں گزر سکتے واپس جاؤ۔“

جارج فلچر کا مارے غصے کے خون کھول اٹھا۔ وہ اپنے گھوڑے کو موڑ کر سر پٹ بھاگا تا ہوا سیدھے واشنگٹن پولیس ہیڈ کوارٹرز پہنچا۔ ”میرا گھوڑا چوری ہو گیا ہے۔“ وہ چیخ کر بولا۔ ”چور نیوی یا رڈ برج سے فرار ہو گیا ہے۔“

سپرٹنڈنٹ نے فوراً ان ہلاکتوں کا تعلق مفروروں سے جوڑ دیا اور آری ہیڈ کوارٹرز سے درخواست کی کہ انہیں فوری گھوڑے فراہم کیے جائیں تاکہ پولیس کی حجت کو ان مفروروں کا تعلق کے تعاقب میں روانہ کیا جاسکے۔ آری ہیڈ کوارٹرز نے جواب دیا کہ ان کے پاس کوئی گھوڑا دستیاب نہیں ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے پولیس کو ہدایت کی کہ ہیڈ کوارٹرز میں جم کر بیٹھے رہو اور ملٹری کو یہ تعاقب ہینڈل کرنے دو لیکن انہوں نے اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کیا۔ انہیں اگلے دن اس کا ہوش آیا۔ تب تک قاتل کہیں سے نہیں فرار ہو چکے تھے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیوں؟ آخر ایسا کیوں ہوا؟ آری ہیڈ کوارٹرز نے سپرٹنڈنٹ کی درخواست پر کیوں نہیں کان دھرا اور خود کوئی قدم کیوں نہیں اٹھایا؟ کیا سرخ فیتہ راہ میں حاکم ہو گیا تھا یا ایڈون اسٹینٹن کے ناقابل فہم رویے کے پیچھے کوئی گھناؤنی سازش کا فرما تھی؟ اس کا جواب آج تک نہیں مل سکا۔

☆.....☆

دریائے اتا کو مشیا عبور کرنے کے بعد ہیرولڈ بوتھ سے مل گیا اور وہ دونوں ایک ساتھ شمال کی سمت بڑھتے چلے گئے۔ آدھی رات ہوتے ہوئے بوتھ اپنے ٹخنے میں آٹنے والی سوچ سے بے حال ہو گیا۔ لیکن کے پاس سے اس پر چھلانگ لگانے پر اس کے پائیں ٹخنے میں سوچ آگئی تھی اور اب گھوڑے پر سوار ہر جھکے پر تکلیف پڑھ رہی تھی۔ درو اس قدر شدید تھا کہ اسے التلیاں ہونے لگیں۔ اسے براہی کی

خست طلب محسوس ہو رہی تھی، اس کا گلخک ہو رہا تھا۔ واشنگٹن سے دس میل دور ایک مقام سرات ویل میں ایک سرانے بھی جہاں سازشیوں نے اپنے اسلحے کا ایک ہینڈل چھپا رکھا تھا۔ یہاں وہ دونوں رکے اور سرانے کے مالک جان لائڈ کے دروازے پر زور زور سے دستک دے کر اسے نیند سے جگایا۔ اس نے ان کے طلب کرنے پر اسلحے کا وہ ہینڈل لاکر ان کے حوالے کر دیا۔ اس دوران بوتھ وہاں سے اپنی پیاس بجھاتا رہا۔ پھر دونوں اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر پورٹ ٹوبیو کی سمت روانہ ہو گئے جہاں ایک کشتی انہیں دریائے پوٹومیک عبور کرانے کے انتظار میں تھی لیکن ابھی وہ منزل بہت دور تھی۔

اب تک بوتھ کا بھرا اس بری طرح سوچ چکا تھا کہ اسے اپنا بوٹ اس جھگڑے میں لوہے کے ٹکٹے کی مانند کھوا لگ رہا تھا۔ اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ اس نے ہیرولڈ سے کہا کہ اسے کوئی ڈاکٹر ڈھونڈنا پڑے گا۔ قریب ترین جگہ بریڈن ٹاؤن تھی جہاں ڈاکٹر سیوسیل ہوا کرتا تھا۔ کچھ کی سردیوں میں بوتھ اکثر اس کے پاس آتا رہا لیکن وہ ڈاکٹر سیوسیل کی سیاسی وابستگی کے بابت وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ پھر بھی انہوں نے اس کے پاس جانے کا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ ایک ہلاکت خیز فیصلہ تھا۔ صبح کے تقریباً چار بجے ہیرولڈ، بوتھ کی رہنمائی کرتا ہوا، سیوسیل کے فارم پر پہنچا اور سڑک کی طرف کھلنے والے پھانک پر زور زور سے دستک دینے لگا۔

”کون ہے؟“ تھوڑی دیر کے بعد کسی نے پکار کر پوچھا۔

”ایک شخص گھوڑے سے بری طرح گر گیا ہے اور سخت تکلیف میں ہے۔“ ہیرولڈ نے پکار کر کہا۔ ”کیا ڈاکٹر اس کی ٹانگ ٹھیک کر دے گا؟“

چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا اور ڈاکٹر سیوسیل مڑ نمودار ہوا۔ اس نے بوتھ کو ہیرولڈ کی مدد سے گھوڑے سے اتارا اور دونوں اسے اٹھا کر اندر لے گئے۔ بوتھ نے ایک مثال سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا تاکہ ڈاکٹر سیوسیل اسے پہچان نہ سکے۔ ہیرولڈ نے ڈاکٹر سے بوتھ کا تعارف مسٹر ٹائی سن کی حیثیت سے کرایا۔ بعد ازاں ڈاکٹر نے حکام کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا کہ یہی وجہ تھی کہ وہ اور اس کی بیوی اس مفروروں کی پوچھ پچائے سے قاصر رہے تھے۔ اس وقت ڈاکٹر نے بوتھ کے جوتے کو کٹ کر کھول دیا اور پچھپوں کی مدد سے

اس کے ہر کوئی صدمہ ہمارے لئے کے اقدامات کیے۔ پھر اس کے جسم پر کھیل ڈال کر مروجہ تڑکے اپنے کھیت پر کام کرنے چلا گیا۔

دو پہر میں فارم سے واپس آ کر اس نے پوتھ کے پھر کا پھر معائنہ کیا۔ پوتھ نے اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ رکھا تھا۔ یہ بات کسی بھی فزیشن کو تجسس کر سکتی تھی اور وہ اپنے مریض سے اس کی وجہ پوچھ سکتا تھا لیکن ڈاکٹر نے اس کے بیان کے مطابق اس نے مریض سے کچھ نہیں پوچھا۔ اس کے بجائے وہ کھلیان میں گیا اور اس کے لیے ایک میسا کھی بنا کر لایا۔ اسی سے پہر وہ دونوں گھڑسوار وہاں سے رخصت ہو گئے۔

☆.....☆

وہ سہ پہر سے مسلسل بھاگ رہے تھے اور اب رات ہو گئی تھی۔ جنگل میں ایک چمچ کے قریب وہ راستہ بھول گئے۔ وہ جس گڈ پٹری پر بڑھ رہے تھے وہ گڈ پٹری دلدلی علاقہ میں جا کر ختم ہو گئی تھی۔ وہ کچھوے کی رفتار سے آگے بڑھنے لگے۔ گھڑسواری کی وجہ سے اب پوتھ کے دونوں پیر زخمی ہو گئے تھے اور وہ سخت تکلیف میں تھا۔ جب اس نے گھوڑے سے اتر کر پیدل چلنے کی کوشش کی تو اس کی بیسامی کچھڑ میں دھنس گئی۔ وہ بار بار گر کر پڑتے ہوئے ہفتے کی آدمی رات کو کرل کا کس کے ہاں پہنچے پائے لیکن اس وقت تک دریائے پونٹیک کو عبور کرنا بے حد خطرناک ہو چکا تھا۔ وفاق کے سپاہی چپے چپے پر موجود تھے۔ چنانچہ کرل کا کس نے انہیں چھ دن تک اپنے گھر سے دو میل دور ایک دلدلی علاقے میں چھپائے رکھا اور کھانے پینے کی چیزیں فراہم کرتا رہا۔ اس دوران فوجی اور پولیس شکاری کتوں کی طرح ان کی ہوسو گھنٹے پھر رہی تھی۔

اس دوران پوتھ نے اپنے خیالات ایک ڈائری میں محفوظ کیے جو خود ستائی کا اعلیٰ مشاہیر کا رہا۔ اس نے خود کو ایک ایسے ہیر وے تشبیہ دی جسے حوام الناس سمجھ نہیں سکے۔ اس کا مشن اتنا اعلیٰ و ارفع تھا کہ عام انسانوں کو اس کا ادراک نہیں ہو سکا۔ وہ لکھتا ہے۔

”کاش دنیا میری عظمت کو سمجھ سکے کہ ایک ہی گولی نے مجھے کتنا عظیم بنا دیا ہے حالانکہ مجھے عظمت کی کوئی خواہش نہیں۔ میں یہاں جنگل اور دھماکے میں سردی سے ٹھنڈ رہا ہوں اور فاقے کرنے پر مجبور ہوں۔ فوج اور پولیس کی بھاری نفی شکاری کتوں کی طرح میری ہوسو گھنٹے پھر رہی ہے۔ ہر شخص کی آنکھ میری طرف اٹھی ہوئی ہے۔ میں یہاں

بے بسی اور لاچار کی عالم میں پڑا ہوں، تو کیوں؟ میں نے آخر کیا کیا ہے؟ میں نے تو آج تک کسی سے نفرت نہیں کی، کسی کو اپنی ذات سے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ میرے اندر ایک عظیم روح ہے، میں ایک مجرم کی حیثیت سے مرنا نہیں چاہتا۔“

☆.....☆

قتل کی اس بھیاں اور تاریخی رات کو واشنگٹن پولیس کا سپرنٹنڈنٹ میجر ایس ی رچرڈز بھی خود ڈس تھیر میں تماشائیوں کے درمیان موجود تھا اور اس نے پوتھ کو پہلی نظر میں پہچان لیا تھا۔ وہ اٹھ کر صدر کے باکس کی طرف بھاگا۔ باکس کے باہر کرسی پر وہ گاڑا موجود نہیں تھا جسے پہرہ دینے کے لیے متعین کیا گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ رچرڈز اس پہرے دار کو ڈھونڈنے میں ناکام ہو کر بھاگتا ہوا، پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچا اور اس نے دس منٹ کے اندر اندر مشینری کو حرکت دے دی۔ اس نے ڈیوٹی پر موجود فورس کو مختصر الفاظ میں اس قومی سانحے سے آگاہ کرتے ہوئے، ہر یوزر پولیس کو فوری طلب کر لیا اور جاسوسوں کی ایک فوج کو فورڈس تھیر روانہ کر دیا۔

رات بارہ بجے کے بعد 15 اپریل کی تاریخ شروع ہو گئی۔ رات کے دو بجے تک فورڈس تھیر میں موجود سارے تماشائیوں سے سخت پوچھ کچھ کی جاتی رہی جس کے نتیجے میں تین نام ابھر کر سامنے آئے۔ جان ولکس پوتھ، ڈیوڈ ای ہیر ولڈ اور جان، ایچ سرات سپرنٹنڈنٹ رچرڈز کو ایک اہم پتے کا بھی علم ہو گیا۔ 1541 ایچ اسٹریٹ، رچرڈز نے فوراً سراغ رساں جان کلارو کو حکم دیا کہ اس بورڈنگ پر چھاپہ مار کر پوتھ اور سرات کو گرفتار کرے۔ جان کلارو نے اپنے دس سراغ رسالوں کی معیت میں رات کے سوا دو بجے بورڈنگ ہاؤس پر چھاپہ مارا۔ وہاں کے ایک رہائشی لوگ دھج مین نے اطلاع دینی پر دروازہ کھولا۔ سارے سراغ رساں ایک ساتھ اندر گھس کر ہر طرف پھیل گئے۔ پھر جب وہ واپس ہال میں آئے تو لوگس نے ناگواری سے ان سے پوچھا۔ ”معزز حضرات! رات کے اس پہر اس خانہ تلاشی کا کیا مطلب ہے؟“

کلارو نے اسے سخت نظروں سے گھور کر دیکھا۔ ”کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ تمہیں پتا ہی نہیں۔ بجلی رات کو کیا سانحہ پیش آیا ہے؟“

رہائشی لوگس نے اسے خالی نظروں سے اس کی طرف

”خدا گواہ ہے۔ میں نے اس شخص کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

اگلے ہی لمحے سراغ رسالوں نے نو وارد پر ریوالور تان لیے۔ ”اپنی شناخت کراؤ۔“

”لعنت ہو۔“ نو وارد جیسے انداز میں بڑبڑایا اور پھر اس نے ایک سندان کی طرف بڑھا دی۔

اس سند پر اس کا نام لوکس پین تحریر تھا۔ پولیس نے اسے اسی وقت گرفتار کر لیا لیکن وہ اپنے اسی موقف پر ڈٹا رہا کہ وہ گڑھا کھودنے والا مزدور ہے۔ وہ لوگ اسے لے کر پولیس ہیڈ کوارٹر لائے اور پھر انہوں نے وزیر داخلہ مسٹر سیوارڈ کے ٹیکو ملازم ولیم تیل کو طلب کر لیا۔ ولیم تیل پہلی ہی نظر میں پین کو پہچان گیا۔ پولیس نے پین کو فوراً دہری ہتھکڑیاں پہنا دیں اور دریائے پوٹومیک میں قیدیوں کے نیوی جہاز ساؤکس میں سوار کر دیا جہاں اسے دیگر قیدیوں سے الگ تھک قید تھالی دے دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی حکمہ جنگ نے اعلان کر دیا کہ انہوں نے وزیر داخلہ کے حملہ آور کو گرفتار کر لیا ہے۔

☆.....☆

اس سال 17 اپریل 1865ء کا ایسٹر سوموار سرکاری ایجنسیوں کے لیے خوش قسمتی کا دن ثابت ہوا۔ یہ سچ ہے کہ لیکن کا قاتل اور اس کے ساتھی اب تک مفرد تھے۔ تاہم اس سلسلے میں ہونے والی گرفتاریاں خاصی موثر تھیں۔ مسز میری سرات، لوکس پین، پوتھ کے دو گرگے مائیکل اولافلین اور سمویل لی آرملڈ کے علاوہ پوتھ کا اردلی ایڈورڈ بھی گرفتار ہو چکے تھے۔ اگلے دو دنوں میں ایک اور اہم سازشی جارج ایڈورڈ بھی 19 اپریل کو اپنے کزن کے فارم ہاؤس سے گرفتار ہو گیا۔ وہ نئے میں دھت اور شراب سے تر تھا۔ اسے بھی قیدیوں کے جہاز ساؤکس کی ایک کونٹری میں دیگر قیدیوں کے ساتھ پھینک دیا گیا۔

ان میں سے کسی بھی قیدی پر فرد جرم عائد نہیں کی گئی تھی۔ محض قتل کے الزام میں قید کیا گیا تھا۔ مقدمہ بعد میں چلایا جاتا تھا۔ انہیں بے پناہ اذیت دی گئی۔ تاہم اسٹینٹن اس برہمی مطمئن نہیں تھا۔ اس نے 23 اپریل کو ایک حکم جاری کیا کہ جہاز پر موجود سارے قیدیوں کے سروں پر کیوس کے بیک پہنائے جائیں اور گردن پر کس دیئے جائیں۔ یہ کیس ماسک جیسے تھے۔ ان میں صرف ناک اور منہ کے پاس سوراخ تھے جن سے وہ سانس لے سکتے تھے اور کھانسی سکتے

دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں۔“ کلارڈ نے ایک سیاہ گلوبند اسے دکھایا جس پر خون کے دھبے تھے۔ ”کیا تمہیں اس پر خون نظر آرہا ہے؟“ لوکس اس خون آلود منظر کو کھورنے لگا۔

اسی وقت مسز سرات اپنے بیڈروم سے برآمد ہوئی۔ لوکس نے وہ خبر اسے سنائی۔ بیوہ مسز سرات یہ سن کر بوکھلا گئی۔ ”اودہ خدایا! مشرودج مین۔“ وہ اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر محوش لہجے میں بولی۔ ”ایسا مت کہو۔“

کلارڈ کو اس کے تاثرات بالکل اصلی لگے۔ مسز سرات نے پوچھ گچھ کے دوران اعتراف کیا کہ اس نے پوتھ کو گزشتہ روز سہ پہر کے دو بجے دیکھا تھا لیکن اس نے زور دے کر کہا کہ اس نے اپنے بیٹے جان سرات کو دودھ پینے سے نہیں دیکھا کلارڈ کو پوتھ اور جان سرات دونوں کو گرفتار کرنا تھا لیکن دونوں ہی اس وقت وہاں موجود نہیں تھے۔ دج مین نے رضا کارانہ پیشکش کی کہ وہ افراد سے تعاون کرنے کے لیے صبح آٹھ بجے پولیس ہیڈ کوارٹر آئے گا اور اس یقین دہانی کے ساتھ سراغ رسال رخصت ہو گئے۔

☆.....☆

وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ مسز سرات کے سر پر قضا ناچ رہی تھی۔ سوموار 17 اپریل کی رات کو واشنگٹن آری فورس کے کمانڈر انچارج جنرل کرسٹوفر نے اس بورڈنگ ہاؤس میں موجود ہر فرد کو گرفتار کرنے کے احکامات جاری کر دیے۔ کرسٹوفر کے آدی پارلر کے باہر انتظار کر رہے تھے۔ اس دوران بورڈنگ ہاؤس کی خواتین اپنے لباس پہن رہی تھیں۔ بعض سپاہی بورڈنگ ہاؤس کے باہر تارکی میں کھڑے تھے۔ رات کے تقریباً گیارہ بج کر بیس منٹ پر فٹ پاتھ پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک راہ گیر اپنے شانے پر ایک کدال اٹھائے ہوئے نمودار ہوا اور بورڈنگ ہاؤس کے سامنے رک کر اس نے کال تیل بجا لی۔ اندر موجود پولیس والوں نے دروازہ کھول دیا اور وہ اندر آ گیا۔ سراغ رسالوں نے اس سے پوچھ گچھ کی تو اس نے جواب دیا کہ مسز میری سرات نے صبح ہی اسے ایک گڑھا کھودنے کے لیے بلا بھیجا تھا۔ پولیس اس سے پوچھ گچھ کر رہی تھی کہ مسز میری سرات کمرے میں داخل ہوئی۔

”کیا تم اس مزدور کو جانتی ہو؟“ ایک سراغ رسال نے نو وارد کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

تجربے کو کبھی نہیں بھول سکا اور کئی سال تک وہ بوتھ کو اپنا بھائی تسلیم کرنے سے انکار کرتا رہا۔ اسٹینٹن کو جب کوئی قابل ذکر سراغ ہاتھ نہ آیا تو اس نے بوتھ کی فیملی کو جیلوں میں ٹھونسنا شروع کر دیا۔

حزبے کی ایک اور بات سامنے آئی۔ جب پورا ملک صدر ٹنکن کے قتل پر سکتے کے عالم میں تھا، بوتھ کی موجودگی کی ایک درجن رپورٹیں ملیں۔ واسٹنٹن کے کئی شہریوں نے دعویٰ کیا کہ بوتھ کو انہوں نے پنسلوانیا ایونیو پر دیکھا تھا۔ نیو یارک کے شہریوں کو وہ براڈوے پر نظر آیا۔ نیا گرافٹو، بوسٹن اور شکاگو سے بھی اسی قسم کی اطلاعات موصول ہوئیں۔ پنسلوانیا میں پولیس نے ایک شخص بوتھ کے گرد گھیرا تنگ کر دیا۔ اس کا پورا نام بھی جان و لیس بوتھ تھا۔ لیکن وہ کوئی اور تھا۔ اس طرح پولیس اس نام کے ایک اور بے گناہ شخص کا ڈائریکٹ سے پیچھا کرتی ہوئی مونٹریال پہنچ گئی اور اسے پکڑ کر دم لیا لیکن وہ بے چارہ بھی کوئی اور بوتھ تھا۔

☆.....☆

17 اپریل 1865ء سے بوتھ کی ملک گیر تلاش نہایت زور و شور سے شروع ہو گئی۔ زیریں میری لینڈ میں پرنس جارج اور چارلس کاؤنٹی کے علاقے دس ہزار گھوڑوں کی ٹاپون سے قمرالٹھے۔ سواروں کو بوتھ کا سراغ لگانے میں تھوڑی سی دشواری پیش آئی۔ ایٹلنس فریش اور پورٹ ٹوبیکو جیسے مقامات پر لگ بھگ آدھے گاؤں والے جان سرات، ڈیوڈ ہیرولڈ، جارج ایڈریوٹ سے واقف لگتے تھے۔ سرات ویل میں سرانے کے مالک لائڈ پراس وقت بجلی ہی گری جب ایک شہ سوار دستہ اس کے ہاں آیا۔ فوج کی اتنی بڑی نفری دیکھ کر اس پر کچھی طاری ہو گئی۔ جب فوجیوں نے اس سے پوچھ گچھ شروع کی تو وہ بلاپس وپش سب کچھ اٹھا گلیا اور یوں چھائی کے پھندے سے بچ کر وفاقی حکام کی گود میں بیٹھ گیا اور حکومت کا سب سے اہم گواہ بن گیا۔

اس نے حلفیہ بیان دیا کہ قتل کی شام سزمیری سرات اس کے پاس آئی تھی اور اس سے کہا تھا کہ اس کے سرانے میں جو اسٹے چھپائے گئے ہیں، ان اسلحوں کی آج رات ضرورت پڑ سکتی ہے اور وہ اسٹے رات میں طلب کیے جاسکتے ہیں۔

لائڈ کی یہی گواہی بعد میں سزمیری سرات کو چھائی پر لگانے کے کام آئی۔ لائڈ نے یہ بھی اقرار کیا کہ قتل کی رات جان بوتھ، واسٹنٹن سے فرار ہوتے ہوئے اس کے ہاں رکا

تھے لیکن دیکھنے اور سننے سے محروم تھے۔ کیٹس کے بیک اوڑھائے جانے کے بعد قیدیوں کی حالت مزید ابتر ہو گئی۔ گردن پر ڈوری کی سخت بندش کی وجہ سے انہیں اپنا دم گھٹنا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ قیدیوں کے سرجن نے اس ظالمانہ اور غیر انسانی سلوک پر اسٹینٹن سے احتجاج کیا کہ قیدیوں کے گلے کی بندش ذرا ڈھیلی کی جائیں تاکہ ان کا دم نہ گھٹ جائے لیکن اسٹینٹن کی طرف سے اس کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ قیدیوں میں سب سے عظیم الجذہ لوٹس پین کے لیے یہ ناقابل برداشت ہو گیا اور وہ باہل ہو گیا۔ اس نے اپنا سر کوشری کی دیوار سے ٹکرا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی۔

ایٹرو سوار تک قاتلوں کی تلاش پھیل کر ملک گیر ہو گئی تھی۔ جو کے ساتھ کن بھی بسنے لگے۔ ایسے بے گناہوں کی گرفتاری بھی عمل میں آئی جو صدر ٹنکن کے قاتل کی بابت کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ انہیں صرف شریک جرم یا معاون ہونے کے شبہ میں گرفتار کیا گیا تھا۔ ریجنل ملٹری پولیس نے ان مشتبہ افراد کو واسٹنٹن روانہ کر دیا۔ جلد ہی نئی پولیس اور دور دراز کے علاقوں کے شہر کی کارروائیوں کے نتیجے میں جیلیں مشتبہ افراد سے بھر گئیں اور پھر بوتھ کے رشتے داروں پر سرکاری ایجنسیاں قہر بن کر نازل ہوئیں۔ بوتھ کی بہن آسیا بوتھ کلارک کا جو پانچ ماہ کی حاملہ تھی، اس وقت نزدیکی ڈاؤن ہوتے ہوئے رہا گیا جب پولیس اسے ہتھکڑیاں پہنا کر کھینچے ہوئے، واسٹنٹن کے برائے جیل میں لے جا کر ڈال گئی جب کہ وہ بالکل بے گناہ تھی۔

اس کے بعد بوتھ کے بھائی جوئیئر پر قہر ٹوٹا۔ وہ قتل کی رات سنٹانی میں ایک ڈراما کر رہا تھا۔ اس دوران ٹنکن کے قتل کی خبر وہاں پہنچی اور مشتعل ہجوم نے اس کے ہوٹل کا گھیراؤ کر لیا۔ وہ بڑی مشکل سے ایک بنگلے راستے سے جان بچا کر بھاگا اور ہمیں بدل کر فرضی نام سے مشرق کی سمت روانہ ہو گیا لیکن 26 اپریل کو فلاڈیلفیا میں گرفتار ہو گیا۔ جب پولیس نے اسے جیل میں ڈالا تو غصے کی شدت سے اس کے منہ سے کوئی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے خانہ جنگی کے دوران شمال کی حمایت کی تھی۔

بوتھ کے دوسرے بھائی جوزف بوتھ کے سر پر اس وقت حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا جب اسے سان فرانسسکو سے نیو یارک پہنچنے ہی ایئر میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس قتل میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ پھر بھی پولیس نے اسے ٹھیک ٹھاک طریقے سے رگڑا اور چند گھنٹوں کے بعد رہا کر دیا۔ وہ اس

تھا۔ چنانچہ قاتل کے فرار کی راہ کا تعین ہو گیا۔

اس جال میں سنسنے والا دوسرا اہم مشتبہ ڈاکٹر سمونیل مل تھا۔ کسی نے لیفٹیننٹ کو ڈاکٹر مل کی تجویز کر دی اور اس نے نانڈ کے سرائے پر چھاپہ مار کر اسے گرفتار کر لیا۔ شروع شروع میں ڈاکٹر مل کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا لیکن پھر اس نے صرف یہ اقرار کیا کہ دو گھڑ سوار 15 اپریل کی رات کے اوٹمن چہر میں اس کے ہاں آئے تھے اور ان میں سے ایک گھڑ سوار کے ٹوٹے ہوئے ٹخنے کا علاج کرایا تھا جو اپنے کھوڑے سے گر گیا تھا۔

”کیا تم انہیں جانتے تھے؟“ لیفٹیننٹ نے چہمتا ہوا

سوال کیا۔

”نہیں، ہرگز نہیں۔ وہ دونوں میرے لیے بالکل اجنبی تھے۔“ ڈاکٹر نے ہرگز زور لہجے میں جواب دیا۔ لیکن جب اس سے سختی سے باز پرس کی گئی تو اس نے اقرار کر لیا۔ ”ہاں وہ بوتھ ہی تھا جس کی ٹانگ کا میں نے علاج کیا تھا اور میں نے دلدل عبور کرنے میں اس کی مدد کی تھی۔“

☆.....☆

اب جال کسا جانے لگا۔ 20 اپریل کو وزیر دفاع اسٹینٹن نے ایک سخت اعلان جاری کیا۔ ”ان تمام لوگوں کو جنہوں نے بوتھ اور ہیر ولڈ کو پناہ دی، ان کی پشت پناہی کی، ان کے سراغ پر پردہ ڈالا، کسی بھی طرح سے ان کی مدد کی یا ان سے تعاون کیا یا ان کے فرار میں مدد دی یا انہیں پوشیدہ رکھا، انہیں صدر کے قتل میں شریک جرم سمجھا جائے گا اور اس کا مقدمہ ملٹری کیمپن میں چلایا جائے گا۔ اسے سزائے موت بھی دی جاسکتی ہے۔“

اس اعلان نے زیریں میری لینڈ میں زبردست سنسنی مہیلا دی۔ لوگ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے ارنے لگے۔ پھر بھی اطلاعات کا سلسلہ جاری رہا۔ پروڈسٹ مارشل جیمو آراو، پیر نے 21 اپریل کو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ کرنل سمونیل کا کس کے ایک ملازم کا کہنا ہے کہ ادھر کچھ دنوں سے کرنل کا کس خود اپنے ہاتھوں سے کھانا پکا کر دلہی علاقے کی طرف لے جا رہا ہے۔ یہ ایک اہم اطلاع تھی لیکن مارشل جیمو کے سراغ رسالوں کو اس تک پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ جب وقاف کا رسالہ کرنل کا کس کے مکان کے چھوڑے دلدلی علاقے میں ہانپا تو بوتھ اور ہیر ولڈ دیائے پوٹو میک کو عبور کر کے ورچینیا

میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ قتل کی رات کے ایک ہفتے کے بعد جمعہ اور ہفتے کی شب کے درمیان کا واقعہ ہے۔ ورچینیا پہنچ کر ہیر ولڈ نے ایک خاتون مسز کوئیزن ہیری کو تلاش کیا جو ایک انڈر گر اوڈ سازش اور اس کی رفتی کار بھی۔ مسز کوئیزن ہیری نے ان دونوں کو چوری جیسے اپنے آدمیوں کے ہمراہ دوسری جگہ بھیج دیا۔ وہاں ان آدمیوں نے انہیں رازداری سے ایک دوسرے گروپ کے حوالے کر دیا۔ اس طرح کئی ہاتھوں سے گزر کر وہ جنگل میں واقع لوکاس نامی ایک سیاہ قلم کے کیمپن تک پہنچے۔

”تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“ لوکاس نے انہیں اپنے سامنے پا کر پوچھا۔

”ہم یہاں رات گزارنا چاہتے ہیں۔“ ہیر ولڈ نے کہا۔

”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ لوکاس نے جواب دیا۔ ”میں سیاہ قلم ہوں اور مجھے سفید قلموں کی مہمان نوازی کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس کے علاوہ میرے پاس صرف ایک ہی کمرہ ہے اور میری بیوی بیمار ہے۔“

جیسا کیمپ کے سہارے کھڑے ہوئے بوتھ نے اپنا مختصر نکال لیا۔ ”بڑھے اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ اس کا لہجہ شفاک تھا۔

بوٹھ لوکاس اور اس کی بیوی بے چوں و چرا کیمپن سے باہر جا کر سیڑھیوں پر بیٹھ گئے اور انہوں نے ساری رات اسی طرح گزار دی۔ صبح میں وہ دونوں لوکاس کے کھوڑے لے کر وہاں سے چلے گئے۔

☆.....☆

سوموار کو ان دونوں بھگوڑوں کی ملاقات تین سپاہیوں سے ہوئی جو بغاوت کا ساتھ دینے والوں میں تھے۔ بوتھ اور ہیر ولڈ نے ان سے اپنا تعارف کرایا اور مدد طلب کی۔ ان میں سے ایک اٹھارہ سالہ کیمپن دلی ایس جیٹ رضا کارانہ طور پر ان کی رہنمائی کرتا ہوا انہیں ورچینیا کے پورٹ رائٹل سے تین میل دور جنوب میں واقع ایک شخص رچرڈ کیمپٹ کے فارم پر لے گیا۔ وہ جگہ واشنگٹن سے اٹھتر میل دور تھی۔ وہاں کیمپن جیٹ نے رچرڈ سے ان الفاظ میں بوتھ کا تعارف کرایا۔ ”یہ میرا دوست جان ولیم بوائلڈ ہے، ایک سپاہی۔ یہ رچرڈ کی جنگ میں زخمی ہو گیا ہے۔ میں بدھ کی مع خود آکر انہیں لے جاؤں گا۔ تب تک ہر طرح سے ان کا خیال رکھنا۔“

لیکن کیپٹن جیٹ بدھ کی صبح کے بجائے منگل کی شام کو اپنا کھوڑا سر پٹ دوڑاتا ہوا رچڑ کے مکان کے بیرون پھانک پر آکا اور اس نے وہیں سے جھج کر بوتھ کو خبردار کیا۔ ”دفاق کے نیلے کوٹ والے فیری سے دریائے رپاہنوک عبور کر کے پورٹ رائل پہنچ رہے ہیں۔“

یہ سن کر بوتھ اور ہیر ولڈ کے ہوش اڑ گئے۔ کیپٹن جیٹ مزید ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جتنی تیزی سے آیا تھا اتنی ہی تیزی سے چلا گیا۔ ابھی کھوڑا ہی وقت گزارا تھا کہ شام کے جھپٹے میں پوری فضا کھوڑوں کی ٹاپوں سے گونجنے لگی۔ فوج کا ایک دستہ بگولے کی مانند رچڑ کے پھانک کے سامنے سے گزرا۔ وہ دستہ کیپٹن جیٹ کے تعاقب میں تھا۔ برآمدے میں کھڑے ہوئے رچڑ کے نوجوان بیٹے ولیم گیرٹ نے یہ منظر دیکھ کر کہا۔ ”یہ لوگ ہتھیار ڈانگ کرین جا رہے ہیں۔“

بوتھ اور ہیر ولڈ بھی کہیں جا رہے تھے۔ گیرٹ اور اس کی فیملی کی اس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے ان دونوں مہمانوں کو ٹوبیکو فارم کے پھوڑے واضح پائسن کے جنگلات کی طرف جاتے دیکھا۔ بوتھ اپنی میسا کھی کے سہارے مضحکہ خیز انداز میں پھدک پھدک کر چل رہا تھا۔ دونوں کتے جنگل میں غائب ہو گئے اور اپنے پیچھے شک و شبہ میں جہلا ایک حیران اور ششدر فیملی کو چھوڑ گئے۔

ان دنوں گیرٹ پاؤس میں کسان رچڑ گھیرٹ کی سالی ہولووے ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ ایک اسکول ٹیچر تھی۔ اس کے مطابق اس کا بھانجا ولیم، ان مہمانوں کے اس عجیب و غریب رویے سے بے حد پریشان ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے ان کے بارے میں تحقیق کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ آس پاس کے لوگوں سے اسے معلوم ہوا کہ نیلے کوٹ والے شہسوار ایک ننگوڑے اور اس کے ساتھی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ واپس آیا تو اس وقت تک بوتھ اور ہیر ولڈ واپس آچکے تھے۔

ولیم نے انہیں دیکھ کر غصے سے کہا۔ ”تم لوگوں کو صبح میں یہاں سے ہر صورت میں جانا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم لوگوں کی وجہ سے میرا باپ کسی مصیبت میں پڑے۔“

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن رات میں جب سب لوگ سونے کی تیاری کرنے لگے تو ایک عجیب بات ہوئی۔ بوتھ نے بالائی منزل پر سونے سے انکار کر دیا۔ وہ بالائی منزل کے سوا کہیں بھی سونے کو تیار تھا۔ چنانچہ ولیم انہیں سلانے کے لیے تبا کو کے کھلیان میں لے گیا اور وہ

جیسے ہی کھلیان میں داخل ہوئے اس نے دروازہ بند کر کے باہر سے قفل لگا دیا اور چابی اپنی خالہ مس ہولووے کو دے دی۔

”یہ چابی کسی کو بھی مت دینا۔“ وہ زور دے کر بولا۔ ”کیونکہ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ یہ دونوں ہمارے کھوڑے چرا کر فرار ہو جائیں گے۔“

یہ معاملہ عجیب اور ناقابل فہم ہے۔ کیونکہ بوتھ کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ اس کے سر کی قیمت ایک لاکھ ڈالر تھی۔ جو بھی اسے زندہ یا مردہ پیش کرتا، اسے حکومت ایک لاکھ ڈالر انعام دیتی۔ دوسرے یہ کہ بوتھ اور ہیر ولڈ دونوں ہی خطرناک حد تک مسلح تھے جس کے سر کی قیمت ایک لاکھ ڈالر ہو، اس نے اتنی آسانی سے کھلیان میں بند ہونا کیسے قبول کر لیا۔ اگر انہیں اس بات کا ذرا سا بھی شبہ ہوتا کہ وہ ٹریپ ہو گئے ہیں تو نہ صرف یہ کہ وہ گیرٹ فیملی کو جان سے مار دیتے یا اپنے رپالور سے دروازے کے قفل کو اڑا کر وہاں سے نکل جاتے لیکن انہوں نے بظاہر کوئی احتجاج نہیں کیا۔

آدمی رات کے وقت ایک اور عجیب بات ہوئی۔ دفاق فوج کے رسالے نے جس کی کمانڈ لیفٹیننٹ ڈوہرنی کے ہاتھ میں تھی، ہانڈلنگ گرین میں اس ہوٹل کو گھیر لیا جس میں کیپٹن جیٹ رہتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے کمرے میں بے خبر سو رہا تھا۔ فوجیوں نے اسے بستر سے اٹھایا اور اس کی گردن پر رپالور رکھ کر کھینچتے ہوئے بالائی منزل سے نیچے لے آئے۔ نوجوان کیپٹن کو گھری نیند سے جگایا گیا تھا اور اس کا ذہن ٹھیک سے کام نہیں کر رہا تھا۔ فوجی فوراً اپنے مطلب پر آ گئے۔ ”بتاؤ تم نے انہیں کہاں چھپایا ہے؟ آج صبح بتادو ورنہ تمہارا بہت ہی برا حشر ہوگا۔“

نوجوان کیپٹن پہلے ہی بغاوت کے جرم میں کافی سزا بھگت چکا تھا اور اب اسے اپنے سر پر قضا ناہتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ وہ فوراً ٹوٹ گیا۔ اس نے انہیں ان کا ٹھکانا بتا دیا جہاں وہ چھپے ہوئے تھے۔ گویا جان بوتھ کے گرد جال مزید تنگ ہو گیا۔

☆.....☆

خواہیدہ مس ہولووے اپنے بیڈ پر ایک جھٹکے سے سیدھی ہو بیٹھی۔ باہر کھوڑوں کی ٹاپوں، جھانپوں کی سرسراہٹ، دروازے کی زنجیر کی پر شور اور دل ہلا دینے والی کھڑکڑاہٹ اور برآمدے میں فوجی بوٹوں کی دھمک سے

پوری فضا تھرا رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے زبردست بھونچال آگیا ہو۔ اچانک جگن کے دروازے پر زور زور سے ککے برسنے لگے۔ لیفٹیننٹ ڈوہرنی کے سپاہی وہاں آدمکے تھے۔

”دروازہ کھولو..... دروازہ کھولو.....!“ باہر سے گرج دار آواز میں فوجی چیخے۔

مس ہولووے نے ایک کھڑکی کے اوپر سرکنے کی آواز سنی اور پھر گیرٹ کی آواز سنا دی۔ ”کون ہے؟“ مس ہولووے بھاگ کر کھڑکی پر پہنچی اور اس نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ ہر طرف فوجی ہی فوجی تھے۔ وہ کلیان میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے اور پھولوں کی کیاریوں کو روند رہے تھے۔

”دروازہ کھولو۔“ انہوں نے دروازے پر بدستور ککے برساتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ”ورنہ ہم اسے توڑ دیں گے۔“

مس ہولووے ہال کی طرف بھاگی۔ اسے اپنا بہنوئی رچرڈ گیرٹ ہانپتا کھینچتا کرتا پڑتا ہوا اپنے اترتا نظر آیا۔ ”رکھو رکو۔“ وہ پکار کر بولا اور جگن کے دروازے کی زنجیر کھولنے لگا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور دروازہ ٹوٹ کر گرنے لگا تھا۔

زنجیر کھلتے ہی دروازہ ایک دھماکے سے پورا کھل گیا اور فوجی دعدتاتے ہوئے گھس آئے۔ ان کے پوش کچڑ میں لت پت تھے۔ چہروں سے بربریت اور سفاکی چمک رہی تھی۔

”ہمیں وہ دو آدمی چاہئیں۔“ لیفٹیننٹ ڈوہرنی دہاڑا۔

”وہ تو چلے گئے۔“ رچرڈ گیرٹ کے منہ سے نکلا۔ لیفٹیننٹ نے اس کا گلہ دبوچ لیا اور اس کا سر دروازے سے گھرا کر اس کی کینٹی پر پڑا اور رکھ دیا۔ ”کیواس بند کرو اور ان ہائیوں کو ہمارے حوالے کر دو۔“ وہ حلق پھاڑ کر چیخا۔ پھر اس نے گردن موڑ کر اپنے آدمیوں کو مخاطب کیا۔ ”اس باغی کو پکڑ کر لٹکا دو۔ پھر شاید یہ اپنی زبان کھولے۔“

فوجیوں نے رچرڈ کو فوراً پکڑ لیا اور کھینچتے ہوئے پورچ کی بیڑیوں کے پاس لے گئے۔ پھر اسے احاطے کے ایک کونے میں کھڑا کر دیا اور موٹے رسوں کا کواٹل نکال کر اس کے ایک سرے پر بچانسی کا پھندا بٹانے لگے۔ رچرڈ کے منہ

سے ایک کترہ نکل گئی۔ فوجیوں نے اسے گھیر رکھا تھا اور وہ ان کے زرخے میں دم بخود کھڑا تھا۔ فرط دہشت سے اس کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ برآمدے میں اس کی بیوی اور بیٹی خوف اور دہشت سے پھٹی پھٹی نظروں سے یہ ناقابل یقین منظر دیکھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے کی رنگت سفید سفید ہو رہی تھی۔ رچرڈ پھر قہر کا نپ رہا۔ پھر جو بیٹی ایک فوجی نے رے کا دوسرا سراورخت کی ایک شاخ کی طرف پھینکا، مس ہولووے کے منہ سے بے اختیار ایک دہشت آمیز چیخ نکل گئی۔ اس موقع پر ولیم کی ذہانت کام آئی۔ اس نے بروقت مداخلت کی۔

”معزز حضرات، میں آپ لوگوں کو وہاں لے چلا ہوں۔“ وہ بولا۔

اگلے ایک منٹ میں فوجیوں نے تمباکو کے اس کلیان کو گھیرے میں لے لیا اور ولیم سے چابی لے کر دروازے کا قفل کھول دیا۔

”باہر نکلو۔“ لیفٹیننٹ ڈوہرنی تھمکانہ لہجے میں گرجا۔ کلیان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اندر جو لوگ تھے وہ اسلحے بھی رکھتے ہوں گے۔ اندر جاتے ہی وہ حملہ کر دیتے اسی لیے فوجی اندر جانے سے ہچکچا رہے تھے۔

جواب نہاد۔

”سنو۔“ ایک فوجی آفیسر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ ”ہم کلیان کو آگ لگا کر ان کی جلی ہوئی لاشیں نکال لیتے ہیں۔“ وہ چیخ کر بولا۔ ”کچھ جھاڑیاں لے کر آؤ۔“

کئی فوجی حکم کی تعمیل میں ذرا ہی دیر میں جھاڑیوں کا بنڈل اٹھالائے۔ انہوں نے اسے کلیان کی دیوار کے ساتھ ڈھیر کر دیا، پھر اس پر کچھ خشک لکڑیاں بھی ڈال دیں۔ ”تم دونوں کے لیے آخری موقع ہے۔“ لیفٹیننٹ نے چیخ کر کہا۔ ”ہم تمہیں پانچ منٹ دیں گے۔“

رات کو جیسے سناٹے نے ڈس لیا ہوا اور وقت کی بغض قسم گئی ہو۔ سب لوگ سانس روکے کھڑے تھے۔ کلیان کے اندر گہرا سکوت تھا۔ اچانک ہتھ کی آواز سنا دی۔ ”تم کون ہو، ہم سے کیا چاہتے ہو؟“

برآمدے میں مس ہولووے شال اوڑھے غم کی تصویر بنی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی کیریں رخسار پر بہنے لگی تھیں۔

کسان رچرڈ گیرٹ اپنی جگہ کسی مجسمے کی طرح ساکت و سامت کھڑا تھا اور بیسیوں رائفلوں کی ٹائلس اس

کا انداز بڑا ہی ڈرامائی تھا گویا وہ اسٹیج پر مرنے کی اداکاری کر رہا ہو۔ ”ماں سے کہتا میں اپنے ملک پر قربان ہو رہا ہوں۔“

لیکن اس نے مرنے میں خاصا وقت لے لیا، بھوکے پیاسے جھکے ہارے، کئی راتوں کے جاگے ہوئے فوجی صبح میں پیٹ بھرتاٹے یا انعام ملنے کی آس میں بوتھ کے مرنے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے رہے۔ بالآخر پوچھنے بوتھ نے دم توڑ دیا۔

☆.....☆

اسے کس نے اور کس کے حکم سے شوٹ کیا کیونکہ اسے ہلاک کرنے کے نہیں بلکہ زندہ گرفتار کر کے واپس لانے کے واضح احکامات تھے۔ کیونکہ وہ نہایت اہم سوالات کا جواب دے سکتا تھا۔ لیکن کے ٹل کی سازش میں لوٹ لوگوں کے چہروں سے نقاب اتر سکتی تھی۔ کئی سوال حل طلب تھے کہ جان سرات کہاں ہے؟ رچرڈ میں کس نے مدد کی؟ واشنگٹن میں کتنے لوگوں نے مدد کی؟ وغیرہ لیکن اب وہ مرجکا تھا۔ کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ کس نے گولی چلائی تھی۔ ایک اطلاع کے مطابق جس پر سب متفق ہیں بوتھ نے خود کشی کر لی تھی۔

لیفٹیننٹ ڈوہرٹی اور اس کے آدمی اپنے انعام کے ساتھ واپس واشنگٹن پہنچنے کے لیے بھینا بہت بے تاب تھے۔ لیفٹیننٹ نے بھاگ کے نزدیک کھڑے ایک گھوڑے کی پیٹ پر سے ایک کبل اتارا اور برآمدے کی طرف لپکا۔ ”لاش کو اس میں لپیٹ دیں۔“ اس نے اپنے ایک ماتحت سے کہا۔

لیفٹیننٹ کے پاس مزید چار قیدی تھے۔ لہذا گھوڑوں کی کئی پڑکی بھی ورنہ ان نیم جاں قیدیوں کو گھوڑوں پر سوار کر کے لے جایا جاتا۔ خانہ جنگی کے باعث دور دراز کے دیہاتوں میں چھڑا گاڑیاں بھی ناپید ہو گئی تھیں لیکن ایک مقامی ٹیکو وینڈ فری مین کے پاس ایک کھٹارا ایسویٹس مٹی جیسے گھوڑے کھینچتے تھے۔ وہ انہیں اور لاش کو بیل چلین میں درپائے پلوٹومیک تک لے جانے پر راضی ہو گیا۔ وہاں سے لاش مٹی میں مفر کر گئی۔

☆.....☆

27 اپریل کی صبح نمودار ہوتے ہوئے یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ہوئی واشنگٹن پہنچ گئی کہ بوتھ کی لاش اسٹیر کے ذریعے لائی جا رہی ہے۔ اس خبر کے پہنچنے ہی

کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ کلیان کے اندر اور باہر ایک بار پھر سٹائٹس لے رہا تھا۔ ”وقت ہو گیا۔“ اچانک لیفٹیننٹ کی آواز سنائے میں کسی کوڑے کی مانند لہرائی۔

جواب میں کلیان کے اندر سے ایک کھکھکاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”مجھے اپنی جان بچانے کا ایک موقع دو۔“ وہ دونوں آپس میں تاریک کلیان کے اندر ایک دوسرے کی مخالفت کر رہے تھے۔ پھر بوتھ جیسے پھٹ پڑا۔ ”تم ایک بزدل ہو جاؤ جاؤ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔“ وہ حلق کے بل چیخا۔ آواز میں وحشیانہ پن تھا۔

چند ہی ثانیے کے بعد دروازے کے پیچھے کھڑکڑاہٹ سی ہوئی۔ پھر ایک آواز سنائی دی۔ ”مجھے باہر آنے دو۔ میں سرٹ کر رہا ہوں۔“

لیفٹیننٹ ڈوہرٹی یہ سن کر دروازے کے بالکل قریب ہو گیا۔ ”جو شخص سرٹ کرنا چاہتا ہے وہ اپنے دونوں ہاتھ دروازے سے باہر نکالے۔“ وہ کھسمانہ لہجے میں بولا۔

لیفٹیننٹ نے اس کی آواز دہرائی اور ایک ہاتھ باہر آیا۔ لیفٹیننٹ نے وہ ہاتھ پکڑ کر ایک شدید جھٹکا دیا۔ قیدی جیسے کے بل گرتے گرتے بچا۔ فوجیوں نے پلک جھپکنے سے پہلے ہی اسے دیوچ کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ ہمیر و لڈ تھا۔ لیفٹیننٹ اسے گھسیٹ کر احاطے کے دوسری طرف لے گیا اور اس نے نہایت چابکدستی سے اسے ایک رے کی مدد سے ایک درخت سے باندھ دیا۔ لیفٹیننٹ کے پاس جھڑپیاں نہیں تھیں۔ سارے فوجی خوشی سے نعرے لگانے لگے۔ ہمیر و لڈ کی گرفتاری پر پچیس ہزار ڈالر کا انعام تھا۔

اب بوتھ، کلیان کے اندر تجھارہ گیا تھا اور بڑھکیں مار رہا تھا۔

فوجیوں نے اس کی بڑھکوں کے دوران جھاڑیوں میں آگ لگا دی۔ آنا فانا کلیان نے آگ پکڑ لی اور پورا کلیان ایک جیسے جگمگتے جہنم میں بدل گیا۔ بھڑکتے ہوئے شعلوں کی تاریخی روشنی میں کلیان کے اندر بوتھ کا بیولا بنجرے میں قید کسی زخمی درندے کی مانند اپنی میسامی کے سہارے ادھر سے ادھر پھرتا پھرتا تھا۔ وہ جدھر بھی جاتا، آگ کے بمیاں شعلے اس کا استقبال کرتے۔ اچانک ایک گولی چلی اور بوتھ سر کے بل زمین پر گر پڑا۔ اسے جلتے ہوئے کلیان کے اندر سے گھسیٹ کر باہر لایا گیا اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ وہ دم توڑ رہا تھا لیکن اس

تھے لیکن ایسا لگتا ہے کہ اسٹینٹن کی سفارش پر اور ملھیا اس کی رضا مندی سے جج ایڈووکیٹ جنرل جوزف ہولٹ نے ٹریبونل کے ان پانچ ججوں سے ایک سمجھوتے کا اہتمام کیا۔ وہ یہ کہ اگر ٹریبونل اتفاق رائے سے مسز سرات کو سزائے موت سنائی ہے، تو صدر جاسن سے رحم کی اپیل کی جائے گی۔ چنانچہ اس سمجھوتے کے تحت پانچوں ججوں نے اس پیشین پر اپنے دستخط کیے اور سفارش کی کہ مسز سرات کی سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا جائے۔ ایڈووکیٹ جنرل جوزف ہولٹ نے یقین دلایا کہ وہ پیشین صدر جاسن کو پیش کی جائے گی لیکن صدر جاسن کے بیان کے مطابق وہ پیشین کبھی اس کی نظر سے نہیں گزری۔ مورخہ 6 جولائی کی صبح صدر جاسن نے ان چاروں کے موت کے پروانے پر اپنے دستخط ثبت کر دیے۔ سزائے موت پر اگلے ہی دن عملدرآمد ہونا قرار پایا۔

مقدمے کا انصرام شک و شبہ کی ایک اور عجیب و غریب دھند میں لپٹا ہوا نظر آتا تھا۔ وفاقی فوجیوں نے دم توڑتے ہوئے بوتھ کی جیب سے اس کی ڈائری برآمد کی تھی اور وہ ڈائری ڈاکٹمن میں اسٹینٹن کے حوالے کر دی تھی۔ اسٹینٹن کا بیان ہے ”میں نے اس ڈائری کا بغور مطالعہ کیا اور اس کے سارے مندرجات پڑھے۔“

اس کے باوجود اس انتہائی اہم ڈائری کو شہادت کے طور پر پیش کیا جاتا تو درکنار مقدمے کے دوران کبھی اس کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ کیا اس میں سازشی لیڈروں کی فہرست تھی؟ وہ ڈائری اسٹینٹن کے حوالے کیے جانے کے بعد عائب کر دی لیکن 1867ء میں وہ محکمہ جنگ کی ایک بھولی بری فائل سے بازیاب ہوئی تاہم اس کے اٹھارہ صفحات عائب تھے جن میں سازش کے آغاز سے لٹکن کے قتل تک کا ذکر تھا۔ وہ صفحات بلیڈ سے کٹے ہوئے تھے۔

☆.....☆

مورخہ 7 جولائی کی صبح احاطے میں پھانسی کا چھندا تیار تھا۔ تماشاخیوں، فوجیوں اور نامہ نگاروں کے چہروں سے پسینہ بہہ رہے تھے۔ وہ دھوپ میں پھانسی کی سزا پر عمل درآمد ہونے کے شہر تھے۔ اسی دوران قید خانے کا دروازہ کھلا اور مسز میری سرات دو پادریوں کے بازوؤں میں جمبوتی ہوئی برآمد ہوئی۔ اس کے بعد جارج ایزیروٹ نکلا۔ اس کے پیروں میں بیڑیاں تھیں۔ بھرہ دلہ برآمد ہوا۔ سب سے آخر میں لوئس پین نظر آیا۔ اس کا چہرہ اٹھا ہوا اور

پورے ڈاکٹمن میں زبردست کھلبلی مچ گئی۔ شہر کے سارے درگاہیں چھوڑ کر اپنے کھوڑوں کی طرف بھاگے۔ شرفاء نے اپنی اپنی بھٹی کو تیار کرنے کا حکم دے دیا۔ ڈاکٹمن کی پوری آبادی اٹھ کر نیوی یارڈ پہنچ گئی۔ پوریا رڈ لوگوں سے کچھا کچھا بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے لیکن لاش کو اتارنے وقت عرشے پر ایک کیڑوں پھیلا دیا گیا تا کہ عوام بوتھ کو نہ دیکھ سکیں۔ اس کے فوراً بعد اس کیڑوں کے نیچے نقیشت کا آغاز ہو گیا۔ اسٹیمر پر موجود کوئی بھی آفیسر ذاتی طور پر بوتھ سے واقف نہیں تھا۔ لہذا ایک عجیب و غریب مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ پر مسئلہ لاش کی شناخت کا تھا۔ اس منہ شدہ لاش کے بال بکھرے ہوئے تھے، آنکھوں میں وحیانیہ پن تھا، دانت غرائے کے سے انداز میں باہر جمنا رک رہے تھے۔ کیا یہ وہی شخص تھا جسے لوگ حسن کا دیوتا کہتے تھے؟ جو بے شمار نازنیوں کے دلوں کی دھڑکن تھا؟ جو ایلیج کا پاپا اور فین کا شہزادہ کہلاتا تھا؟

چونکہ لاش کی شناخت کا مسئلہ محکوک لگتا تھا، لہذا ڈے دار افسران سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ بوتھ کے دوستوں اور رشتے داروں کو لاش کی شناخت کے لیے طلب کرتے۔ اس وقت بوتھ کا بھائی جوئیس بوتھ جوئیز ڈاکٹمن کی پرانی جیل سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن اسے لاش کی شناخت کے لیے طلب نہیں کیا گیا بلکہ بوتھ کی لاش اسی روز انتہائی رازداری سے جہاز سے اتار کر اسلے کے ایک بکس میں رکھ کر دفن کر دی گئی۔

☆.....☆

9 مئی 1865ء کو بوتھ کے شرکائے جرم پر ملٹری کیشن میں مقدمے کا آغاز ہوا۔ اس مقدمے میں یہ موقف اختیار کیا گیا کہ چونکہ صدر کائل کا مندر را چیف اور آری کے سربراہ کی حیثیت سے ہوا تھا چنانچہ یہ ایک فوجی جرم تھا۔ مورخہ 30 جون کو وہ سارے مدعا علیہان جیل کی سازش میں شریک جرم پائے گئے۔ ڈاکٹر سیوکل، ڈے، سیوکل، بل آرملڈ اور مائیکل اولافسن کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ ایڈورڈ اسٹونگر کو چھ سال کی سزا ہوئی۔ لوئس پین، ڈیوڈ ہیرولڈ، جارج ایزیروٹ اور مسز میری سرات کو پھانسی کی سزا دے دی گئی۔ لیکن کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ مسز میری سرات کو لٹکایا جائے گا۔ بہت بعد میں یہ راز کھلا کہ مسز میری سرات کی سزائے موت کے پیچھے ایک گہری سازش کا فرما تھی۔ لریونل کے چار سے پانچ ملٹری جج سزائے موت کے خلاف

شانے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ بے خوف نظر آ رہا تھا۔ ان چاروں کو تختہ دار پر پہنچا دیا گیا۔ جلاد نے پھانسی کے پھندے درست کیے، ان چاروں کو موت کی سیاہ ٹوپی اوڑھائی، گردنوں میں پھانسی کے پھندے پہنائے اور لیور کھینچ دیا۔ اگلے ہی لمحے تختہ دار پر چار لاشیں لٹک رہی تھیں۔ یہ کہنا تو درست ہوگا کہ صدر ابراہام لنکن کے قتل میں ملوث ان تمام سازشیوں کو کبھی فرکار تک پہنچا دیا گیا لیکن یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ انصاف کے تمام تقاضے پورے کیے گئے کیونکہ ایک سازشی اپنے انجام سے صاف بچ نکلا۔ وہ تھا جان سرات۔

اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ وزیر دفاع اسٹینٹن نے جان بوہر کو سرات کو فرار ہونے دیا تھا۔ اسٹینٹن کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ جان سرات بھاگ کر کینیڈا چلا گیا ہے لیکن کسی بھی ملٹری ایجنٹ کو اسے پکڑنے کے لیے نہیں بھیجا گیا۔ چار ماہ کے بعد جان سرات انگلینڈ میں نظر آیا۔ امریکی قونصل نے فوراً اسٹینٹن کو یہ اطلاع بھیجی تو اسے یہ جواب موصول ہوا۔ ”وزیر دفاع سے صلاح و مشورے کے بعد یہ طے پایا ہے کہ جان سرات کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔“

اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد جان سرات کو اٹلی میں اس کی ایک دوست نے پہچان لیا۔ جان سرات نے اسے راز کی ایک بات بتائی۔ ”سازشیوں نے کچھ ایسے لوگوں کے حکم پر یہ کام کیا جو ہنز پرودہ راز میں ہیں۔“

اسٹینٹن کو ایک بار پھر مطلع کیا گیا، جس پر وزیر داخلہ سیوارڈ نے وزیر دفاع اسٹینٹن کو ایک نوٹ لکھ کر بھیجا کہ اس مفرد کی گرفتاری کے لیے آپریشن ایجنٹ بھیجے جائیں۔ اسٹینٹن نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اسٹینٹن کو اس سلسلے میں جتنے بھی خطوط بھیجے گئے۔ ان کا کبھی کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ بالآخر دسمبر 1866ء میں نیوی سیکریٹری ویلس، وزیر داخلہ سیوارڈ کے حکم پر جان سرات کو گرفتار کرنے کے لیے فعال ہو گیا۔ وہ گرفتار کر کے واسٹنگٹن لایا گیا۔ اس پر دو مرتبہ مقدمہ چلا۔ پہلی جوری کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔ دوسرا مقدمہ خارج کر دیا گیا کیونکہ وقت گزر چکا تھا۔ کوئی بھی شخص بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس کی گرفتاری اور اس پر مقدمہ چلانے میں جان بوہر کتنا خفیہ حربے استعمال کیے تھے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ ایسا کیوں کیا گیا؟

☆.....☆

ابراہام لنکن کے قاتل جان ویلس کو تھک کی فیلٹی کی

درخواست پر اس کی لاش فروری 1869ء میں اس کی عارضی قبر سے بائیں مور کے قبرستان میں منتقل کرنی تھی۔ صدر کے احکام کے بموجب اس کی قبر پر کسی بھی قسم کی یادگار نصب نہیں کرنی تھی لیکن جب اس کے تابوت کو بائیں مور کے چیمبر و سٹینٹن کے بار میں کھولا گیا تو ایک بار پھر لاش کی شناخت متنازع بن گئی۔ جو لوگ بوتھ کی لاش کو جلالت میں دفن کیے جانے پر غیر مطمئن تھے، انہوں نے فوراً یہ نقطہ اٹھایا کہ بائیں مور میں کیا جانے والا دانتوں کا معائنہ واسٹنگٹن کے اس دندان ساز کے ریکارڈ سے میل نہیں کھاتا جس نے بوتھ کے دانتوں کا علاج کیا تھا۔ اس پر خاصی بحث ہوئی اور کافی عرصے تک ہوتی رہی۔ اس سمیت چھوٹے بڑے کئی سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی رہی جس کی کوئٹ لگ بھگ ایک صدی تک سنا دی جاتی رہی۔ فاضل مورخین کو یقین ہے کہ بوتھ نیپلی کی طرف سے اس کے باقیات کو قبول کر لینے کے بعد کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی لیکن بڑے بڑے اور نہایت اہم ایٹوز کی بابت کیا کہا جاسکتا ہے۔ ان بے شمار مجرم نامہ سرکاری کارروائیوں اور شواہد کی کیا تو جیہ پیش کی جاسکتی ہے جنہوں نے بلاشبہ اس پورے کیس کو دھندلا رکھا ہے۔

☆.....☆

1926ء میں ابراہام لنکن کے بیٹے رابرٹ ٹوڈ لنکن نے اپنی موت سے پہلے اپنے باپ کے ذاتی کاغذات کے ایک بنڈل کو جلا ڈالا۔ اتفاق سے اس وقت اس کا ایک دوست اس کے ہاں پہنچ گیا اور اس نے ان کاغذات کے بارے میں پوچھ لیا۔

صدر کے بیٹے نے جواب دیا۔ ”یہ کاغذات اور لنکن کے کابینہ کے ایک رکن کی غداری کی شہادتوں پر مشتمل تھے۔ میں نے سوچا کہ ایسی شہادتوں کو تلف کر دینے میں ہی سب کی بھلائی ہے۔“

لہذا اس شخص کو پہچانا شاید کبھی ممکن نہ ہو جو اس بھیاک سازش کا مرکزی کردار تھا لیکن وہ اور اس کے ہماراز جو کوئی بھی رہے ہوں انہوں نے اس شخص کو بے نقاب کر دیا جس نے صدر کو غیر محفوظ کر کے جانے پہچانے سازشیوں کو فرار ہونے کے مواقع فراہم کیے۔ وہ سب کے سب ایک ہی تھالی کے چنے بنے تھے اور امریکا کی تاریخ کے سب سے بڑے جرم کے گواہ تھے۔

انوکھی شادیاں

وسیم بن اشرف

شادی ہر معاشرے کے لیے ایک لازمی امر ہے۔ ہر مذہب و ملت نے اسے ضروری قرار دیا ہے لیکن اس امر کی بجا آوری کے لیے ہر معاشرے میں الگ الگ رسم و رواج ہیں۔ بعض علاقوں کی رسمیں اتنی عجیب اتنی دلچسپ ہیں کہ انہیں پڑھ کر ہی لطف آجائے۔ اب ذرا سوچیں کہ انہیں دیکھنے میں کتنا مزہ آتا ہوگا۔

دنیا بھر سے دلچسپ رسوم شادی کا احوال

رکھا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں دلچسپ، انوکھی، مہنگی ترین اور عجیب ترین شادیوں کا کچھ حال احوال قارئین سرگزشت کی نذر ہے۔

دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنی شادی پر کچھ انوکھا کرنے کے لیے اچھوتا انداز اپناتے ہیں۔ برطانوی شہر سنڈرلینڈ سے تعلق رکھنے والے 43 سالہ کلیرا فیلون اور 38 سالہ پال ورمی کا شمار بھی ایسے ہی افراد میں کیا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا جنہوں نے اپنی شادی پر روایتی پریش گاڑیوں میں سفر کرنے کی بجائے پکرا جمع کرنے والے ٹرک کو ترجیح دی۔ سنڈرلینڈ سٹی کونسل کے لیے پکرا جمع کرنے کا ٹرک چلانے والا یہ جوڑا اپنی ملازمت کی جگہ پر پہلی بار ملا اور ایک دوسرے سے شادی کے عہد و بیان کر ڈالے۔ شادی کی تقریب کو یادگار بنانے کے لیے اس جوڑے نے روزی روٹی کے ذریعے کوئی شادی کے لیے اپنا سفری ذریعہ بنانے کی ٹھانی اور 1 لاکھ 27 ہزار پاؤنڈ بن لوری ویکن کو سجا سنوار کر اس کے ذریعے شادی کے دیوتا تک پہنچے۔

شانداز پریش گاڑیوں یا پھر کھوڑا گاڑیوں اور بھیوں کی

ہر دور میں لوگ کچھ نیا کر کے دکھانے کے خواہشمند رہے ہیں۔ لوگوں کے اندر یہ آرزو جنم لیتی رہی ہے کہ ان کی تعریف اور تحسین کے گن گائے جائیں، شادی بھی زندگی کا ایک ایسا ہی ایونٹ ہے، کچھ لوگ سادگی سے اور کچھ سچ دوج کے شادی رچاتے ہیں۔ ماضی میں اگر شادی کی رسومات عجیب و غریب ہوتی تھیں تو حال میں بھی ایسی ایسی شادیاں ہو رہی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بالخصوص مغرب میں تو شادی کو یادگار بنانے کے لیے لوگوں نے ایسے ایسے اقدامات کیے کہ انسان دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ جاتا ہے، شادی ایک ایسا سماجی بندھن ہے جس سے زندگی میں رونق میلے ہے۔ اس کی بنیاد پر خاندان پھلتے پھولتے ہیں۔ شادی کا بندھن بے حد خوبصورت، پرکشش اور نازک ہوتا ہے۔ ہر قوم و مذہب میں شادی کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ شادی کے موقع پر ہر ملک میں خاندان اپنے اپنے رواج کے مطابق مختلف رسومات ادا کرتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان رسوں کے انداز بھی بدلتے رہتے ہیں مگر اہمیت کسی بھی دور میں کم نہیں ہوئی۔ لیکن کچھ شادیاں ایسی انوکھی ہوتی ہیں کہ انہیں تادیر یاد

بجائے اس انوکھے سچے سجائے ٹرک پر شادی کے استقبالیے تک پہنچنے والے اس جوڑے نے دیکھتے ہی دیکھتے برطانیہ سمیت دنیا بھر میں اپنی منفرد پہچان بنالی ہے۔

شادیاں تو آپ نے بہت دیکھی ہوں گی مگر ایک دوسرے پر گتیں تان کر زندگی بھر ساتھ بھانے کا عہد کرتے جوڑے آپ کو کبھی نظر نہیں آئے ہوں گے۔ جی ہاں امریکی عوام میں آج کل ایک نیا ہی رجحان فروغ پانے لگا ہے وہ یہ



کہ دولہا اور دلہن ہاتھوں میں نیس اٹھائے شادی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جس کے بعد وہ نشانہ بازی کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ جی یہ پینکس لاس ویگاس کے ایک گن اسٹور کی ہے جس کے 300 باؤنڈز کے بیکنج میں گنوں کی فراہمی اور پھر وہی آئی پی شوٹنگ رینج میں نشہ بازی کی مشق کرتا ہے، شاٹ گن ویڈیو نامی یہ شادیاں فائرنگ میں بچوں کے قتل کے واقعات کے باوجود لوگوں میں تیزی سے مقبول ہو رہی ہیں اور اب تک کسی بھی جوڑے نے اس انداز کی شادی منسوب نہیں کی ہے۔ دنیا کے سب سے طویل قد انسان کی شادی کا تذکرہ بھی خوب ہے۔ ترکی سے تعلق رکھنے والے دنیا کے سب سے طویل قد سلطان نے شام سے تعلق رکھنے والی اپنی خوابوں کی شہزادی سے شادی کر لی۔ گواسے ڈھونڈنے میں دیر لگی۔



2.51 میٹر (8 فٹ 3 انچ) طویل سلطان کی بیوی کا قدر 1.75 میٹر ہے، 31 سالہ سلطان تو سین کی شادی 20 سالہ مروی دیو سے مردن صوبے میں ہوئی۔ سلطان نے کہا کہ یہ میری زندگی کا سب سے خوشگوار لمحہ ہے، ان کی بیوی نے امید ظاہر کی کہ ان کے لیے شادی ہمیشہ کی خوشیاں لائے گی۔

دنیا میں معمر ترین جوڑے کی شادی نے بھی تہلکہ مچا دیا تھا۔ پیراگوئے کے ایک ضعیف جوڑے نے اسی سال تک اکٹھے زندگی گزارنے کے بعد مذہبی طور پر شادی کر لی ہے۔ شادی کے لیے عمر کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ شاید یہ دنیا کا معمر ترین جوڑا ہے۔ جس میں دولہے جوڑے مینوئل کی عمر 103 جبکہ دلہن مارٹینا لوپیز کی عمر 99 برس ہے۔ دولہا ویل چیر پر بیٹھ کر شادی کی تقریب میں شریک ہوا۔ اس شادی کی تقریب جوڑے کی گھر کے لان میں ہوئی۔ شادی کی تقریب میں ان کے آٹھ بچوں، چچا، نواسے، نواسیوں، پوتے، پوتیوں، پینتیس پڑپوتے، پڑپوتیوں، پڑنواسے، پڑنواسیوں اور ان کی اگلی نسل کے بیس بچوں نے شرکت کی۔ اس موقع پر پادری نے کہا کہ انہیں نے اس سے پہلے اتنی عمر کے نئے شادی شدہ جوڑا نہیں دیکھا۔ اس جوڑے نے انچاس برس پہلے بھی ایک سول میریج کی تھی لیکن انہوں نے مذہبی طور پر شادی نہیں کی تھی۔ ننانوے سالہ دلہن مارٹینا نے کہا کہ مذہبی شادی پر بہت جذباتی ہو رہی ہیں۔ خاندان نے اس شادی کے بعد ایک پارٹی کا انتظام کیا تھا۔

قلمیں تو بہت سے لوگ دیکھتے ہیں لیکن کچھ لوگ انہیں خود پر اتنا سوار کر لیتے ہیں کہ حقیقی زندگی میں بھی ویسا ہی کرنے

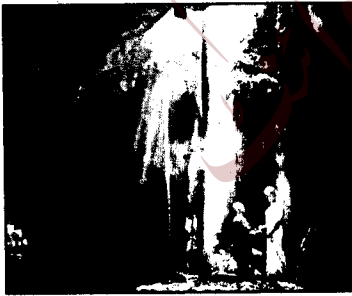


کی کوشش کرتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو امریکی ریاست انڈیانا میں ہونے والی اس انوکھی شادی کو ہی دیکھ لیں جس میں دولہا دلہن سے لے کر وہاں آئے ہوئے مہمانوں نے بھی فلموں میں نظر آنے والے خوفناک کردار ڈومنی بن کر شرکت کی۔ اس



لباس پہن کر آئیں۔

کھیلوں کے ایک شوقین مارٹن لیمبرٹ کی شادی دو ہزار چھ میں برطانیہ کے آئیس ہاکی کے ریک میں ہوئی۔ ایسی ہی ایک شادی سمندر کی تہہ میں ہوئی۔ چیف پارکمنز کی بیٹی لیسلی اور ان کے شوہر بین اپنی شادی کے دن موسم کی طرف سے بالکل بے فکر تھے۔ ان کی شادی امریکا میں سی ایٹل کے علاقے میں سمندر کی سطح کے نیچے ہوئی۔ ایک جوڑے نے برقیلے پہاڑوں پر شادی کا پروگرام بنایا۔ سارا دراکون اور ان کے ہونے والے شوہر نے شادی کی تقریب کینیڈا کے پرنس کولمبیا کے علاقے میں برقیلے پہاڑوں پر انجام دی۔ ایک شادی پر جوڑے نے تیلیوں کو آزاد کرتے ہوئے شادی کے



عہد و پیمان کیے۔ امریکا میں میسچو سیٹس میں 'سیلک شادی' میں ڈیٹھیل، رن میک کی اور برین تھامس تھر برنے تیلیوں کو آزاد کرتے ہوئے شادی کی۔ دسمبر 2010ء میں سیرنیل اور لیسلا وائٹ نے لندن کے مشہور لینڈ مارک لندن آئی کے سائے تلے اپنی شادی کی تقریب منعقد کی۔ دارالحکومت ماسکو میں ایک جوڑے نے شادی سائیکلوں پر کی۔ جبکہ سائنس براؤن اور اکلکارن پلانگ پڈ سائے تھائی لینڈ کے جزیرے پوکھٹ میں سمندر کے کنارے شادی کی۔

ڈراکونی شادی میں شریک مہمانوں نے بھوتوں اور چڑیلوں کا روپ اس مہارت سے وہارا کہ انہیں دیکھ کر واقعی حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ عالمی ریکارڈ قائم کرنے والی شادی بھی کمال کی تھی، یہ شادی سری لنکا میں ہوئی۔ شادی کی اس انوکھی تقریب نے عالمی ریکارڈ توڑ ڈالا۔

دنیا میں بہت سے افراد کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی شادی کی تقریب ایسی شاہانہ ہو کہ لوگ دیکھ کر رشک کریں اور اس مقصد کے لیے لاکھوں روپے خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ سری لنکا میں شادی کی ایک ایسی انوکھی تقریب منعقد ہوئی جس میں تمام ملازمین نے ایک جیسے لباس زیب



تن کر کے عالمی ریکارڈ بنا ڈالا۔ سری لنکا کے دارالحکومت کولمبو میں ہونے والی شادی کی اس تقریب میں 126 خواتین ملازمین، 25 مرد ملازمین، 20 کم عمر ملازمین اور 23 پھول پکڑنے والی لڑکیوں نے شرکت کر کے ایک نیا عالمی ریکارڈ بنایا، سب خواتین اور مرد ملازمین نے سری لنکا کا ایک جیسا روایتی لباس زیب تن کر رکھا تھا، شادی کی تقریب کی مہمان خصوصی سری لنکا کی خاتون اول شراضی راجا پاکس تھیں۔ شادی کی تقریب کا اہتمام کرنے والی ڈریس ڈیزائنر چیمپری وردنے کا کہنا تھا کہ شادی کی ریکارڈ ساز تقریب منعقد کرنا ان کا خواب تھا، گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ توڑنا ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ شادی کی تقریب میں موجود گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے افسران کا کہنا تھا کہ سہیلی جوڑے نے تھائی لینڈ کا 96 خواتین ملازمین کے ساتھ شادی کی تقریب میں شرکت کا سابقہ عالمی ریکارڈ توڑا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ چند منفرد شادیوں کا ذکر بھی ہو جائے۔ ایک شادی میں دولہا دلہن نے شادی کی بھی تہن منائی۔ کرسٹینا میک نکال نے کہا کہ ہماری شادی کی 'تھیم' 'سمندری فزاق' تھی۔ جس میں ہم نے مہمانوں کو بھی دعوت دی کہ وہ ایسا

گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پھول چس کرنا اور شادی کی پیشکش کرنا یہ تو آپ نے بہت سی فلموں میں دیکھا ہوگا لیکن اس نوجوان نے تو ڈرامے کی حد کر دی۔ اس نوجوان نے اپنی دوست کو انوکھے انداز میں شادی کی پیشکش کی۔ چھت کے کنارے پر کھڑا یہ نوجوان بات کرتے ہوئے اچانک چھت سے نیچے گر پڑا اور جب اس کی دوست نے گھبراہٹ اور تشویش کے عالم میں نیچے جھانکا تو شادی کے ایک خوبصورت پروپوزل کی جھڑی اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ ظاہری بات ہے کہ اس انوکھے انداز میں پروپوز کیے جانے کے بعد کون لڑکی ہے جو انکار کر سکتی ہے لہذا یہ خاتون بھی فوراً ہی شادی کے لیے راضی ہو گئیں اور گھنٹی کی انگوٹھی پہن لی۔

”بھارتی تاریخ کی پہلی ترین شادی“ کا حال بھی جان لیجئے۔ گواچل کل ماڈرن شادیاں بھی ہو رہی ہیں۔ آبادی میں چین و بھارت کے مابین مقابلہ جاری ہے اور بھارت اب چین سے آگے نکلنے ہی والا ہے۔ بھارت میں بھی شادیاں



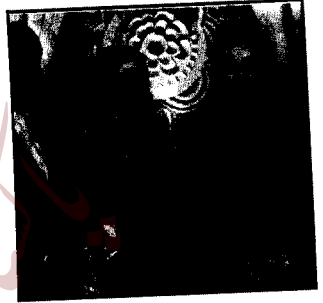
دھوم دھام سے ہوتی ہیں۔ بھارتی تاریخ کی پہلی ترین شادی اب بھی لوگوں کو یاد ہے۔ سال 2011 میں بھارت میں ایک ایسی شادی بھی ہوئی جس کی تفصیلات کسی دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ شادی بھارتی تاریخ کی اب تک پہلی ترین شادی ثابت ہوئی جس میں 15 ہزار بارانی شریک ہوئے جبکہ اس پر کروڑوں روپے کے اخراجات آئے۔ یہ شادی بھارت کی حکمران جماعت کا حکمران کے راہنما کنور سنگھ تنوور کے بیٹے للیٹ سنگھ اور دہن یو گیتا کی تھی۔ دہن کی رخصتی بمبئی کا پٹر میں ہوئی جو اسے جہیز میں دیا گیا تھا۔ شادی میں شرکت کرنے والے ہر فرد کو تحفے کے طور پر 30 گرام سونے اور چاندی کا ایک بیگٹ دیا گیا۔ اس کے علاوہ ہر فرد کو ایک سفاری سوٹ، ایک شال اور 2100 روپے بطور تحفہ دیئے گئے۔ شادی تو شادی دیر سے ہی قلیل ذکر رہا۔ ویسے میں شرکت کے لیے لڑکے

والوں کی طرف سے 11 ہزار افراد کو دعوت نامے بھیجے گئے جبکہ دہن کی طرف سے 7 ہزار افراد کو دعوت دی گئی ہے۔ ویسے میں شرکت کے لیے تمام افراد کو ہوائی جہاز کے ٹکٹ بھی بھجوائے گئے۔ لڑکی کو سلمانی میں ڈھانکی کروڑ روپے دیئے گئے۔ دیر سے نئی دہلی میں ہوا۔ جہیز کی مد میں 21 کروڑ روپے نقد اور 25 کروڑ روپے کا ایک گھر دیا گیا۔ اس گھر میں 11 کروڑ روپے کا سامان پہلے سے موجود تھا۔ بھارت کی روایات کے تحت شادی میں بیٹا باجے والوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا جن پر تقریباً ایک کروڑ روپے بھجوا دیئے گئے۔

نئی شادیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو دنیا کے کونے کونے میں دیکھی جاتی ہیں۔ برطانوی شہزادے پرنس ولیم اور کیٹ میڈلن کی شادی بھی یادگار رہی۔ برطانوی شاہی خاندان کی یہ یادگار شادی دنیا کے کونے کونے میں براہ راست دیکھی گئی۔ یہ شادی تھی ملکہ برطانیہ الزبتھ دوم کے پوتے پرنس ولیم اور کیٹ میڈلن کی۔ شادی میں 600 غیر ملکیوں سمیت 1900 مہمانوں نے شرکت کی۔ دنیا بھر میں شادی کی براہ راست تقریب ٹی وی پر دیکھی۔ سفید رنگ کے عروسی لباس میں ملیں کیٹ میڈلن و پرنس ولیم کا شاہکار تھیں تو شہزادہ ولیم شادی کے موقع پر فوجی وردی میں بہت فخر رہے تھے۔ دنیا بھر کی مشہور لیکن منتخب ہستیاں کی شرکت نے جہاں تقریب کو ایک انوکھا رنگ دیا وہیں دہن کے سادہ مگر انتہائی اسٹائلش لباس نے فیشن کی دنیا میں ایک نیا ٹرینڈ متعارف کرایا، شہزادہ ولیم اور کیٹ میڈلن کی شادی جس قدر دنیا کے لیے ایک حسین و جمیل لمحہ ثابت ہوئی، اسی خاندان سے تعلق رکھنے والے پرنس سوزارا کی شادی اس قدر سادگی سے ہوئی کہ سادگی کے سبب ہی اسے سال کی ایک اور یادگار شادی کا درجہ مل گیا۔ یہ شادی ہوئی نہایت خاموشی، رازداری اور سادگی کے ساتھ۔ حتیٰ کہ اس شادی کا اعلان بھی صرف ایک دن پہلے کیا گیا۔ ملکہ برطانیہ



البرجھ کی پوتی زارا فلیس رگبی کے کھلاڑی مائیک ٹڈل کے ساتھ رشتہ ازدواج میں بندھیں۔ شادی اسکاٹ لینڈ کے مائے ایلن برگ کے ایک چرچ میں انجام پائی جبکہ شادی سے ایک روز پہلے استقبالیہ ایک بحری جہاز پر دیا گیا جس میں شاہی خاندان کے صرف اہم ترین افراد نے شرکت کی۔ ایک حیران کن شادی بھوٹان کے شاہ جگمے کھیسر کی ہے۔ انہوں نے اپنی کالج کی دوست سے شادی کی۔ بھوٹان کے 31 سالہ بادشاہ جگمے کھیسر نے اپنی کالج کی دوست اور ایک عام لڑکی بیٹھن پما سے شادی کی۔ اس شادی کا جشن



مسل 3 روز تک منایا گیا۔ دولہا اور دلہن ایک دوسرے کو 14 سال سے جانتے تھے۔ شادی کی تقریب دارالحکومت پناکھا میں ہوئی۔ جگمے کھیسر بھوٹان کے پانچویں بادشاہ ہیں۔ وہ بکا اور برطانیہ سے فارغ التحصیل ہیں۔ انہیں ہمالیہ کا 11 بادشاہ ”بھی کہا جاتا ہے۔ وہ 2008ء میں تخت نشین ہوئے تھے۔ بیٹھن پما شاہ بھوٹان سے 10 سال چھوٹی

شادیوں کا یہ سلسلہ یونہی جاری ساری رہے گا، آنے والے اپنے دور میں شادیوں کے نئے نئے انداز اپنائیں گے۔ شادی ہر شخص کی زندگی کا ایک ایسا واقعہ ہے، جسے لوگ بھول جاتے ہیں لیکن دولہا دلہن کو یہ دن ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ تان میں بھی ایک انوکھی شادی ہوئی ہے جس کی پہلے کبھی نہیں ملتی، بالی ووڈ کی محبت کی کہانیوں کے برعکس دلہن کا ہندو مذہب اور دولہے کا تعلق مسلمان خاندان سے تھا۔ شادی میں پسندیدگی ضرور مسمیٰ مگر کوئی جبر یا زبردستی ملکہ دونوں خاندانوں کی منشا سے یہ شادی ہوئی۔ میر پور کے معروف ہندو ڈاکٹر کی بیٹی ایک مسلمان لڑکے کو پسند گئی۔ باپ نے بیٹی کی پسند کے سامنے تسلیم ختم کیا۔ بیٹی ادا بہت تبدیل کر کے مسلمان کیا اور پھر اس کی مسلمان

سے شادی کر کے رخصت کر دیا۔ شادی کی تقریب میر پور خاص کے ایک شادی ہال میں ہوئی جہاں دونوں خاندانوں کے افراد نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ شادی کی تقریب کے بعد دلہن کو رسم کے مطابق رخصت کیا گیا۔ واضح رہے کہ ایسی شادی پہلی مرتبہ ہوئی جس میں ہندو اور مسلمان خاندانوں نے اپنے بچوں کی پسند کو ملحوظ خاطر رکھا اور باہمی رضامندی سے ان کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا۔

بھارت میں ایسی کئی شادیوں کے واقعات سامنے آئے جس میں لڑکا مسلمان اور لڑکی ہندو ہوتی ہے، تاہم انہیں پسند ہندو تملناٹھ سے ’لو جہاد‘ قرار دیتے ہیں، چند ماہ قبل بھارتی شہر میسور میں مسلمان لڑکے نے بچپن کی ہندو دوست کے ساتھ دھوم دھام سے شادی کر لی۔ دلہن نے اسلام قبول کیا جس کے بعد دونوں کا نکاح ہوا۔ تقریب میں دلہن کے رشتہ دار بھی شریک ہوئے جس پر ہندو انہیں پسند تملناٹھ سے اور ہنگامہ کیا۔

بالی ووڈ کی محبت کی کہانیوں میں ہمیشہ لڑکا ہندو ہوتا ہے اور لڑکی مسلمان جس کی ایک مثال فلم ’ویر زارا‘ اور ’باجے‘ ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ تینوں خاٹوں (شاہ رخ، سلمان اور عامر) کی شادی یا محبت کا تعلق ہندو خواتین کے ساتھ رہا ہے۔ کرینہ کپور سے شادی کرنے والے سیف علی خان کی بھی مثال سامنے ہے۔

گوجرانوالہ کے علاقے کاموکی میں شادی کے حوالے سے دلچسپ معاملہ سامنے آیا۔ برأت لیٹ ہونے پر ایک براتی دلہن کو بیاہ کر لے گیا اور دولہا نے مہمان آئی لڑکیوں میں سے ایک سے شادی چاہی۔

محکمہ حبیب پور سے تنویر احمد کی برأت مقررہ ٹائم ایک بجے کی بجائے تقریباً دو گھنٹے تاخیر سے 4 بجے محکمہ صابری کا ٹوٹی اڈاکاڑہ میں لڑکے کی خالہ کے ہاں پہنچی تو لیٹ آنے کی وجہ دریافت کرنے پر دولہا تنویر اور دلہن کے بھائی بھولا کی آپس میں سچ کھلائی کے بعد نوبت ہاتھ پائی تک جا پہنچی، جس پر دلہن کے بھائی بھولانے اپنی بہن کا نکاح تنویر سے کرنے سے انکار کر دیا اور دولہا کے ساتھ برأت میں آئے ہوئے قریبی عزیز براتی عثمان سے نکاح کرنے کا اعلان کر دیا جبکہ دلہن کے گھر میں مہمان آئی ہوئی دلہن کی خالہ نے متاثرہ دولہے تنویر سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔

جہاں ہم نے بھارت کی ایک مہنگی ترین شادی کا ذکر کیا وہاں بھارت میں ہی ”پانی کی بیویوں کی کٹھا بچی پڑھ لیں“

شادی کرنی پڑی۔ سکھارام کی تیسری بیوی کی عمر صرف 26 سال ہے اور اس کے پہلے شوہر کی وفات ہو چکی ہے۔ اس کی تین بیویاں ایک ہی گھر میں رہتی ہیں۔ پہلی کے ڈے بچوں کے کام ہیں، جبکہ دوسری گھر کے بانی کا کام کرتی ہے۔ پہلی کی بہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ باقی دووں کی ضروریات کا خیال رکھے ان میں اکثر جھگڑے بھی ہو جاتے ہیں پھر بھی بعد کی دووں بیویاں خوش ہیں۔

اس گاؤں میں لڑکی کی پیدائش پر خوشی منائی جاتی ہے کیونکہ گاؤں والوں کا خیال ہوتا ہے کہ پانی بھرنے کے لیے ایک رکن کا اضافہ ہو گیا ہے۔ تاہم گاؤں کی عورتوں کو اُمید ہے کہ جب ان کی بیٹیاں جوان ہوں گی تو ان کے گاؤں میں بھی پانی کے شل لگ جائیں گے۔

ہندوستان کی بڑی ریاست مہاراشٹر کے بارے میں گزشتہ سال کے سرکاری تخمینے کے مطابق 19 ہزار سے زیادہ گاؤں کے لوگوں کو پینے کا پانی میسر نہیں ہے۔ مہاراشٹر کے اس گاؤں میں پانی بھرنے کا مشقت بھرا کام صرف خواتین ہی کی ذمہ داری ہے۔ ڈینگمل گاؤں میں بنجر زمین کے ایک حصے پر تقریباً 100 کچے گھر موجود ہیں۔ یہاں زیادہ تر کسان کھیتوں میں مزدوری کرتے ہیں اور بہت معمولی آمدنی میں بمشکل گزارا کر پاتے ہیں۔ اس گاؤں کے ایک فرد کا کہنا ہے کہ پانی کے لیے شادی کرنا۔ یہاں کی روایت ہے۔ یاد رہے کہ ایک سے زیادہ شادیاں ہندوستان میں غیر قانونی ہیں لیکن اس گاؤں میں پانی کی بیویاں عام ہیں۔ ڈینگمل گاؤں کے ایک اور فرد نام دیو کا کہنا ہے کہ بڑا خاندان رکھنا آسان نہیں ہے اور خاص طور پر اس صورت میں جب کہ پانی ہی دستیاب نہ ہو۔ نام دیو کی بھی دو بیویاں ہیں۔

آپ نے بھارت کے ایک گاؤں میں پانی کی بیویوں کا دلچسپ احوال پڑھا، اب آپ جانے کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں ان کی شادیوں اور رسومات کا عجیب و غریب رسم و رواج کیا ہے؟ ان شادیوں اور رسومات کا احوال بھی دلچسپ ہے۔ خالی نہیں اور حیرت انگیز بھی ہے۔ ارجنٹینا میں نوجوان شادی کرنے سے کترانے لگے ہیں۔ ایک سرکاری ادارے نے جانب سے جاری کردہ اعداد و شمار جن کی رو سے 1990ء دارالحکومت بوئنس آئرس میں 22000 جوڑے شادی بندھن میں بندھے تھے مگر 2013ء میں یہ تعداد نصف (11642) رہ گئی۔ براعظم جنوبی امریکا میں واقع ملک ہندوستان میں نوجوان شادی کرنے سے گریزاں ہیں مگر پچھلے دو سال

پانی کی بیویوں کے حوالے سے ایک ہندوستانی گاؤں کی انوکھی روایت سے لطف اٹھائیے۔

ہندوستانی ریاست مہاراشٹر کے خشک سالی سے متاثرہ علاقے دوار بھا کے ایک گاؤں ڈینگمل میں کہیں بھی پانی کے نکلنے نہیں نظر آتے۔ اس گاؤں کے لوگ پینے کا پانی ان کنوؤں سے حاصل کرتے ہیں، جو ایک پہاڑ کے نیچے واقع ہے۔ گاؤں کے لوگ یہاں پہنچنے کے لیے گھنٹوں پیدل چلتے ہیں



اور کنویں پر اپنی باری کا انتظار کرنے کے لیے بھی گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس مشکل سے نجات کا حل گاؤں کی بچایت نے یہ نکالا ہے کہ پانی لانے کے لیے گاؤں کے مردوں کو مزید دوشادیاں کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ اس گاؤں کے ایک کسان سکھارام بھگت کی تین بیویاں ہیں، سبکی، سکھری اور بھاگی۔ ان میں سے ایک کو باضابطہ طور پر بیوی کا درجہ حاصل ہے، باقی دو پانی کی بیویاں کہلاتی ہیں۔ پانی کی بیویاں کہلانے سے مراد یہ ہے کہ گھر کے استعمال کے لیے طویل فاصلے سے پانی بھر کر لانا ان کی ذمہ داری ہے۔ سکھارام نے پہلی بیوی کے ہونے کے باوجود دو مزید شادیاں صرف اس لیے کیں تاکہ دووں گھر کے استعمال کے لیے پانی لائیں۔ اپنی تین شادیوں کے بارے میں اس کا کہنا ہے ”میری پہلی بیوی اپنے بچوں کے کام کاچ میں مصروف رہتی ہے۔ پانی لانے کے لیے میں نے دوسری شادی کی تھی لیکن اس کی بیماری کی وجہ سے مجھے تیسری شادی کرنی پڑی۔“ سکھارام بھگت اسی گاؤں میں کھیتوں میں مزدوری کر کے اپنا گزر بسر کرتا ہے۔ اس کے گھر میں روزانہ تقریباً 100 لیٹر پانی خرچ ہوتا ہے۔ کئی چکر لگانے پر یہ ضرورت پوری ہوتی ہے۔ اس نے بتایا، پہلی بیوی شادی کے فوراً بعد حاملہ ہو گئی تھی، اور کنویں سے پانی نہیں لاسکتی تھی چنانچہ دوسری شادی کی، اس کی عمر زیادہ تھی، کچھ عرصے بعد اس کے لیے بھی کنویں سے پانی بھر کر لانا مشکل ہو گیا۔ لہذا تیسری

خاتون کا ہاتھ مانتے کے لیے لڑکے کو اپنے ممکنہ سرکوبیل مچلی کے دانت بطور تحفہ دینے پڑتے ہیں کیونکہ وہاں کے لوگوں کا تو ماننا ہے کہ محبت کا حقیقی اظہار ہی اس وقت ہوتا ہے جب آپ سمندر کے اندر سینکڑوں فٹ گہرائی میں جا کر دنیا کے سب سے بڑے ممالے کے دانتوں کو ڈھونڈ نکالیں۔

کرغیزستان میں دلہنوں کے اغوا کا قصہ بھی عجیب و غریب ہے۔ ایک پرانی کرغیز کہات ہے کہ شادی کے روز آنسوؤں کا بہنا خوش باش شادی کی بنیاد ہوتی ہے اور اس پر عمل کرتے ہوئے وہاں کچھ لڑکے لڑکیاں اغوا کر کے انہیں شاویوں پر مجبور کر دیتے ہیں اور ان کے والدین بھی مجبوراً اس رشتے کو تسلیم کر لیتے ہیں اور یہ روایت 1991ء میں غیر قانونی قرار دیئے جانے کے باوجود زعمہ ہے۔ ویسے دولہا کو اغوا کر کے شادی کرانا..... بھارت میں عام ہے۔ اس کی وجہ جہیز کی لعنت ہے۔ بھاری جہیز دینے کے بجائے اغوا کرنے والے کو تھوڑے سے پیسے دے کر ان کی خدمت حاصل کر لی جاتی ہے۔ لڑکی والوں کو جو لڑکا پسند آتا ہے وہ اسے اغوا کر کے بیٹی سے شادی کرا دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ لڑکوں کو اغوا کار گروپ دھمکی دے دیتا ہے کہ اگر پانچ سال کے اندر تم نے لڑکی کو چھوڑا تو قتل کر دیتے جائے گے۔

دلہن کا منہ کالا کرنے کے حوالے سے آپ نے سنایا پڑھا ہوگا۔ دنیا بھر میں شادی سے کچھ عرصے قبل ہونے والی دلہن اور دولہا کے چہروں کو مختلف طریقوں سے چمکانے کا کام کیا جاتا ہے مگر اسکاٹ لینڈ میں معاملہ بالکل الٹا ہے جہاں



کے لوگوں کا ماننا ہے کہ کسی شادی شدہ جوڑے کا کامیاب آغاز ان کی تذلیل سے ہی ممکن ہے۔ جب ہی تو شادی سے قبل دلہن کا منہ سیاہ یا کالا کر کے اس کی باقاعدہ نمائش بھی کی جاتی ہے۔

”محبت کے تالے“ کی رسم بھی کافی دلچسپ ہے۔ روم

شادی کی تقاریب کے انعقاد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ان تقاریب میں نوجوان بڑھ چڑھ کر شریک ہوتے اور خوب ہلا گلا کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے محبت فارغ عالم ہے مگر کیا آپ کو معلوم ہے کہ دنیا بھر میں محبت کے اظہار کے طریقے بالکل مختلف اور حیران کر دینے والے ہیں؟ یقین نہیں آتا۔ کوئی بات نہیں دنیا کے مختلف خطوں میں محبت سے جڑی یہ روایات آپ کی حیرت کے لیے کافی ثابت ہوں گی بلکہ ہوسکتا ہے کہ آپ ہیرا، نچھایا، بلی، مجنوں جیسی کلاسیک کہانیوں کو بھی بھول جائیں۔ کوریا میں ہر ماہ منایا جانے والا ویلنٹائن ڈے عجیب روایت ہے دنیا بھر میں اکثر افراد محبت کا دن سال میں ایک دفعہ مناتے ہیں مگر بارہ مرتبہ ایسا کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کوریا میں تو ایک صرف چودہ فروری کو ہی ویلنٹائن ڈے نہیں مناتے بلکہ وہ ہر ماہ کی اسی تاریخ کو خصوصاً رومانوی اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ تاہم کبھی انہیں معافی کا دن کا نام دیا جاتا ہے تو کبھی گلے لگانے کا مگر ہر ماہ کی چودہ تاریخ کو منفرد انداز میں محبت کا اظہار ضرور کیا جاتا ہے۔ ایک دلچسپ منظر ملاحظہ فرمائیں۔

بیویوں کو اٹھانے کی ورلڈ چیمپئن شپ ہر سال دنیا بھر کے لوگ فن لینڈ کے گاؤں سوٹا جروی میں جمع ہوتے ہیں جہاں ایک دلچسپ کھیلوں کا مقابلہ ہوتا ہے جس میں مرد



عرات اپنی بیویوں کو کندھوں پر اٹھا کر دوڑتے نظر آتے ہیں اس کے فارغ کو بیوی کے وزن کے برابر مشروب اور نیک کی شمولیت سے نوازا جاتا ہے۔

روس میں قبر کے ساتھ شادیوں کا ذکر بھی حیران کن ہے۔ ماسکو کے معروف نامعلوم فوجی کا مقبرہ شادیوں کا بھی دل ترین مقام ہے جہاں اس فوجی کی قبر کے ساتھ نیا نوپلا ازدواجی بھرتی جھانے کے عہد و میاں کرتا نظر آتا ہے۔ کیا کی کا بہترین تحفہ ڈھونڈنے میں آپ کو مشکل کا سامنا ہے؟ اسوچے کئی میں کیا ہوتا ہے جہاں شادی کے لیے کسی

مہینا مہرگزشت

بل گیٹس کی 5 پیشگوئیاں

بل گیٹس برسوں سے دنیا کے امیر ترین شخص کا اعزاز اپنے نام کیے ہوئے ہیں، جس کی وجہ ان کی کمپنی مائیکروسافٹ ہے۔ تاہم 1999 میں انہوں نے مستقبل کے حوالے سے کچھ پیشگوئیاں کی تھیں جو حیران کن حد تک درست ثابت ہوئیں۔ انہوں نے انسانیت کے مستقبل کے حوالے سے بلا سوچے سمجھے بات نہیں کی تھی بلکہ ٹیکنالوجی کے روزمرہ کی زندگی پر اثرات کو کاغذ پر لکھ کر دیا تھا۔ اور اس وقت اسرارٹ فون کا تو تصور ہی نہیں تھا جبکہ انٹرنیٹ بھی کچھ زیادہ اچھی طرح استعمال نہیں ہو رہا تھا۔ فیس بک کی آمد سے پانچ سال پہلے بل گیٹس نے فیس بک جیسی تخلیق کی پیشگوئی تھی۔ یہاں ان کی ایسی ہی چند پچھ پیچگوئیوں کے بارے میں جانیں جو حقیقت کا روپ اختیار کر گئیں۔

موبائل ڈیوائسز

بل گیٹس نے پیشگوئی تھی کہ مستقبل لوگ ایسی چھوٹی ڈیوائسز اپنے ساتھ لے کر گھومنا کریں گے جو انہیں مسلسل ایک دوسرے سے رابطے میں مدد دے گی، ان کی مدد سے خبروں کو دیکھا جاسکے گا، پرواز کا وقت اور اسی طرح بہت کچھ معلوم کیا جاسکے گا۔ اور یہ اسرارٹ فون کے موجودہ نمچر سے درست ثابت ہو چکا ہے۔

سوشل میڈیا

انہوں نے کہا تھا کہ ایسی ویب سائٹس سامنے آئیں گی جو لوگوں کو اپنے دوستوں اور گھر والوں سے بات چیت میں مدد دیں گی، آسان الفاظ میں بل گیٹس نے فیس بک یا ٹویٹر سے سوشل میڈیا کی آمد کی پیشگوئی کی تھی۔

پڑتا ہے اگر وہ مجھ سے ہوتا یہ اچھا لگتا ہوتا ہے اور شادی کی تاریخ طے کر دی جاتی ہے تاہم ایسا نہ ہوتا تو جوڑے کو کسی اچھے جگر کی تلاش تک مرغیاں ہی کاٹنا پڑتی ہیں۔

اسی طرح شادی کے موقع پر رونا دھونا تو سمجھ میں آتا ہے مگر چین کے نتیجے میں نسل کے افراد شادی سے ایک ماہ قبل ہی روزانہ ایک گھنٹا رو دھو کر گزارنا پسند کرتے ہیں خاص طور پر وہاں پر تو یہ فرض ہوتا ہے جبکہ اس کی ماں بھی دل کرے تو اس مشغلے میں شامل ہو سکتی ہے۔

”خواتین کی بالادستی“ یہ بھی خوب حقیقت ہے کہ دنیا بھر میں اکثر جگہوں پر خواتین کو بچنا سنورا پڑتا ہے تاکہ مرد انہیں زندگی بھر کے تعلق کے لیے جن سکیں تاہم تاہم نا بچر کے دو ڈاڈا بالافولا قبیلہ کا دستور بالکل ہی نرالا ہے جہاں مردوں کو باقاعدہ میک اپ کر کے تیار ہونا پڑتا ہے اور ناچ گ کر خواتین کو متوجہ کرنا ہوتا ہے جو ان میں سے اسے لیے شوہر چنتی ہیں۔

جاپانی ”وائٹ ڈے“ کی رسم بھی خوب ہے۔ جاپان میں ویلنٹائن ڈے پر خواتین مردوں کے لیے چاکلیٹ خریدتی ہیں تاہم ایک ماہ بعد وائٹ ڈے منایا جاتا ہے جس میں مردوں کو اپنی گرل فرینڈ کے نقش کے مقابلے میں دو گنا زیادہ

کے پونے میلو پونامی علاقے میں دنیا بھر سے جوڑے آکر اپنی محبت کی یادگار کے طور پر وہاں ایک تالا لگا جاتے ہیں اور اس کی چابی دریا میں پھینک دی جاتی ہے جو اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ ان کا پیار بھی ختم نہیں ہو سکتا۔

چینی دولہوں کی مشکل کوکون آسان کرے گا۔ چین میں شادی کے بعد دولہا کا دلہن تک پہنچنے کا راستہ اس کی سیلیاں روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور پیسوں سے بھرے سرخ لفافوں کی مانگ کرتی ہیں، جسے پورا کرنے کے بعد بھی دولہا کی مشکل آسان نہیں ہوتی بلکہ اسے مختلف گیمز اور جسمانی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اکثر اسے گانے پڑ بھی مجبور کیا جاتا ہے۔

دیرونا میں جولینٹ کی بالکونی“ کا قصہ بھی مسخو کن ہے۔ کہا تو اسے دنیا کی عظیم ترین داستان محبت جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر سال ہزاروں جوڑے اطالوی شہر دیرونا میں جولینٹ کی اس مشہور مانہ بالکونی کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں جہاں سے رومئو کو خط وغیرہ بھیجتی تھی۔

”چین کی ایک اور عجیب روایت کا ذکر کر رہے ہیں“ محبت میں ایک کاٹنے کا تو سنا ہوگا مگر مرفی کو کاٹنا نہیں؟ مگر چین میں رہنے والے ایک خاص نسل کے افراد میں روایت ہے کہ مکئی کے بعد جوڑے کو ایک مرفی کاٹ کر اس کے جگر کا معائنہ کرنا

کمپوٹنگ ویب سائٹس

ٹیل گئیس کی ایک پیچیدگی یہ تھی کہ کمپوٹنگ ویب سائٹس سامنے آئیں گی جن میں مختلف موضوعات کی آن لائن کیوٹریز تشکیل پائیں گی، اب ریڈیٹ اس کی ایک مثال ہے۔

آن لائن ملازمت کا حصول

ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ لوگ آن لائن جا کر ملازمتوں کو تلاش کر سکیں گے اور اب پاکستان میں نہ ہی مگر متحدہ ممالک میں انٹرنیٹ ملازمت کی تلاش کرنے والوں اور کمپنیوں کے لیے بڑا ذریعہ بن چکا ہے۔ لاتعداد ویب سائٹس ملازمت کی تلاش میں مدد دیتی جاتی ہیں۔

ڈیجیٹل اسسٹنٹ

ٹیل گئیس نے یہ بھی پیچیدگی کی تھی کہ پرنٹل اسسٹنٹ یا سامی تیار کیے جائیں گے جو کہ آن لائن کنکٹ ہو کر تمام ڈیوائسز کو ایک ساتھ جڑ دیں گے، چاہے وہ دفتر میں ہوں یا گھر میں، جبکہ ڈیٹا کا تبادلہ بھی ہو سکے گا۔ اور اب ایسا ہو چکا ہے، گوگل ناڈ مو بائل ڈیوائسز کے لیے ایسا اسارٹ اسسٹنٹ ہے جو اسی سمت پیش قدمی کر رہا ہے، جبکہ آمیزون، ایکیو اور گوگل ہوم وغیرہ بھی اسارٹ ہوم کو کنٹری بنا رہے ہیں۔

مرسلہ: وسیم بن اشرف، ملتان

کلہا کر موٹا کیا جاتا ہے جو مختلف طبی مسائل کا شکار ہو جاتی ہیں۔

”جھاڑو سے کودنا“ یہ بھی شادی کی ایک رسم ہے۔ امریکا کے انتہائی جنوب میں ایک انوکھی روایت ہے جھاڑو سے کودنا جس کا مطلب ہے کہ اوپر سے چلائیے گا کر گزرے جو ان کی نئی زندگی کے کامیاب سفر کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں عجیب و غریب اور انوکھی شادیوں کے بے شمار واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ اب بھی یقیناً ناقابل یقین شادیاں ہوتی ہوئی گی۔

انوکھی شادیوں کا تذکرہ بہت طویل بھی ہے اور حیران کن بھی، پاکستان میں بڑے حیران کر دینے والے واقعات رونما ہوتے ہیں جیسا کہ مئی 1986ء میں چاؤ خان نامی ایک شخص نے رائے ونڈ میں رہائش اختیار کی۔ اس نے کرائے کا مکان حاصل کیا اور بہت جلد اہل محلہ پر اپنا اعتماد قائم کر لیا۔ چاؤ خان اپنی بیٹی کی شادی کرنے کا آرزو مند تھا۔ اس شخص نے کمال خوشیاری سے کام لیتے ہوئے چار مختلف خاندانوں سے اپنی بیٹی کے رشتے کی بات طے کر دی۔ اس نے اس دوران ہر خاندان سے بھاری رقم وصول کر لی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے سب کو شادی کی ایک ہی تاریخ دے دی۔ شادی سے

خارج کر کے تحائف خرید کر دینے پڑتے ہیں تاکہ وہ ثابت کر سکیں کہ وہ بھی محبت میں کسی سے کم نہیں۔ ”بھندے کے ٹیڈ“ کے بارے میں جابے کہ افریقہ کی عربی و افریقی خواتین کی جانب سے محبت کا منفرد اظہار بھندی کے ڈیزائنز کی شکل میں کیا جاتا ہے۔

”شادی سے پہلے علیحدگی“ ہے تاحیرت کی بات۔ طلاق موجودہ دنوں میں کافی عام ہو چکی ہے مگر پھر بھی یہ تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو سکتا کہ عین شادی کے دن ہی یہ تعلق ختم بھی ہو جائے، تاہم یوکرین میں ایسا ہی کچھ لوگ کھاتا ہے جہاں اپنے والدین کی پسند سے ناراض جوڑے شادی کے دن ہی ایک دوسرے سے الگ بھی ہو جاتے ہیں۔

”موٹاپے کا کرشمہ“ یہ ایک دلچسپ روایت ہے کہ شادی سے پہلے وزن کم کرنا کسے یاد نہیں رہتا، مگر جناب افریقی ملک موریتانیہ میں آپ جتنے موٹے ہوں گے اتنے ہی خوبصورت مانے جائیں گے۔ خاص طور پر خواتین پر تو اس فارمولے کا زیادہ اطلاق ہوتا ہے کیونکہ موٹی بیویاں شوہر کے لیے دولت مند کی علامت بھی جانی ہیں تاہم یہ سننے میں جتنا اچھا لگتا ہے اتنا آسان کام نہیں کیونکہ ان خواتین کو زبردستی کھلا

ایک اور حیرت ناک واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔ 2001ء میں جنوبی افریقہ میں ایک خاتون زہمی نے اپنے مردہ شوہر سے دوبارہ شادی کی۔ یہ شادی کا اتنا اونگھا واقعہ تھا کہ لوگوں نے دانتوں کے نیچے انگلیاں دبائیں۔ زہمی کے شوہر کا اس کی غیر حاضری میں انتقال ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس کے گھر والوں نے ایک گرجا گھر میں زہمی اور اس کے آنجنابی شوہر آئزک کو قانونی طور پر میاں بیوی بنانے کی قدیم رسومات ادا کیں۔ رات بھر خوشی کے شادیانے بجائے گئے۔

دنیا کی دس حیرت انگیز شادیوں کا جان کر بھی سر دھنسنے کو جی چاہتا ہے، ان شادیوں کا تذکرہ بھی انکشت بدندان کرنے کے لیے کافی ہے۔ آپ نے انسانوں کی شادیوں کے بارے میں سنا ہوگا اور شرکت چچی کی ہوئی کیا آپ نے سنا ہے کہ کسی نے شادی اپنی من پسند شے سے کی یا پھر خود سے ہی کر لی؟ واقعی یہ سب کچھ آپ کے لیے حیران کن ہوگا؟ یہاں ہم آپ کو چند ایسے ہی لوگوں کے بارے میں بتا رہے ہیں جنہوں نے کسی دوسرے انسان کی بجائے اپنی من پسند شے سے شادی کی یا اگر انسان سے کی بھی تو وہ بھی حیران کن انداز میں اور ان سب شادیوں کی باقاعدہ طور پر تقریبات بھی منعقد کی گئیں۔ 37 سالہ ریٹائرڈ فوجی خاتون سان فرانسسکو میں رہائش پذیر ہیں انہیں بھفل ٹاور سے بہت زیادہ محبت ہے۔ اپنی اس محبت کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے ایک بہت بڑی تقریب منعقد کر کے بھفل ٹاور سے شادی کی اور باقاعدہ قانون کے مطابق اپنے نام کے ساتھ بھفل کا اضافہ بھی کیا۔ ایجا 54 سالہ Eija جرمن خاتون ہیں۔ انہوں نے 1979ء میں برلن وال سے شادی کی۔ ایجا کا کہنا ہے کہ انہیں اس وال سے بے پناہ محبت ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے اس وال کو پہلی مرتبہ سات سال کی عمر میں دیکھا تھا اس کے بعد انہیں اس وال سے محبت ہو گئی تھی۔

ایک جاپانی شخص نے ٹینیڈ ویگم کے کردار سے شادی کی جو ایک لڑکی کا ہے۔ انہوں نے گوام میں باضابطہ طور پر اپنی شادی کی تقریب منعقد کی جس میں انہوں نے قانونی طور پر اس کردار سے شادی کا اعلان کیا جو صرف گیم کا ایک خیالی کردار ہے۔ ایم اے وولف 32 سالہ امریکن شہری ہے۔ انہوں نے فیئر کراؤنڈ رائڈ سے شادی کی۔ یہ رائڈ پٹسلوینا کے لیگو زونٹ پارک میں نصب ہے۔ ”مرحوم دوست سے شادی“ ماگالی اور جو تھن جارج نومبر 2008ء میں شادی کرنے والے تھے۔ ایک موٹر سائیکل ایکٹیوٹ کا فکار ہو گئے

ایک رات پہلے جاؤ خان نے مکان چھوڑ دیا اور نجانے کہاں غائب ہو گیا۔ اگلے دن صبح چار برائیں اس مکان کے باہر اکٹھی ہو گئیں۔ حقیقی صورت حال کا علم ہونے پر بارائیاں نے اپنا سر پیٹ لیا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا مکار شخص اپنا کام دکھا چکا تھا۔

ایک اور دلچسپ واقعہ مئی 1985ء میں پیش آیا شہداد پور سے اورنگی ٹاؤن جانے والی بارات سے دلہن کے والدین نے مطالبہ کیا کہ پانی کے دینکر بھی ساتھ لائے جائیں کیوں کہ یہاں پانی کی انتہائی قلت ہے۔ دلہن کے والدین نے دولہا والوں کو بتایا کہ یہ پانی نہ صرف ذاتی استعمال کے لیے ہوگا بلکہ مقامی لوگوں کے کام بھی آئے گا۔

یکم جنوری 1985ء میں جنوبی افریقہ میں اپنی نوعیت کی ایک انوکھی شادی ہوئی۔ دولہا کا باپ اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا لیکن وہ بیٹے کی برأت میں موجود تھا۔ وہ کیسے؟ 24 سالہ مارک سان گرکی یہ شدید آرزو تھی کہ اس کا باپ بھی اس کی شادی میں شریک ہو لیکن کرکس کے دن اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ دولہا کا کہنا تھا کہ اگر اس کا باپ اس شادی میں شریک نہ ہوتا تو اس کی خوشیاں برباد ہو جائیں گی۔ اس نے سب سے پہلے اپنی مچھتری رضا مندی حاصل کی اور پھر اپنے باپ کے کھلے تابوت کو بارات میں شامل کر لیا۔ جب برائیاں نے یہ منظر دیکھا تو ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

ایک اور انوکھی شادی کا حال بھی ملاحظہ کیجئے۔ یہ قصہ اپنے ہی ملک کا ہے۔ نومبر 1984ء میں پاکستان کے شہر وزیر آباد میں ایک نوجوان کا نکاح ہوا۔ نکاح کے بعد جب دولہا کے دوست اور عزیز واقارب اسے مبارکباد دینے کے لیے آئے تو دولہا میاں غائب تھے۔ مہمانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ دلہن نے رونا دھونا شروع کر دیا۔ دولہا کے والدین انتہائی پریشان تھے کہ ان کے بیٹے نے انہیں کس صورت حال سے دوچار کر دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ اچانک کسی نے بادد لایا کہ وہ شہر میں فٹ بال کا میچ چھیڑ کھلاڑی ہے۔ اس پر تمام لوگ بھاگ بھاگ فٹ بال کے میدان میں پہنچے۔ وہاں ایک عجیب و غریب منظر دیکھنے میں آیا۔ دولہا میاں عروسی جوڑا اپنے ہوئے فٹ بال کو تک لگا رہے تھے۔ دولہا میاں کو سمجھایا گیا کہ بھائی صاحب گھر چلیں اور شادی کی تقریب میں شامل ہوں۔ نکاح کے بعد بھی آپ کا وہاں موجود رہنا ضروری ہے۔ دولہا نے شادی کے شرکاء کی خواہش کا احترام کیا اور ان کے ساتھ واپس گھر چلا گیا۔

جس کے نتیجے میں جو ناخصن چارج کی موت واقع ہوگئی اس واقعے کے باوجود ماگالی نے اپنی شادی کی تقریب منسوخ نہیں کی اور باقاعدہ طور پر اپنے ہونے والے شوہر کی تصویر کے ساتھ شادی کی۔

”نیکے سے شادی“ یہ تو آپ نے سنا ہوگا کہ محبت اندھی ہوتی ہے اور وہ کسی سے بھی ہو سکتی ہے مگر کیا بھی آپ نے اتنی اندھی محبت کے بارے میں سنا ہے جو انسان کو اپنے نیکے سے ہو جائے۔ کو ریا کے رہنے والے لی جن نے اپنے نیکے سے شادی کی جس کے لیے انہوں نے باقاعدہ طور پر ایک تقریب کا اہتمام بھی کیا۔

”سانپ سے شادی“ ایک ہندو خاتون جنہوں نے 2000 افراد کے سامنے 2006ء میں ایک سانپ سے شادی کی۔ اس شادی کا اہتمام ہندو رسم و رواج کے مطابق کیا گیا۔ خاتون شادی کی رسومات کے دوران سانپ کے ساتھ بیٹھی رہیں۔ ہندوستان میں چرند، پرند سے شادی عام ہے۔ لڑکی اگر مالک ہے تو اسے کتے، بلی یا چڑ پودے سے شادی کرنا ضروری ہے ورنہ وہ بیوہ ہو جائے گی۔ ایسا بھ بچن کی بہو ایڈووکیٹ رائے کی شادی پہلے نیم کے بیڑ سے کرائی گئی پھر اگلے دن اصل شادی ہوئی کوکل پرانی شادیوں کی بے شمار تصویریں مل جاتی ہیں۔

”دیکن سے شادی“ ایڈورڈ اسمتھ جنہوں نے اپنی ویلا واکس دیکن ہٹل کے ساتھ شادی کی۔ مسٹر اسمتھ 57 سالہ شخص ہیں ان کا کہنا ہے کہ انہیں پہلی مرتبہ 15 سال کی عمر میں اس گاڑی سے محبت ہوگئی تھی۔

”اسٹیریو سسٹم سے شادی“ ایما 43 سالہ برطانوی خاتون ہیں انہوں نے ایک فائی اسٹیریو سے شادی کی۔ ان کا کہنا ہے کہ انہیں اس سسٹم سے بے پناہ محبت ہے اور وہ اسے جیک کے نام سے پکارتی ہیں۔ ان کے خیال میں جیک ایک مضبوط قابل بھروسہ اور خوبصورت ساتھی ہے۔

شادی میں اعداد کا عمل دخل بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ہم آپ کو چمن لیے چلتے ہیں جہاں شادی میں 9 کا ہندسہ اہمیت کا حامل ہے۔ چمن میں شادی کرنے والے ہندسے دیکھتے ہیں۔ چینی روایت میں 9 کے عدد کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ ان کے علم کے اعداد کے مطابق 9 کے عدد سے تشکیل پانے والے چینی لفظ کا مطلب ہے ”ہمیشہ قائم رہنے والی“ چنانچہ شادی کو پائیدار بنانے کے لیے 9 کے عدد کا بکثرت استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ نے کوئی تحفہ دینا ہے تو 9

کی تعداد پوری کرنا ہوگی مثلاً کوئی جواب دیتا ہے تو 9 سے جوڑ دے گا۔ کسی نے رومال دینا ہے تو 9 عدد ہوں گے۔ کوئی پھل دینا چاہتا ہے تو 9 دانے ہوں گے۔ یہ تو کم از کم ہے آپ نے زیادہ کرنا ہے تو کوئی حد نہیں، آپ 99، 999، 9999، 99999، علیٰ ہذا التیاس کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ مگر 9 کے چکر سے باہر نہیں نکلنا۔ چنانچہ سلاوی وغیرہ بھی اس حساب سے دی جاتی ہے۔ دولہا کی جانب سے دیئے گئے شادی کے کھانے یعنی دعوت ولیمہ میں ویڈنگ ہال کی آرائش قابل دیدہ ہوتی ہے، ہر طرف بکھری سرخی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ گویا پورے ماحول کو بحرہ احمر میں ڈبکی دے کر چمن کے اس قہیے میں رکھ دیا گیا ہو۔ روایتی چینی کھانے میں غیر ملکی مہمانوں کے ذوق و ضرورت کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کی طرح سلاوی کا رواج چمن میں بھی ہے۔ مگر وصولی کا طریق کار انوکھا۔ وصولی ہال کے مرکزی دروازہ پر ہی کی جاتی ہے۔ مہمان ویڈنگ بک پر اپنا نام اور سلاوی میں دی جانے والی رقم کا اندراج کرتے اور سرخ لفافہ انٹیڈنٹ کو تھما دیتے۔ یہاں بھی 9 کے عدد کا رواج ہے۔ سلاوی کی رقم یہ اہتمام 9، 99، 999 یا 9999 روآن پر مشتمل ہوتی ہیں۔ تاکہ بدشگونی کا احتمال نہ رہے۔ رخصتی کا منظر بھی مشرقی رنگ لیے ہوتا ہے۔ لہن کو گاڑی میں بٹھانے کا فریضہ کسی بھائیوان کے ذمہ ہوتا ہے جو شوہر اور بچوں والی ہو اور ماں باپ اور ساس سسر بھی حیات ہوں اس دوران لہن کی بہن یا سہیلی اس پر سرخ رنگ کی قمیض پہنتی ہے اور دوسرے ہاتھ سے اس کی نشست پر مٹھی بھر چاول پھینک دیتی ہے۔ گاڑی کے پیچھے سرخ رنگ کی چھتی اور آئینہ باندھنے کا رواج بھی ہے جسے بدروحوں سے لہن کے تحفظ کا موجب سمجھا جاتا ہے ہمارے ہاں تو رواج نہیں رہا مگر چمن میں آج بھی دلہنیں رخصتی کے وقت آنسو ضرور بہاتی ہیں اور ماں آخری پیار کے بعد اسے چند نصائح کے ساتھ رخصت کرتی ہے۔ چینی دلہنیں مایوں بھی بیٹھتی ہیں۔ شادی سے چند ہفتے پہلے باہر نکلتا چھوڑ دیتی ہیں اور گھر میں زیادہ سے زیادہ وقت والدین، بہن بھائیوں اور سہیلیوں کے ساتھ گزارتی ہیں۔

چمن میں جھنڈ کا رواج بھی ہے۔ جو نئے گھر کی بنیادی ضروریات پر مشتمل ہے جو شادی کے دن سے پہلے دولہا کے گھر پہنچا دیا جاتا ہے۔

چینی شادیوں میں لی شی می بھی ایک خاصے کی چیز ہے۔ ہمارے ہاں شادی کی تقریب میں مختلف مواقع پر ہونے

قدرتی آفات مثلاً زلزلہ، طوفان، فصلوں کو محفوظ رکھنا ہے۔ اس شادی سے ہمارے گاؤں میں ”شادی بنی رہے گی“۔ علاقے کے بیشتر کاشت کار لوہا اور روٹی اگاتے ہیں اور ان کی زندگی کا دارومدار ہی اچھی فصل پر ہے۔ گجگ اور پرکاش کی شاہانہ شادی میں گاؤں اور قریبی علاقوں کے 5000 افراد نے شرکت کی۔ گجگ کو خصوصی طور پر تیار کردہ دہنوں والی ساڑی، ہار اور پھول پہنائے گئے اور میک اپ بھی کیا گیا۔ دوسری جانب دولہا یعنی ”پرکاش“ کی شان بھی نزائی تھی۔ آراستہ پیراستہ بھی میں ملٹی ٹکڑو شیروانی اور اورنگ پکڑی میں پرکاش بھی کچھ کم خوبصورت نہیں لگ رہا تھا۔ شادی کی تمام رسومات ساہوچی نے روایتی انداز میں ادا کیں۔ ان رسومات میں ہلدی، گنیش پوجا، منڈپ اور اگنی کے گرد پھیرے بھی شامل تھے۔ شادی کے بعد پٹواری جی خوشی سے پھولے نہیں سمار رہے تھے۔ پھیروں کے بعد ناچ گانے اور کھانے پینے کا سلسلہ کئی گھنٹوں تک چلا جس میں سب نے دل کھول کر حصہ لیا۔

مہنگی اور عجیب و غریب شادیوں کے احوال کے دوران ملتان میں 2017ء میں ہونے والی اس سستی ترین شادی نے بھی سب کو حیرت کر لیا۔ ملتان میں دو مہنگی شادیوں کے بعد ایک سستی اور انوکھی شادی ہوئی جس میں شادی کے لیے دولہا میاں تیار ہو کر باتاریوں کے ساتھ میٹرو بس میں سوار ہو کر دہلیا لیے بیچے اور وہاں بالوشاہی اور پانی سے تواسنح کے بعد دہلیا لے کر گھر واپس آ گئے۔ دولہا نے شادی کے لیے چھوٹے گئے انوکھے کارڈ میں تمام مہمانوں کو وقت پر پہنچنے کی تلقین بھی کر ڈالی اور کارڈ پر یہ بھی درج کیا کہ اس کے ماموں قدیر میٹرو کے سیکے ہائیں گے۔

ملتان کے علاقے منظور آباد میں دو لہے میاں نے پہلے تو یہ انوکھا کارڈ چھو لیا اور پھر برأت کے ساتھ میٹرو اسٹیشن پہنچ گیا۔ سفید شلوار قمیص پر کالی واسکت زیب تن کیے دولہا رمضان میٹرو اسٹیشن پہنچا تو ماموں قدیر نے وعدے کے مطابق باتاریوں میں سکے تقسیم کیے اور یوں برأت شاہر کن عالم اسٹیشن پہنچ گئی۔ دولہا میاں ماموں قدیر کے ساتھ 62 باتاریوں پر 1240 روپے کا خرچ کرنے کے بعد دہلین کے گھر پہنچے تو نکاح ہوا جس کے بعد میٹرو بس پر آئی بارات کی صرف بالوشاہی اور پانی سے ہی تواسنح کی گئی۔ دفاتی دارالحکومت اسلام آباد میں چچی ایک انوکھی شادی نے مغلیہ دور کی یاد تازہ کر دی۔ ایک بڑے مذہبی گھرانے کے بیٹے کی شادی میں پولیس اور انتظامیہ

والے خرچوں کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ جیسے سلائی، منہ دکھائی، رخصتی خرچا وغیرہ۔ چچی ان سب مواقع کے اخراجات کے لیے صرف ایک جادوی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ”لی ٹی منی“ لی ٹی کا مطلب ہے ”Good luck“ ”for ever“ یعنی دائمی خوش بختی۔ لی ٹی منی سے دولہا بھی مبرا نہیں۔ برأت روانہ ہوتی ہے تو دولہا لی ٹی منی الگ سے سرخ رنگ کے لفافے میں رکھ لیتا ہے۔

بھارت میں مہنگی ترین شادی کا تذکرہ ہو چکا، اب ایک عجیب و غریب شادی کا حال بھی جان لیجے۔ شادی پر 10 لاکھ روپے، یعنی یوں کہہ لیجے 10 ہزار پاؤنڈ کا خرچا آیا۔ یہ وہ رقم ہے جس میں برطانوی جوڑا بہت شاندار طریقے سے شادی رچا سکتا ہے۔

کہتے ہیں جوڑے آسمانوں پر بنے ہیں۔ لیکن بھارت میں ایک ایسے انوکھے جوڑے نے شادی رچائی جو آپ نے شاید پہلے کبھی نہ دیکھی ہو اور نہ سنی ہو۔ شادی کا نام آتے ہی ڈھول، تاشے، زرق برق کپڑے پہنے برأت کے آگے ناچے گاتے براتی، آتش بازی اور حرے حرے کے کھانوں کا خیال آتا ہے۔

بھارت میں بھی ایک ایسی ہی شادی کی تقریب ہوئی جس میں یہ سب روتی میلہ اور ہلا گلا تو ہوا، لیکن یہ سب کچھ دوسری شادیوں سے کچھ الگ اس طرح تھا کہ اس شادی میں



برأت کا دولہا ”بتیل“ جبکہ دہلین ”گائے“ تھی۔ اس انوکھی اور دلچسپ شادی کا احوال کچھ یوں ہے کہ شادی پر 10 لاکھ روپے یعنی یوں کہیے 10 ہزار پاؤنڈ کا خرچہ آیا۔

یہ شادی کروائی کس نے اور کیوں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ گائے ”گجگ“ اور بتیل ”پرکاش“ کا بیہ رچانے والے ریاست مدیہ پردیش کے شہر اندور کے قریبی رہنے والے لنگا کے مالک گوپال پٹواری۔ گوپال کا کہنا تھا کہ شادی کا مقصد

نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی، یوں تو شادی کی تقریبات میں دکھاوا ہمارے معاشرے کا دستور بنتا جا رہا ہے مگر کچھ ایسی تقریبات بھی ہیں جن پر نہ چاہئے ہوئے بھی قلم اٹھ جاتا ہے۔ وفاقی دارالحکومت کی شاہراہوں پر گھوڑوں کی بکلی میں سوار یہ نوجوان راولپنڈی کے معزز مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اسلام آباد کی تاریخ کی یہ شاید پہلی شادی ہوگی جس کے لیے ہائی سیکورٹی زون میں واقع قائمہ اشارہوں تک پہنچنے کے لیے راولپنڈی اور اسلام آباد کی سول انتظامیہ اور پولیس نے دی آئی پی ٹی کلر کو فروغ دینے میں اپنی ڈیوٹی خوب نبھائی اور برائت کے لیے تمام راستے بند کر کے پروٹوکول دیا گیا بلکہ اسلام آباد کی ضلعی انتظامیہ نے تو اپنے آفیسر بھی تعینات کیے تاکہ پروٹوکول میں کوئی کمی نہ رہ جائے، انوکھی شادی کے تمام راستے صاف کرنے والے اسلام آباد پولیس اور سول انتظامیہ کے افسران حیرت انگیز طور پر گھوڑوں اور ادھنوں کی آمد سے لاطمی کا اہتمام کرتے رہے۔ سعودی عرب میں شادی کی ”انوکھی ترین“ تقریب کا حال بھی قابل ذکر ہے۔

سعودی عرب کے علاقے الجوف میں ایک انوکھی اور غیر روایتی انداز کی شادی دیکھنے میں آئی جہاں دولہا ایک ”ٹرالر“ میں سوار ہو کر اپنے دوستوں کے ہمراہ شادی کی تقریب میں پہنچا اور تمام لوگوں کو حیران کر ڈالا۔ شوشل میڈیا پر مذکورہ شادی کا ویڈیو کلپ پورے زور و زور کے ساتھ گردش میں رہا۔ سعودی حلقوں کی جانب سے اس کو مملکت میں ”انوکھی ترین“ شادی قرار دیا جا رہا ہے۔ یاد رہے کہ سعودی عرب کی شادیوں میں دولہا کی بہت بڑی سواری میں آمد کو انوکھا اور غیر مانوس امر شمار کیا جاتا ہے۔ ویڈیو کلپ میں دولہا کو شادی ہال کے اندر ایک بڑے ٹرالر ٹرک میں سوار ہو کر داخل ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے جب کہ دولہا کے عزیز و اقارب اور دوست اس کو مبارک باد دینے کے لیے ایک جانب ہو گئے۔

نئی شادیوں کے لیے ایک ہی دن میں چار بیویوں کو طلاق کا معاملہ دلچسپی سے خالی نہیں، یہ واقعہ بھی سعودی عرب کے شہر جدہ میں پیش آیا۔ ایک سعودی شہری نے نئی شادیاں کرنے کے لیے اپنی موجودہ چاروں بیویوں کو ایک ہی دن میں طلاق دے دی لیکن نئی شادیاں کرنے میں بھی ناکام رہا جبکہ سابقہ بیگمات سے دوبارہ شادی کرنے کے لیے اسے ایک لاکھ ساٹھ ہزار سعودی ریال بطور جہیز دینا ہوں گے۔ نوزدیب سائٹ ایمریش 24/7 نے سعودی میڈیا کے حوالے سے لکھا کہ طلاقیں کی یہ انوکھی کہانی شوشل میڈیا پر پھیل

گئی، چار بیگمات کے شوہر نے چار نئی بیگمات لانے کے لیے پہلے سے موجود چاروں خواتین کو طلاق دینے کا فیصلہ کیا تاہم جب وہ نئی خواتین سے شادی کرنے میں ناکام ہوا تو پہلی بیگمات سے دوبارہ شادی کا فیصلہ کیا لیکن اب سابقہ بیگمات نے بھی جہیز کا مطالبہ کر دیا جو تقریباً ایک لاکھ 60 ہزار سعودی ریال (تقریباً 44 لاکھ 63 ہزار پاکستانی روپے) بنتے ہیں۔

آرکیسٹرا کا بندوبست نہ ہونے پر شادی کے ٹوٹ جانے کا انوکھا واقعہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ بھارت میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر شادیاں ٹوٹنا روزانہ کا معمول بن گیا ہے لیکن اس بار آرکیسٹرا کا بندوبست نہ ہونے پر شادی کے ٹوٹ جانے کا انوکھا واقعہ پیش آیا ہے۔ ریاست اتر پردیش کے ضلع وارانسی (بنارس) کے چولا پور گاؤں میں شادی کی تقریب کے لیے دولہا اور دلہن والوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت تقریب کے لیے دولہا دالوں کی جانب سے ڈی جے کا بندوبست کیا جانا تھا لیکن دلہن کے والد ڈی جے پر فارمنس کا مطلب آرکیسٹرا سمجھ بیٹھے۔ لڑکی والے جب تقریب میں پہنچے تو لڑکے والوں نے ان کا بھرپور استقبال کیا اور ساتھ آئے لوگوں نے دیگر مہمانوں کے ساتھ مل کر ڈی جے کے گانوں پر خوب رقص کیا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد دلہن کے والد نے آرکیسٹرا کا بندوبست نہ ہونے پر شوہر چٹان شروع کر دیا اور شادی ختم کرنے کی دھمکی بھی دی۔ انہوں نے الزام عائد کیا کہ دولہا والے اپنے وعدے کی خلاف ورزی کر رہے ہیں جس پر مہمانوں نے مداخلت کی اور دونوں کو معاملہ سلجھانے کی ہدایت کی تاہم دلہن کا والد اپنی ضد پر اڑا رہا اور شدید ضد بحث کے بعد شادی ہی ختم کر ڈالی۔

یہ محبت کی انوکھی داستان ہے کہ 16 سالہ لڑکے کی 73 سالہ خاتون سے شادی ہو گئی۔ انڈونیشیا میں روایات اور قانون کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک نوجوان نے 70 سال کی مفر خاتون سے شادی کی۔ اس بات کا انکشاف اس وقت ہوا جب شادی کی ویڈیو آن لائن وائرل ہو گئی۔ نوجوان دو لڑکے کی عمر 16 سال ہے اور قانونی طور پر اسے شادی کرنے کا حق نہیں ہے۔ بہر حال جب گاؤں کے لوگوں اور حکام نے اس شادی کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تو جوڑے نے خود کشی کی دھمکی دی۔ اس کے بعد حکام نے بغیر رجسٹریشن کے شادی کی اجازت دے دی۔ انڈونیشیا قانون کے مطابق شادی کے لیے خواتین کی عمر 16 سال اور مردوں کی عمر 19 سال ہونی چاہیے۔ دونوں میں اس وقت قربت بڑھی جب

لمیر یا میں جتلاڑ کے کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بزرگ عورت نے سنبھالی۔ جنوبی سائرا کے اس گاؤں کے سربراہ سک اپنی نے بتایا کہ ”چونکہ لڑکے کی عمر کم تھی، اس لیے ہم نے شادی کی اجازت بغیر رجسٹریشن کے دے دی۔“ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ”ایک غیر اخلاقی عمل کو روکنے کے لیے دو جولائی کو یہ شادی ہوئی۔ لڑکے کا نام سلامت جبکہ ان کی اہلیہ روہیا کی عمر 73 سال تھی۔“ اطلاعات کے مطابق لڑکے کے والد کی کئی سال پہلے موت ہو چکی تھی جس کے بعد اس کی والدہ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ روہیا کی یہ تیسری شادی ہے اور ان کی پہلی دو شادیوں سے کئی بچے بھی ہیں۔

ایک اور واقعہ بھی آپ کی دلچسپی کا سامان لیے ہوئے ہے۔ دولہا کو ڈانس کرنا مہنگا پڑ گیا، دلہن نے شادی سے انکار کر دیا۔ بھارت میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر شادیاں ٹوٹنا معمول بن گیا ہے لیکن اس بار دولہا کے ڈانس کرنے پر شادی کے ٹوٹ جانے کا انوکھا واقعہ پیش آیا ہے۔ بھارتی ریاست اتر پردیش کے علاقہ شاہ جہان پور میں ایک دولہے نے اپنی شادی کے دوران اچانک تانگن ڈانس شروع کر دیا۔ اسے یہ حرکت اتنی مہنگی پڑی کہ دلہن نے شادی سے ہی انکار کر دیا۔ نشے میں دھت دولہا جیسے ہی برأت لے کر دلہن کے گھر پہنچا تو اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور سڑک کے بچوں بچ لوتے ہوئے تانگن ڈانس کرنا شروع کر دیا۔ دلہن پر اپنا نکارتابی کو جب یہ سب واقعہ معلوم ہوا تو اسے بہت شرمندگی ہوئی اور اس نے فوری طور پر اپنے والدین سے کہہ دیا کہ وہ ایسے شخص سے کسی صورت شادی نہیں کرے گی۔ دونوں خاندانوں نے دلہن کی بہت منت سماجت کی کہ وہ شادی سے انکار نہ کرے تاہم دلہن اپنے فیصلے پر قائم رہی، یوں دولہے میاں کی ایک چھوٹی سی غلطی ان کی عمر بھر کا بچھتا واہن بنی۔

سنگاپور میں بھی عجیب واقعہ رونما ہوا۔ سنگاپور سے تعلق رکھنے والا ایک جوڑا گزشتہ دو سال سے اچھی بھلی ازدواجی زندگی گزار رہا تھا مگر حال میں ہی شوہر نے ایک ایسا کام کر ڈالا کہ حکومت نے مداخلت کرتے ہوئے ان کی شادی کو غیر قانونی قرار دے دیا ہے۔ شوہر نے اپنی جنس تبدیل کروائی تھی اور تبدیلی جنس کے بعد اپنے شہاخی کارڈ کو بھی تبدیل کروایا اور اس پر اپنی جنس عورت لکھوائی تھی۔ جب متعلقہ محکمے کو معلوم ہوا کہ میاں بیوی دونوں کی جنس عورت ہے تو ان کی شادی کو غیر قانونی قرار دے دیا۔

سنگاپور کے قانون کے مطابق شادی شدہ جوڑوں کو

پہلی بار رہائش گاہ خریدنے کی صورت میں حکومت کی جانب سے رعایت ملتی ہے، جسے حاصل کرنے کے لیے اس جوڑے نے بھی اپنی معلومات متعلقہ محکمے کو دی تھیں لیکن اس کوشش میں ان کی اصل حقیقت سامنے آ گئی۔ حکام کا کہنا ہے کہ سنگاپور کے قانون کے مطابق شادی ایک عورت اور مرد کے درمیان ہو سکتی ہے لہذا یہ جوڑا میاں بیوی قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی انہیں گھر خریدنے کے لیے حکومتی رعایت حاصل ہو سکتی ہے۔ دیگر ترقی یافتہ ممالک کے برعکس سنگاپور نے ہم جنس شادیوں کو تا حال قانونی قرار نہیں دیا۔ سنگاپور کے وزیراعظم کا کہنا ہے کہ یہ ملک ابھی ہم جنس شادیوں کو قانونی قرار دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ذکر پھر بھارت کا آ گیا ہے، کبھی ڈانس پر شادی سے انکار اور کبھی گولکا کھانے سے دلہن روٹھ گئی۔ دولہے کے سہکے کھانے پر شادی کے ٹوٹ جانے کا انوکھا واقعہ پیش آیا ہے۔ جی ہاں ریاست اتر پردیش کے مرارتی گاؤں میں شادی کی تقریب میں دولہے کو گولکا چٹانا مہنگا پڑ گیا اور دلہن نے اسی وقت شادی سے انکار کر دیا۔ دولہا شادی کی رسومات کے دوران گولکا کھارہا تھا جو اس کی دلہن کو ذرا نہ بھایا اور دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے شادی سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر لڑکی کے گھر والوں نے بہت سنبھالائیں لیکن دلہن اپنی ضد پراڑی رہی، شدید ضد بحث کے بعد شادی ہی ختم کر ڈالی۔

پاکستان میں بھی ایک واقعہ سنئے اور سر دھنئے۔ رواں برس 21 جنوری کو حیدر آباد پاکستان میں گدھے گدھی کی شادی کر دی گئی۔ ”حیدر آباد میں انوکھی شادی کا اہتمام کیا گیا ہے۔ حیدر آباد کے رہائشیوں نے ایک انوکھی شادی کا اہتمام کیا۔ رہائشیوں کی طرف سے گدھے کو دولہا اور گدھی کو دلہن بنایا گیا۔ گدھا گاڑی بان نے اپنے لاڈ لے گدھے کو دولہا بنا کر اپنے دوست کی گدھی سے شادی کروادی۔ گدھا اور گدھی کی شادی کے لیے کئی گدھا گاڑی بانوں نے مل کر خصوصی اہتمام کیا اور خوب مزہ ہلا گلا گیا۔

شادیوں کے ان حیران کن واقعات میں ایک دلچسپ واقعہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ ایک شخص نے ”جل پری“ کو شادی کی پیشکش کر دی۔ اس جوڑے نے ایک دوسرے سے محبت ایک نئی ”گمراہی“ پر پہنچا دیا ہے۔ جی ہاں امریکی ریاست ٹیکساس سے تعلق رکھنے والے لاریک مارش نے اپنی گرل فرینڈ کئی رہتی سی میکسیکو کے علاقے ریور یا مایا میں تعطیلات کے دوران زندگی بھر کے ساتھ کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس جوڑے

شادی ہمارے لیے درست انتخاب نہیں، اگرچہ ہم اپنے اس خاص دن کو گھر والوں اور دوستوں کے ساتھ شہر کرنا پسند کرتے، مگر ہم دونوں نے اس خیال کو اپنایا کہ ان حیران کن تعطیلات کے دوران شادی کے بندھن میں بندھا جائے۔ اگرچہ یہ شادی کے لیے دنیا کا بلند ترین اور غیر متوقع مقام سمجھا جاسکتا ہے مگر جوڑے نے امریکی روایتی عروسی لمبوسات پہننے کو ترجیح دی۔ جیمو نے سوٹ جبکہ لمبٹل نے سفید رنگ کا روایتی عروسی لباس زیب تن کیا، ان کی اس تقریب کو ایک ایڈوجر وڈنگ فوٹو گرافر چارلسٹن چرلے نے کیرے کی آنکھ میں محفوظ کیا۔ فوٹو گرافر نے اپنی ویب سائٹ پر ایک بلاگ پوسٹ میں اس تقریب کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا ”مفر کے آغاز میں بہت زیادہ برقی باری ہو رہی تھی، ہمارے گائیڈ کے مطابق



ہمارے اوپر پورے موسم سرما سے زیادہ برف گر سکتی ہے، 14 ہزار فٹ کی بلندی پر درجہ حرارت منفی 8 سے 10 فارن ہائیٹ تک گر گیا تھا اور ہمارے ہاتھ دستاؤں سے نکلنے ہی بجھد ہو جاتے، جیسا کہ تصاویر لینے کی کوشش کے دوران میرے ساتھ ہوا۔“ انہوں نے لکھا ”جیمو اور لمبٹل کی شادی منفی پانچ سے پانچ ڈگری فارن ہائیٹ کے دوران ہوئی، وہیں کے عروسی لباس کے لیے ہم نے خصوصی طور پر انتظام کیا کہ وہ گرم رہے۔“ تاہم تمام مشکلات کے باوجود شادی کی تقریب کا انعقاد ہوا۔ فوٹو گرافر کے مطابق جب ہم بیس کمپ پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ ہمارے پاس ڈیڑھ گھنٹا ہے جس کے دوران کھانا، شادی، سامان یاغداد اور ہیلی کاپٹر پر سوار ہونا ہے، تو ہم نے ایک گھنٹے کے اندر کھانا، پینا اور شادی کی تقریب نمنائی جس کی ہم نے چند تصاویر بھی لیں۔“

چار مرتبہ شادی کرنے والے میاں بیوی کا تذکرہ بھی حیران کن اور اپنی طرز کا انوکھا واقعہ ہے۔ آپ نے کئی رومانوی ناڈر اور افسانوں میں تو پڑھا ہی ہوگا کہ محبت کا کوئی



نے فوٹو گرافر پولی ڈاؤسن سے اس یادگار لمحے کو کیرے کی آنکھ میں محفوظ کرنے کا کہا۔ مگر ایرک نے اپنی ہونے والی دلہن کے لیے صرف یہ سربراہی نہیں رکھا تھا بلکہ انہوں نے اپنی مگسٹریٹ کی بچپن کی خواہش کو بھی حقیقت کا روپ دینے کا اہتمام کیا تھا۔ ایرک نے مکی کو کہا کہ وہ ایک بار پھر شادی کی پیشکش کرے گا مگر اس بار پانی میں۔ اور خاتون جل پری کے روپ میں ہوں گی۔ مکی نے ایک انٹرویو کے دوران بتایا ”میری بچپن سے پسندیدہ شہزادی دی لمل مر میڈ کی ایریل تھی، جل پریاں جادو کی ہوتی ہیں اور سمندر کی گہرائیوں کو کھجال سکتی ہیں، اور میں اتنی خوش قسمت ہوں کہ مجھے پرس ایرک جیسا شخص ملا، جس نے میرا خواب پورا کر دیا۔“ اس مقصد کے لیے ایرک نے خاص قسم کی سرخ آنکھیں بھی تیار کرائی تھیں تاکہ زیر آب فوٹوشوٹ میں اسے نمایاں کیا جاسکے، جبکہ خاتون کے لیے جل پری جیسی گولڈ اور یڈ رنگ کی دم بھی تیار کروائی۔ اگرچہ اب یہ تصاویر بہت خوبصورت اور آسانی سے لی جانے والی لگ رہی ہیں مگر مکی کے مطابق یہ انتہائی مشکل کام تھا خصوصاً اس لیے کیونکہ میرا سر چکر رہا تھا، مگر پھر بھی پانی کے اندر میں خود کو سنبھالنے میں کامیاب رہی۔“

ماڈنٹ ایورسٹ پر شادی کرنے والے جوڑے کی داستان بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے، اس نوبیا پتا جوڑے نے ایک دوسرے سے محبت کو ایک نئی ”بلندی“ پر پہنچا دیا ہے۔ امریکا سے تعلق رکھنے والے 35 سالہ جیمو سیوسم اور 32 سالہ لمبٹل شیدر نے زندگی بھر کے تعلق میں بندھنے کے لیے انتہائی غیر متوقع مقام کا انتخاب کیا اور وہ ہے دنیا کی بلند ترین چوٹی ماڈنٹ ایورسٹ۔ رواں برس مارچ کے آخر میں ہونے والی یہ شادی ماڈنٹ ایورسٹ کمپ پر ہوئی جہاں وہ اس سے قبل تین دفعے تک ہائیکلنگ کرتے رہے تھے۔ لمبٹل نے بتایا ”کافی سوچ بچار کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ روایتی انداز سے

میرج ایکٹ کے تحت شادی کی، یہ ایکٹ مسلمان مرد کو 4 شادیوں سے بھی روکتا ہے۔ اکلچا اور فیض نے اپنی تیسری شادی اور محبت کو یادگار بنانے کے لیے ہندوستانی فلموں اور رومانوی ناول کی کہانیوں میں بتائے گئے آئیڈیلز کو خوب استعمال کیا۔ وہ تیسری شادی کے لیے بھارتی ریاست گودا پنچے، جہاں انہوں نے ایک بار پھر اسلامی رسم و رواج کے مطابق دوستوں اور سیاحوں کے سامنے نکاح کیا، اس دوران گیت سنگیت اور رقص کا پروگرام بھی سجایا گیا۔ اکلچا اور فیض نے چوتھی شادی ہندو رسم و رواج کے مطابق کی، انہوں نے ساحل سمندر پر سات پھیرے لیے۔ شادی کی چوتھی تقریب میں بھی انہوں نے گیت سنگیت اور رقص کے پروگرام کا اہتمام کیا۔ دسمبر 2010ء میں سیرٹیل اور لیسادوائٹ نے لندن کے مشہور لینڈ مارک لندن آئی کے سامنے تلے اپنی شادی کی تقریب منعقد کی، امریکا میں میسچو سیٹس میں اپنی سبیلک شادی میں ڈیٹیل لٹن میک کی اور برے ٹن تھامس ٹھرنے تحلیلوں کو ازاد کرتے ہوئے شادی کی۔

چوبیس گھنٹوں میں دو شادیاں کر کے ملتان میں ایک نئی روایت ڈالی گئی۔ ملتان میں ایک نوجوان نے ایک دن میں دو شادیاں رچا کر ایک سے زیادہ شادیوں کے منتہی مردوں کے لیے ایک نئی روایت قائم کر دی ہے۔ تیس سالہ اعظم حیدری چوبیس گھنٹوں میں دو شادیوں کا اعلان کر کے پاکستانی ذرائع ابلاغ کی توجہ کا مرکز بنے، اعظم حیدری نے بتایا کہ اس کی دلہنوں میں سے ایک اس کے خاندان کی پسند ہے جبکہ ایک ان کی اپنی پسند ہے۔ انہوں نے کہا کہ دراصل وہ اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے خاندان نے ان پر زور ڈالا کہ وہ اسی خاتون سے شادی کریں جسے ان کے والدین نے بچپن سے طے کر رکھا تھا۔ اس مشکل صورت حال سے نکلنے کے لیے انہوں نے یہ حل نکالا کہ دونوں لڑکیوں سے انہیں شادی کر لی جائے۔ انہوں نے کہا کہ دونوں خاندانوں نے ان کی تجویز کو مان لیا اور اب وہ اپنے آپ کو بہت خوش قسمت محسوس کرتے ہیں کیونکہ دو عورتوں نے شاید ہی کسی ایک مرد کو پسند کیا ہے۔ تیس سالہ اعظم حیدری کی پہلی شادی اتوار کے روز اٹھائیس سالہ کرن حمیرا قائم سے ہوئی جبکہ ان کی دوسری شادی ان کی اپنی پسند رومانہ اسلم سے سوموار کے روز ہوئی۔ پاکستان میں رائج اسلامی قانون مرد کو ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دیتا ہے بشرطیکہ اس میں پہلی بیوی کی رضامندی شامل ہو۔

مذہب یا ذات نہیں ہوتی اور یقیناً آپ نے ایسی فلمیں بھی دیکھی ہوں گی جن میں ہیر اور ہیر ورن الگ الگ مذہب اور ملک سے تعلق رکھنے کے باوجود شادی کرتے ہیں۔ دنیا کے کئی ممالک میں ایسا حقیقت میں بھی ہوتا ہے کہ دولہا اور دلہن الگ الگ مذہب رکھنے کے باوجود شادی کرتے ہیں اور مذہب بھی تبدیل نہیں کرتے، مگر ایک ہی میاں بیوی چار بار مختلف طریقوں سے شادی کریں ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ بھارت جیسے کثیر المذاہب اور کثیر الثقافتی ملک میں دو مختلف مذاہب کے ماننے والے افراد کی شادی ہمیشہ ہی سماجی مسئلہ رہی ہے، تاہم بہت سارے جوڑے ایسے بھی ہیں جنہوں نے غیر مذہب افراد سے شادی کر رکھی ہے، ایسی شادیاں کرنے والوں میں بولی ووڈ اداکار، سیاستدان، کھلاڑی اور کاروباری افراد شامل ہیں۔

ہندوستان کی ریاست ہریانہ سے تعلق رکھنے والی اکلچا بھی ایک ایسی ہی لڑکی ہے، جس نے ایک مسلمان لڑکے سے شادی کی اور یہ شادی ایک بار نہیں بلکہ چار بار کی۔ اکلچا ہندو مت کی ماننے والی ہیں، جبکہ ان کے شوہر فیض کا تعلق ترقی پسند مسلمان گھرانے سے ہے۔ فیض اور اکلچا کی محبت ڈرامائی طور پر 2 سال قبل شروع ہوئی، جو بتدریج بڑھتی چلی گئی اور پھر دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر یہ آسان اور ممکن نہ تھا۔ اکلچا نے اپنی شادی کی کہانی لکھتے ہوئے اعتراف کیا کہ ان کے گھروالے شادی کے لیے تیار نہیں تھے، تاہم انہوں نے کھل کر مخالفت بھی نہیں کی۔ گھر والوں کو راضی کرتے کرتے انہیں 2 سال گزر گئے مگر دونوں کے اہل خانہ راضی نہ ہوئے پھر بالآخر انہوں نے گھر والوں کی رضامندی کے بغیر ہی شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اکلچا اور فیض کی شادی کے بعد بالآخر ان کے اہل خانہ بھی راضی ہو گئے، فیض کے مطابق ایک مسلمان مرد کو چار شادیاں کرنے کی اجازت ہوتی ہے، اس لیے انہوں نے ایک ہی دلہن کے ساتھ چار بار شادی کی رسومات ادا کیں۔ شادی کے بعد دونوں نے ایک دوسرے پر اپنا مذہب تبدیل کرنے کے لیے دباؤ نہیں ڈالا، بلکہ دونوں اب بھی اپنے اپنے مذاہب پر یقین رکھنے کے باوجود ایک دوسرے کی زندگی کا انٹ حصہ بن چکے ہیں۔

اکلچا اور فیض نے پہلی شادی ہندو رسم و رواج کے مطابق کی، فیض نے اکلچا کی مانگ میں سندور مہرا اور انھیں مالا پہنائی۔ اکلچا اور فیض نے دوسری شادی اسلامی رسم و رواج کے تحت کی، وہ عدالت گئے اور بھارت کے انجیل

باراتیوں کو پرغمال بنالیا تاہم رات گئے ان کو چھوڑ دیا گیا جس کے بعد برأت دہن کو لیے بغیر واپس چلی گئی۔

دنیا بھر میں شادی کی رسوم و رواج میں وہاں کی روایات اور تہذیب و ثقافت جھلکتی ہے۔ مسلمانوں میں نکاح، عیسائیوں میں مقدس انگشتی اور ہندوؤں میں انگی کے سات پھیرے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا عہد نامہ ہوتے ہیں۔

پاکستان میں شادیاں بہت رنگین اور روئی والی ہوتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے ہاں شادی کی رسوم میں بے پناہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ذیل میں چند دلچسپ شادیوں کی رسومات کے بارے میں اجمالی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے:

پاکستان میں شادی کی تقریبات کا آغاز دھولگی سے ہوتا ہے۔ شادی سے کئی روز پہلے سے دھولگی بچتا شروع ہو جاتی ہے جس میں خاندان کی لڑکیاں اور عورتیں شرکت کرتی ہیں۔ شادی کی پہلی باقاعدہ رسم مایوں ہوتی ہے۔ اس میں دہن کو پیلا جوڑا پہنا یا جاتا ہے۔ مہمان بھی پہلے کپڑے پہنتے ہیں۔ دہن اور دولہا کو اکٹھا کر لگائی جاتی ہے۔ اینٹن کے بعد مہندی کی رسم ہوتی ہے۔ قدامت پرست گھرانوں میں لڑکے اور لڑکی کی مہندی علیحدہ علیحدہ جبکہ ماڈرن گھرانوں میں ایک ساتھ ہوتی ہے۔ برأت والے روز دولہا کی سہرا بندی کی جاتی ہے۔ دہن والے برأت کا استقبال ہار چھول پھنا کر کرتے ہیں۔ نکاح کی رسم ادا ہونے کے بعد چھوہارے تقسیم کیے جاتے ہیں۔ دودھ پلائی کی رسم ہوتی ہے۔ رخصتی کے وقت دہن کو قرآن مجید کے سائے میں رخصت کیا جاتا ہے۔

عیسائیوں میں دوفرے رومن کی تھوٹھ اور پرنسٹنٹ ہیں۔ کی تھوٹھ فرنے میں شادی کی رسوم کی ابتدا رشتہ لے جانے سے ہوتی ہے۔ باہمی رضامندی کے بعد بات طے ہو جاتی ہے۔ قریبی عزیزوں کو مدعو کر کے منگنی کا اعلان کیا جاتا ہے۔ دولہا دہن ایک دوسرے کو انگوٹھی پہنتا ہے۔ شادی کی تاریخ طے ہوتی ہے اور تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ شادی کی رسم چرچ میں ہوتی ہے۔ دہن سفید مٹکی اور دولہا سیاہ سوٹ پہنتا ہے۔ پادری دعائیں پڑھتا اور شادی کی رسوم ادا کرتا ہے۔ ایجاب و جوبل کے بعد پادری شادی کی مقدس انگشتیاں بائبل پر رکھتا ہے جسے دولہا اور دہن ایک دوسرے کو پہنتا ہے۔ اس کے بعد پادری ان کے میاں بیوی ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ بعد ازاں میاں بیوی شادی کے رجسٹر پر دستخط کرتے ہیں پھر موم بتیاں جلاتے ہیں۔ دو موم بتیاں ان دونوں کی اور تیسری ان کے بندھن کی ہوتی ہے۔ شادی کی

پاکستان میں ایک سے زیادہ بیویاں ہونا انتہائی بات نہیں ہے لیکن دوسری شادی اکثر کئی سالوں کے وقفے کے بعد کی جاتی ہے۔ اس سے پہلے ایک ہی شخص کی چوبیس گھنٹوں میں دو شادیوں کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ پاکستان کے کئی دی وں چوتھو پر انظر حیدری کی شادی کی تقریبات کو براہ راست دیکھا گیا تھا۔

ملتان میں مہنگی ترین شادیوں کے بعد مہنگی ترین مہندی کی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ دولہا 2 ہزار مہمانوں اور قیمتی گھوڑے، اونٹوں اور شیروں کے ہمراہ دہن کے گھر مہندی لے کر پہنچ گیا تھا۔ روسی بزنس مین نے بیٹی کی شادی پر 1 ارب لٹا دیے تھے۔

یوں تو ہر انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی بچوں کی شادی کو یادگار بنانے کے لیے کوئی کرسٹ چھوڑے لیکن کچھ لوگ تو اس موقع پر خزانے کا منہ ہی کھول دیتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ دیکھنے کو ملا۔ امریکی شہر لاس اینجلس میں جہاں روسی بزنس مین نے اپنی 22 سالہ بیٹی کی شادی میں صرف چند گھنٹوں میں ہی ایک ارب روپے سے زائد لٹا دیے۔ ایڈراوسانو وانا ہی روسی بزنس ٹائیگن کی بیٹی کی شادی کی تقریب لاس اینجلس کے ڈوبلیو تھیٹر میں منعقد کی گئی اور اس موقع پر تھیٹر کو رنگ برنگے مینے ترین پھولوں سے سجایا گیا۔ جن کی مجموعی مالیت 5 لاکھ امریکی ڈالر تھی۔ تقریب میں معروف امریکی سنگر لیڈی گاگائی بھی پرکارم کیا جبکہ تقریب میں دیگر امریکی دوری اشار زنجی شریک تھے۔ اس شادی پر مجموعی طور پر ایک ارب سے زائد خرچ ہوئے، جس میں مہنگا عروسی لباس، کئی فٹ لمبا ایک، آرکیسٹرا پر فارمنس بھی شامل تھی۔ چلتے چلتے پھر بھارت کا ذکر آ گیا۔

بھارت میں ازدواجی بندھن کی بے حرمیتوں کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں۔ ریاست اتر پردیش کے ضلع سہارنپور میں دولہا کی طرف سے گاڑی کا مطالبہ کرنے پر دہن نے نکاح کرنے سے انکار کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ دہن کے گھر والوں نے باراتیوں کو پرغمال بھی بنالیا۔ پولیس کے مطابق نکاح کی رسم جب ادا کی جا رہی تھی تو اچانک دولہا نے کہا کہ نکاح کی رسم بھی ادا ہوگئی جب لڑکی والے اسے گاڑی دیں گے۔ لوگوں نے دولہا کو سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنی بات سے ٹس سے مس نہیں ہوا۔ دونوں اطراف کے لوگ اس مسئلے کو حل کرنے میں لگے رہے لیکن اسی دوران دہن نے نکاح کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ جس کے بعد لوگوں نے

تکمیل کے بعد کیک کاٹا جاتا ہے جو جتنا امیر ہوتا ہے اسی حساب سے کیک کی منزلوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ کیک اور مشروبات سے مہمانوں کی تواضع کی جاتی ہے اور اس کے فوراً بعد ہی ہون پر روانہ ہو جاتے ہیں۔

ہندوؤں میں شادی کی بہت سی رسمیں ہیں۔ ان میں رشتہ لڑکی والے لائے ہیں۔ پنڈت، کنڈی ملاتا ہے۔ رضامندی کے بعد مگنی (سگائی) کی تقریب ہوتی ہے اور دو روز بعد شادی کی تاریخ دے دی جاتی ہے۔ ان کے ہاں شادی کی ابتدا ”دوا“ کی رسم سے ہوتی ہے جسے ہم مایوں کہتے ہیں۔ دہن کو پیلا جوڑا پہنا کر انہیں اور ہندی لگائی جاتی ہے۔ شادی والے دن دولہا تیار ہونے کے بعد کھیر کی خالی کٹوری پاؤں سے توڑتا ہے جبکہ لڑکی والوں کے ہاں پنڈت ایک منگے میں پانی ڈالتا ہے اور منگے پر ناریل رکھتا ہے۔ لڑکی کی ماں وہ منگاسر پر رکھ کر لاتی ہے پھر اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ ایک رسم میں دودھ بھری ہوئی کٹوری میں دولہا اور دہن کی انگوٹھیاں ڈال دی جاتی ہیں۔ دونوں پیالے میں ہاتھ ڈال کر انگوٹھیاں تلاش کرتے ہیں جس کو انگوٹھی مل جاتی ہے وہ دوسرے کو دے دیتا ہے یہ عمل تین بار دہرایا جاتا ہے۔ شادی کی اہم ترین رسم اگنی کے سات پھیرے ہیں۔ آگ کو گواہ بنا کر یہ رسم ادا کی جاتی ہے۔ اس میں دولہا کا پنکا دہن کے پلوے سے باندھ کر اگنی کے سات پھیرے لیے جاتے ہیں اس دوران پنڈت منتر پڑھتا رہتا ہے۔ لڑکی کا ماسوں آگ میں جوڑا ڈالتا ہے اور دہن کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ اگلے پھیروں میں چچا، بھائی اور باپ بھی رسم دہراتے ہیں۔ پھیرے مکمل ہونے کے بعد دولہا دہن کی مانگ میں سینہ دھر بھر کر اسے منگل سوتر پہناتا ہے اور آخر میں دونوں ایک دوسرے کو پھولوں کے ہار اور مالا پہناتے ہیں۔ اس کے بعد مہمانوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ رخصتی کے بعد دہن سسرال آتی ہے تو سر پر دودھ بھرا کٹورا رکھتی ہے اور چوکھٹ سے گھر کے اندر دودھ کے چھینٹے مارتی ہے۔ چوکھٹ پر ہی ساس دہن کی آرتی اتارتی ہے۔ وہیں سندور سے بھرا کٹورا رکھا ہوتا ہے جسے دہن ٹھوکر سے گرا کر سرخ پاؤں سے گھر کے اندر داخل ہوتی ہے۔ دہن کے ہاتھ میں تل اور جور کھا جاتا ہے اور منہ دکھائی دی جاتی ہے۔

جاپان کے جزائر کی تاوا میں دہن کو آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ جملہ عروسی میں داخلے کی منہمی لڑکی کے سر کے بال جلائے جاتے ہیں۔ اس موقع پر قبیلہ کا جادوگر کسی جانور کے تیز دانت سے لڑکی کی پیٹھ پر گہری لکیریں ڈالتا ہے اور زخموں میں

پسی ہوئی مرچیں بھرنے سے قبل لڑکی کے ہاتھ کو خوب منہ بوٹی سے باندھ دیتا ہے۔ لڑکی زخموں میں پسی ہوئی مرچوں کی تکلیف سے درد کے مارے ترپتی رہتی ہے لیکن کامیاب شادی کے لیے اسے یہ تکلیف برداشت کرنا ہوتی ہے۔

سوڈان کے بعض علاقوں میں رواج ہے کہ دہن اپنے ہونے والے شوہر کے رخسار کو داغ دیتی ہے۔ اس سے یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ اسے اپنے ہونے والے شوہر سے محبت ہے اور یہ داغ اس کی محبت کی مہر ہے جو اس کے رخسار پر ثبت ہے۔ یہ داغ دیتے وقت شوہر کو جو تکلیف ہوتی ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ عشق کی یہ مہر زندگی بھر شوہر کے چہرے پر ثبت رہتی ہے۔

ویلز انگلستان کا مشہور علاقہ ہے۔ وہاں قدیم ایام سے آج تک یہ رسم جاری ہے کہ دولہا دہن کو جملہ عروسی میں داخل ہونے کے لیے آگ کے ڈھیر پر سے گزرنا پڑتا ہے۔

کیفیا کے مسائی قبیلے میں رخصتی کے وقت دہن کا باپ اپنی بیٹی کے سر اور جسم پر دودھ کے قطرے چھڑکتے وقت دعائے کلمات ادا کرتا ہے کہ اللہ اسے بہت سے بچوں کی ماں بنائے۔ سسرال پہنچنے پر دہن کا طمانچوں پھنوں اور گھونٹوں سے استقبال کیا جاتا ہے۔ کوئی خاتون آگے بڑھ کر دہن کے سر پر مٹھی بھر کر ڈال کر اسے عروسی سلام پیش کرتی ہے۔ پھر دہن کی ساس اسے جملہ عروسی (جو ایک خوبصورت جھونپڑی کی صورت میں ہوتا ہے) میں لے جانے کے لیے آتی ہے۔ پھر عزیز واقارب بیش قیمت تحفے دے کر اور لاڈ پیار سے اسے جملہ عروسی میں پہنچا دیتے ہیں۔

مراکش کے ایک قبیلے میں شادی کے موقع پر مذہبی رہنما ایک تیز و حار چاقو دہن کے گلے پر رکھ دیتا ہے جب دہن کے گلے سے خون کا ایک قطرہ ٹپک پڑے تو نکاح ہو جاتا ہے۔ اس رسم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دہن پر واضح ہو جائے کہ وہ اب شوہر کے رحم و کرم پر ہوگی۔

تبت کے سوگ قبائل میں شادی کی رسم کی ادائیگی کے لیے دولہا اور دہن کو ایک ایک پورا کیک کھانا پڑتا ہے اور یہ ضروری ہوتا ہے کہ دونوں میں سے کوئی بھی کیک کھانے میں ناکام رہے تو وہ شادی اسی دن ختم ہو جاتی ہے۔

بھارت کے ایک قبیلہ جو شیخو میں شادی کی رسومات میں دہن کی ماں شریک نہیں ہوتی۔

سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کے باوجود دنیا میں آج بھی ایسی رسوم پائی جاتی ہیں کہ جن کے متعلق سن کر ہی انسان

اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے شوہر سے بے پناہ محبت ہے اور دلچسپی کا نشان اس کی محبت کا ثبوت ہے۔

1991ء میں کرغیزستان میں ایک رسم پر پابندی لگائی گئی جس میں ہونے والی دہن کو شادی کے دن اغوا کر لیا جاتا تھا اور اسے خوب رلایا جاتا تھا۔ دہن کے آنسو جتنے زیادہ بہتے اسے اتنا زیادہ اچھی زندگی کی ضمانت سمجھا جاتا۔ دہن کا زارو قطار رونا شادی شدہ زندگی کے لیے انتہائی نیک شگون سمجھا جاتا تھا۔ یہ رسم اب بھی چوری چھپے ادا کی جاتی ہے۔ اصل میں اس رسم میں دہن کو رولانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کا رونا آج ہی ختم ہو جائے گا۔ تاہم دوہلا کو ساری زندگی رو رو کر ہی گزارنی ہے۔ ہمارے ہاں اس رسم کی اتنی ضرورت نہیں ہے کیونکہ رحمتی کے وقت دلہنیں خود ہی دل کھول کر رو لیتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے ان کا اغوا ضروری نہیں ہوتا۔

میانمار میں لوگ اپنے بچوں کے پیدا ہونے کا دن یاد رکھتے ہیں جب ان کی شادی کا وقت آتا ہے تو اس بات کا خاص دھیان رکھا جاتا ہے کہ ایک ہی دن پیدا ہونے والے لوگوں کی آپس میں شادی نہ ہونے پائے۔ اگر یہ شادی ہو جائے تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلتا۔ مثلاً بدھ کو پیدا ہونے والے لڑکے کی شادی اسی دن پیدا ہونے والی لڑکی سے نہیں کی جاتی۔

سری لنکا میں جوئی سال میں ایک دن کو شادی کے لیے بہت موزوں قرار دیتے ہیں لوگ اس خصوصی دن کا کئی کئی مہینے انتظار کرتے ہیں اور کئی شایاں ایک ہی دن سرانجام پا جاتی ہیں۔

چین میں قبروں سے خواتین اور لڑکیوں کی لاشیں نکال کر ان کی مردہ آدی سے شادی کرنے کے بعد دوبارہ دفن کرنے کے واقعات میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ چین میں تو ہم پرستی کے مارے لوگوں کا خیال ہے کہ اگر کوئی کنوارا شخص اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو اچھی دنیا میں اسے مسائل کا سامنا ہوتا ہے، اسی لیے مرنے والے لاشیاں افراد کی کسی خاتون یا لڑکی کی لاش سے شادی کرا دی جاتی ہے اور اس کے بعد اسے کسی مرد کے ساتھ یا مرد کے برابر قبر میں دفنایا جاتا ہے۔ قدیم چینی تہذیب میں یہ بات بھی عام ہے کہ اگر کوئی شخص بغیر شادی کے مر جائے تو اس کی روح بھگ کر اس کے عزیزوں کو اذیت پہنچاتی رہتی ہے، اسی لیے کئی خاندان اپنے مرنے والوں کے لیے ”بھوت دہن“ تلاش کرتے ہیں اور اسے اپنے عزیز کے ساتھ دفن کرتے ہیں، اس طرح ان کے عقائد کے

پریشان ہو جاتا ہے۔ چین کے دور دراز علاقوں میں پائی جانے والی ایک رسم بھی ایک ایسی ہی مثال ہے کہ جس کا جدید دنیا میں تصور کرنا خاصا مشکل ہے۔ یہ رسم دو لمبے کواد کرنا پڑتی ہے جو اپنی دہن کو اٹھا کر دھکتے ہوئے کوٹلوں پر چلتا ہوا گزرتا ہے۔ قدیم چینی روایات کے مطابق نئے جوڑے کے لیے اپنے نئے گھر میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسم ادا کرنا ضروری ہے۔ مقامی افراد کا کہنا ہے کہ اس کے دور رس فوائد ہیں جن میں سے سرفہرست یہ ہے کہ دہن جب حاملہ ہوگی اور بچے کو جنم دے گی تو اس سارے عمل کے دوران اسے کسی تکلف کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، اگر اس کا خاندان پہلے ہی کوٹلوں پر چلنے کی تکلف اٹھا چکا ہوگا۔ قدرتی آفات سے دوچار ہونے کی صورت میں بھی چینی لوگ اس رسم کو ادا کرتے ہیں اور جنوب مشرقی ایشیاء کے کئی اور ممالک میں بھی یہ رسم پائی جاتی ہے۔

ہر علاقے کی رسومات الگ ہوتی ہیں۔ یہ رسومات اس علاقے کی شناخت بن جاتی ہیں۔ کچھ علاقوں میں یہ رسومات توہمات کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہیں۔ جیسے زمانہ قدیم میں دریائے نیل کے کنارے آباد لوگ اس بات کو ضروری سمجھتے تھے کہ ہر سال نیل کے کنارے ایک نوجوان دوشیزہ کا خون بہانا بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر دریا بہنا بند ہو جائے گا۔ یہ سلسلہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مصر پر قبضہ کرنے سے پہلے تک چلتا رہا۔

ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ سمندر کے پانی کو چھڑنے سے سمندر کا دیوتا ناراض ہو جائے گا اور طوفان کی صورت انہیں ہلاک کر ڈالے گا۔ یہ عقیدہ اب بڑی حد تک دم توڑ گیا ہے کیونکہ نیوی اور مہی گیروں کی صورت میں ہندو سمندر سے دوستی کر چکے ہیں۔

چینی اپنے نئے سال کے آغاز پر پٹائے بچاتے ہیں تاکہ بدروحیں بھاگ جائیں اور پچھلے سال کی بد قسمتی کو ختم کرنے کے لیے نئے سال سے ایک دن پہلے ہی گھر کو صاف کر لیتے ہیں۔ نئے سال کے پہلے دن گھر کو صاف نہیں کرتے تاکہ خوش قسمتی غلطی سے جھاڑو کے ساتھ گھر سے باہر نہ نکل جائے۔ دنیا بھر کے ممالک میں سب سے زیادہ دلچسپ رسومات شادی بیاہ کے موقع پر دیکھنے کو ملی ہیں۔ کالگو کے چلی بانگ میں یہ رواج ہے کہ دہن اپنے دلہا کے ماتھے پر نوکیلے لے سے اپنا نام کندہ کرواتی ہے تاکہ کوئی اور عورت اس کے دہر پر حق نہ جتا سکے۔ اسی طرح کی ایک رسم سوڈان میں بھی ہے جس میں دہن اپنے شوہر کے منہ کو داغ دیتی ہے۔

مطابق تمام بلائیں ٹل جاتی ہیں اور خاندان محفوظ رہتا ہے۔
 جن کے مختلف علاقوں میں کنوارے شخص کی موت کے
 بعد کسی خاتون کا چاندی کا مجسمہ، پلاسٹک کا پتلا اور دیگر اشیاء
 دفن کی جاتی رہی ہیں تاہم ان میں سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے
 کہ کسی تازہ قبر کو کھود کر خاتون کی لاش نکالی جاتی ہے پھر اسے
 میک اپ کر کے نئے کپڑے پہنا کر مرنے والے کی قبر کے
 ساتھ دفن دیا جاتا ہے جبکہ یہ لاشیں قبر سے نکالنے کے لیے
 خطرات مول لینے کے ساتھ ساتھ خطیر رقم بھی خرچ کی جاتی
 ہے۔ چین میں اس کام کے لیے مردہ خواتین کو چرانے والے
 کئی خفیہ گروہ کام کر رہے ہیں جو لاشوں کی بڑھتی ہوئی طلب کو
 پورا نہیں کر سکتے۔ ایک لاش کی قیمت اس وقت پاکستانی 10
 سے 15 لاکھ ہے جبکہ 2011ء میں 14 ایسے افراد کو پکڑا گیا تھا
 جنہوں نے قبر سے 10 خواتین کی لاشیں نکال کر فروخت کی
 تھیں اور اس کے بدلے میں قریباً 40 لاکھ روپے حاصل کیے
 تھے۔ چین میں خواتین کی لاشوں کو بے رحمی سے بچانے کے
 لیے کئی خاندان انہیں قبرستان کی بجائے دور دراز کے پہاڑی
 علاقوں پر دفن کر رہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے قبروں کو پختہ کر کے
 خاردار تار لگا دیے اور کچھ نے سی سی ٹی وی کیمرے بھی نصب
 کرائے ہیں۔ واضح رہے کہ چین میں مردہ خواتین اور مردوں
 کی شادی پر 1949ء میں پابندی لگا دی گئی تھی تاہم گزشتہ کئی
 سال سے کچھ علاقوں میں یہ واقعات بڑھ گئے ہیں۔ ہٹان اور
 شائیکی صوبوں میں گزشتہ 3 برسوں میں قبر کھود کر خواتین کی
 لاشیں نکالنے کے 30 کے قریب واقعات ہو چکے ہیں۔
 شادیوں کا ذکر ہوتا ہی رہے گا۔ کچھ بات دنیا بھر میں
 پہنچنے جانے والے روایتی عروسی ملبوسات کے بارے میں ہو
 جائے۔ دنیا کے ہر علاقے کی دلہن جانتی ہے کہ شادی کے دن
 سب سے زیادہ اہم عروسی لباس ہی ہوتا ہے۔ بیشتر ممالک
 میں دلہن کا لباس وہاں کی ثقافت کا اظہار ہوتا ہے، اس کا
 رنگ، ساخت اور دیگر تفصیلات اس جگہ، مذہب وغیرہ کی
 روایات کی عکاسی کرتے ہیں۔ جیسے ترکی میں دلہن ایک سرخ،
 دوشیزکی کی ہلکے خوش قسمتی کی علامت کے طور پر پہنتی ہے۔
 اریٹیریا میں دلہن گہرے رنگ کے ریشمی تاج اور جاسی و گولڈ
 عبادہ زیب تن کرتی ہے۔ دنیا بھر میں جوڑے کس طرح کے
 عروسی ملبوسات پہنتے ہیں، یہ جاننا آپ کے لیے دلچسپی سے
 خالی نہیں ہوگا، جس سے ان ممالک کی ثقافتی روایات کا بھی
 اندازہ ہوتا ہے۔ جاپانی شادیوں میں دلہن اکثر دو یا اس سے
 زائد ملبوسات پوری تقریب میں استعمال کرتی ہے جو کہ سفید

اور سرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔ گھانا کی روایتی شادی بہت رنگا
 رنگ ہوتی ہے، وہاں اکثر ملبوسات کے ڈیزائن مختلف رنگوں
 اور پیٹرن کے حامل ہو سکتے ہیں، ہر خاندان کے لباس کا اپنا
 پیٹرن ہوتا ہے۔ رومانیہ میں اکثر نو جوان شادی کے موقع پر
 جدت کو ترجیح دیتے ہیں، تاہم روایتی تقریبات اب بھی اس
 کے دیہی علاقوں میں ہوتی ہیں، اگرچہ یہ ملک زیادہ بڑا نہیں مگر
 اس کے ہر خطے کی شادی کے حوالے سے اپنی روایات
 ہیں۔ اگر آپ کو کسی سری لنکن روایتی شادی میں شرکت کا موقع
 ملے تو آپ کی نگاہیں دولہا سے نہیں ہٹ سکیں گی۔ بھارت
 میں سرخ یا گلابی عروسی ملبوسات بھارتی ثقافت میں دلہن کا
 روایتی انتخاب ہوتا ہے۔ اسکاٹ لینڈ میں دولہا عام طور پر
 اسکرٹ پہنتا ہے، جبکہ شادی کی تقریب کے بعد دولہا ایک
 شال دلہن کے کندھے پر ڈالتا ہے جو اس کے خاندان کے
 رنگوں پر مشتمل ہوتی ہے اور اس طرح یہ دلہن کی نئے خاندان
 میں رکنیت کی علامت بن جاتا ہے۔
 پاکستان کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں
 کیونکہ ہمیں اپنے ملک کی روایات کے بارے میں کافی کچھ علم
 ہے۔

ایتھوپیا واحد افریقی ملک ہے جہاں عیسائیت سرکاری
 مذہب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شادیاں یونانی یا رومی انداز
 کی ہوتی ہیں۔ اٹلی و نیٹھیا میں ایک سے دوسرے جڑے میں
 شادی کی روایات مختلف ہوتی ہیں، ویسے بھی تین سوئی گروپس
 اور چھ بڑے مذہب کو ماننے والے افراد پر مشتمل اس ملک کی
 ثقافت متعدد رنگوں کی حامل ہے۔ یورپ اور ایشیا کی سرحد پر
 موجود علاقے ثقافتی طور پر روایتی شادی کے موقع پر دولہا وہاں کا
 روایتی کوٹ پہنتا ہے جبکہ ہلکے سے نکوار بندھی ہوتی ہے۔ دلہن
 اکثر سفید عروسی لباس میں ہوتی ہے جس پر خوبصورت سیاہ
 پٹیاں لگی ہوتی ہیں۔

چین کا روایتی عروسی لباس سرخ ہے، چین میں ویسے
 سفید رنگ کو ماتم کار نگ مانا جاتا ہے۔ شادی کے بعد دولہا دلہن
 کے سر سے سرخ دوپٹے کو مٹاتا ہے۔ ملائیشیا میں اکثر دلہن
 جاسی یا کریم رنگ کے عروسی لباس کا انتخاب کرتی ہے۔ جنوبی
 کوریا میں روایتی انداز سے شادی کرنے کا رواج حالیہ عرصے
 میں زور پکڑ چکا ہے، یہاں کی تاریخی روایات کے مطابق دولہا
 اپنی بیوی کو کمر پر اٹھا کر میز کے گرد گھومتا ہے، جو اس بات کی
 علامت ہوتا ہے کہ دلہن اپنے شوہر پر انحصار کر سکتی ہے۔
 ناروے میں دلہن ایک روایتی نارویجن لباس پہنتی ہے،

برس بعد محبت نامہ پانے والے میاں بیوی ایک بار پھر سے اس محبت کو یاد کر سکیں جس نے انہیں ملایا تھا۔ دنیا کے کئی ممالک میں طلاق کے ایسے عجیب و غریب قوانین موجود ہیں جہاں طلاق حاصل کرنا ایک ناقابل یقین تجربہ ثابت ہوتا ہے۔

دنیا میں قلائدین واحد ملک ہے جس کا قانون آج بھی اپنے شہریوں کو طلاق کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ تاہم پتا چلتا ہے کہ 1985ء سے 2000ء کے درمیان جاپان میں طلاق کی شرح سب سے زیادہ تھی۔ اس کی وجوہات سے پتا چلتا ہے کہ 2006ء میں جاپانی جوڑوں میں شادی کے بیس برس بعد طلاق لینے کا رواج زیادہ عام ہو گیا تھا۔ ماہرین کا کہنا تھا کہ یہ ریٹائرڈ مسیڈر سیدرزم کی وجہ سے تھا یعنی ایسے شوہروں کی وجہ سے جو روزگار کے لیے ملک سے باہر رہتے ہیں اور اپنی بیوی کو زیادہ نہیں جانتے ہیں لیکن، ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں اپنی

نا بھریا میں دلہنیں روایتی عرودی لمبوسات کا انتخاب کرتی ہیں جبکہ سر پر ایک مخصوص چھڑی ٹائپ کپڑا بندھا ہوتا ہے۔

طلاق کی دلچسپ رسومات اور عجیب و غریب قوانین کے بارے میں بھی دلچسپ باتیں سامنے آتی ہیں۔ آپ نے شادی کے موقع پر ادا کی جانے والی رسومات کے بارے میں تو سنا ہوگا لیکن دنیا میں چند ایک مقامات ایسے بھی ہیں جہاں شادی کی ناکامی پر بھی مذہبی رسومات ادا کرنے کی روایت موجود ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ شادی کی ناکامی کی وجوہات چاہے کچھ بھی ہوں، شادی ٹوٹنے کا تجربہ لوگوں کے لیے خوشی کا باعث نہیں ہوتا ہے جس میں دونوں فریق کو طلاق کا معاہدہ کرنا ہوتا ہے اور اس حوالے سے اپنے ملک کے قوانین کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ دنیا میں کئی ممالک میں پائی جانے والی طلاق کے عجیب و غریب رسومات اور طلاق کے حیرت انگیز قوانین موجود ہیں۔

پاکستان

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہار و خزاں کی... پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہا کر سے بک کروالیں

جاپان میں ایک ایسا مندر واقع ہے جو اپنے زائرین کو ناکام شادی ٹوائٹ میں بہانے کی پیشکش کرتا ہے۔ وسطی جاپان کے صوبے گونما میں منٹوکوجی ٹمپل ازواجی تعلقات سے چھٹکارا حاصل کرنے والے جوڑوں کو ایک کاغذ پر تمام گلے شکوے لکھنے اور طلاق کی وجوہات بیان کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے، جسے بعد میں فلیش میں بھادیا جاتا ہے۔

2000ء کی بات ہے جب جرمنی میں ایک پادری مارکوس کسمین نے ملک کے تمام گرجا گھروں میں طلاق کے موقع پر ماتم کی رسم ادا کرنے کی تجویز پیش کی جس کے بعد ان کی تجویز پر گرجا گھروں میں طلاق کے موقع پر بڑے پیمانے پر ماتم کی رسم ادا کی گئی۔ ان تقریبات میں دونوں فریقین دوستوں اور رشتہ داروں کو اپنی شادی کی ناکامی کی وجوہات سے آگاہ کرتے ہیں۔

چین سے تعلق رکھنے والی ایک اقلیتی نسل جینگ کے ہاں طلاق کا ایک مخصوص طریقہ ہے، جس کے مطابق طلاق کے شوقین پر دستخط گھر کے اندر نہیں کیے جاسکتے اور دستخط کرنے کے فوراً بعد قلم اور دوات کو براہ راست سمجھ کر دور پھینک دیا جاتا ہے۔

2011ء میں چین میں ایک سرکاری ڈاک خانے کی طرف سے ایک ایسی مہم چلائی گئی جس میں شادی شدہ جوڑوں کو ایک محبت نامہ لکھنے کی ترغیب دی گئی، جسے شادی کے سات برس بعد شریک حیات کو ارسال کیا جائے گا، اس اقدام کا مقصد دراصل ملک میں طلاق کی شرح کو کم کرنا تھا تاکہ سات

بیوی میں ہر طرح کے عیب نظر آتے ہیں۔

شادی، ملبوسات، طلاق کے بارے میں کافی دلچسپ باتیں جاننے کے بعد شادی کی ایک رسم کا تذکرہ بر محل ہے جو اب معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ یہ رسم گھڑولی کہلاتی ہے۔ پنجاب کے دیگر اضلاع کی طرح جھنگ میں بھی شادی کی کچھ انوکھی رسومات و تقریبات اپنی سادگی اور خوبصورتی کی بنا پر ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ ان رسومات میں گھڑولی کی قدیم رسم کو ایک عرصہ تک وہ مقام حاصل رہا ہے جو شاید دوسری کوئی بھی رسم حاصل نہیں کر سکی۔ تاہم وقت کی بے رحم لہروں میں بہتی یہ قدیم رسم اب ماضی کا حصہ بنتی جا رہی ہے۔ گھڑولی کی رسم اس وقت ادا کی جاتی تھی جب نکاح کے بعد برأت منڈال سے دلہن کے گھر لے جاتی جاتی تھی۔ گھڑولی دراصل دو گھڑوں پر مشتمل ہوتی ہے جن پر خوبصورت طریقے سے نقش نگاری کی جاتی ہے، ایک گھڑا سائز میں دوسرے گھڑے سے چھوٹا ہوتا ہے۔ چھوٹے گھڑے کو بڑے گھڑے کے اوپر رکھا جاتا ہے اور بعد ازاں ان کو ایک رینگیں کپڑے جس پر کڑھالی کا خوبصورت کام ہوتا ہے سے ڈھانپ دیا جاتا ہے۔ اس کو دو لہر کی بنیوں یا دیگر عورتیں اٹھاتی ہیں اور ڈھول کی تھاپ پر علاقے کے کسی محزز کے گھر جا کر اس میں پانی بھرا جاتا ہے۔ بزرگ بتاتے ہیں کہ کچھ عرصہ پہلے تک اس پانی سے وضو کروا کر ہی دلہن کو شادی کا جوڑا پہنایا جاتا تھا لیکن اب صرف انگلی ڈوبنے پر ہی اسکا کٹا کر لیا جاتا ہے۔ گھڑولی کی معدوم ہوتی رسم میں گھر والوں کی حیثیت کے مطابق ان سے پیسے مانگتے ہیں جو لوگ امیر ہوتے ہیں وہ پیسوں کے ساتھ کوئی پالتو جانور مثلاً چمچڑا یا بکرا وغیرہ بھی دے دیتے ہیں جبکہ متوسط لوگ پانچ سو سے تین ہزار روپے تک دیتے ہیں۔ جدید دور میں لوگ اس رسم کو فرسودہ سمجھ کر نظر انداز کرنا شروع ہو گئے ہیں جس سے گھڑولی بنانے کا کاروبار بری طرح متاثر ہوا ہے۔ اب پہلے جیسا دور اور وہ لوگ نہیں رہے۔ اب لوگ شادی ہالز میں جا کر رسومات کرتے ہیں جہاں اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ نکاح اور کھانے کے سوا کوئی اور کام کیا جاسکے۔ ایک وقت تھا جب نہ صرف جھنگ بلکہ پورے پنجاب میں شادی کو اس رسم کے بغیر اور حورا تصور کیا جاتا تھا۔ آج کی شادیاں ان رسوں کے بغیر نامکمل لگتی ہیں۔ زمانے کی تیزی اور جدت کے باعث گھڑولی سمیت پنجاب کے کئی قیمتی رسم و رواج ماضی کا حصہ بن چکے ہیں۔ معاشی بدحالی، مغربی روایات اور جدید فیشن کی بھرمار نے لوگوں کو اپنی ثقافت سے دور کر دیا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکا کی سات ریاستوں جن میں ریاست نیو میکسیکو اور مسیسیپی شامل ہیں، شادی کی ناکامی کی وجہ ایک تیسرے فریق کو ٹھہرایا جاسکتا ہے اور شادی خراب کرنے والے تیسرے شخص پر شادی کے نقصان کے لیے بھاری رقم کا ہرجانہ دائر کیا جاتا ہے، تاہم اس الزام کو ثابت کرنے کے لیے ثبوت کی ضرورت پڑتی ہے۔ امریکی ریاست کنساس میں شادی کو طویل مدت تک قائم رکھنے کے لیے طلاق کا ایک ایسا قانون موجود ہے جس کے تحت دونوں فریق کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ ساس کے ساتھ بدسلوکی یا برے تعلقات رکھنے پر ایک دوسرے کو طلاق دے سکیں۔

امریکی ریاست ڈیلاویز میں طلاق کے لیے ایک ایسا قانون موجود ہے جس کے تحت اگر ایک شخص اپنی مذاق یا شرط نبھانے کے لیے شادی کر لیتا ہے تو اسے بعد میں طلاق کا مقدمہ دائر کرنے کی اجازت ہے جبکہ اس قانون سے اپنی مذاق میں شادی کرنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

آسٹریلیا میں قبائلی خواتین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یا تو اپنے شوہر کو طلاق دینے کے لیے آمادہ کریں یا پھر شادی سے چھٹکارا پانے کے لیے ایک دوسری شادی کر لیں اس طرح ان کی پہلی شادی خود بخود منسوخ ہو جاتی ہے۔ امریکی ریاست کیٹیکس میں اس بات کی اجازت ہے کہ آپ ایک ہی شخص سے طلاق کے بعد تین بار شادی کر سکتے ہیں لیکن چوتھی بار اسی شخص سے شادی کرنے کی اجازت ریاست کا قانون نہیں دیتا ہے۔ امریکی ریاست ٹینیسی میں اگر شریک حیات جان سے مارنے کے لیے کوئی حربہ مثلاً زہر پلانے کی کوشش کرتا ہے تو اس بنیاد پر آپ کی طلاق منظور ہو سکتی ہے۔

نیویارک میں اگر آپ یہ ثابت کر سکیں کہ آپ کے شریک حیات کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے تو آپ کو طلاق مل سکتی ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ شادی کے دوران شریک حیات کی دماغی حالت کم از کم پانچ سالوں سے خراب رہی ہو۔ برطانیہ میں طلاق حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ شریک حیات کی حدود پر برائیاں کا ذکر کیا جائے۔ صرف ذہنی ناپسندیدگی کی بنیاد پر طلاق منظور نہیں کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ میں جوڑے طلاق کے لیے شریک حیات میں عجیب و غریب عیب تلاش کرتے ہیں۔ جیسا کہ ایک شوہر نے طلاق کے مقدمے میں کہا کہ وہ اپنی بیوی کو اس لیے طلاق دینا چاہتا ہے کیونکہ وہ ہر روز پھل پکاتی ہے۔



بھیرے

کاشف زبیر

رواں صدی کا مورخ جب تاریخ لکھے گا تو وہ مسلمانوں کو مظلوم ترین قوم کا خطاب دے گا۔ جس طرح مسلمانوں کا خون بہایا جا رہا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ہٹلر نے تھوڑے سے یہودیوں کا قتل عام کرایا تو لوگ اس ہولو کاسٹ پر آج بھی رو رہے ہیں۔ جب کہ اس سے کہیں زیادہ مسلمانوں کا قتل عام قیام پاکستان کے وقت ہوا، اب بھی فلسطین و لبنان میں جس طرح مسلمانوں کا خون بہایا جا رہا ہے یہ تاریخ کا حصہ بن رہا ہے لیکن ان سب سے زیادہ بری افتاد یورپ کے اکلوتے مسلمان ملک کے مسلمانوں پر پڑی ہے۔ جہاں ایک دن میں کئی کئی سو مسلمانوں کو ایذا اٹھانے دے دے کر ہلاک کیا گیا۔ کس بری طرح وہاں مسلمانوں کی نسل کشی کی گئی اس کا ہلکا سا عکس۔

اس ملک میں مسلمانوں کو چن چن کر شہید کیا گیا جس کی نظیر نہیں ملتی

ساتھ اپنے چھوٹے سے گھر میں موجود تھی۔ سردی کی وجہ سے ان کا بیشتر وقت باورچی خانے میں گزرتا تھا جہاں آگ جلتی اور کسی قدر حرارت رہتی تھی۔

سفینہ کا شوہر حاجو بیگ ملک کی فوج میں شامل ہو کر سریوں سے لڑنے گیا ہوا تھا اور سفینہ نے آخری بار ڈیڑھ سال پہلے اسے دیکھا تھا جب وہ کسی محاذ پر جانے سے پہلے

اس بار موسم سرما شدید تھا۔ یوٹیا کے اس دور دراز چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں لوگ ابھی تک اپنے گھروں میں محصور تھے۔ اپریل کا وسط آنے کے باوجود برف پگھلنے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ بہار کا موسم دور تھا۔ باغوں میں انگوٹھیں بھی نہیں لگے تھے سفینہ کو لگ رہا تھا کہ وہ وقت بھی نہیں آئے گا۔ سفینہ اپنے تین چھوٹے بچوں کے

ذرا دیر کے لیے گھر آیا تھا۔ اس نے سفینہ سے کہا۔ ”ممکن ہے یہ ہماری آخری ملاقات ہو مجھ سے وعدہ کرو کہ اگر میں مر گیا تو تم بچوں کا خیال رکھو گی۔“

سفینہ نے سن کر رو دی تھی لیکن جگ نے اس قوم کے اعصاب مضبوط کر دیے تھے اور انہوں نے تسلیم کر لیا تھا کہ جب اجتماعی طور پر کسی قوم کو خطرہ لاحق ہو تو فرد واحد کی زندگی کی اہمیت نہیں رہتی۔ اس احساس کے تحت سفینہ نے جلد خود پر قابو پا لیا۔ اور اس نے شوہر سے وعدہ کر لیا کہ وہ بچوں کا پورا خیال رکھے گی لیکن وہ اس کا انتظار بھی کرے گی۔ بے شک اسے ساری عمر انتظار کا رنڈا پڑے جب بھی وہ کرے گی۔

”جب ہم یہ جگ جیت جائیں اور میں بھی زندہ نہ رہوں تو تم کسی ایسے آدمی کو اپنا شریک سفر بنا لیتا۔“ حاجو بیک نے اس سے کہا لیکن سفینہ دل میں سوچ چکی تھی۔ اس کے لیے دنیا کا واحد مرد حاجو جی تھا۔ پھر وہ چلا گیا اور اس کے بعد اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ سریوں نے پورے بوسنیا کو یوں اپنی گرفت میں لے رکھا تھا کہ ایک حصہ دوسرے حصے سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ آمدورفت اور اطلاعات کے راستے بند تھے۔ ملک کا دارالحکومت سراہوو دو برس سے سریوں کے محاصرے میں تھا۔ سفینہ خود کو کسی دیتی تھی کہ حاجو خیریت سے ہے کسی وجہ سے اپنی خیریت کی اطلاع دینے سے قاصر ہے۔

اس چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں حاجو بیک کی کچھ زمین تھی، جس پر گرمیوں میں وہ گندم کاشت کرتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد یہ کام سفینہ نے سنبھال لیا تھا۔ اس کا ایک چھوٹا سا باڑہ تھا جس میں ایک گائے اور دو دھدینے والی چند بکریاں تھیں۔ ان کے علاوہ کچھ مرغیاں اور ٹرکی بھی پال رہی تھیں جن سے اڑے اور گوشت مل جاتے تھے۔ زمین سے اتنی گندم مل جاتی تھی کہ اپنے لیے نکال کر باقی وہ فروخت کر دیتی تھی تو اس سے کچھ رقم ہاتھ آ جاتی تھی۔ خوراک کے لحاظ سے انہیں کوئی پریشانی نہیں تھی بلکہ اگر بھی مجاہدین گاؤں میں آ جاتے تو سب کے ساتھ سفینہ بھی ان کی خوراک کی ضرورت پوری کرنے میں حصہ لیتی تھی۔

سفینہ کے تین چھوٹے بچے تھے، سب سے بڑی علیہ سات سال کی تھی پھر اس سے ایک سال چھوٹا غازی اور اس سے دو سال چھوٹا علی تھا۔ تینوں بچے ذہین اور ہوشیار تھے۔ انہوں نے محسوس کیا تھا کہ ان کا ملک اور ان کا گھر مشکل حالات سے دوچار ہے اور ان کی ماں کی مدد کرنے والا کوئی

نہیں ہے۔ اس لیے وہ عام بچوں کی طرح سفینہ کو بچک کرنے کے بجائے گھر اور زمین کے کاموں میں اس کی مدد کرتے تھے۔ خاص طور سے علیہ تو باورچی خانے کا آدھا کام سنبھال چکی تھی۔ گھر کی صفائی بھی وہی کرتی تھی۔ جب کہ غازی اور علی باہر کے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

اس علاقے میں عام طور سے اپریل کے آغاز تک برف پگھل جاتی تھی لیکن اس سال اپریل کے پہلے ہی برف غیر متوقع طور پر شدید برف باری ہوئی تھی۔ لوگ جو باہر نکل کر اپنے کھیتوں اور باغات کی دیکھ بھال اور سرما میں برفباری اور طوفانوں سے ہونے والی مکالوں کی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کی تیاری کر رہے تھے، پھر سے گھروں میں بند ہو جانے پر مجبور ہو گئے۔ جب سرما کا آغاز ہوتا تو لوگ خوش ہو جاتے تھے۔ کیونکہ گرمیوں میں شدید محنت کے بعد اب انہیں آرام کا موقع مل جاتا تھا۔

گھر والے لال کر کوئی مکمل کھیلے یا قسے کہانیاں سناتے لیکن رفتہ رفتہ یہ آرام انہیں بور کرنے لگتا تھا۔ وسط سرما تک وہ باہر جانے کے لیے بے تاب ہو جاتے اور جب بہار کا وقت قریب آتا تو ان کی بے تابی بھی عروج پر پہنچ جاتی تھی۔ جیسے ہی زمین برف کی قید سے آزاد ہوتی اور درختوں پر پرنے سے آنے لگتے وہ باہر نکل آتے اور اس وقت ان کی خوشی کا عالم دیکھنے والا ہوتا تھا اور اگر سرما طویل ہو جاتا اور وہ کچھ دنوں یا کچھ ہفتوں کے لیے مزید گھروں میں قید ہو جاتے تب ان کی مایوسی دیکھنے والی ہوتی تھی۔

سفینہ اور اس کے بچوں کا بھی یہی عالم تھا۔ گرمائے آخر میں چلنے والی گندم اور دوسری اشیا کو ذخیرہ کر کے اور فالٹو اجناس فروخت کر کے وہ سرما کے لیے لکڑی جمع کر لیتے تھے۔ جانوروں اور پرندوں کے لیے چارہ اور دانہ جمع کیا جاتا تھا۔ گھر اور باڑے کی مرمت کی جاتی تھی اور سارے کام منڈائے جاتے تھے۔ نومبر کے پہلے ہی برف باری کا آغاز ہو جاتا تھا اور یہ سلسلہ مارچ کے آخر تک جاری رہتا۔ اس کے بعد برف پگھلنے لگتی تھی۔

برف باری کے آغاز کے بعد سفینہ خود بھی باہر جانے سے گریز کرتی تھی اور بچوں کو بھی نہیں چلنے دیتی تھی اگر کوئی بیمار ہو جاتا تو طبی امداد کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ ان کے گاؤں میں نہ تو کوئی ڈاکٹر تھا اور نہ ہی دواؤں کا انتظام تھا۔ اس لیے سفینہ خاص طور سے بچوں کے معاملے میں بہت احتیاط کرتی تھی۔ اس کے بچوں کو سرما پسند نہیں تھا کیونکہ وہ

سفینہ جھکن سے چور ہو جاتی تھی۔ خاص طور سے موسم گرما میں اسے بہت محنت کرنا پڑتی۔

شمالی یونین میں ان کا گاؤں شروع میں جنگ سے دور تھا اور پہلے دو سال وہاں گولی کی آواز بھی نہیں گونجی تھی لیکن پھر سرب رفتہ رفتہ اس طرف بھی آنے لگے۔ دور پہاڑوں پر ان کی طرف سے کی جانے والی گولہ باری کی دھمک ساتھ دیتی راتوں میں روشنی دکھائی دینے لگی تھی۔ جنگ کو اپنے قریب پا کر گاؤں والوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ جنگ سے دور ہونے کے باوجود انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ سرب مسلمانوں کے ساتھ کیا کر رہے تھے۔ وہ جس علاقے پر قابو پاتے وہاں کے ہر مسلمان کو یا تو قتل کر دیتے یا اسے اپنے بنائے ہوئے غنیمت خانوں میں قید کر دیتے تھے۔ جوان عورتوں اور لڑکیوں کو جن جن کر لے جاتے اور بندی کیپوں میں انہیں مسلک زیادتی کا نشانہ بناتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ حاملہ ہو جائے اور پھر سربوں کی اولاد کو جنم دے۔ سرب مجرمانہ حملوں کو جنگی حربے کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ جوان مردوں اور لڑکوں کو وہ گرفتار کر کے جنگلوں اور پہاڑوں میں لے جا کر ان کا قتل عام کرتے اور انہیں اجتماعی قبروں میں دفن کر دیتے تھے۔

جب یہ خبریں گاؤں والوں تک پہنچیں اور انہیں پتا چلتا کہ سرب ان کے علاقے سے اب زیادہ دور نہیں ہیں تو ان میں بے چینی کی لہر دوڑ جاتی تھی اور وہ اپنی اور اپنے پیاروں کی جانوں کے لیے فکر مند ہو جاتے تھے۔ خاص طور سے جن کے گھروں میں جوان عورتیں تھیں ان کی فکریں بھی کہیں زیادہ ہو جاتیں۔ لیکن یہاں سے کہیں نہیں جاسکتے تھے کیونکہ ان کے چاروں طرف مسلمانوں کے دھمک تھے۔ یورپ کا کوئی ملک ان کو پناہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا اور ان کو نہارتا کہنے کے لیے یونین کے چاروں طرف ہجراتی کا کڑا حصار بنا دیا گیا تھا۔

سربا کے دوران ہی چاروں طرف سے لڑائی اور بربادی کی خبریں آنے لگی تھیں۔ سربوں نے علاقے میں مسلمانوں کی بستیاں اجاڑنا شروع کر دی تھیں۔ وہ کسی گاؤں کا محاصرہ کر لیتے اور پہلے اسے اپنی توپوں اور مارٹر گنوں سے نشانہ بناتے تھے۔ جب پورا گاؤں جلے گا ڈھیر بن جاتا اور انہیں حراحت کا موبوم سا خدشہ بھی باقی نہیں رہتا تو وہ بھوکے بھڑکیوں کی طرح آبادی میں گھس جاتے اور وہاں جو زندہ فرد نظر آتا اسے بے دریغ موت کے گھاٹ

کھلے اور آزار ہنا پسند کرتے تھے۔ جب کہ سردی میں انہیں پانچ مہینے کے لیے اس چھوٹے سے گھر میں محدود ہو جانا پڑتا تھا۔

بچوں کا دل بھلانے کے لیے سفینہ انہیں طرح طرح کے کھانے پینا کر کھلاتی تھی۔ ان کے ساتھ کھیتی اور انہیں کہانیاں سناتی تھی۔ سردیوں میں ناشتے کے بعد دن چھوٹا ہونے کی وجہ سے یہ لوگ دوپہر کا کھانا نہیں کھاتے رات کا کھانا سورج غروب ہوتے ہی کھا لیتے تھے۔ اس کے بعد وہ ہادرچی خانے سے مکان کے نیچے بنے خانے میں چلے جاتے۔ ساری سردیاں وہ خانے میں سوتے تھے کیونکہ وہ رات کے وقت گرم ہوتا تھا۔

تہ خانے میں ایک بڑا سا بستر تھا جس پر روٹی اور اون سے بھرا دبیر گدا بچھا ہوا تھا اور وہ اس نرم بستر پر اپنے اپنے کپلوں میں لیٹ کر سو جاتے تھے لیکن سونے سے پہلے وہ سفینہ سے کہانیاں ضرور سنتے تھے۔ سفینہ بڑھی لکھی تھی۔ اس نے کالج تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اسے کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا وہ جب تک کالج کی تعلیم کے دوران اپنی خالہ کے پاس شہر میں رہی اس نے کالج کی لائبریری کی تقریباً تمام ہی کہانیوں کی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ پھر اس کی شادی حاجو سے ہو گئی۔ یہاں گاؤں میں کتابیں مشکل سے دستیاب ہوتی تھیں اور اسے مطالعے کا وقت بھی نہیں مل پاتا تھا۔ پھر اس کی شادی کے پانچ سال بعد یونینا پر سربوں کی جانب سے جنگ مسلط کر دی گئی اور نتیجے یونینا کی مسلمان جدید ترین اسلحے سے لیس سربوں کا مقابلہ کرنے لگے۔ ملک کی فوج نہ ہونے کے برابر تھی لہذا رضا کار فوجیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان کے پاس اسلحہ بھی نہ ہونے کے برابر تھا لیکن وہ اپنے ملک اور قوم کے دفاع کے جذبے سے سرشار ہو کر سفاک سربوں کے مقابل ڈٹے ہوئے تھے۔

رفتہ رفتہ گاؤں کے سارے ہی جوان مرد بلکہ ہر وہ مرد جس کی عمر پندرہ سے پچاس برس کے درمیان تھی جنگ لڑنے چلا گیا اور اب گاؤں میں سوائے عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے کوئی نہیں تھا۔ وہی گاؤں کے سارے کام کرتے تھے۔ مویشی چراتے اور کھیتوں و باغات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ بہت سے گھرا لیے تھے جن میں کوئی ایک بھی مرد نہیں رہا تھا اور سفینہ کا گھر بھی ان ہی میں سے ایک تھا۔ اسے سارا کام خود کرنا پڑتا تھا۔ بچے اس کی مدد کرتے تھے لیکن وہ بھی کس حد تک مدد کر سکتے تھے۔ صبح سے شام تک کام کر کے

اتار دیتے۔ جوان عورتوں اور لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے جاتے۔ اگر گاؤں میں کچھ مکانات بچ جاتے تو سب آگے جانے سے پہلے انہیں آگ لگا دیتے تاکہ کسی اپنے گھر چھوڑ کر جانے والے مسلمانوں کو واپس آنے کا موقع بھی ملے تو یہاں سوائے راکھ کے ڈھیر کے انہیں کچھ نہ ملے۔ اسی طرح وہ ایک ایک کر کے مسلمانوں کی بستاناں اجاڑ رہے تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان بے گناہ لوگوں کی حمایت میں کوئی نہیں اٹھے گا۔

یہ بات گاؤں والے بھی جانتے تھے۔ انہیں احساس تھا کہ انہیں اپنا دفاع خود کرنا ہے لیکن وہ جدید اسلحے سے لیس ان درندہ صفت سربوں کے خلاف کیا کر سکتے تھے۔ پورے گاؤں میں کشتی کے چند ہتھیار تھے۔ یوگوسلاویہ میں مسلمانوں پر ہتھیار رکھنے کی سختی سے پابندی تھی اور کسی مسلمان کے پاس سے ہتھیار نکل آتا تو اسے فوراً جیل بھیج دیا جاتا تھا۔ ایسے میں مسلمان بہت رہ گئے اور سب جو فوج اور پولیس میں تھے ہر طرح سے مسلح اور طاقت ور تھے۔ جیسے ہی یونینیا نے آزادی کا اعلان کیا سب نیچے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ مذہب کہلانے والے یورپ میں قتل و غارت کا وہ طوفان اٹھا کہ اس نے شاید بنگلہ اور چکنیز خان کی رگوں کو بھی دنگ کر دیا ہوگا۔ اس قتل و غارت گری سے زیادہ تکلیف دہ..... رویہ یورپی اقوام کا تھا جنہوں نے انجانی ڈھنسا کی کے ساتھ مسلمانوں کا قتل عام نظر انداز کر کے یونینیا پر اسلحہ حاصل کرنے کی پابندی لگائی تھی۔ ایک نام نہاد پابندی سربوں پر بھی لگائی تھی مگر لیکن سب آؤں تو پہلے ہی پوری طرح مسلح تھے اور پھر سابق سوویت یونین یعنی روس ان کی ہر طرح سے مدد کر رہا تھا۔

گاؤں کے رہ جانے والے مرد ایک جگہ جمع ہوئے اور انہوں نے سربوں سے دفاع کے طریقوں پر غور کرنا شروع کر دیا۔ دفاع کا واحد طریقہ جو کبھی میں آیا وہ فرار کا تھا کیونکہ اب وہ یہاں سے نکل کر ہی... اپنی جان بچا سکتے تھے۔ لیکن یہاں سے نکل کر کہاں جاتے کیونکہ چاروں طرف سرب تھے۔ ان کے ہتھیار بہت معمولی تھے صرف کچھ دیہی مزامت کر سکتے تھے لیکن انہوں نے فیصلہ کر لیا، سربوں نے حملہ کیا تو وہ ان کے آگے ہتھیار نہیں ڈالیں گے بلکہ مرے دم تک مقابلہ کریں گے۔ ہتھیار ڈالنے کی صورت میں بھی ان کا بھی انجام ہوتا تھا۔

اپریل کا آغاز تھا لیکن پورے گاؤں میں ایک سہمی

ہوئی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کسی نے بہار کی آمد کا استقبال کرنے کا نہیں سوچا تھا۔ اور پھر موسم سرما میں پورے دو دن تک شدید برفانی طوفان آیا تھا۔ ہر طرف برف کے انبار لگ گئے اور گاؤں والے دوبارہ اپنے گھروں میں دھک جانے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے پاس خوراک ختم ہو رہی تھی۔ جنگ کی وجہ سے ویسے ہی کھانے پینے کے سامان کی قلت ہو گئی تھی۔ اور پھر سربا بھی طویل ہو گیا تھا۔

سفینہ کھانا بنا کر نیچے آئی تو بیچے بستروں میں دبے ہوئے تھے۔ علیہ کی طبیعت خراب تھی۔ بھائی اسے کہنے دینے کے لیے اس کے پاس بیٹھے تھے۔ اس نے ان سب سے کھانے کے لیے اور پر آنے کو کہا۔ ”علینہ تم یہیں رکو میں تمہارے لیے کھانا لاتا ہوں۔“

غازی اور علی اوپر آگئے۔ اس نے ان کے لیے میز پر کھانا لگا دیا اور خود علیہ کے لیے پیالے میں سوپ نکال کر نیچے لے آئی۔ علیہ کی طبیعت خرابی کی وجہ سے اس نے گوشت اور خشک سبزیوں کا سوپ بنایا تھا تو بیمار علیہ بھی پی سکتی تھی۔ علیہ بیمار ہونے کے ساتھ خوف زدہ بھی تھی۔ اس نے سن لیا تھا کہ سب اس کے گاؤں کے پاس آگئے تھے اور وہ حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ سفینہ نے اس کے سینے پر نیپکن بچھایا اور اسے بچ سے سوپ پلانے لگی۔

”ماما کیا سب یہاں آگئے ہیں؟“
سفینہ کا ہاتھ رک گیا۔ ”ہاں... لیکن تم غلرمت کرو ہم انہیں اندر آنے نہیں دے س کے اور جلد ہماری بہادر فوج آ کر ان سربوں کو مار بھگائے گی۔“

علینہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ ”ماما ایک بار آپ نے ہمیں بھیڑیوں کی کہانی سنائی تھی جنہوں نے گاؤں کا محاصرہ کر لیا تھا۔“

”ہاں سنائی تھی۔“ سفینہ نے سر ہلایا۔ درحقیقت اس نے یہ کہانی ایک بار نہیں ان بچوں کو لے کر بار بار سنائی تھی۔ ہر سربا میں وہ کہانیاں سننے تھے ان میں سب سے زیادہ شوق سے سنی جانے والی کہانی یہی تھی۔ علیہ نے سوپ ختم کر کے اس سے التجا آمیز انداز میں کہا۔

”ماما آج رات یہ کہانی پھر سناؤ۔“

سفینہ اس دن بہت تھک گئی تھی کیونکہ اس نے چھت سے برف بھی صاف کی تھی مگر وہ بیمار علیہ کی التجا نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے کہا۔ ”ضرور سناؤں گی میری بچی کیوں نہیں سناؤں گی۔“

کیا آپ لبوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کبتوری، غبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدا را۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوائیں۔

المسلم دار الحکمت (جرٹر)

(دیسکی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

جب غازی اور علی کو پتا چلا کہ آج رات ان کو میلوں والی کہانی سننے کا موقع ملے گا تو وہ بھی خوش ہو گئے۔ اس خوشی میں انہوں نے جلدی جلدی سفینہ کا ہاتھ بنا کر کام ختم کرایا۔ کچھ کافی رکھی تھی سفینہ نے اپنے لیے کافی مانی اور دروازے کھڑکیاں اچھی طرح بند کر کے نیچے نہ خانے میں آگئی۔ بچے بستر میں اپنی اپنی جگہ لیٹ چکے تھے۔ بستر اتنا بڑا تھا کہ وہ سب آرام سے مل کر لیٹتے تھے۔ سفینہ بھی کبل میں گھس گئی اور اس نے کافی کا گک پاس رکھ لیا تھا۔ ”ماما کہانی سنائیں نا۔“ غازی نے بے چینی سے کہا۔ سفینہ نے گک اٹھایا اور کہانی کا آغاز کیا۔ یہ نسل در نسل چلنے والی کہانی تھی۔ اس نے کہا شروع کیا۔ ”بہت عرصے پہلے کی بات ہے.....“

یہ اس وقت کی بات تھی جب مشرقی یورپ عیسائیوں اور ترک مسلمانوں کے درمیان میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ کئی سو سال تک جاری رہنے والی اس جنگ نے اس پورے علاقے کو تباہ و برباد کر ڈالا تھا۔ آبادیاں اجڑ گئی تھیں اور شہر و دیہان ہو گئے تھے۔ لوگ خانہ بدوش بن گئے تھے۔ ایک طرف یہ جنگ جاری تھی تو دوسری طرف عیسائیوں میں آپس میں خانہ جنگی جاری تھی۔ کیتھولک اور آرتھوڈوکس آپس میں لڑ رہے تھے پھر ان کے بے شمار ذیلی فرقے تھے جو موقع پا کر ایک دوسرے کے خلاف خون ریز کارروائیاں کر جاتے تھے۔ آرتھوڈوکس فرقے بے الگ ہونے والے ایک فرقے نے اپنی الگ شناخت بنائی تھی وہ امن پسند لوگ تھے۔ اب کے امن پسند دوسرے فرقوں کو ظلم کا شکار بنا رہے تھے۔ عیسائی ایک طرف جو آرتھوڈوکس کو ظلم کا شکار تھے تو دوسری طرف کیتھولک ان کی زندگی الگ اجہرن کر کے رکھتے تھے کیونکہ دونوں فرقے اس نئے فرقے کو عیسائیت سے خارج سمجھتے تھے۔ نئے فرقے کے لوگ اپنی جانیں بچانے کے لیے پہاڑوں پر چڑھ گئے اور وہیں اپنی بستیاں بسا لیں۔ کیونکہ نیچے میدانوں میں ان کے دشمن بہت طاقتور تھے۔ ان کو بڑی مملکتوں کی حمایت حاصل تھی۔ جیسے آرتھوڈوکس کے پشت پناہ یونانی اور روسی تھے جب کہ کیتھولکس کی حمایت میں اٹلی اور فرانس کھڑے تھے۔ اس بے چارے فرقے کو کہیں جائے پناہ نہیں تھی۔

ان کی تعداد بھی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ لیکن سو سال میں انہوں نے اس علاقے میں بے شمار بستیاں آباد کر لی تھیں۔ ان میں سے ایک بستی سفینہ کا یہ چھوٹا سا گاؤں بھی

تھا۔ اس وقت اس گاؤں میں صرف نئے فرتے کے لوگ تھے۔ انہیں پھلتے پھولتے دیکھ کر آرتھوڈوکس عیسائی زبردست فوجی تیاری کے ساتھ ان پر چڑھ دوڑے اور ایک ایک کر کے ان کی بستیاں تاراج کرنے لگے۔ جو ان کے ہاتھ آتا اسے قتل کر دیتے اور باقی بچ جانے والوں کو غلام بنا لیتے۔

لیکن اس موقع پر عثمانی ترک ان کے نجات دہندہ بن کر آئے انہوں نے حملہ آور فوج کی پشت سے حملہ کر کے اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ نچتے لوگوں کے خلاف بہادری کے مظاہرے کرنے والی فوج ترکوں کے سامنے چند گھنٹے بھی نہیں ٹھہر سکی تھی اور اس طرح کھست کھا کر بھاگی کہ پہاڑوں میں دور تک ان کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ نئے فرتے کے لوگوں نے جان بچانے پر ترکوں کا شکر یہ ادا کیا اور پھر اس قوم نے ایک انوکھا فیصلہ کیا جو اس سے پہلے دنیا کی شاید ہی کسی قوم نے کیا ہو۔ اپنے ہم مذہبوں کے ظلم و ستم کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے وہ سب کے سب ایک ساتھ مسلمان ہو گئے اور یہی لوگ آج یونینیا کے مسلمان کہلاتے ہیں۔ یہ ترک یا وسط ایشیائی نہیں ہیں جیسا کہ ان کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے بلکہ یہ ایک یورپی قوم ہے۔ اسی نسل کے مسلمان البانیہ اور پورے مشرقی یورپ میں پھیلے ہوئے ہیں۔

سفینہ کے گاؤں کے لوگ بھی مسلمان ہو گئے اور اسی جگہ آباد رہے۔ جنگیں یونانی جاری رہیں۔ ان کے علاقے پر بھی ترک قابض ہو جاتے اور بھی عیسائی غالب آ جاتے۔ جب عیسائی آتے تو وہ ان کی زندگی اجیرن کر دیتے۔ ان کا قتل عام کرتے اور ان کی بستیاں اور کھیتیاں اجاڑ دیتے تھے۔ پھر جب ترک آ جاتے تو وہ سکون کا سانس لیتے تھے۔

اٹھارویں صدی کا آخری عشرہ یورپ میں سردی کے لیے مشہور ہے اس عشرے میں بے پناہ سردی پڑی تھی اور گرمیاں بہت مختصر سی آئی تھیں۔ اس سردی نے جہاں انسانوں کو پریشان کیا وہیں جنگل کے جانور بھی پریشان ہو گئے تھے۔ کیونکہ سردی کی وجہ سے ان کو خوراک کم ملتی تھی۔ درندوں کی خوراک کم ہوئی تو انہوں نے یوکلار انسانی آبادیوں کا رخ کیا کیونکہ وہاں انہیں کھانے کے لیے پالتو جانور تو مل سکتے تھے۔

ایک سرما کے آخری دن تھے اپریل کا آغاز ہو چکا تھا اور ابھی تک برف باری جاری تھی۔ سردی ایسی تھی کہ انسان

گھر سے باہر نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک دن جنگل میں لکڑی کاٹنے والے چرواہوں نے وہاں چند بھیڑ چا دیکھے۔ حالانکہ یہ اس موسم میں بچنے میدانوں کی طرف چلے جاتے تھے اور جب برف پھل جاتی تو اوپر پہاڑوں پر چلے جاتے تھے۔ اس گاؤں کے آس پاس اس سے پہلے بھی بھیڑ بے نظر نہیں آئے تھے۔ یہ بھوکے تھے اور انہوں نے چرواہوں کا گاؤں تک پیچھا کیا۔ شروع میں لوگوں نے اس بات پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن اس کے چند دن بعد ہی جنگل میں جانے والی دو عورتوں پر بھیڑیوں نے حملہ کر دیا اور انہیں ہلاک کر کے کھا گئے۔ جب ان کے گھر والے انہیں تلاش کرنے لگے تو ان عورتوں کی بس چند ہڈیاں ہی ملی تھیں۔

پہلی بار لوگوں کو احساس ہوا کہ بھیڑیے نہ صرف ان کے علاقے میں آ سکتے ہیں بلکہ وہ بھوک مٹانے کے لیے انسانوں پر حملے سے بھی دریغ نہیں کر رہے۔ اس کے بعد لوگوں نے جنگل جانا چھوڑ دیا اور اپنی ضروریات گاؤں کے پاس سے پوری کرنے لگے مگر اس دوران میں گاؤں کے گرا بھیڑیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ لوگ خوف زدہ ہو گئے کیونکہ یورپ میں سب سے خطرناک جانور بھیڑیے کو سمجھا جاتا ہے مشرقی یورپ کے بھیڑیے خونخواری اور سفاکی میں شہر وں کو بھی مات دیتے ہیں۔ ایسے بے شمار واقعات ہو چکے تھے۔ جب کسی علاقے میں بھیڑیوں کی تعداد بڑھ گئی اور جنگل کے جانور ان کے لیے کم پڑ گئے تو انہوں نے آبادیوں کا رخ کیا اور پالتو جانوروں کے ساتھ انسانوں پر بھی حملے کرنے لگے۔

گاؤں والے اس بات سے واقف تھے اس لیے انہوں نے بھیڑیوں کا تذکرہ کرنے کے لیے مقامی ترک حکام سے مدد طلب کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ تربیت یافتہ فورس ہی ان کا صفایا کر سکتی تھی۔ اس کام کے لیے دو نوجوان تیار ہوئے جو پہلے بھی شہر تک جا چکے تھے لیکن جب وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلے تو انہوں نے کئی سو بھیڑیوں کو اپنے راستے میں موجود پایا۔ بھیڑیے طویل سر میں بھوک سے پاگل ہو چکے تھے لہذا جب انہوں نے کھانے کے قابل انسانوں اور گھوڑوں کو سامنے دیکھا تو وہ ان پر ٹوٹ پڑے۔ دو نوجوان بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر گاؤں واپس آئے۔ ان کے گھوڑے بھیڑیوں کے ہتھے چڑھ گئے تھے اور اب وجہ سے ان کی جان بچی تھی کیونکہ بھوکے بھیڑیے گھوڑوں

بھینٹنے لگے تھے اور انسانوں پر ان کی توجہ اتنی نہیں تھی۔

گاؤں سے نکلنا ناممکن لگ رہا تھا اور اب گاؤں والوں کو اس بات کی فکر لاحق ہوئی تھی کہ کہیں بھیڑیے گاؤں پر حملہ نہ کر دیں۔ اگرچہ گاؤں کے گرد ایک چھوٹی سی پتھروں سے بنی چار دیواری تھی لیکن بہت سارے گھر چار دیواری کے باہر تھے اور بھیڑیے آسانی سے ان گھروں پر حملہ کر سکتے تھے۔ لوگوں نے خوف زدہ ہو کر اپنے گھروں کو مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ پھر ان کا خدشہ درست ثابت ہوا۔ باہر جانے کی ناکام کوشش کے دو دن بعد بھیڑیے گاؤں کے آخری سرے پر واقع ایک مکان سے ملحق باڑے پر حملہ آور ہوئے۔ وہ بھوک سے پاگل ہو رہے تھے۔ مکان کے مالک نے تیر چلا کر انہیں روکنے کی کوشش کی مگر بھیڑیے اپنے ساتھیوں کی ہلاکت کی پروا کیے بغیر باڑے کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے اور مویشیوں کی چرچہ مچا کر مرنے لگے۔ چرواہے بھی سے مکان کی چھت سے انہیں دیکھتا رہا۔ اس نے تیر مار کر کئی بھیڑیوں کو ہلاک کر دیا تھا لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ جب تک گاؤں والے مدد کو آتے بھیڑیے اس کے سارے جانوروں کو مار چکے تھے اور ان کی لاشیں کھا رہے تھے۔ مد اعلت کے آثار دیکھ کر وہ کئی لاشیں منہج کر ساتھ لے گئے۔

اس واقعے کے بعد لوگوں نے فوری طور پر گاؤں کی چار دیواری میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جن کے مکان باہر تھے وہ اپنے اہل خانہ اور جانوروں کو چار دیواری میں منتقل کرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے چار دیواری کو اونچا اور مضبوط کرنا شروع کر دیا تاکہ بھیڑیے اسے پار نہ کر سکیں جن کی تعداد اب ہزاروں میں پہنچ چکی تھی۔

بھوک سے بے تاب یہ بھیڑیے خالی مکانات کا پکڑ لگنے لگے اور جب انہوں نے دیکھا کہ چار دیواری سے باہر سارے مکان خالی ہو چکے ہیں اور وہاں نہ انسان ہیں اور نہ جانور تو انہوں نے گاؤں کی چار دیواری کا محاصرہ کر لیا۔ انہوں نے چار دیواری پھلانگنے کی کوشش بھی کی لیکن یہ اونچی تھی کہ وہ اسے پار نہیں کر سکے۔ گاؤں کے لوگ جتنبو نہیں تھے ان کے پاس اپنے دفاع کے لیے بس چند ایک ہتھیار تھے۔ خاص طور سے تیر کمان محدود تھے اور وہ بھی چند افراد کے پاس تھے۔ کچھ لوگوں کے پاس تلواریں اور نیزے وغیرہ تھے۔ انہوں نے چار دیواری سے تیر چلا کر بھیڑیوں کو ڈرانے کی کوشش کی لیکن چالاک بھیڑیے اپنے چند ساتھیوں

کا نقصان اٹھانے کے بعد ایسی جگہوں سے دور رہنے لگے تھے جہاں سے ان پر حملہ ہو سکتا تھا۔

گاؤں والے چار دیواری میں محفوظ تھے اور بھیڑیے اسے پار نہیں کر سکتے تھے لیکن اتنے افراد چار دیواری میں آنے سے دوسرے کئی مسائل پیدا ہونے لگے تھے۔ صفائی کا فقدان ہو گیا تھا اور انسانی بول ویزاری بوسے دباغ خراب ہونے لگا تھا۔ چار دیواری میں پانی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا وہ برف پگھلا کر اسے استعمال کر رہے تھے۔ پھر جلانے کے لیے لکڑی بھی کم پڑنے لگی۔ البتہ ان کے پاس خوراک خاصی تھی۔ چار دیواری کی حد میں موجود برف تیزی سے ختم ہونے لگی اور اب نئی برف باری کا امکان نہیں تھا اور نہ ہی بارش کا موسم تھا۔

دوسری طرف بھیڑیے مسلسل اس تاک میں تھے کہ کسی طرح انہیں چار دیواری میں داخل ہونے کا کوئی راستہ مل جائے۔ ان کی بھوک بڑھتی جا رہی تھی۔ موسم سرما طویل ہونے سے وہ ابھی اور پر نہیں جاسکتے تھے اور ان کی خوراک کے ذرائع بھی محدود تھے۔ اگر انہیں جلد کھانے کے لیے کچھ نہ ملتا تو وہ بھوک سے مر جاتے۔ چند جانور مار کر ان کی بھوک نہیں ختم ہوئی تھی۔ پھر چند بھیڑیوں نے چار دیواری میں ایک کمزور جگہ بھانپ لی۔ اس جگہ دیوار کے پاس ایک چھوٹا سا ٹیلا تھا اور وہ اس سے چھلانگ لگا کر دیوار کے دوسری طرف جاسکتے تھے۔ جہاں ان کی خوراک کے لیے بہت کچھ تھا۔

بھیڑیوں نے اس جگہ کو تڑپا لیا اور گاؤں کے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے یہ ظاہر اس جگہ سے تغافل پر تیار شروع کر دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے ایک منصوبے کے تحت گاؤں کے لوگوں کو بے آرام کرنا شروع کر دیا۔ وہ رات ہوتے ہی چار دیواری کے پاس جمع ہو کر اتنا شور کرتے کہ اندر موجود لوگوں کا سونا حال ہو جاتا۔ وہ بھیڑیوں کی خوفناک آوازیں سن کر جاگتے رہنے پر مجبور تھے۔ بھیڑیے کسی جگہ جمع ہو کر ایسا شور کرتے جیسے حملہ کرنے والے ہوں اور گاؤں والے اس طرف دوڑے آتے تھے۔ جب وہ اس طرف آتے تو بھیڑیے کسی دوسری جگہ جمع ہو کر ایسا ہی شور شروع کر دیتے تھے۔ ان کا مقصد لوگوں کے اعصاب شل کرنا تھا تاکہ جب وہ اصل میں حملہ کریں تو کوئی مزاحمت نہ کر سکے۔

گاؤں کے لوگ دن رات جاگ جاگ کر واقعی بڑھال ہونے لگے تھے۔ اوپر سے پانی اور ایندھن کی کمی بھی

رنگ لاری تھی۔ بچے کچھ پانی پر لوگوں میں جھگڑے ہونے لگے۔ انہوں نے ایک ایک جگہ سے برف حاصل کر کے استعمال کر لی تھی۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں کنویں نہیں کھودے جاسکتے تھے اور ان کی پانی کی تمام ضروریات گاؤں کے باہر موجود چشمے پوری کرتے تھے۔ لکڑی بھی ختم ہو چکی تھی۔ اوپر سے سردی جانے کا نام نہیں لے رہی تھی جن کو آگ جلانے کے لیے لکڑی نہیں ملتی تھی وہ ساری رات بھسکتے رہتے تھے۔ بہت سارے لوگ خوراک کچی کھانے پر مجبور تھے کیونکہ کھانا بنانے کے لیے بھی لکڑی نہیں رہی تھی۔

ایک رات جب تھکے ہارے گاؤں والے سو رہے تھے اور پہرے پر چند اگتھے ہوئے افراد تھے تو بھیڑیوں نے تاڑی ہوئی جگہ سے چار دیواری بھلائی اور اندر داخل ہو گئے لیکن انہوں نے یہ کام بہت خاموشی سے کیا تھا ان کی کوشش تھی کہ اندر موجود افراد کے خبردار ہونے سے پہلے وہ اچھی تعداد میں اندر پہنچ جائیں۔ ذرا سی دیر میں درجنوں بھیڑیے اندر آچکے تھے۔ لیکن انسانوں سے پہلے رکھوالی والے نتوں نے ان کی موجودگی محسوس کر لی اور وہ بھونک بھونک کر لوگوں کو خبردار کرنے لگے۔ مگر جیسے ہوئے اور گہری نیند میں ڈوبے لوگوں کو جانے اور باہر آنے میں کچھ وقت لگا تھا اور اتنی دیر میں سیکڑوں بھیڑیے اندر گھس آئے تھے۔ جب لوگ باہر آئے تو بھیڑیوں نے پہلے ان پر ہی حملہ کر دیا۔ کئی سو بھیڑیوں کو گاؤں کی چار دیواری میں پا کر لوگوں کے ہوش اڑ گئے تھے۔ ان میں سے اکثر تو پلٹ کر واپس گھروں میں گھس گئے اور جو باہر رہ گئے تھے وہ بھیڑیوں سے مقابلہ کرنے لگے۔ مگر ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ انسانوں پر حاوی آنے لگے۔ درجن بھر پہرے واری پر موجود انسانوں کو ختم کر رہے تھے اس کے بعد بھیڑیے جانوروں پر ٹپ پڑے۔

ایک شور مچا تھا اور لوگ اپنے اپنے گھروں میں قید کانپ رہے تھے۔ بھیڑیے مسلسل چار دیواری میں داخل ہو رہے تھے اور مارے جانے والے انسانوں کے ساتھ جانوروں کو بھی چھینوڑ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے سارے ہی جانوروں کو ختم کر دیا اور ان سے اپنی حکم آگ بھائی۔

ساری رات بھیڑیے لاشوں کو چھینوڑتے اور کھاتے رہے۔ ان کی غراہوں سے گھروں میں قید لوگوں کا خون

خشک ہو رہا تھا انہیں معلوم تھا کہ جانوروں کے بعد ان کی ہی باری ہے۔ لوگ اتنے سہمے ہوئے تھے کہ جن گھروں کے افراد مارے گئے تھے وہ بھی مارے خوف کے محل کران کا غم نہیں منا رہے تھے۔ کوئی رو رہا تھا تو اپنی آواز اپنے سینے تک محدود رکھ کر۔ کیونکہ ان کو خوف تھا۔ بھیڑیے ان کی آواز سن کر ان کے مکانوں میں گھس آئیں گے۔ جن کے مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں کزور تھیں۔ وہ ان کی مرمت کرنے میں لگ گئے۔ اب بھیڑیوں سے جنگ انفرادی ہو گئی تھی سب کو اپنی اپنی جان خود بچانی تھی۔

ساری رات بھیڑیے جا ہی چاتے رہے اور صبح تک انہوں نے چار دیواری میں موجود ہر جانور کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان کا گوشت کھا کر ان کی عظم سیر ہو گئی تھی لیکن ابھی وہ یہاں سے جانے کے موڑ میں نہیں تھے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ابھی یہاں کھانے کے قابل اور بھی بہت کچھ ہے۔ گھروں کے بند دروازوں کے پیچھے سے انہیں انسانوں کی بو آ رہی تھی۔ صبح تک سارے ہی بھیڑیے اندر گھس آئے تھے اور روشنی ہونے پر بھی وہ ہر طرف بکھری لاشوں کو چھینوڑتے رہے۔ جھریوں سے نظر آنے والا منظر بہت خوف ناک تھا۔ ہر طرف خون تھا یا لاشیں اور ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ خوف ناک منظر دیکھ کر لوگوں کو اپنا انجام سامنے نظر آنے لگا تھا۔

☆☆☆

دھاکوں نے انہیں چونکادیا تھا۔ بچے سہم کر سفینہ سے پلٹ گئے۔ علینہ نے سبے انداز میں پوچھا۔ ”ماما یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ سفینہ نے ان کو تسلی دی۔ ”سانسے والے گاؤں میں لڑائی ہو رہی ہے۔“

بچے مطمئن نظر آنے لگے۔ غازی کو کہانی کا خیال آگیا اور وہ اشتیاق سے بولا۔ ”ماما پھر کیا ہوا؟“

وہ پہلے کئی بار یہ کہانی سن چکے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ پھر کیا ہوا لیکن وہ ہر بار اتنے ذوق و شوق سے سنتے تھے جیسے پہلی بار سن رہے ہوں۔ سفینہ نے اپنا دھیان باہر سے آتی آوازوں سے ہٹایا اور انہیں پھر کہانی سنانے لگی۔

☆☆☆

ہزاروں کی تعداد میں بھیڑیے گاؤں کی چار دیواری میں آزادانہ گھوم رہے تھے۔ اگر چہ ابھی انہیں خوراک کی کمی نہیں تھی لیکن اس کے باوجود ان کی رال بند گھروں میں

موجود انسانوں پر ٹیکنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ گھروں میں گھسنے کی کوشش کرنے لگے۔ عورتیں اور بچے رو رہے تھے اور مرد مانس روکے بیٹھے تھے۔ انہیں احساس تھا کہ یہ آفت اتنی آسانی سے جانے والی نہیں ہے۔ اس دن اور آنے والی رات بھیڑیے بچی کچی لاشوں کو بھینڑتے رہے اور اگلے دن تک وہ ان کی ہڈیاں بھی چبا چکے تھے۔ بے شک جانور بہت سارے تھے لیکن کھانے والے بھیڑیوں کی تعداد ان سے کہیں زیادہ تھی اور وہ سردیوں میں کئی ہفتوں سے بھوکے تھے۔

لوگ مایوس ہو کر اب خدا سے دعا کر رہے تھے کہ اس آفت کو ٹال دے۔ پھر رات کسی وقت ہوا میں اچانک تبدیلی آئی اور موسم کسی قدر گرم محسوس ہونے لگا۔ جب اگلی صبح طلوع ہوئی تو لوگوں نے جھریوں اور چھتوں پر بنی کھڑکیوں سے دیکھا کہ آس پاس کے پہاڑوں پر برف پھل رہی تھی۔ درخت جو کل تک برف سے ڈھکے ہوئے تھے ان کی شاخیں نظر آنے لگی تھیں۔

موسم کی اس تبدیلی نے بھیڑیوں کو بھی چونکا دیا اور انہوں نے ان بلند پہاڑوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا جو گرمیوں میں ان کا مسکن تھے اور جہاں وہ افزائش نسل کرتے تھے۔ موسم بدلنے ہی انہیں اپنے بھٹ یاد آنے لگے تھے اور پھر انہوں نے چار دیواری سے باہر جانا شروع کر دیا۔ بھیڑیے جا رہے تھے۔ لیکن سب نہیں بہت سارے اب بھی لالچ میں یہاں رکے ہوئے تھے۔ رہ جانے والوں نے جانے والوں کو روکنے کی کوشش کی لیکن جو فطرت کے سامنے تسلیم خم کرتے ہیں وہ رکنے کو تیار نہیں تھے اور جو فطرت پر اپنی ذہانت کو ترجیح دے رہے تھے وہ وہیں رہ گئے لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی۔ شاید ہزاروں میں سے چند سو بھیڑیے ہی گاؤں میں باقی رہ گئے تھے اور باقی دوسرا دن لالچ ہونے سے پہلے وہاں سے جا چکے تھے۔

گاؤں والے منتظر تھے کہ باقی بھی چلے جائیں تو وہ باہر نکلیں۔ اگلے روز موسم مزید بہتر ہوا اور بہار کے واضح آثار نظر آنے لگے۔ درختوں اور گاؤں کے آس پاس پہاڑوں سے برف تقریباً صاف ہو گئی تھی۔ باقی رہ جانے والے بھیڑیوں میں سے بھی کچھ فطرت کی آواز کو نظر انداز نہ کر سکے اور حسرت و یاس لیے گاؤں پر آخری نظر ڈال کر ہاں سے رخصت ہو گئے لیکن ابھی بہت سارے بھیڑیے ہاں موجود تھے اور ان کے ہوتے ہوئے باہر نکلنے کا سوال

ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

دو دن اور گزر گئے تھے۔ ایک طرف بہت سارے گھروں میں خوراک ختم ہو گئی تھی اور پانی تو شاید ہی کسی گھر میں تھا۔ تو دوسری طرف بھیڑیے پھر سے بھوک سے بیتاب ہونے لگے تھے۔ انہیں آخری بار کچھ کھائے ہوئے دو دن گزر چکے تھے اور ان کے پیٹ پھر سے خالی تھے۔ جب ان کی تاب ختم ہو گئی تو انہوں نے گھروں میں گھسنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ دروازوں اور کھڑکیوں سے خود کو نکرا رہے تھے اور انہیں توڑنے کی سعی کر رہے تھے۔ اندر سے آتی زندہ جسموں کی بو انہیں اور بھی بے تاب کر رہی تھی۔

بھیڑیے جن گھروں میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے ان کے مکین خوف کے باوجود مدافعت کر رہے تھے اور اندر رہتے ہوئے بھیڑیوں کے خلاف ہر ممکن ہتھیار استعمال کر رہے تھے لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ زیادہ دیر مدافعت ممکن نہیں تھی۔ ایک بار بھیڑیے کی گھر کا دروازہ توڑ دیتے تو گھر والوں کو صرف خدا ہی بچا سکتا تھا۔ وہ ایک بار پھر خدا کو یاد کرنے لگے۔ بھیڑیوں کی گاؤں میں موجودگی کو پانچواں دن طلوع ہوا تو ان کے تیور خراب تھے اور روشنی ہوتے ہی انہوں نے گھروں میں گھسنے کی دیوانہ وار کوشش شروع کر دی۔ ان کی گزشتہ دن کے حملوں سے کئی مکانات کے دروازے کمزور ہو گئے تھے اور وہ ان کے تازہ حملوں کے آگے لرزنے لگے تھے۔ ان سے زیادہ اندر موجود لوگ لرز رہے تھے۔ انہیں موت سامنے نظر آرہی تھی۔

پھر جیسے اچانک موسم تبدیل ہوا اسی طرح بھیڑیوں کا رویہ اچانک تبدیل ہو گیا اور وہ حملہ کرتے کرتے رک گئے اور منہ اٹھا کر فضا میں کچھ سو گھٹنے لگے۔ لوگ انہیں حیرت اور خوف سے دیکھ رہے تھے۔ بھیڑیوں کا رویہ ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ پھر اچانک گاؤں کی چار دیواری کے داخلی دروازے کی طرف سے شور بلند ہوا اور ایک فوجی دستہ اندر داخل ہوا۔ یہ ایک ترک فوجی دستہ تھا جو اس علاقے میں گشت کر رہا تھا اور اتفاق سے یہاں چلا آیا تھا۔

بھیڑیوں نے اس فوجی دستے پر حملہ کیا لیکن فوراً ہی اسے لینے کے دینے پڑ گئے جب ترکوں نے بھیڑیوں کو تلواروں اور نیزوں کی نوک پر رکھ لیا۔ جب ان میں سے درجنوں مارے گئے تو پھر انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ پلٹ کر بھاگے لیکن اس احاطے میں کہیں جانے پناہ نہیں تھی کیونکہ باہر جانے کے دو ہی راستے تھے ایک سے گزر کر

بھیڑے اندر آئے تھے اور دوسرے سے فوجی دستہ اندر آیا تھا۔ یہ راستہ بند تھا اور دیوار والا راستہ مشکل تھا۔ اس سے ایک وقت میں ایک ہی بھیڑیا باہر جاسکتا تھا۔ جب تک بچ جانے والے بھیڑیے اس راستے سے باہر جاتے ان میں سے بھی نصف سے زیادہ مارے جاسکے تھے۔ سپاہی باہر نکل کر گھوڑوں پر ان کا پیچھا کر رہے تھے اور اپنے تیروں سے انہیں نشانہ بنا رہے تھے۔ ایک گھنٹے کے اندر دوسو سے زیادہ بھیڑیے مارے جاسکے تھے۔ گاؤں کے احاطے میں اور اس کے باہر ان بھیڑیوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔

جب بھیڑیوں کے اس حملے کی اطلاع مقامی ترک حکام تک پہنچی تو انہوں نے لوگوں کو محفوظ کرنے کے لیے اس پورے علاقے میں بھیڑیوں کے خلاف ایک شکاری مہم شروع کی اور سپاہی جنگلوں میں بھیڑیوں کو گھیر کر ہلاک کرنے لگے۔ چند مہینوں میں ہزاروں کی تعداد میں بھیڑیے مارے جاسکے تھے اور اب مقامی لوگوں کو ان سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔

کہانی سننے سننے بچے سو گئے تھے۔ سفینہ کو بھی نیند آئے گی۔

☆☆☆

سفینہ کئی برس بعد اپنے گاؤں آئی تھی۔ اب یہاں سوائے طے ہوئے مکانوں کے کھنڈرات اور طے کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چار سال پہلے جب سرب یہاں حملہ آور ہوئے تھے تو اس گاؤں کی آبادی کوئی ایک ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ پہلے انہوں نے حسب روایت بے پناہ گولہ باری کی۔ توپوں اور مارٹنز کے گولے ان کے گھروں اور پناہ گاہوں پر برسنے لگے تھے۔ ایک جاہلی تھی، ایک قیامت تھی جو ان پر نازل ہوئی تھی۔ جن کے گھر بمباری کا نشانہ بنے وہ ان کے طے تلے دفن ہو کر رہ گئے اور جو بچ گئے وہ پناہ کے لیے دیوانہ وار ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ لیکن برستے گولوں میں کہیں جائے امن نہیں تھی۔

سفینہ کا مکان بھی ایک مارٹنز گولے کا نشانہ بنا اور وہ اپنے بچوں کو سینے بٹھائی تھی۔ گولے سے مکان کا اوپری حصہ تباہ ہوا تھا اور اس میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ یہ خانہ بچ گیا تھا لیکن اگر وہ یہاں سے نہ نکلے تو کچھ دیر میں یہ ان کا مقبرہ بن جاتا۔ سفینہ نے بچوں سے جموٹ بولا تھا کہ سرب برابر والے گاؤں پر گولہ باری کر رہے تھے۔ وہ ان کے گاؤں کا محاصرہ کر چکے تھے اور اس روز اس محاصرے سے نکلنے کی

کوشش کرنے والے تمام ہی مسلمان سربوں کی مشین گنوں کا نشانہ بن گئے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی بچ کر نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کے بعد مسلمان اپنے گھروں میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ جو چند مارٹنز کے قابل تھے وہ ناقابل ذکر قسم کے ہتھیاروں سے گاؤں کا دفاع کر رہے تھے لیکن صاف نظر آرہا تھا ان کی کوشش لامحالہ تھی۔ سرب جلد ان کے گاؤں پر قابض ہونے والے تھے۔

سربوں نے اپنی توپیں اور مارٹنز نصب کیں اور گاؤں پر بمباری شروع کر دی۔ چاروں طرف آگ و آہن کی بارش جاری تھی۔ سفینہ کا گھر نشانہ بنا تو اس نے بچوں کو لے کر وہاں سے نکل جانا مناسب سمجھا اور نہ وہ یہیں بھل کر مر جاتے۔ لیکن جب وہ اوپر آئی تو اسے پتا چلا کہ آگ نے کوئی راستہ نہیں چھوڑا ہے۔ وہ بچوں کو لے کر دیوانہ وار اس آگ سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگی۔ اس کوشش میں غازی اور علیہ کہیں کم ہو گئے اور وہ صرف علی کے ساتھ گھر سے نکل کر تھی۔ اس پاس کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ تقریباً سارا ہی گھر مسمار ہو چکا تھا اور جو بچے تھے ان پر گولے برک رہے تھے۔ سفینہ کو علیہ اور غازی نہیں نظر نہیں آ رہے تھے اور وہ پاگلوں کی طرح انہیں تلاش کر رہی تھی۔ اسے برستے گولوں اور گولیوں کی پروا نہیں تھی۔ علی اس کے ساتھ ساتھ کھٹ رہا تھا پھر اس نے علی کو حفاظت کے خیال سے ایک چھوٹے سے مکان کی آڑ میں بٹھا دیا اور وہ اپنے جلنے مکان کی طرف واپس آ رہی تھی کہ اسے عقب سے دھماکا سنائی دیا اور اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ مکان غائب تھا جہاں اسکا نے علی کو بٹھایا تھا۔ کسی گولے نے اسے صفحہ ہستی سے نابود کر دیا تھا۔ چند منٹ کے اندر سفینہ اپنی ساری کائنات لٹا چکی تھی۔ وہ کچھ دیر پھٹی پھٹی نگاہوں سے غائب مکان کو دیکھتی رہی اور پھر اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ پچھتانے لگی کہ اسے ہوش کیوں آیا۔ وہ سربوں کے ایک جنگی کیمپ میں تھی جہاں ۱۱ جیسی بے شمار مسلمان عورتیں اور لڑکیاں بند تھیں۔ سرب ۱۱ جوان اور خوبرو مسلمان خواتین کے بطن سے اپنی افزائش کے قابل نفرت منصوبے پر عمل کر رہے تھے۔ سفینہ نے اپنی اور جلد اسے بھی ان حالات سے گزرنا پڑا جس کا یہاں موجود عورتیں شکار تھیں۔ اس کیمپ میں آنے کے تیسرا مہینہ وہ حمل سے ہوگئی۔ اس کے بعد اسے بخش دیا گیا کہ وہ سربوں کا مقصد یہی تھا کہ مسلمان عورتوں کے بطن

پہلا بحری حملہ

حضرت عمرؓ نے 15ھ (35-634ء) میں عثمان ابن ابی عاص لقمی کو بحرین اور عمان کا گورنر مقرر کیا۔ اسی زمانے میں سب سے پہلے مسلمانوں نے محسوس کیا کہ انہیں اپنے تجارتی جہازوں کی حفاظت کے لیے جو ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آتے جاتے رہتے تھے ہندوستان کے کسی ساحلی بندرگاہ پر قبضے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ عثمان ابن ابی عاص نے ایک بحری بیڑہ تیار کر کے بمبئی کے قریب تاند (تھانہ) بندرگاہ پر جواب بھی موجود ہے 15ھ (636ء) میں پہلا بحری حملہ کیا اور یہاں سے بہت سامان قیمت لے کر عمان پہنچے۔ یہ مسلمانوں کا ہندوستان پر پہلا بحری حملہ تھا۔

مرسلہ: زاہد سلطان، پشاور

وہ گاؤں پہنچی تو اسے دیکھ کر اسے دھچکا لگا تھا۔ جلے ہوئے اور گرے ہوئے کھنڈروں کے سوا وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا اسے ایسے ہی مناظر دیکھنے کو ملیں گے لیکن پھر بھی اس کے دل کو دھچکا لگا تھا۔ البتہ وہاں کوئی لاش نہیں تھی۔ یونشیا کی حکومت کے رضا کار یہاں موجود لاشوں کو نکال کر ان کی باقاعدہ تدفین کر چکے تھے۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا جب یہ گاؤں اجڑا تھا۔ بھیڑیوں کے حملے کے بعد کئی بار انسان نما بھیڑیوں نے اسے تاراج کیا تھا۔ ان کو مسلسل مسلمان ہونے کی سزا ملتی رہی تھی لیکن وہ اجڑ کر پھر اسے آباد کر لیا کرتے تھے۔ دشمن کے پاس انہیں اجاڑنے کی طاقت تھی تو اس کمزور قوم کے پاس ہر بار اجڑ کر آباد ہونے کی طاقت بھی لیکن اس بار گاؤں ایسا اجڑا تھا کہ لگتا تھا اب کبھی آباد نہیں ہوگا۔ وہ یونشیا کے بے شمار گاؤں کی طرح ہمیشہ کے لیے نابود ہو گیا تھا۔ کیونکہ ان بستیوں پر جن بھیڑیوں نے حملہ کیا تھا ان کے پیٹ بھی نہیں بھرتے تھے اور ان سے بچانے کے لیے کوئی نہیں آیا تھا۔ اس لیے اس بار بھیڑیے کامیاب رہے تھے۔

سفینہ سرد آہ بھر کر ایک بار پھر سے سبز ہو جانے والے جلے درخت کے تنے سے ٹک گئی۔ اس نے سوچا۔ کیا وہ اکیلے اس گاؤں کو پھر سے آباد کر سکے گی؟ اس کے اندر ایک عزم ابھرا کہ اسے یہ کام کرنا ہی ہے۔ اگلے روز سے اس

مربوں کے بچے پیدا کر کے صدیوں پہلے مسلمان ہو جانے والی اس قوم سے انتقام لیا جائے۔

اس کیمپ میں جو عورت حمل سے ہو جاتی اسے ایک اور کیمپ بھیج دیا جاتا تھا جہاں بچے کی پیدائش تک اس کی دیکھ بھال کی جاتی تھی اور جب بچہ ہو جاتا تو اسے عورت سے ہمیں کر کے مشنری ادارے کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ بہت ساری عورتیں تو پہلے ہی کیمپ میں خودکشی کر لیتی تھیں۔ بہت ساری اس کیمپ میں آ کر اپنی جان ختم کر لیتی تھیں اور اکثر کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اس بچے کو جنم نہ دیں جو جبراً ان کی لکھ میں لایا گیا تھا۔ اس میں کچھ کامیاب ہوتی تھیں اور کچھ ناکام ہو جاتی تھیں۔ سفینہ نے بھی اس بچے سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکی اور اسے بچے کو جنم دینا پڑا لیکن اسے اس بچے کے چمن جانے سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ وہ خود اس کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ جو عورتیں فارغ ہو جاتی تھیں انہیں دوبارہ ریپڈ کیمپ بھیج دیا جاتا تھا کہ وہ ایک بار پھر مربوں کے بچے پیدا کرنے میں استہمال ہو سکیں۔ مگر سفینہ کی خوش قسمتی کہ ان ہی دنوں یونشیا کی مسلم فوج نے اس کیمپ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا اور یہاں موجود عورتوں کو آزاد کر لیا۔ پھر سفینہ کو ایک پناہ گزین کیمپ میں بھیج دیا گیا جہاں وہ جنگ کے خاتمے تک رہی تھی۔ کیمپ سے نکلنے کے بعد اس نے سب سے پہلے اپنے بچوں اور شوہر کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ پورے یونشیا میں قائم ہر پناہ گزین کیمپ میں گئی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید جس طرح وہ بچ گئی اسی طرح اس کے بچے بھی بچ گئے ہوں۔ اس نے یونشیا میں فوج اور رضا کاروں کے ٹھکے سے اپنے شوہر کا جو بیک کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے بارے میں پتا چلا کہ آخری بار وہ سربریکا میں موجود تھا اور پھر سب اس شہر پر قابض ہو گئے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا اور وہاں موجود کسی سلطان کو زندہ نہیں چھوڑا تھا۔

پورے ایک سال تک اپنے پیاروں کو تلاش کرنے کے بعد سفینہ نے ہار مان لی تھی۔ اس نے سمجھ لیا کہ ان میں سے کوئی اب اس دنیا میں نہیں ہے اور اسے ان کے بغیر ہی زندہ رہنا ہوگا۔ پھر وہ گاؤں کی طرف آئی۔ اسے معلوم تھا کہ وہاں کوئی نہیں ہوگا لیکن وہ پھر بھی آئی اس نے سوچ لیا تھا، اگر وہ اپنے گاؤں کی نیچے والی آخری فرو ہوئی تب بھی وہ اس گاؤں کو دوبارہ آباد کر کے رہے گی۔

نے اپنے جل کر کھنڈر ہو جانے والے گھر کی صفائی شروع کر دی اور ایک ہفتے میں اس کا سارا مالبا کمال دیا۔ اب وہ اس کی جگہ نیا گھر بنانے کے لیے تیار تھی۔ فی الحال رہائش کے لیے اس کے پاس ایک خیمہ تھا اور اسے خوراک حکومت کی طرف سے فراہم کی جاتی تھی۔ اس نے خوراک دینے کے لیے آنے والوں سے اوزاروں کی فراہمی کی درخواست کی اور انہوں نے اسے اوزار فراہم کر دیے تھے۔

سفینہ نے سارے گرمائی سخت محنت کر کے اپنے لیے چھوٹا سا اور موسموں سے محفوظ گھر تلاش کر لیا تھا۔ ابھی تک وہ یہاں ایک تکی اور اسے ڈر بھی نہیں لگتا تھا۔ وہ جو دیکھ اور بھگت چکی تھی اس کے بعد وہ ہر خوف سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ جب تک وہ اپنے گھر اور زمین کو آباد نہیں کر سکتی اسے حکومت کی طرف سے امداد ملتی رہتی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ سردیوں کے بعد اپنی زمین پر کام کرے گی۔ پھر وہ سرما میں سراجو دو چلی گئی اور وہاں عورتوں کی بحالی کے ایک مرکز میں بہ طور رضا کار کام کرنے لگی۔ اس وقت اس کی قوم کو ایک ایک فرد کی ضرورت تھی لہذا وہ سرما اپنے محفوظ گھر میں آرام کر کے نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ اس مرکز میں وہ عورتیں تھیں جو جنگ میں اپنے رشتے اور اپنی عصمت دونوں کھو چکی تھیں ان میں سے کئی کی گود میں ایسے بچے تھے جن کے باپ سرب تھے۔ یہ شدید ذہنی اور جسمانی خرابیوں کا شکار تھیں اور مرکز میں ان کی بحالی کی کوشش کی جاتی تھی۔

بہیں سفینہ کی ملاقات اسد الدین سے ہوئی۔ وہ سربر نیکا کار بننے والا تھا اور ان چند افراد میں سے ایک تھا جو وہاں ہونے والے قتل عام سے بچ لکے تھے لیکن اس قتل عام میں اس کے خاندان کے سترہ افراد مارے گئے تھے جن میں اس کی بیوی اور دو بچے بھی شامل تھے۔ وہ اپنے خاندان میں بچنے والا واحد فرد تھا۔ دونوں زخم خوردہ تھے۔ اس لیے جلد ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔

یونیا کی حکومت بچ جانے والے جوان مرد اور عورتوں کی شادی کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی اور ایسے ہر جوڑے کو آباد کاری کے لیے معقول رقم اور زمین بھی دی جا رہی تھی۔ سفینہ نے اسد الدین کو اپنے گاؤں کے بارے میں بتایا۔ وہ چاہتی تھی کہ اسد اور دوسرے لوگ چل کر اس کے گاؤں کو پھر سے آباد کریں۔ سراجو دو میں بے شمار مسلمان ایسے تھے جو سرب اکثریتی علاقوں سے جان بچا کر آئے تھے اور جنگ کے بعد بھی وہاں واپس نہیں جاسکتے تھے۔ انہیں

یونیا کی بالکل تباہ ہو جانے والی بستیوں میں بسایا جا رہا تھا۔ سفینہ نے اپنے گاؤں کا نام بھی پیش کر دیا۔

جب وہ سرما کے خاتمے پر گاؤں جانے کے لیے تیار ہوئی تو اس کے ساتھ تیس سے زیادہ مردوزن پر مشتمل ایک قافلہ تھا جو اس کے گاؤں میں آباد ہونے جا رہا تھا۔ ان میں اسد بھی تھا لیکن اس نے ابھی تک سفینہ سے شادی کے بارے میں کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ اسے پسند کرتا تھا۔ جب وہ گاؤں پہنچے تو برف پھل رہی تھی اور درختوں پر نئے پتے آ رہے تھے۔ ان لوگوں نے پرانے کھنڈرات کے بجائے گاؤں کو نئے سرے سے اور منظم انداز میں بسانے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے مسجد کے لیے ایک جگہ مخصوص کر دی اور پھر اس کے گرد اپنے لیے مکانات کی تعمیر شروع کر دی۔ انہوں نے زمین ہموار کی اور اس کے ساتھ ہی کھیت اور باغات کو بھی بحال کرنے لگے۔

اسد نے اپنے لیے کوئی جگہ منتخب نہیں کی تھی وہ مسجد میں رہ رہا تھا اور اس تعمیر کا زیادہ تر کام وہی کر رہا تھا۔ بہار اور پھر گرم موسم بھی گزر گیا اور سردیوں کے آثار نظر آنے لگے۔ جب سفینہ نے ہمت کر کے خود اسد سے کہا۔ ”کیا تم اپنا گھر نہیں بساؤ گے؟“

اسد جیسے اس کے جملے کا منتظر تھا اس نے سفینہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ”اگر تم مجھے اپنے گھر میں جگہ دو گی تو اسے ضرور آباد کروں گا۔“

جب سفینہ کی سمجھ میں آیا وہ اس کی طرف سے پہل اُٹھانے کا اشارہ تھا کیونکہ اسے اس کا گاؤں تھا۔ اسے آباد کرنے کے لیے اس کی اجازت کی ضرورت تھی۔ سفینہ نے مسکرا کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”میرا گھر اب تمہارا ہے۔“

آج سفینہ اپنے گھر میں اپنے شوہر اسد اور چار بچوں کے ساتھ رہ رہی ہے۔ اس سانحے کو سترہ سال گزر چکے ہیں اور گاؤں کی حد تک اس کے آثار مٹ گئے ہیں۔ لیکن جس نسل نے بربادی جمیل کر آبادی کی ہے اس کے دلوں میں یہ آثار ہمیشہ موجود رہیں گے۔ گاؤں کی آبادی پھر سے بڑھ کر کوئی پانچ سو نفوس پر مشتمل ہو گئی ہے۔ اگرچہ ان میں سوائے سفینہ کے کوئی بھی اس گاؤں کا پرانا ہاسی نہیں ہے لیکن سفینہ جانتی ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ لوگ آتے جاتے رہتے اور گاؤں آباد رہتے ہیں۔ آج اس کا گاؤں پھر آباد ہو گیا تھا۔



شوین

انور فرہاں



ماضی میں پاکستانی فلم انڈسٹری اپنی مثال آپ تھی، پھر گویا ایک سازش ہوئی اور حکومت کے خزانے کو لبا لب بھر دینے والی فلمی صنعت چور چور ہو گئی۔ ہنرمند شرفاً آہستہ آہستہ الگ ہوتے چلے گئے۔ ایسے وقت میں گنے چنے کامیاب لوگ رہ گئے جنہوں نے موت کی کگار پر پہنچ جانے والی اس صنعت کو سنبھالا دیا اور نامساعد حالات میں بھی جی جان سے محنت کرتے رہے، انہی میں سے ایک بڑے نام کا ذکر جس نے پاکستانی فلمی صنعت کو سنبھالے رکھا۔

فلمی صنعت کے ایک اہم فرد کی داستان جہد و داستان

کریں تو ایک زمانہ تھا جب ہمارے ہاں سال بھر میں خاصی فلمیں بنا کرتی تھیں اور اچھی فلمیں بھی اچھی تعداد میں ہوتی تھیں مگر وقت سدا ایک سانپیں رہتا۔ اس لیے فلم سازی کے میدان میں بھی تبدیلی آئی۔ اچھے فلم میکرز آہستہ آہستہ فیڈ

فلمیں بنی تو بہت ہیں مگر اچھی فلمیں کم بنتی ہیں۔ یہ بات صرف ہم پر ہی صادق نہیں ہوتی۔ پوری دنیا کی فلم انڈسٹریز کا یہی حال ہے۔ کیونکہ اچھی فلمیں اچھے فلم میکرز ہی بناتے ہیں۔ اگر ہم اپنے وطن عزیز کے تناظر میں بات

آؤٹ ہوتے تھے اور ان کی جگہ غلط قسم کے اور ناٹیکنیکل لوگ آتے گئے۔ جس کا نتیجہ سامنے آتا ہی تھا وہ آیا مگر اللہ کا شکر ہے کہ برے وقت میں بھی کچھ اچھے لوگ اچھی فلمیں بنا کر فلمی صنعت کی ڈوبتی تیا کو بچا رہے ہیں۔

اچھے لوگ چاہے زندگی کے جس شعبے سے بھی تعلق رکھتے ہوں، بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ آج ہم اس نشست میں ایک ایسی ہی فلمی شخصیت کی باتیں کریں گے جو بڑی خوبیوں کی مالک ہے۔ جس سے ہماری فلم انڈسٹری کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ جس نے فلم سازی کے کئی شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ اس لیے وہ شوہر کی دنیا میں سب کے لیے قابل احترام۔

ہمارے ہاں ایک بہت غلط رواج ہے کہ جب کوئی بڑا آدمی، بڑا فنکار، بڑا کلاکار، بڑا ادیب بڑا شاعر اس جہان فانی سے گزر جاتا ہے تو جب لوگ اس کے گن گاتے ہیں۔ اس کے بارے میں اپنی محبت اور عقیدت کے پھول چھاد کر کرتے ہیں۔ لیکن اس کی زندگی میں اسے صفر بنائے رکھتے ہیں۔

ہم اسی غلط روایت کو توڑنے کے لیے ہی اپنے ایک لہجہ کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ہی آپ کے پاس موجود ہیں۔

یہ عہد حاضر کے بہترین ہدایت کار اور اپنی ذات میں اکیڈمی کی حیثیت رکھنے والے شوہین سید نور ہیں۔

یہ بات ہم نے یوں ہی نہیں کہی ہے۔ جیسے جیسے اس تحریر میں آپ ان کے بارے میں پڑھتے جائیں گے ہماری بات کی سچائی آپ پر روشن ہوتی جائے گی۔

سید نور کو پاکستانی فلمی صنعت کا ”شوہین“ کا خطاب دیا گیا ہے۔ یہ بہت بڑا خطاب ہے اور ہر کسی فنکار کو عطا نہیں کیا جاتا۔ اس کے لیے راجہ پور اور سید نور جیسے گرانقدر خدمات درکار ہوتی ہیں۔ پاکستان میں ”تیری یاد“ کے دور سے اب تک کسی اور فلمی شخصیت کو اس اعزاز سے نوازا نہیں گیا۔ اس لیے ہمیں سید نور پر فخر ہے۔

سید نور سے پہلے ہمارت میں شوہین کا خطاب راج کپور کو ان کی فنکارانہ عظمت اور بہترین فنی خدمات کے صلے کے طور پر اس خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا۔ پاکستانی فلم انڈسٹری کی بہترین خدمات کے لیے جو انہوں نے فلمی صنعت کے شدید ترین بحران کے دور میں نہایت عمدگی سے سرانجام دیئے اسی پران کو شوہین کا خطاب عطا کیا گیا۔

ہمارے شوہین نے انتہائی آزمائشی دور میں نہایت عمدہ اور مثالی فلم میننگ کا مظاہرہ کر کے اپنی فنی استطاعت اور جوش و دیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ انہوں نے تفریحی، اصلاحی اور کامیاب ترین سپر ہٹ فلمیں تخلیق کر کے فلمی صنعت کو زوال کے صحنہ سے نکالا۔ ان کا یہ کارنامہ کسی صورت بھی کو دور میں فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔ فلمی تاریخ کا مؤرخ ان کے اس کارنامہ کو سنہری حروف میں لکھے گا۔

سید نور کے فنی کئی روپ ہیں۔ وہ ایک کامیاب فلم رائٹر ہیں۔ ایک مستند ڈائریکٹر ہیں اور ایک قابل اعتماد فلم ساز بھی ہیں۔ شائقین صرف ان کا نام دیکھ کر فلم دیکھنے جاتے ہیں۔ انہوں نے ایسے کئی آرٹسٹ فلم انڈسٹری سے متعارف کرائے جو پاکستانی فلمی صنعت کا اثاثہ ثابت ہوئے۔

سید نور نے جب اپنا فلمی کیریئر شروع کیا تھا، وہ پاکستانی فلمی صنعت کا سنہری دور تھا۔ ایسے دور میں کسی نئے اور نو آموز کا قدم جمانا بڑا دشوار ہوتا ہے مگر ان کے اندر پوشیدہ فنی صلاحیتوں نے اجاگر ہو کر انہیں بڑے بڑوں کے سامنے ثابت قدم رکھا۔ انہوں نے فلمی صنعت کا سنہری دور بھی دیکھا اور زوال کا صبر آزمائے بھی۔ زوال کے دور میں جہاں بہت سے لوگ انڈسٹری کا ساتھ چھوڑ گئے کہ اب یہاں موجود رہنا مناسب نہیں مگر یہ جوان ہمت سید نور تھے کہ انہوں نے ایسے برے حالات میں بھی بھاگنا کوارا نہ کیا۔

ان پر ایک ایسا دور بھی آیا کہ انہیں گن پوائنٹ پر مجبور کیا گیا کہ تم پنجابی ہو پھر بھی اردو فلمیں لکھتے ہو اور اردو فلمیں بناتے ہو تمہیں پنجابی فلمیں بھی بنانی ہیں۔ اپنی ماں بولی میں اگر فلم نہیں بناؤ گے تو نقصان میں رہو گے۔

پنجابی میں فلم نہ بنانا سید نور کا جرم ضرور تھا مگر اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ پنجابی فلم بنانا نہیں چاہتا تھا۔ خود اس کی خواہش تھی کہ وہ پنجابی فلم بنائے لیکن اس دور میں بارودھا، عربی اور غشی سے بھرپور پنجابی فلمیں بنائی جا رہی تھیں سید نور اس نوعیت کی فلم نہیں بنا سکتے تھے۔

مگر انسان کو جان بہت پیاری ہوتی ہے۔ مرتا کیانہ کرتا، لہذا سید نور نے کہا۔ ”بندوق کی نال ہٹاؤ۔ میں پنجابی فلم بنائوں گا۔“

اس کے بعد انہوں نے پنجابی فلم بنائی مگر وہ جو کہتے ہیں کہ اصل سے خطا نہیں اور کم اصل سے وفا نہیں۔ سید نور

نے پنجابی فلم بنائی ضرور مگر اس میں پنجابی فلموں کا مال مسالہ نہیں ڈالا۔ نہ کنڈا سا تھانہ برادری ازم کی لڑائی بھڑائی۔ نہ بھاب کے اصل کلچر کو بدنام کرنے والے عریانی اور فاشی کی سہ ہودی تھی۔ سید نور نے جو پنجابی فلم بنائی اس میں پنجاب کو اس کے اصل روپ میں پیش کیا۔ اس فلم کی کھیل کے دوران میں جن لوگوں نے اس کی شوٹنگ دیکھی، انہوں نے یہی کہا۔ ”یہ تو ایک ڈاکوسری فلم ہے۔ پنجابی فلم دیکھنے والوں کے لیے اس میں کوئی جاذبیت نہیں۔“

سید نور کو بھی اس بات کا اندازہ تھا کہ ان کی اس فلم کا کیا حشر ہوگا اور اس بات کا ڈر بھی تھا کہ اب کی بندوق برادر ان کی اس گستاخی کا کیا جواب دیں گے۔ لہذا اپنی سلامتی کے لیے وہ اس فلم کی نمائش سے پہلے دینی چلے گئے نمائش کے روز وہ لاہور سے کسی دوست کے فون کے منتظر تھے کہ جو یہ بتاتا۔ ”یار! وہ سینما گھر جس میں تمہاری فلم ریلیز ہوئی تماشائیوں نے اسے نہیں نہس کر دیا۔ تمہارا بھی حشر ہوگا تمہاری تلاش جاری ہے۔“

اپنی سوچ میں گم وہ دھڑکتے دل کے ساتھ ٹیلی فون کے پاس بیٹھے رہے۔ پھر جب ٹیلی فون کی کھنٹی بجی اور انہوں نے ریسپورڈ کان سے لگایا تو ان کی حالت دیدنی تھی۔ آواز آئی۔ ”شاہ جی، چوڑیاں ہٹ ہو گئی سپر ہٹ۔“

”مذاق نہ کریا! میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ سچ سچ بتاؤ۔“

”پانکل سچ بتا رہا ہوں۔ اتنا اچھا رسپانس شاید ہی تمہاری کسی فلم کو ملا ہوگا۔“

اب بھی سید نور کو دوست کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیونکہ انٹرسٹری میں ”چوڑیاں“ کو ایک ڈاکوسری فلم سے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی تھی مگر یہ کیا ماجرا ہو گیا۔ کیسے ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ ڈرامہ سکون ہوئے تو خود لاہور فون کیا اور ایک دو جاننے والوں سے پوچھا۔

”چوڑیاں“ کی کیا رپورٹ ہے؟

”سپر ڈپر ہٹ۔“

”کیوں میرا مذاق اڑا رہے ہو۔“

”خدا کی قسم سچ کہہ رہا ہوں۔“

ہر ایک نے جب ایک ہی جیسا جواب دیا تو انہوں نے اپنے ڈسٹری بیوٹر سے رابطہ کیا۔ ان کی آواز سن کر تقسیم ارب پل پڑا۔ ”ارے یار! تم کہاں ہو۔ تم تو تمہیں پھولوں

زندگی نامہ

خانہ دانی نام..... محی الدین نور

فلمی نام..... سید نور

پیدائش..... 21 فروری 1951ء

تعلیم..... صحافت میں پیچہرزی ڈگری

فلمی کیریئر..... 1970 میں فلم انٹرسٹری جوائن

کر لی کیریئر کا آغاز بلو د فیر انٹر کیا۔

1970 سے 1975ء تک ایس سلیمان کے

ساتھ بلور اسٹنٹ کام کیا۔ 1976 میں پہلا فلم

اسکرپٹ لکھا جس پر سوسائٹی گرل نام سے فلم بنی۔

پہلی فلم بلور ہدایت کار..... قسم جو 1993ء میں

ریلیز ہوئی

اب تک 55 کے قریب فلمیں ڈائریکٹ کر چکے

ہیں۔

شادی..... دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی صفائی

ادبیہ و شاعرہ رخسانہ نور سے 20 اپریل 1984ء کو

دوسری اداکارہ صائمہ سے 2005ء میں۔

بچے..... رخسانہ نور سے چار بچے ہیں۔ تین

بیٹیاں ایک بیٹا۔ بیٹیاں شادی شدہ ہیں اور بال بچے

دار۔ بیٹا لاہور میں باپ کے ساتھ پیراگون اکیڈمی

سے وابستہ ہے۔

کے بار پہنانے اور تمہارا منہ بیٹھا کرانے کے لیے پورے شہر

میں تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔“

”کیوں کیا چوڑیاں کی رپورٹ اتنی خراب ہے کہ تم

لوگ.....“

”نہیں شاہ جی خراب نہیں، بہت اچھی رپورٹ ہے۔

ہم تو زیادہ سے زیادہ سینما گھر پہنچ کرنے کی کوشش کر رہے

ہیں۔“

نیکی کبھی رانگاں نہیں جاتی۔ اچھائی کی پذیرائی ضرور

ہوتی ہے۔ ”چوڑیاں“ اس لیے سپر ہٹ ہوئی کہ پنجابیوں کو

اس میں اصل پنجاب نظر آیا۔ وہ جو ایکشن کے نام پر مار

دھاڑ، خون خرابہ دیکھتے رہے تھے ان سے انہیں نجات ملی

تھی۔

”دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں خن در سہرا۔“ کے

مصدق ہر فلم بین دوسرے سے کہتا۔ ”جاؤ دیکھو چوڑیاں

ایسی ہوتی ہیں پنجابی فلمیں۔“

اس کے بعد ”عاجن“ اور کئی دوسری پنجابی فلمیں بنا کر سید نور نے پنجابی فلموں کی آمد و بچائی۔ ان پر ہندو کی نال رکھنے والوں کو پنجابی فلم بنانے سے مطلب تھا، سید نور نے ان کا مطالبہ پورا کیا اور ایسی پنجابی فلمیں بنائیں جنہیں باکس آفس پر بھی پذیرائی ملی اس طرح وہ پنجابی فلموں کے بھی دو دلہان بن گئے۔

سید نور کا فنی سفر بھی جہاں بہت پر نور ہے وہاں بڑا عجیب بھی ہے۔ سید نور نے سید سلیمان جیسے کامیاب اور لیجنڈ ڈائریکٹر کے اسٹنٹ کی حیثیت سے اپنا فلمی کیریئر شروع کیا۔

جس شخص کی تربیت اس قدر عمدہ ماحول میں رہ کر ہوئی ہو، جس ماحول میں آکر لوگ خود پر فخر کیا کرتے تھے تو یہ دنیا وہی سب کچھ اس میں آ گیا۔ شخصیت، کردار اور فن کی وہ ہی بلندی اس میں آ گئی۔

جب سید سلیمان سے ہدایت کاری کی تربیت حاصل کرنے والے سید نور نے اپنے فنی سفر کا آغاز کیا تو لوگ حیران ہوئے بغیر نہیں رہے۔ کیونکہ اس نے ہدایت کاری کو یکسر نبھ دیا تھا، بھی تو لوگ کہہ رہے تھے۔

”ارے اس نو جوان نے تو ہدایت کاری کی تربیت حاصل کی تھی مگر یہ کیا، اس نے فلم رائٹر کی حیثیت سے فلم انڈسٹری میں پہلا قدم رکھا۔“

یہ سیکھتا ہی پہلی فلم ”سوسائٹی گرل“ تھی۔ 16 اپریل 1976ء کو ”سوسائٹی گرل“ سینما گھروں کی زینت بنی اور سید نور کی منفرد کہانی کی وجہ سے ہٹ ہو گئی۔ فلم والوں کی حیرانگی بجا بھی کہ ہدایت کاری کی بجائے اس نے فلم رائٹنگ کا شعبہ اپنایا تھا اور کمال کر دیا تھا۔ ایسی کہانی لکھی تھی کہ سیکھتا جیسی نو آموز کو کامیاب ہدایت کاروں کی صف میں کھڑا کر دیا تھا۔

☆.....☆

سید نور کو لکھنے پڑھنے کا شوق ابتداء سے ہی تھا۔ وہ لکھتے بھی تھے اور چھپتے بھی تھے۔ لاہور یوں بھی لکھنے پڑھنے والوں کا شہر ہے۔ سید نور کو بھی یہاں کی ہواؤں اور فضاؤں نے لکھنے لکھانے کی طرف مائل کیا۔ اپنے اس شوق کی وجہ سے انہوں نے کچھ دنوں تک صحافت بھی کی مگر جب اپنے مستقبل کی منزل کے تعین کا وقت آیا تو فلم انڈسٹری کا ہی انتخاب کیا۔ فلم رائٹنگ کا سلسلہ شروع ہوا تو آج تک

کامیابی کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ فلمیں بنا بھی رہے ہیں، ان کی ہدایت بھی دے رہے ہیں اور ان کی کہانیاں، مکالمے اور اسکرین پے بھی لکھ رہے ہیں۔

در اصل یہ لکھنا بھی ایک فن ہے۔ چھٹی نہیں منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ ان کے اس لکھنے لکھانے کا شوق ہی تھا جس نے اپنی شریک حیات کے لیے ایک ایسی ہی لڑکی کا انتخاب کیا جو خود بھی رائٹر تھی۔ شاعرہ تھی۔ ادیب تھی۔ صحافی تھی۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے میں رخسانہ نور کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ جو ان کی پہلی منکوحہ بیوی تھیں۔ اللہ انہیں غریب رحمت کرے۔ (آمین)

سید نور مصنف ہیں، ہدایت کار ہیں، فلم ساز ہیں، یہ سب لوگ جانتے ہیں مگر بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ انہوں نے فلموں میں اداکاری بھی کی ہے۔ یوں بھی دیکھنے میں وہ ایک دلچسپ اور مرکب جو ان ہیں اور دیکھنے والوں کو... ہیرا ہی نظر آتے ہیں مگر یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ ان کی بطور اداکار پہلی فلم ”جدائی“ تھی جو پنجابی زبان میں بنائی گئی تھی۔ یہ 1984ء میں سینماؤں کی زینت بنی تھی۔ اس کی کاسٹ میں سید نور کے علاوہ رانی، نازلی، تنہا وغیرہ شامل تھے۔ اس فلم کی خاص بات یہ تھی کہ مشہور بھارتی فلم باغبان، جدائی کی کاپی تھی۔ اس کی کہانی ”جدائی“ کی کہانی سے مستعار لی گئی تھی۔ ”جدائی“ کے بعد بھی نور صاحب متحدہ فلموں میں بطور اداکار پیش ہوئے لیکن اہم کرداروں میں نہیں، ثانوی کرداروں میں یا مہمان اداکار کے طور پر۔ پھر شاہ جی نے خود ہی اداکاری ترک کر دی۔ کیونکہ وہ فلم میکے کے ساتھ ساتھ اشار میکے بھی بن گئے تھے۔ انہوں نے نہ صرف کئی لڑکے لڑکیوں کو اداکاری کے میدان میں لا کر بہترین پر فارم بنایا بلکہ کئی ٹیٹاٹے ہوئے ستاروں کو چاند سورج بنا دیا۔ فلمی صنعت کے زوال کے باعث ناکام ہو جانے والے شان کو اپنی فلم ”گھوگھٹ“ سے ایسا کامیاب کرایا کہ وہ بہرہ اشار بن گیا۔ عام اداکاروں میں شامل ہونے والی صائمہ

سید نور نے دورِ حاضر کی سب سے بڑی ہیروئن بنا دیا۔ یہ سہ نور ہی تھے جنہوں نے باہر علی اور ریشم جیسے جوان سال ہیرا ہیروئن متعارف کرائے۔ اداکار اور گلوکار عدنان سیج کو نور صاحب نے اپنی فلم ”سرم“ میں پہلی بار پیش کیا۔ اسی فلم سے شہرت حاصل کر کے وہ بولی ووڈ کے پھر کھلا کار بنے۔

سید نور ایک دن میں شوٹیں نہیں بنے۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے انہیں بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ بطور رائٹر

کی پہلی فلم ”سوسائٹی گرل“ 1976ء میں ریلیز ہوئی۔
 ”دعی چلو“ ان کے فنی کیریئر کی پہلی پنجابی فلم تھی۔ اس کے
 انہوں نے صرف مکالمے لکھے تھے۔ یہ 1979ء میں نمائش
 پذیر ہوئی تھی۔ ”سوہراتے جوانی“ ان کی وہ پہلی فلم تھی جس
 کی کہانی اور مکالمے انہوں نے تحریر کیے تھے۔ یہ پنجابی فلم
 1981ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ فلم ”جسم“ ان کی وہ پہلی فلم تھی
 جس سے انہوں نے فلم ساز و ہدایت کار کی حیثیت سے اپنے
 کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ یہ فلم 1993ء میں نمائش کے لیے
 پیش کی گئی تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ وہ دور تھا جب
 پاکستانی فلمی صنعت انتہائی زوال کا شکار تھی۔ یہی وہ دور تھا
 جب غیر معیاری فلم میکنگ کے باعث دل برداشتہ ہو کر
 جناب الیاس رشیدی نے نگار ایوارڈ کا سلسلہ بند کرنے کا
 اعلان کر دیا تھا۔ زوال کے اس بدترین دور میں فلمی صنعت
 کی ڈوبتی تیا کو بچانے کے لیے سید نور کی آمد فلم انڈسٹری کے
 لیے ہوا کا تازہ جھونکا ثابت ہوئی۔ انہوں نے یکے بعد
 دیگرے سنگم، سرم، زیور، ہوائیں، ہم ایک ہیں، کمانڈو،
 محافظ جیسی شاہکار فلمیں بنائیں۔ پھر چور چائے شور،
 دیوانے تیرے پیار کے، جیوا، گھونگھٹ، ڈاکو رانی، بجا جن
 جیسی سپر ہٹ فلمیں پیش کیں۔ ان کی فلم ”چوڑیاں“ نے
 کامیابی اور بزنس کے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے تھے۔

ان کی کامیابیوں کے پیچھے جو عوامل کار فرما ہیں ان
 میں سب سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ وہ ہمیشہ مختلف
 موضوعات پر منفرد فلمیں بناتے ہیں۔ گھریلو، رومانی،
 تفریحی اور اصلاحی فلم میکنگ کے وہ ماہر مانے جاتے ہیں۔
 ایکشن فلمیں انہیں پسند نہیں لیکن فرماشی طور پر انہوں نے
 ایکشن فلمیں بنا کر یہ ثابت کیا ہے کہ وہ ایکشن فلمیں بھی بنا
 سکتے ہیں۔ ان کی دیگر فنی خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ
 وہ کہانی کار بھی ہیں۔ ہر فلم کے لیے ایک نئی اور اچھوتی کہانی
 لکھتا اور ان پر فلم بنانا ان کا طرہ امتیاز ہے۔ مجھے ان میں
 ظہیر ریحان جیسی کچھ باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔ میں سابق
 شرقی پاکستان کے مایہ ناز مصنف و ہدایت کار ظہیر ریحان
 کی بات کر رہا ہوں جنہوں نے متعدد منفرد اور یادگار ہنگامی
 فلموں کے علاوہ پاکستان کی پہلی رنگین فلم ”سنگم“ اور پہلی
 ہینڈ اسکوپ فلم ”بہانہ“ بنائیں۔ ظہیر ریحان بھی بنیادی طور
 پر فن رائٹر تھے۔ وہ خود اپنی فلموں کی کہانی لکھتے تھے۔ جو
 موضوع اور تھیم کے لحاظ سے اچھوتی ہوتی تھیں جب کہ ان
 کی ڈائریکشن کا معیار بھی بلند تھا۔ اچھے کاردار جیسے پختہ

سید نور بطور ہدایت کار

قسم۔ جیوا۔ چور چائے شور
 سنگم۔ چوڑیاں۔ بجا جن۔
 ڈاکو رانی۔ گھونگھٹ۔ کمانڈو۔ زیور۔ زور
 دیواریں۔ ہوائیں۔ راجو بن گیا جنتلیں۔
 دیوانے تیرے پیار کے۔ دو پناہ مل رہا ہے۔
 جنگل کوئین۔ باغی لڑکی۔ دل دیوانہ ہے۔ سرم۔
 ہم ایک ہیں۔ محافظ۔

☆☆☆

سید نور کی بطور کہانی نویس فلمیں

سنگدل۔ ڈائمنڈ جوبلی
 وہلیز۔ ڈائمنڈ جوبلی
 بوبی۔ ڈائمنڈ جوبلی
 ڈاکو رانی۔ ڈائمنڈ جوبلی
 چور چائے شور۔ ڈائمنڈ جوبلی

☆☆☆

سید نور کی وہ فلمیں جن کی کہانیاں خود نہیں لکھیں

سید نور جنہوں نے بطور مصنف بے شمار فلموں کی
 کہانیاں لکھیں، وہاں انہوں نے خود اپنی فنی فلموں کی
 کہانیاں تحریر نہیں کیں۔ ان کی کہانیاں ان کی شریک
 حیات رخسانہ نور نے تحریر کیں جو کامیاب بھی ثابت
 ہوئیں اور ان پر بطور کہانی نویس رخسانہ نور کو ایوارڈز
 اور اعزازات بھی ملے۔ ان فلموں میں ”ہوائیں۔
 چوڑیاں۔ مہندی والے جتھ اور سنگم“ قابل ذکر ہیں۔
 ان میں ”ہوائیں۔ چوڑیاں، مہندی والے جتھ“ کو
 بہترین کہانی نویس کے نگار ایوارڈز ملے جبکہ ”سنگم“
 اور ”چوڑیاں“ کو بہترین کہانی نویس کے قومی ایوارڈ
 سے نوازا گیا۔

ان کے علاوہ بھی سید نور کی دیگر فلمیں ہیں جن
 کی کہانیاں اور مکالمے رخسانہ نور نے لکھے۔ ان میں
 ”دیوانے تیرے پیار کے“۔ زیور۔ دیواریں۔ دو پناہ
 مل رہا ہے۔ جنگل کوئین۔ دل دیوانہ ہے۔ باغی لڑکی
 اور جموہر قابل ذکر ہیں۔

ہدایت کا ظہیر ریحان کے پہلے استاد تھے۔ فیض احمد فیض صاحب نے انہیں بین الاقوامی معیار کی فلم ”جاگو ہوا سویرا“ کے یونٹ میں شامل کیا تھا۔

ہمارے ہاں زیادہ تر فلم میکرا جھی کہانیوں کا شعور نہیں رکھتے۔ پیشہ ور کہانی کار نے جو کچھ لکھ کر دے دیا اس پر فلم بنا لی۔ ایسی کہانیاں زیادہ تر عامانہ اعزاز کی ہوتی ہیں۔ جب کہ کچھ فلم ساز ہدایت کار کی سپر ہٹ فلم کا حوالہ دے کر رائٹر سے کہتے ہیں۔ ”بس..... اسی طرح کی کوئی کہانی لکھ دو۔“

مگر تکرار کے طور پر بنائی گئی یہ فلمیں پہلی فلم جیسی کامیابی حاصل نہیں کرتیں۔ سید نور نے بطور مصنف دوسرے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کے لیے بھی جو کہانیاں لکھیں ان میں بھی اس بات کا خیال رکھا کہ وہ بھی منفرد ہوں۔ مثال کے طور پر مستدل، دلہیز اور بوبلی۔ ان تینوں فلموں نے ڈانٹنڈ جوہلی کا اعزاز حاصل کیا۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ کوئی کسی کو آسانی سے تسلیم نہیں کرتا۔ اپنے آپ کو منوانا بڑا مشکل اور صبر طلب کام ہے۔ کارکردگی کی حسن کارکردگی کے اعزاز اور اکرام سے نوازتی ہے مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اچھے کام کو اچھا انعام ضرور ملتا ہے۔ پھر بھلا سید نور کو ان کی بہترین کارکردگی کا صلہ کیوں نہیں ملتا؟ انہیں قومی صدارتی اعزاز ”تمغہ حسن کارکردگی“ اور تمغہ امتیاز سے نوازا گیا اور مختلف شعبوں میں سال بھر کی بہترین کارکردگی پر 20 سے زائد نگار ایوارڈز بھی حاصل کیے جب کہ پرائیویٹ طور پر دیگر ایوارڈز دینے والوں نے بھی ان کی فنی خدمات پر اعزاز و اکرام سے نوازا۔

سید نور خاصے بڑے لکھے اور ہاشور فلم میکرا ہیں۔ اس لیے میڈیا کا مقابلہ بھی بڑی جوان مردی سے کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی 41 سالہ فنی زندگی میں بہت سے فحش و فراز دیکھے ہیں۔ نرم گرم، تلخ ترش حالات سے گزرے ہیں اس لیے صحافیوں کے سخت تنقید و تہرے پر گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتے نہیں، بڑی سوچ بوجھ کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔ حال ہی میں جب ان کی تازہ ترین فلم ”چمن آئے نہ“ نمائش کے مرحلے میں تھی ایک میڈیا مین نے ان سے کہا۔ ”شاہ جی! آپ پر الزام ہے کہ گزشتہ پانچ سالوں میں آپ نے کوئی فلم عوام کے لیے نہیں پیش کی اور اس سے قبل آپ نے پنجابی فلموں کو زیادہ پروجیکٹ کیا جس کی وجہ

سے آپ کی اردو فلموں کی تعداد کم ہو گئی۔“ شاہ جی نے بڑے اعتماد اور پرسکون انداز میں جواب دیا۔ ”پنجابی بھی ہمارے ملک کی زبانوں میں سے ایک ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے چوڑیاں، مجا جن اور ہندی والے تھ جیسی معرکتہ آلا پنجابی فلمیں بنا کر عوام کو میوزیکل فلمیں دیں جو تشدد اور بار دھاڑ سے پاک ہیں۔ اب اس میں میرا کیا قصور کہ دیگر فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے سوائے فن و عمارت گری اور برادری ازم پر مبنی فلمیں بنائیں جن سے ہمیں نقصان پہنچا جب کہ میں نے 90ء کی دہائی میں اردو فلمیں بنائیں تو میرے ساتھ ہی میڈم فہم آراء، سنگیتا بیگم، اقبال کا شمیری اور حسن عسکری وغیرہ نے بھی قومی زبان کی معیاری فلمیں بنا کر میرا اور فلم انڈسٹری کا حوصلہ بڑھایا۔ جب کہ پنجابی فلموں میں ایسا کچھ نہیں کیا گیا۔ سید نور نے اس موقع پر یہ بھی کہا۔ ”ایک وقت ایسا بھی آیا کہ پاکستانی سینماؤں پر ہماری فلموں کا راج ہو گیا جس کی وجہ سے پاکستانی اردو فلمیں سینما مالکان کی ضرورت نہ رہیں۔ اس طرح ہماری بڑی بڑی فلمیں مناسب سینما گھر دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے وہ کامیابی حاصل نہ کر سکیں جو ان کا حق تھا۔ اس کی سب سے بڑی اور زعمہ مثال ”بھائی لوگ“ اور ”لومیں گم“ ہے جو حقیقتاً معیاری فلمیں تھیں۔ انہیں نمائش حاصل بہترین موقع ملتا تو وہ باکس آفس پر نمایاں کامیابی حاصل کرتیں لیکن وہ سینما آئرز کی مفاد پرستی کی بھیئت چڑھ گئیں۔“ اس کے بعد شاہ جی بولے۔ ”جی وہ واقعات اور حالات تھے جن کی وجہ سے میں نے کچھ عرصہ تک ایک خاص سرکٹ کے لیے فلمیں بنائیں اور صحیح وقت کا انتظار کیا اور عوام کو پانچ برس تک مجھ سے دور رہنا پڑا لیکن عوام کے دلوں میں میری جو محبت اور قدر ہے وہ برقرار رہی۔ میں اس عوامی جذبہ کو سلام تحسین پیش کرتا ہوں اور اپنے چاہنے والوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ فلموں میں طویل گپ نہیں آنے دوں گا۔“

سید نور کے بارے میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ایک سچے اور کھرے انسان ہیں۔ ان کا ایک اپنا انداز ہے۔ جب کن پوائنٹ پر ان سے پنجابی فلم بنانے کو کہا گیا تو انہوں نے کہا۔ ”تمک ہے میں پنجابی فلم بنائوں گا۔“

انہوں نے پنجابی فلم بنائی مگر اپنی جان بچانے کے لیے اپنے اصولوں کا خون نہیں بہایا۔ جیسی صاف ستھری ام با مقصد اردو فلمیں بناتے تھے ویسی ہی ستھری اور ستھری پنجابی

قلم بنا کر معترضین کے منہ بند کر دیئے۔

جب کسی شخصیت کی حیثیت عوامی ہو جائے تو اسے اس کے چاہنے والے جہاں اس پر تشریف و توصیف کے ڈوگرے برساتے ہیں وہاں تیز و تند الزامات کے تیر بھی چلاتے ہیں۔ ان پر ایک الزام یہ بھی لگایا گیا کہ وہ شان اور خصوصاً صائمہ کے بغیر قلم نہیں بنا سکتے۔

اس سلسلے میں شاہ جی نے اپنی صفائی یوں پیش کی۔ ”شان اور صائمہ پاکستانی قلم انڈسٹری کے بڑے اشارز ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگائیں کہ آج بھی کسی عوامی مقام پر ان دونوں اشارز کو کھڑا کر دیں۔ آپ کو خود پتا چل جائے گا کہ شہرت اور مقبولیت کیا ہوتی ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ شان اور صائمہ کی مقبولیت کم ہو چکی ہے تو میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ گزشتہ دو برسوں میں کراچی میں بنائے گئے کئی وی ڈراموں میں صائمہ نے مرکزی کردار ادا کیے۔ جن میں انہیں بے حد پسند کیا گیا اور ان ڈراموں کی رینٹنگ نمبروں رہی۔ آج کل بھی اسے آروائی پر صائمہ کا ڈراما سپر ہٹ ہے۔ وی ڈی کمرشل کے لیے بھی وہ موزوں سمجھی جاتی ہیں۔ حال ہی میں ہم نے ترمگ کا کمرشل کیا جس کا ہم دونوں کو ریکارڈ معاوضہ دیا گیا۔ اسی طرح شان آج بھی کارپوریٹ سیکٹر کی پہلی چوائس اور فلموں کی ضرورت ہے لیکن اس کا اپنا حراج ہے وہ جس کے مطابق کام کرتا ہے لیکن مقبولیت میں اب بھی نمبروں ہے۔

بے شک یہ دونوں پر اشارز ہیں مگر مجھ پر یہ الزام درست نہیں کہ میں ان کے سہارے اپنی فلموں کو کامیاب کراتا ہوں۔ ان کے بغیر قلم نہیں بناتا اگر ایسی بات ہوتی تو میری تازہ ترین رومانوی فلم ”چھین آئے نہ“ میں بھی دونوں رومانوی ہیرو ہوتے لیکن اس قلم میں ان کی بجائے میں نے نئے اور ابھرتے ہوئے اداکاروں اور اداکاراؤں کو کاسٹ کیا۔

میں ہمیشہ کہانی کی ڈیمانڈ کو پیش نظر رکھ کر کاسٹنگ کرتا ہوں۔ جہاں شان یا صائمہ کی ضرورت ہوتی ہے وہاں ان کو کاسٹ کرتا ہوں۔ جہاں ان کی ضرورت نہیں ہوتی انہیں نہیں لیتا۔ میری اس نئی فلم ”چھین آئے نہ“ کی کہانی میں ایک بیک ٹریک اور لڑکا درکار تھے جو اپنی پہلی محبت شروع کرتے ہیں اس لیے ان کرداروں میں صائمہ اور شان کی جگہ نہیں بنتی تھی۔ جب کہ قلم کے دیگر کردار بھی ان کے لیے موزوں نہیں تھے۔ اس لیے زبردستی انہیں کاسٹ نہیں کیا

سید نور

پہلی فلمی کہانی..... سوسائٹی گرل
پہلی بطور اداکار قلم..... جدائی (جنگلی)
پہلی بطور ہدایت کار قلم..... جسم
پہلی بطور فلم ساز قلم..... تسلیم

پہلی جنگلی قلم بطور ہدایت کار..... چوڑیاں
بطور اسٹوری لائنر جنگلی قلم..... دوعی چلو

پہلی قلم بطور مصنفہ و مکالمہ نگار..... سوہراتے جوانی

سید نور کی کہانی کا بھارتی چرہ

سید نور کی یادگار جنگلی قلم ”سوہراتے جوانی“ کو بھارت میں ”مہنی سون“ کے نام سے بنایا گیا۔ ممتاز اور علی اعجاز نے جو کردار کیے تھے وہ رشی کپور اور ایک نئی ہیروئن سے کروائے گئے۔ مگر ”مہنی سون“ کو سوہراتے جوانی جیسی کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ سوہراتے جوانی کی کہانی سید نور کی تحریر کردہ تھی جبکہ اس کے ہدایت کار حیدر چوہدری تھے موسیقی طاغوث تھی جس کی کاسٹ میں مستانہ علی اعجاز، ہنسا، تنہا، شجاعت ہاشمی اور وردانہ رحمن شامل تھے۔ یہ مکمل کامیڈی قلم تھی۔

سید نور کی تحریر کردہ دوسری فلم جس کا بھارت میں کامیاب چرہ بنایا گیا وہ ”جنگلی قلم“ ”جدائی“ تھی۔ بھارت میں اسی کہانی کو ”باغبان“ کے نام سے فلمایا گیا جس میں ایشیا بھٹنچن اور ہیمانانی نے کلیدی کردار ادا کیے تھے۔ ”جدائی“ 1986ء کی فلم ہے۔ جس میں رانی، نازلی، ہنسا اور سید نور نے اہم کردار ادا کیے تھے۔

سید نور کے دادا استاد

سید نور نے ہدایت کاری کے اسرار رموز نامور ہدایت کار ایس سلیمان سے حاصل کیے۔ انہوں نے کئی برسوں تک ایس سلیمان کے اسٹنٹ کے طور پر کام کیا جبکہ ایس سلیمان نے اپنا ابتدائی زمانہ لجنڈ ڈائریکٹر انور کمال پاشا کی شاگردی میں گزارا تھا۔ یہ پاشا صاحب ہی تھے جنہوں نے ایس سلیمان کو ہدایت کاری سکھائی۔ اس طرح سید نور انور کمال پاشا کو اپنا دادا استاد قرار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میری استاد کی کا سلسلہ محترم و حکم انور کمال پاشا سے جاملتا ہے۔

جاسکتا تھا۔“

اعلان کرنا پڑا کہ انہوں نے واقعی صائمہ سے شادی کر لی ہے۔

رخسانہ نور ایک دیدہ ورمحانی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ قلم نگری کے مردوں کی یہ پرانی ریت ہے کہ وہ فلموں میں کام کرنے والی عورتوں کے ساتھ خوشگوار لمحات گزارنا اپنا بنیادی حق تصور کرتے ہیں۔ اپنے شوہر کے بارے میں بھی وہ زیادہ خوش فہم نہیں تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ قلم سازی اور ہدایت کاری کی تکنیک اتارنے کے لیے وہ ایسی تفریح کا سہارا لے لیتے ہوں گے مگر انہیں اس بات کا ہرگز یقین نہیں تھا کہ وہ اپنی فلموں کی ہیروئن کو اپنی حقیقی ہیروئن بنائیں گے۔

رخسانہ نور کے لیے یہ بہت بڑا سانحہ بہت بڑا صدمہ تھا جسے وہ برداشت نہ کر سکیں۔ اس سانحے نے ناسور کی صورت میں انہیں موت کی آغوش میں پہنچا دیا۔

صائمہ بے شک ایک اچھی اور باصلاحیت اداکارہ ہے۔ اسے سراسر اشارہ بنانے میں بلاشبہ سید نور کا بڑا کردار ہے مگر رخسانہ نور بھی کوئی گئی گزری شخصیت کی مالک نہیں تھی۔ وہ ایک شاعرہ تھی ایک ادیبہ تھی ایک صحافی تھی اور پھر سید نور کی شریک حیات بننے کے بعد اس نے قلم انٹرسٹی میں بھی بطور کہانی نویس، مکالمہ نگار اور نغمہ نگار کے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ وہ سید نور کی ایک باوقار بیوی تھیں۔ ایسی بیوی کے ساتھ اس کے شوہر کا ایسا سلوک حقیقتاً بڑا تکلیف دہ تھا۔ کوئی بھی بے پناہ چاہنے والی بیوی اپنے شوہر کی ایسی بے وفائی برداشت نہیں کر سکتی۔

یہ کہنا کافی نہیں کہ شاہ جی بھی ایک انسان ہیں اور انسان خطا کا چٹا ہوتا ہے۔ ان سے بھی یہ غلطی ہو گئی۔ لیکن نہیں سید نور کوئی عام آدمی نہیں۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اچھی سوجھ بوجھ کے مالک اور ایک دانا و پینا دانشور ہیں۔ انہیں ایسی اصول بیوی، اس قدر چاہنے والی بیوی نہ تھی جس نے ان کے لیے اور ان کے بچوں کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اس پر سوکن کا بم لا کر بلاست کر دیا۔ یہ غلطی معافی کے قابل نہیں۔

قلم والے اپنی ساتھی اداکاروں کے ساتھ شادی بیاہ کرتے ہیں۔ یہ کوئی نئی یا بری بات نہیں۔ نذیر نے سورن لٹا سے شادی کی۔ ستوش کمار نے سمیو خانم سے، درپن نے نیر سلطانہ سے، ایس سلیمان نے پنا (ذریں) سے، انجری نے زینا سے شادی کی مگر ان شادیوں سے کسی کی حق تلفی نہیں ہوئی۔ سید نور اگر رخسانہ نور سے پہلے کسی اداکارہ سے شادی

انہی دنوں کی بات ہے۔ میرے ایک صحافی دوست نے ان سے کہا۔ ”شاہ جی! کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اب لاہور کے پروڈیوسرز انٹریکٹرز فلمیں بناسکتے کراچی والے زیادہ بہتر کام کر رہے ہیں۔“

شاہ جی نے برملا کہا۔ ”یہ سب بکواس ہے۔ کوئی لاہور اور کراچی والی بات نہیں ہے۔ ایک وقت تھا جب قلم انٹرسٹی لاہور میں تھی لیکن کراچی کے فنکار، قلم ساز، ہدایت کار، تدوین کار اور دیگر ٹیکنیشنز نے لاہور آکر اپنا نام اور مقام بنایا۔ مل جل کر قلم انٹرسٹی کو 60 برسوں تک چلایا۔ دراصل ہماری قلم انٹرسٹی نہیں بلکہ سینما انٹرسٹی نے ترقی پذیر ہوئی۔ پھر پاکستان میں جیسے ہی سینما انٹرسٹی نے ترقی کی ویسے ہی عوام کا مزاج بھی تبدیل ہوا۔ انٹرسٹی ہمارے مستقل اسکرین سینماؤں کی دیگرگوں حالت کی وجہ سے برباد ہوئی۔ ان کا حال آج بھی برا ہے۔ اسکرینز پرانی ہیں، کینٹین غیر معیاری، ہاتھ روم، بیٹھیں اور بہت کچھ نامناسب ہے۔ اصل میں سینما گلی ہوا تھا قلم نہیں۔ عوام کا مزاج اب بدل چکا ہے۔ وہ معیاری سینماؤں میں قلم دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ لاہور ہو یا کراچی اچھا سینما وقت کی اہم ضرورت ہے۔ جو لوگ لاہور اور کراچی کی باتیں کرتے ہیں وہ قلم ”چھین آئے نہ“ سینما گھروں میں آکر دیکھیں۔ انہیں اپنی بات کا جواب مل جائے گا۔“

ذرا پہلے اداکارہ صائمہ کا ذکر خیر ہوا تھا۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے اس فنکارہ کا کچھ ذکر اداکار ہو جائے اور شاہ جی کے حوالے سے ہی ہو۔ یہ بات جواب کوئی دشمنی چھپی نہیں رہی ہے کہ یہ موصوفہ صائمہ سے صائمہ نور بن چکی ہیں اور یہ خوشگوار ”دووع“ رخسانہ نور کی وفات حسرت آیات کے بعد پیش نہیں آیا، ان کی موجودگی میں رونما ہوا۔

رخسانہ نور ایک طویل عرصہ تک اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن تھیں۔ وہ دنیا میں خود کو خوش قسمت ترین عورت سمجھتی تھیں۔ انہیں اس بات کی بھی خوشی تھی کہ انہوں نے جسے چاہا اسے حاصل بھی کر لیا۔

پھر ان کی زندگی میں ایک ایسا انقلاب آیا جس نے ان کی زندگی میں زہر گھول دیا۔ انہیں معلوم ہوا کہ ان کے محبوب شوہر نے اپنی فلموں کی فحوت ہیروئن سے خفیہ طور پر شادی کر لی ہے۔ ایسی شادیاں زیادہ دنوں تک خفیہ نہیں رہیں۔ ایک دن اس کا ہوا ٹراپھوٹ گیا اور سید نور کو باضابطہ

کرتے یا رخسانہ نور کی وفات کے بعد تو ان کے چاہنے والوں کو اس بات کا دکھ نہیں ہوتا۔ بہر حال جو ہوتا تھا وہ ہو گیا۔

جہاں تک صائمہ کا تعلق ہے۔ اس کے جسم کی آب و تاب میں بھی اب پہلی سی بات نہیں رہی ہے جس کی حدت سے شاہ جی پھل کر موم ہو گئے تھے۔ اب فلموں میں بھی اس کی وہ مانگ نہیں رہی ہے۔ شاہ جی خود اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں کہ اب ٹی وی ڈراموں اور کرکشل ہی میں ان کی منجائش رہ گئی ہے۔

یہ میرے جذبات و احساسات نہیں، جو اوپر بیان کیے گئے ہیں۔ یہ شاہ جی کے چاہنے والوں اور پرستاروں کے محسوسات ہیں جو میں نے پیش کیے ہیں۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں شاہ جی کو ان کے فنی محاسن کی وجہ سے بہت بڑا فنکار اور فلم نیکر سمجھتا ہوں۔ ان کی ذات سے ہماری فلم انڈسٹری کو بڑے فائدے پہنچے ہیں اور آنے والے دنوں میں بھی ہم ان سے گراں قدر فائدے حاصل کریں گے۔ انہوں نے جو منفرد اور یادگار فلمیں بنائی ہیں وہ انہیں ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھیں گی۔

یوں تو ان کے کریڈٹ میں متعدد کامیاب فلمیں ہیں مگر چوڑیاں، زیور، جیوا، ڈاکو رانی، گھونگھٹ، ہوائیں اور ذکیت جیسی آئی ٹائم سپر کلاس ان کی یادگار فلمیں ہیں۔

اس موقع پر میں ان کی معاشرتی فلم ”زیور“ کا خصوصی طور پر ذکر کروں گا۔ زیور ہمارے معاشرے کی عورتوں کی خاص کمزوری ہے۔ اس کو موضوع بنا کر سعادت حسن منٹو نے ایک یادگار کہانی ”جھمکے“ لکھی تھی جس پر ”بدنام“ نامی فلم بھی بنائی گئی تھی۔ اس فلم کے یہ مکالمے آج بھی ضرب المثل کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔

کہاں سے آئے یہ جھمکے؟

کون لایا تھا یہ جھمکے؟

کس نے دیئے یہ جھمکے؟

علاؤ الدین جو اس فلم میں ایک غریب تانگے والا ہے اپنی بیوی زمرہ کے کانوں میں جب سونے کے جھمکے دیکھتا ہے تو جذباتی ہو جاتا ہے۔

سید نور نے عائشہ اسی فلم سے متاثر ہو کر ”زیور“ بنائی۔ جو خواتین کی زیور سے متعلق دلچسپی اور چاہت کو خاطر کرتی ہے۔ سید نور نے فلم کے قہم کو کہانی، اداکاری اور ڈائریکشن کی اعلیٰ ترین خوبیوں سے بڑی خوب صورتی کے ساتھ نکتہ و

سید نور کی پنجابی فلمیں

سید نور کی وجہ شہرت ان کی ہدایت کاری میں بننے والی منفرد فلمیں ہیں۔ محرم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ انہوں نے بے شمار فلمی کہانیاں بھی تحریر کی ہیں جن میں پنجابی فلموں کی تعداد خاصی ہے۔ فلسازی اور ہدایت کاری شروع کرنے کے بعد انہوں نے قوی زبان کی ہی فلمیں بنائیں تو کچھ لوگوں نے انہیں پنجابیوں کا دشمن سمجھ کر انہیں گن پوائنٹ پر پنجابی فلمیں بنانے پر مجبور کیا۔ ان کو غالباً اس بات کی خبر نہیں تھی کہ جیسے وہ پنجابی فلموں کا دشمن قرار دے رہے ہیں اس نے کتنی ہی کامیاب پنجابی فلموں کی کہانیاں لکھی ہیں۔ سوہراتے جوانی (1980ء) مفت پر (1981ء) پوشی (1981ء) چاچا بھتیجا (1981ء) ددنی دا سوال اے (1982ء) راکھا (1983ء) دادا استاد (1989ء) کالا (1984ء) چور چوکیدار (1984ء) جن دشمن (1985ء) جدائی (1986ء) شیر بہادر (1987ء) ظلم و طوفان (1986ء) فقیر یا (1987ء) شیر باز خان (1988ء) گوری دیاں جھانجراں (1990ء) جنگ ای جن (1990ء) محلہ جٹ (1990ء) خاندانی بدعاش (1990ء) چوراں دی رانی (1990ء) سارن (1990ء) جیلر (1990ء) بڈھا سمجھ (2003ء) ددنی لے کے جانی اے (2010ء) جگنی (2011ء) شریکا (2012ء)

عروج تک پہنچایا ہے۔ اپنی متعدد اچھائیوں کی وجہ سے یہ فلم پاکستانی فلموں کا جھومر کہلانے کی منتظر ہے۔ سید نور کی اپنی کامیاب فلموں میں بھی یہ ایک سپر کلاس فلم کے طور پر نمایاں حیثیت کی حامل فلم ہے۔

”زیور“ کے فلم ساز ایم شفیق بٹ ہیں جب کہ اس کی کاسٹ میں باہر علی، ریماء، صاحبہ، جان ریمو اور شاہد کلیدی کردار میں شامل ہیں۔ اس کی کچھ شوٹنگ ترکی اور استنبول میں بھی کی گئیں۔ شاہد جن کو صفت اول کے ہیروز میں شمار کیا جاتا تھا اس فلم میں اس نے منفی کردار ادا کیا تھا۔ ریماء نے

قلم دیکھنے والوں کو بہت متاثر کیا۔ صائمہ کا بھی کسی اردو قلم میں پہلا بھرپور کردار تھا۔ ”مکھوگٹھ“ ریلیز ہوئی اس نے طوفانی کامیابی حاصل کی پورے پاکستان میں سپر ہٹ ثابت ہوئی۔ اس قلم کی کامیابی میں اس کی موسیقی کا بھی اہم کردار تھا۔ کئی گانوں نے تو دھوم مچادی جن میں

☆ دیکھا جو چہرہ تیرا موسم بھی پیارا لگا۔ کانوں میں جھمکا تیرے ہم کو ستارا لگا۔

اور صائمہ پر پکڑا تڑ ہونے والا گیت۔
ہڈی ٹھوڑی کبھی جوانی ہے۔

عوامی حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا۔ اس قلم میں سید نور کی ہدایت کاری کا معیار بہت بلند تھا۔ اس قلم کو خواتین نے بھی بے حد پسند کیا۔ اس قلم کی اہم بات یہ ہے کہ اس قلم کی وجہ سے اداکارشان کوئی زندگی ملی۔ شاہ جی نے ان سے وہ کام لیا کہ دوسرے ہدایت کار جبران رہ گئے۔ ایک وقت ایسا تھا کہ کراچی سرکٹ میں شان کی فلمیں کوئی تقسیم کاری لینے کو تیار نہیں ہوتا تھا مگر اس قلم کے بعد وہ اس قدر معروف ہو گئے کہ ان کی لگا تار فلمیں آئیں۔ 12 جولائی 1996ء میں ریلیز ہونے والی اس کامیاب قلم کے ساتھ یہ زیادتی ہوئی کہ اس کے تقسیم کار ادارے شیر افگن نے اسے اتار کر سنگیتا کی نئی اردو قلم ”مکھلوتا“ لگا دی جس سے ”مکھوگٹھ“ گولڈن جوبلی سے محروم رہ گئی۔

اس قلم کی کاسٹ میں محسن حسن خان، رشیم، ارباز خان، عندلیب، صائمہ، شان اور سائرہ خان شامل تھے۔ ارباز خان کو چاکلیٹی ہیرو کے طور پر پیش کیا گیا تھا جو شاہ جی کا ہی کارنامہ تھا۔

قلم بے شک ٹیم ورک ہے۔ بہت سے لوگوں کی کارکردگی کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے مگر ہدایت کاری حشیت فوج کے سپہ سالار جیسی ہوتی ہے۔ اس کی سوجھ بوجھ اور حکمت عملی کی وجہ سے فتح حاصل ہوتی ہے۔ سید نور بھی ایسے ہی ڈائریکٹر ہیں جو اپنی فلموں کی ایسی منصوبہ بندی کرتے ہیں جن کی کامیابی یقینی ہوتی ہے۔ کس سے کس طرح کا کام لینا چاہیے اس ہنرمیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ قلم میکنگ کے سلسلے میں ان کی سوجھ بوجھ اور فہم و فراست عظیم خداوندی ہے۔

”سگم“ ان کی رتھین اردو قلم تھی جو ریلیز ہوئی تو اس نے طوفانی کامیابی حاصل کی۔ اگرچہ یہ قلم ابتداء میں فٹل کا شکار رہی۔ قلم ساز ایس بی حسین کی یہ رومانی قلم 1995ء

اس قلم میں اپنا کردار اس خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے کہ تمام ناقدین اور مبصرین نے اسے ان کی تمام فلموں سے زیادہ معیاری اور سپر کلاس قرار دیا ہے۔ ”زیور“ ہر لحاظ سے ایک ایسی قلم تھی جسے ریکارڈ کامیابی حاصل کرنی چاہیے تھی مگر اس کے قلم ساز اور تقسیم کار نے قلم کی نمائش سے پہلے جو اہم اور ضروری فریضہ انجام دینا چاہیے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ قلم چاہے جتنی بھی اچھی ہو، اس کی تفسیر بہت ضروری ہوتی ہے مگر اس پر نہ قلم ساز نے توجہ دی نہ تقسیم کار نے، قلم مکمل ہوتے ہی اس کی تفسیر کے بغیر جلد بادی میں اسے ریلیز کر دی۔ جس کا نتیجہ جو ہونا چاہیے تھا وہ ہوا۔ قلم دیکھنے والوں کو پتا ہی نہ چلا کہ قلم کب آئی اور کب گئی۔ اس طرح ایک سپر کلاس قلم باکس آفس پر سپر فلاپ قرار دے دی گئی۔ اس قلم کی تاریخ نمائش 6 مارچ 1998ء ہے۔

تفسیر یا پلٹنی کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو سید نور کی قلم ”ہوائیں“ کی مثال دی جاسکتی ہے۔ اس قلم کے ٹریلر نے قلم کی نمائش سے بہت پہلے ملک بھر کے سینما گھروں میں چل کر دھوم مچادی اور عوام بڑی بے صبری سے اس قلم کا انتظار کرنے لگی اور جب نمائش پڑی ہوئی تو بہت پسند کی گئی۔ اس قلم کی کامیابی سے متاثر ہو کر بعد میں اسی کہانی پر ”یہ وعدہ رہا“ اور ”دی سگم“ بنائی گئی۔ دل چپ بات یہ ہے کہ عدم نمائش ”ہوائیں“ میں جو کردار ادا کیا تھا وہی کردار ان سے ”یہ وعدہ رہا“ اور ”دی سگم“ میں بھی کرایا کیا اور ان کا گیت اب بھی ”ہوائیں“ والا ہی رکھا گیا۔ مگر یہ دونوں فلمیں ”ہوائیں“ جیسی کامیابی حاصل نہ کر سکیں۔ وجہ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھی کہ سید نور کی قلم میکنگ کا جو انداز ہے اس انداز میں دوسروں کے لیے قلم بنانا آسان نہیں۔ ”ہوائیں“ میں سید نور کی ہدایت کاری فن کی بلند یوں پر مبنی۔ اگرچہ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ ”ہوائیں“ بھارتی قلم ”ارجن“ کی کہانی پر بنائی گئی ہے۔ اس بات کی تصدیق نہ ہو سکی کہ یہ الزام کہاں تک درست ہے۔ ہو سکتا ہے دونوں فلموں کی کہانیوں میں کچھ مماثلت ہو۔ ”ارجن“ ایک کامیاب قلم تھی۔ کامیابی کے لحاظ سے ”ہوائیں“ بھی یادگار قلم ہے۔

قلم ساز شہزاد رفیق کی میوزیکل اور رومانوی قلم ”مکھوگٹھ“ کا شاعر ارثر ٹریلر بھی ”ہوائیں“ کے ساتھ پورے پاکستان میں ریلیز ہوا تھا۔ جسے بے حد پسند کیا گیا۔ خاص کر اس ٹریلر میں شان کی آخر میں جو انٹری تھی اس نے

میں شروع ہوئی مگر مسلسل لیٹ ہوتی چلی گئی۔ ایک مرحلہ ایسا آیا کہ یوں محسوس ہونے لگا کہ یہ فلم کسی مکمل نہیں ہوگی۔ اس دوران فلم ساز فرزند علی نے اسے حاصل کر کے نہ صرف اسے مکمل کروایا بلکہ اس کی زبردست تشہیر بھی شروع کرا دی۔ پھر جب یہ ریلیز ہوئی تو اس نے لاہور اور کراچی سرکٹ میں طوفانی کامیابی حاصل کی۔ امجد یوٹی کی موسیقی اور رخسانہ نور کے نغمات نے بھی سنگم کی کامیابی میں نمایاں کردار ادا کیا۔

سرمنی بادلوں میں

اور

دل توڑ کے نہ جا

نے دھوم مچا دی۔ باقی نغمات بھی بہت پسند کیے گئے۔ ”سنگم“ میں شان کی اداکاری اسے دن بھی سید نور کی یادگار ہدایت کاری نے اس فلم کی اہمیت میں نمایاں اضافہ کیا۔ خواتین نے بھی اس فلم میں خصوصی دلچسپی لے کر اس کی کامیابی کو چار چاند لگایا۔ سنگم ہمیشہ اچھی اور کامیاب فلموں میں شمار ہوئی۔ آج بھی راہ چلتے ہوئے جب اس فلم کا کوئی گانا سنائی دیتا ہے تو قدم رک جاتے ہیں اور سید نور کی فنی عظمت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس فلم کی کاسٹ میں شان، ریشم، تنہا، آغا طالش اور اسلم شیخ شامل ہیں۔ اس کی تاریخ نمائش 4 جولائی 1997ء ہے۔

سید نور جنہیں عرف عام میں لوگ شاہ جی کہتے ہیں، ان کی ایک فلم ہے ”سرگم“ اس کے نام سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کا موضوع موسیقی ہے۔ موسیقی جسے روح کی غذا قرار دی گئی ہے اور کہا گیا ہے

سُر سے جس کو پیار نہیں

وہ مورکھ انسان نہیں

شاہ جی نے اس موضوع پر اتنی خوب صورت فلم بنائی ہے کہ اس کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ اسے دیکھتے وقت تماشاہیوں کے منہ سے ہر منظر پر واہ وا نکلتی ہے۔ فلم دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ اسے دیکھتے وقت ہم اس میں ایسے گم ہو جاتے ہیں کہ ہمیں اپنا ہوش نہیں رہتا۔ جب فلم ختم ہوتی ہے جب ہم چونک کر گویا بیدار ہوتے ہیں۔ ایک وقت ایسا تھا کہ جہاں جاؤ سرگرم کے گانے بچ رہے ہوتے تھے۔ ریکارڈ تعداد میں اس کے آڈیو فروخت ہوئے۔

اس فلم ”سرگم“ کی کہانی پر بھارت کے نامور ہدایت کار رنجے لیلہ بھسالی نے ”ہم دل دے چکے نمم“ بنائی وہ بھی

”سرگم“ کی طرح سپر ہٹ ہوئی۔

”سرگم“ میں شاہ جی نے زیبا بختیار، عدنان سیج، ندیم، مہاراج کھٹک اور مصطفیٰ قریشی سے ایسا کام لیا کہ وہ اپنے کرداروں میں انگوٹھی کے ٹکینے کی طرح فٹ نظر آئے۔

اس موقع پر یہ سچ حقیقت بیان کرتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ شاہ جی کے ساتھ ان کی اکثر فلموں کی نمائش کے وقت تاروا سلوک کیا گیا۔ سنگل اسکرین کے سینماؤں کے دور میں سینما گھروں کی کمیابی کی وجہ سے ان کی کئی فلمیں جو بڑی تیز رفتاری کے ساتھ بزنس کر رہی ہوتی تھیں، ان کے تقسیم کار انہیں اتار کر اپنی نئی فلم لگا دیتے تھے۔ جس سے طوفانی کامیابی حاصل کرنے والی فلم کو پر یک لگ جاتا تھا۔ چند فلموں کی مثالی پیش کروں گا۔ رٹین اردو فلم ”سنگم“، فلم دیکھنے والے خواتین، حضرات بے حد ذوق و شوق سے دکھ رہے تھے کہ اس نئے تقسیم کرنے اسے اتار کر جاوید شیخ کی نئی فلم ”لیس باس“ لگا دی۔ جسے کامیابی کا منہ دیکنا نصیب نہ ہوا۔ جبکہ سنگم کی نمائش کے دوران اردو فلمیں کرم داتا۔ ڈریم گرل اور گھٹا ریلیز ہوئیں مگر کوئی بھی سنگم جیسی کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

اس طرح سید صاحب کی فلم ”گھونگھٹ“ کے ساتھ بھی فلم ہوا جب تقسیم کار حاجی شیرا نے تیز رفتاری کے ساتھ چلتی ہوئی فلم ”گھونگھٹ“ کو اتار کر سنگیتا بیگم کی نئی فلم ”کھلونا“ لگا دی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ گھونگھٹ سے جب جی بھر کر کما لیتے، نئی فلم ”کھلونا“ لگاتے یا گھونگھٹ کی نمائش کو ڈسٹرب کئے بغیر نئے سینما انچج کرتے ”کھلونا“ ریلیز کرتے۔

یہی کچھ ”ہوائیں“ کے ساتھ بھی ہوا۔ اس کے تقسیم کار ادارے راشد اینڈ کو نے 47 ہفتے میں چلتی ہوئی فلم ”ہوائیں“ کو اتار کر نئی فلم ”چوروں کے گھر چور“ لگا دی جو فلاب ہوئی۔ اس ادارے نے تین ہفتے کا بھی انتظار نہیں کیا کہ اس کی گولڈن جوبلی ہو جائے تو اس کی جگہ دوسری فلم لگائیں۔

رونا محض سنگل اسکرین سینما مالکان کا نہیں، اب جبکہ ملٹی پلکسی سینماؤں کا دور ہے تو کون سا پاکستانی فلموں کو فائدہ پہنچ رہا ہے؟ شاہ جی کی نئی فلم ”چین آئے نہ“ جو 2017 کی ایک یادگار فلمی فلم ہے۔ جسے اس کے تقسیم کار اور سینما مالکان نے توجہ نہ دے کر سوتیلے پن کا سلوک کیا۔ ورنہ عوام نے تو اس فلم کو بے حد سراہا۔ لیکن مناسب شوز نہ ملنا

اس فلم کے لیے ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

”چین آئے نہ“ 11 اگست 2017 کو نمائش کے لیے پیش کی گئی لیکن کراچی سمیت ملک بھر کے مالکان خصوصاً ملٹی پلکسیس سینماؤں نے پاکستانی فلم کو مناسب ٹائم نہیں دیا۔ اور چان بوجھ کر صرف مارننگ اور لاسٹ شوز دے دیے۔ حد تو یہ تھی کہ 14 اگست کے دن بھی بے حس ملٹی پلکسیس مالکان نے بھارتی فلم ”ٹائٹ“ چلائی۔ کم از کم یوم آزادی کی عظمت کا تو خیال رکھنا چاہیے تھا۔ اس دن پاکستانی فلمیں۔ ”چین آئے نہ“ اور ”جیوسراٹھا کے“ عوام غمی کثیر تعداد نے سنگل اسکرین سینما کپیری پردیکھا اس دن کپیری میں پورے دن چار شوز چلائے گئے۔ جن میں دو شوز ”چین آئے نہ“ اور دو شوز ”جیوسراٹھا کے“ کے تھے۔ اگر شوز کے ٹائم مناسب ہوتے تو یہ دونوں فلمیں بھرپور بزنس حاصل کرتیں۔

سید نور بلاشبہ پاکستان فلم انڈسٹری کی پہچان ہیں۔ کل بھی وہ معیاری اور منفرد فلمیں بناتے تھے اور آج بھی اعلیٰ معیار کی فلمیں بنا کر اپنے آپ کو ایک ذہن فلم نیکر ثابت کر رہے ہیں۔ ان کے کریڈٹ پر بنائی فلمیں ان کی ذہانت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ”چین آئے نہ“ ڈائریکشن کے اعتبار سے ایک بڑی فلم ہے۔ جس کے ایک ایک سین پر محنت کی گئی ہے۔ گزشتہ پانچ برسوں میں سوائے ندیم بیک، نیل قریشی، یاسر نواز اور وجاہت رؤف کے کوئی بھی فلم بنانے کا فارمولہ سمجھ نہیں پایا۔ جس کی وجہ سے ڈراما ٹائپ فلم بنتی گئیں۔ ”چین آئے نہ“ ایک مکمل فلم لگتی ہے۔ جسے دیکھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ ہم دی ڈراما نہیں واقعتاً فلم دیکھ رہے ہیں۔ سید صاحب نے ثابت کر دیا، مویہ خان جیسے نئے چہروں سے بھرپور کام لیتا ان ہی کا خاصا ہے۔ شاہجی نے بطور ہدایت کار ان نئے نوجویوں سے توقعات سے بڑھ کر کام لیا۔ عجم صاحب جیسے لیجنڈ کو فلم میں سرفہرست رکھا۔ جبکہ مصطفیٰ قریشی سے بھی خوب کام لیا۔ گانوں کی کچرا اڑیشن میں تو شاہجی نے کمال کر دیا۔ فلم کی کہانی کو نئے اعزاز سے خوبصورت ٹریٹمنٹ دیا جس کی وجہ سے فلم مزید خوبصورت بن گئی۔ ان تمام باتوں کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ جنگل میں مورنا چاکس نے دیکھا؟

یہاں تو بے چارے مور کو انا دل نشین رقص دکھانے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ کیا سید نور جیسے لیجنڈ کے ساتھ ساتھ ہماری فلم انڈسٹری کے ساتھ فلم نہیں؟ یا رونا انا تو پاکستانی بنو

کہ اپنے وطن عزیز کی مصنوعات کو پھولے لئے پھلنے کا موقع دو۔ پاکستانی فلموں کی آبیاری کرو۔ بھارتی فلمیں ضرور دکھاؤ۔ فلمیں اپنی حب الوطنی کا اتنا ثبوت دو کہ قومی فلموں کو بھی نمائش کا مناسب موقع فراہم کرو۔

سید نور جیسے لیجنڈ فلم میکر کی ایک ایسی فلم کو جان بوجھ کر شائقین تک نہ پہنچانا بہت بڑا اخلاقی جرم ہے۔ ان پر ہی نہیں، پوری فلم انڈسٹری کے ساتھ زیادتی ہے۔ شاہجی کی یہ فلم ”چین آئے نہ“ ایک مکمل فلم ہے۔ ناقدین کے خیال میں یہ فلم 90 سینما اور ماڈرن ایج کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس فلم میں وہ سب کچھ ہے جو ماڈرن سینما کے نام پر ہم دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔

بہت سے تماشاخیوں کو یہ فلم دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس فلم کے بارے میں خاص خاص باتیں بتاؤں۔

پاکستانی نژاد امریکی جاوید صدیقی اور عجم ہارون ساکھا ”چین آئے نہ“ کے پروڈیوسر ہیں جبکہ سید نور بھی اس فلم کے شریک فلما ساز ہیں۔ اس کی کہانی مکالمے اور اسکرین پلے شاہجی نے اپنے جادوئی قلم سے خود لکھے ہیں۔

اس فلم کی کاسٹ میں سید نور نے اپنی روایات کے مطابق نئے ستاروں پر انحصار کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر افراد کا تعلق فلمی گھرانوں سے ہے۔ اس فلم کا ہیروز، سینئر اداکار بہروز سنوار کی بیٹی ہیں۔ عادل مراد، وحید مراد کے، فرزند ارجمند ہیں۔ فلم کی ہیروئن سحرش خان صبیحہ خانم اور سنوٹش کماری نواسی ہیں۔ دانش نواز، یاسر نواز کے چتر ہیں۔ فلم کے فوٹو گرافر عرفان مرزا لیجنڈ فوٹو گرافر کا مران مرزا کے بیٹے ہیں۔ نامور سنگر وارث بیک کے سنگر بیٹے عمار بیک نے بھی اس فلم میں گاکر اپنے کیریئر کا آغاز کیا ہے۔

نئے اور ابھرتے ہوئے آرٹسٹوں کے ساتھ ساتھ شاہجی نے اپنی اس فلم میں سینئر، پختہ کار اور نامور فنکاروں کو بھی پیش کیا ہے۔ ندیم، مصطفیٰ قریشی، بہروز سنوار کی، عجم اڈھو کو کہانی کے اہم کرداروں میں پیش کیا ہے۔ ندیم صاحب نے فلم میں ہیروئن کے باپ کا کردار کیا ہے۔ عجم اڈھو ایک خاتون سیاستدان ہیروئن کی والدہ ماجدہ کے طور پر نظر آتی ہیں۔ مصطفیٰ قریشی نے فلم کے ولن کے باپ اور ایک وڈیرے چاغڈیو کے روپ میں بڑا جادو کار کردار ادا کیا ہے۔

دوسرے فلسفازوں اور ہدایت کاروں

کے لیے لکھی فلمیں جو بہت مشہور ہوئیں

سوسائٹی گرل - عشقِ عشق - لاڈلیار بیٹی - مس
ہانگ کانگ - نہیں ابھی نہیں - سنگدل - آہٹ - دلہیز -
بونی - لازوال - ہم سے ہے زمانہ - مس سنگاپور -
زنجیر - ایک ہی راستہ - فیلا کے جانناز - بارود کی
چھاؤں میں - بلندی - قیامت کے بعد - شکل - لاکھوں
میں ایک - اف - بیہوشیاں - لیڈی اسکور

بطور اسکرپٹ رائٹر

سید نور کی لکھی ہوئی پہلی فلمی کہانی ”سوسائٹی
گرل“ 1976ء میں تحریری کی گئی۔ اس کہانی پر بننے
والی فلم نے باکس آفس پر کامیابی کے جھنڈے گاڑے
تو سلسلہ ایسا چل نکلا کہ تقریباً سب بڑے ہدایت
کاروں نے ان سے کہانیاں لکھوائیں۔ 1992ء تک
وہ 200 فلموں کے اسکرپٹ لکھ چکے تھے۔ جن کی
تعداد ادب سوا چار سو سے زیادہ ہو چکی ہے۔

بہترین اسکرپٹ رائٹنگ پر انہیں بے شمار
ایوارڈز مل چکے ہیں۔ جن میں نیشنل فلم ایوارڈز، نگار
ایوارڈز کے علاوہ متعدد دیگر ایوارڈز بھی ہیں۔

سید نور کے پرستاروں کی انجمن

اداکاروں کے مین کلب تو ہوتے ہیں تقریباً
تمام ہی بڑے فنکاروں کے پرستاروں نے مختلف
ناموں سے مین کلب بنائے ہیں۔ دلچسپ بات یہ
ہے کہ بعض فنکاروں کی موت کے بعد بھی ان کے
چاہنے والے ان سے محبت کا پرچار کرتے ہیں۔ جیسے
وحید مراد، محمد علی اور سلطان راہی وغیرہ۔ مگر کسی ہدایت
کار کے نام پر پہلی بار سید نور کے پرستاروں نے آل
پاکستان لورڈز آف سید نور فین کلب بنائے۔ جس
کے بانی اور چیئرمین محمد خان اعوان ہیں۔ جبکہ وائس
چیئرمین اداکار اچھی خان ہیں۔ عبدالسلام صدر اور
بلال خان جنرل سیکریٹری ہیں۔ تہواروں کے موقع پر
فلمی اخباروں میں اپنے کلب کا اشتہار چھپواتے ہیں۔



جین آئے نہ کی کہانی رومانی اور ڈرامائی مناظر سے
بھرپور ہے۔ کسی بھی رومانی فلم میں موسیقی ریڑھ کی ہڈی کی
طرح ہوتی ہے۔ اس فلم کا میوزک سن کر احساس ہوتا ہے کہ
ایک بار پھر پلے بیک سونگس کا ٹریڈ ان ہونے جا رہا ہے۔
سید نور کے اس میوزیکل رومیک فلم کا میوزک ایم ارشد
نے دیا ہے۔ جو اس سے پہلے بھی سید نور کے ساتھ بے شمار
ہنس دے چکے ہیں۔ ایم ارشد نامور موسیقار ایم اشرف
کے صاحبزادے ہیں۔ اس فلم کے پلے بیک میں راحت فتح
علی خان، وارث بیک، عماد بیک، بیتا خان، اور ڈی جے غنی
نے اپنی آوازوں کا جادو جگایا ہے۔ اس فلم کے راحت فتح
علی خان کی آواز میں دوسو سونگس فلم کی ریلیز سے قبل ہی
میوزک چارٹس پر دھوم مچا چکے تھے۔ راحت فتح علی خان نے
اس فلم کے لیے

”ہونا تھا یار ہو گیا“۔ ”میری وفا میرے وعدے پہ
اعتبار کرو“

جیسے میلوڈی گیت گائے ہیں۔

شاہ جی نے اس فلم کا پوسٹ پروڈکشن ورک بیکاک
سے کرایا ہے ٹرائی اےنگل لوائسٹوری میں وہ سب کچھ ہے جن
کی آپ سید نور سے توقع کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں یہ ناپسندیدہ رواج ہے۔ چاہے جتنی بھی
اچھی فلم ہو، اسے جلدی اتار دی جاتی ہے۔ اس کا مستقبل توڑ
دیتا ہے۔ چاہے جتنی بھی اچھی فلم ہو ہمیشہ کے لیے اس پر
فلاپ کی چھاپ لگ جاتی ہے۔

”جین آئے نہ“ کے ساتھ جو کچھ ہوا برا ہوا۔ اس
سے ان کے چاہنے والوں کو بھی بہت دکھ، بہت صدمہ ہوا۔
مگر شاہ جی فولادی اعصاب کے مالک ہیں۔ ان تمام باتوں
کے باوجود وہ آنے والے دنوں کے حوالے سے بہت
پرامید اور برعزم رہے اور ”آئینہ نو“ کی تیاریوں میں
مصروف ہو گئے۔

نئے اشارز جنہیں اس فلم میں پہلی بار متعارف کرایا
گیا تھا۔ سید صاحب ان کی مایوسیوں کا بھی ازالہ کرنے کی
کوشش میں رہے۔

”آج کل اکثر فلسفاز اپنی فلموں کی ریٹنگ بڑھانے
کے لیے غنیم صاحب کو کاٹ کرتے ہیں۔ کیا آپ نے بھی
.....“

سوال کرتے صحافی کی قطع کلائی کرتے ہوئے شاہ جی
نے کہا تھا۔ ”نہیں..... میں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ غنیم

صاحب کو محض خانہ پری کے لیے نہیں بلکہ کہانی کی ڈیماٹ کے عین مطابق کاسٹ کیا تھا۔ اس فلم میں ان کا کردار ایک سیاست دان بیوی کے شوہر کا جو اپنے ارد گرد ہونے والے حالات و واقعات سے پوری طرح باخبر اور اپنی عزت اور وقار کی خاطر خاموش بھی ہے۔ لیکن فلم کے اختتام پر وہ اپنی بھرپور فارم میں نظر آئے۔“

اپنی اس فلم کی موسیقی کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔ ”ہر کامیاب فلم میں اس کے نعمات کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ اچھا اور معیاری میوزک فلم کی جان ہوتا ہے۔ جسے سن کر اور دیکھ کر عوام انجوائے کرتے ہیں۔ میری سابقہ فلمیں میوزک کے اعتبار سے بھی پرہٹ تھیں۔ جن میں جیوا۔ گھونگھٹ۔ سرگم۔ دیوانے تیرے پیار کے وغیرہ سرفہرست ہیں۔ ان فلموں کی میوزک نے فلموں کو چار چاند لگا دیے۔ جنہیں عوام آج بھی یاد کرتے ہیں۔ میری فلم ”چمن آئے نہ“ بھی ایک مکمل اور بھرپور میوزیکل فلم۔ جس میں 7 گانے تھے۔ ہر گانا ایک دوسرے سے مختلف اور منفرد ہے۔ جبکہ ان تمام کی کچھ انٹرینشن بھی لا جواب ہے۔ انہیں گانے والے گلوکاروں اور گلوکاراؤں نے انہیں شاہکار بنادیا ہے۔“

ایک فلم پر اس کے تخلیق کار کس قدر محنت کرتے ہیں۔ اس کے ایک ایک شعبہ پر کس قدر توجہ دیتے ہیں۔ ایک ایک فریم کو خوبصورت بنانے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرتے۔ خبر افسوس صد افسوس کہ کچھ لوگ محض اپنے تھوڑے سے ذاتی مفاد کی خاطر فلم میکر کی ساری محنت پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ ”چمن آئے نہ“ اس فلم کا ایک اداکار خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ لیجنڈ فنکار وحید مراد کا فرزند ارجمند ہے۔

اگرچہ عادل مراد بحیثیت پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور ایکٹر متحدہ ٹی وی ڈراموں اور سوپ کربار ہاؤرشوز میں اپنے والد کے حوالے سے بہت کبھی اپنی فی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتا رہا تھا۔ مگر کسی فلم کے لیے اسے کاسٹ نہیں کیا گیا تھا۔ کراچی میں جہاں اس کی رہائش ہے، اب خاصی فلمیں بن رہی ہیں جن میں ٹی وی آرٹسٹوں کو بھی کاسٹ کیا جاتا ہے۔ سید نور نے اسے پہلی بار اپنی فلم میں بطور اداکار شامل کیا۔ جنوری 2016ء میں شاہ جی کراچی آئے تو عادل مراد کو بلا کر کہا۔

میں ایک رومانٹک اور میوزیکل فلم بنانا ہوں اور تمہیں ایک خاص رول میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ عادل مراد نے ہاں یا نہ کہنے سے پہلے کہا۔ ”مجھے اس فلم کی کہانی سنائیے اور اس

میں میرا کیا کردار ہے بتائیے۔“

شاہ جی نے انحصار کے ساتھ کہانی سنائی اور کہا۔ ”تمہارا کردار ایک ڈبیرے کے بھڑے ہوئے بیٹے کا ہے جو U.K سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آیا ہے اور دولت کے نشے میں کمی کچھ نہیں سمجھتا۔“

عادل مراد سوچنے لگے کہ کردار بہت مشکل ہے۔ کیا میں کرسکوں گا؟ پھر بھی اس نے ہاں بھری تو اس کی توقعات کے مطابق شاہ جی نے اس کردار کی ڈیماٹ کے مطابق اسے بنا سنوار کر کمرے کے سامنے پیش کیا۔ اس کے لیے جس گاڑی کا بندوبست کیا وہ RANQUE ROVER تھی۔ اس کا شاہانہ لباس معروف ڈیزائنر امیر عدنان سے تیار کروایا۔ اس کی عیاشی کے لیے ایک فارم ہاؤس کا بھی انتظام کیا۔

چونکہ یہ بگوار میں زیادہ سگار کا بھی شوقین ہے لہذا اس کے لیے سگار پور سے خاص طور پر سگار.... منگوائے۔ ایک حقیقت پسند ڈائریکٹر ہونے کے ناتے سید صاحب نے اس کردار کو اس کے حقیقی رنگ میں پیش کرنے کے لیے تمام سہولتیں مہیا کیں۔ تاکہ ہر زاویے سے وہ ایک سیاست دان ڈبیرے کا بڑا ہوا بیٹا نظر آئے۔ یہ سب کچھ اس کردار کی ہائی لائش ہیں۔ عادل مراد بطور اداکار ایک باصلاحیت آرٹسٹ ہے۔ سید نور نے اس کی اس صلاحیت کو بھرپور طور پر اجاگر کیا اور اس سے جس طرح چاہتے تھے، اسی طرح پر فارم کر دیا۔ فلم مکمل ہوئی تو اس کی اداکاری سے جہاں وہ مطمئن تھے وہاں سینئر فنکاروں نے بھی اس کی تحریف کی۔

وحید مراد کے کچھ پرستاروں نے اس سے شکایت کیا۔ ”وحید مراد جیسے پرمیرہ کے صاحبزادے کو منفی کردار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہم تو چاہتے تھے کہ آپ اپنے والد کے نقش قدم پر چلیں۔“

عادل مراد نے یہ کہہ کر انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”وحید مراد دنیا میں ایک ہی تھا اور ایک ہی رہے گا۔ اگر میں وحید مراد بننے کی کوشش کرتا ہوں تو شاید میرے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ میں زندگی بھر اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔“

یہ سب باتیں بتانے کا میرا مقصد یہ ہے کہ ہدایت کار سید نور نے جب فلم کے ایک ولن کے کردار پر اتنی محنت کی تو فلم کے ہیرو، ہیروئن اور دیگر اہم کرداروں کو زندگی سے قریب دکھانے کے لیے کیا کیا جتن کیے ہوں گے۔ کتنی

پڑھو.....“ اس نے ایک اخبار کا پورا صفحہ میری طرف بڑھایا۔ اخبار کی پیشانی پر 3 مئی 2007 کی تاریخ درج تھی۔ اس صفحہ پر
 ”شاہ جی کی مریدنی بن کر جیوں گی۔“ کی سرخی سے
 ایک انٹرویو لگا تھا۔

سید نور سے شادی کے اقرار پر صائمہ کا پہلا انٹرویو تھا
 اگرچہ میں صائمہ سے شادی کے بارے میں بہت کچھ جانتا
 تھا جس کا اظہار میں اس تحریر میں بھی کر چکا ہوں۔ مگر چونکہ
 یہ صائمہ نور کا انٹرویو تھا جو پہلی بار اس نے اس شادی کے بعد
 دیا تھا۔ اس انٹرویو کے کچھ اقتباسات پیش ہیں۔

”رات کے آٹھ بجے کے قریب میں جب ماڈل
 ٹاؤن میں صائمہ کے گھر پہنچا تو ان کی چھوٹی بہن روبینہ نے
 ہمارا استقبال کیا۔ ڈرائنگ روم میں سرخ و سفید صائمہ کالے
 رنگ کی شلوار قمیص میں بڑی پُر وقار دکھائی دے رہی تھیں۔“
 گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو انہوں نے کہا۔

”ہر عورت کا خواب ایک گھر اور پیار کرنے والا
 شوہر ہے۔ میں اب اپنا گھر بنا جاتی ہوں لہذا فیصلہ کیا
 ہے کہ شاہ جی (سید نور) سے اپنے رشتے کو دنیا سے نہیں
 چھپاؤں گی۔“

”شوہر سے وابستہ لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ دونوں کی
 شادی بہت سال پہلے ہو گئی تھی۔“ اس سوال کے جواب میں
 صائمہ نے کہا۔

”یہ درست نہیں ہے۔ شادی ہونے دو سال قبل
 24 جولائی 2005ء کو سادگی سے ہوئی تھی۔ یہ ان دنوں کی
 بات ہے جب ”عاجن“ کی شوٹنگ جاری تھی۔ اس شادی کو
 پوشیدہ اپنی پروفیشنل مجبور یوں کے باعث رکھا۔ ہمارے
 ذہن میں یہ تھا کہ شاید ہمارے پرستار اور فلساذ کو ہمارا یہ
 رشتہ اچھا نہ لگے۔ ہمارے ہاں یہ تاثر بھی پایا جاتا ہے کہ
 شادی شدہ ہیر و دن کی مقبولیت کم ہو جاتی ہے۔ مگر پھر رفتہ
 رفتہ یہ سوچا کہ یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ ماضی میں زیبا محمد علی،
 مصیحہ سنتوش اور اب بھارت میں ایشوریا اور امبیٹک کو بھی
 اچھی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ مجھے اُمید ہے میرے
 پرستاروں کو میری شادی کی بھی خوشی ہوگی اور وہ ہم دونوں
 کے لیے دعا بھی کریں گے۔“

”صائمہ! آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ سید نور پہلے سے
 شادی شدہ ہیں۔ ان کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔“
 صائمہ نے کہا۔

مشکلوں سے گزر رہے ہوں گے؟ کیا کچھ نہیں کیا ہوگا۔ وہ
 ہزار یہ ظاہر کرنے کی کوشش کریں کہ جس قلم میں انہوں نے
 اتنی جان ماری کی اس کا انہیں صلہ نہیں ملا۔ اس کے باوجود
 دل برداشتہ نہیں ہوئے۔ وہ پُر عزم رہے۔ ان کے اعصاب
 پر اس بات کا اثر نہیں۔ اپنے ماڈل لیکنج سے وہ اپنے
 فولادی اعصاب کا جتنا بھی اظہار کریں، میں یہ بات ماننے
 کو تیار نہیں کہ انہیں ان کی محنت کے رائیگاں جانے کا دکھ نہیں۔
 وہ اندر سے بہت دکھی ہیں۔

میں نے اپنے اس خیال کا ذکر جب اپنے ایک صحافی
 دوست سے کیا تو اس نے بھی میری بات سے اتفاق کیا۔
 ”یقیناً شاہ جی کو اس بات کا دکھ ہے، اور ہونا چاہیے،
 یہ ایک فطری عمل ہے۔ جب کسی کو اس کی محنت کا ثمر نہیں ملتا تو
 اسے دکھ ہوتا ہے۔ صدمہ ہوتا ہے۔“ پھر ذرا رک کر دوست
 نے کہا۔ ”یہ عجیب بات ہے کہ لوگوں کو اپنا دکھ درد تو محسوس
 ہوتا ہے۔ مگر وہ دوسروں کے دکھوں کو دکھ نہیں سمجھتے۔ انہیں
 دکھ میں دیکھ کر دکھ نہیں ہوتا، ملال نہیں ہوتا۔“

میں نے دوست سے کہا۔ ”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“
 میرے صحافی دوست نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ اس
 کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اندرونی
 طور پر خود بھی دکھی ہے۔ ذرا توقف کے بعد اس نے کہا۔
 ”شاہ جی کو اس دکھ کی سولی پر تو لٹکنا ہی تھا۔ انہوں نے
 دوسرے کو دکھ دیتے وقت یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کا مکافات
 عمل بھی ہو سکتا ہے۔ کبھی وہ خود بھی قلبی اور ذہنی طور پر دکھوں
 کے صلیب پر مصلوب کیے جاسکتے ہیں۔ یہ تو قدرت کا نظام
 ہے۔ ہر ایک کو اس کے کیے کی سزا ضرور ملتی ہے۔“
 ”یار! تم اتنی باتیں کہہ گئے۔ مگر ہنوز میری ناقص عقل
 میں کچھ نہیں آیا کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

وہ جو بالکل سنجیدہ تھا۔ ”تم شاید بھول گئے کہ شاہ جی
 نے رخصانہ نور کو ایک بڑا دکھ دیتے وقت یہ یاد نہیں رکھا تھا
 کہ انہوں نے ساتھ جینے مرنے کا عہد و پیمان کیا تھا۔ جو وہ
 اس وقت بھول گئے جب اس نے اپنا سب کچھ ان پر نچھاور
 کر دیا۔ ان پر اور ان کے بچوں پر اپنی پوری زندگی واردی۔“

اب میری سمجھ میں آیا کہ میرا صحافی دوست کہنا کیا چاہ
 رہا ہے۔ مگر میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ مجھے خاموش اور
 سوچنا ہوا دیکھ کر اس نے کہا۔
 ”اگر اب بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آیا ہے تو یہ لوا سے

”اخذ کیا؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ واصل اس وقت میں اس کے جذبات سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ چند لمحوں تک میرے جواب کا انتظار کرنے کے بعد وہ بولا۔

”صائمہ جی نے کتنی آسانی سے کہہ دیا۔ ان کی پہلی بیوی رخسانہ کا میں دل سے احترام کرتی ہوں۔ وہ ساری زندگی پہلی ہی رہیں گی۔ اور میں دوسری بن کر رہوں گی۔ بے شک، ایک شوہر کی ایک سے زیادہ بیویاں بھی ہوتی ہیں اور وہ ایک ساتھ بھی رہتی ہیں مگر ایسا اسی صورت میں ہوتا ہے جب شوہر پہلی بیوی کی رضامندی حاصل کر کے دوسری یا تیسری شادیاں کرتا ہے۔ صائمہ بی بی نے تو ان کے بقول پونے دو سال تک شاہ جی کی دوسری بیوی ہونے کی خبر پوشیدہ رکھی۔ اس میں سید صاحب بھی برابر کے حصے دار ہیں۔ میں رخسانہ نور کا نہ پرستار ہوں نہ ان کا کوئی عزیز رشتے دار۔ میں تو ایک نیوٹرل جرنلسٹ ہوں۔ جو دیکھتا ہوں۔ جو محسوس کرتا ہوں اس کا اظہار کر دیتا ہوں۔ میں بھی تمہاری طرح شاہ جی کی فنی صلاحیتوں اور خوبیوں کا معترف ہوں۔ لیکن ان کی صائمہ سے خفیہ شادی کے اقدام کو غلط سمجھتا ہوں۔ جب دوسروں کے ساتھ رخسانہ نور کو بھی شادی کا پتا چلا تو ان پر جو غم کا پہاڑ ٹوٹا اس کا نتیجہ کینسر اور اس کا انجام موت رہا۔ رخسانہ نور، کوئی عام خاتون نہیں۔ وہ ایک حساس دل و دماغ رکھنے والی شاعرہ تھیں، ادیبہ تھیں، صحافی تھیں۔ انہوں نے اپنے اس دکھ کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا۔ کوئی پریس کانفرنس کر کے دکھ دینے والوں کے خلاف کوئی احتجاج ریکارڈ نہیں کرایا۔ خاموشی کے ساتھ اس صدمے سے بھرا۔۔۔ پڑیں اور خاموشی کے ساتھ اس دنیا سے سدھار گئیں۔“

یہ تو تھا صائمہ جی کا ایک پرانا انٹرویو کا قصہ جو انہوں نے 2007ء میں صائمہ نور بننے کے بعد دیا تھا۔ اب دس سال بعد 2017ء میں اس دوہستیوں کے جوڑے کا تازہ ترین انٹرویو، یا گپ شپ جو دونوں نے ایک ساتھ اپنے کچھ پرستاروں کے ساتھ کیس۔ یہ انٹرویو بیات چیت لاہور میں صائمہ نور کی نئی رہائش گاہ میں ہوئی جو شاہ جی نے انہیں بنا کر دیا تھا۔ وہاں ہونے والی باتوں کا بھی خاص خاص حصہ آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔

اپنی حالیہ ریلیز شدہ فلم ”چمن آئے نہ“ کے بارے میں کچھ بتائیں۔ مہمانوں میں سے ایک نے پوچھا۔

صائمہ پوری سچائی سے بولیں۔ ”سید نور اور رخسانہ کے بچے میرے بھی ہیں۔ خدا مجھے تو متفق دے گا۔ میں اپنے بچوں کو ان کی ماں بن کر ان کا خیال رکھوں گی۔ میں اپنی بیٹیوں کو اپنے ہاتھوں سے رخصت کروں گی۔ اور اپنے بیٹے ظل شاہ کے سر پر سپرہا بھی جاؤں گی۔ میں ان کی پہلی بیوی رخسانہ کا دل سے احترام کرتی ہوں۔ وہ ساری زندگی پہلی ہی رہیں گی۔ میں دوسری بن کر رہوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے صائمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تو اس نے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے شاہ جی کی مرید بی بی بن کر بیٹنا چاہتی ہوں۔ خدا ار اجازت دیں میں بھی زندگی جی لوں۔“ اس سے پہلے کہ صافی کوئی دوسرا سوال کرتا صائمہ خود ہی بولیں۔ بعض لوگ کہہ رہے ہیں کہ شاید میں اُمید سے ہوں اس لیے مجبوراً شادی کا اعلان کر رہی ہوں مگر فی الحال ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم خوش و خرم ازدواجی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

”آپ خود بھی ماں بننا چاہیں گی؟“

”میں سچے دل سے کہہ رہی ہوں کہ سید نور کے بچے میرے اپنے بچے ہیں۔ پھر میرے گھر میں بہنوں کے بہت سارے بچے ہیں۔ ہر وقت رونق مگی رہتی ہے۔ مگر میری خواہش ہے کہ میں خود بھی ایک بچے کو جنم دوں تاکہ اس مرتبے پر فائز ہو سکوں جس پر صرف ایک ماں ہی ہو سکتی ہے۔“

سید نور اور صائمہ کی شادی کا باضابطہ اعلان ہدایت کار سعود بٹ کی فلم کے سیٹ پر کیا گیا۔ یہاں صرف ایک صائمہ تھیں۔ سید نور سے متعلق بتایا گیا کہ وہ کراچی میں ایک نجی ٹی وی کے پروگرام میں شریک ہیں۔ مذکورہ انٹرویو کے دوران بھی سید نور موجود نہیں تھے۔ صائمہ نے اس انٹرویو کے دوران بتایا کہ شادی بے حد سادگی سے ہوئی جس میں کسی فلمی شخصیت نے شرکت نہیں کی۔ اس موقع پر سید نور نے مجھے انگوٹھی اور میں نے انہیں گھڑی تحفہ میں دی۔ حق مہر شرعی رکھی گئی۔“

انٹرویو کے اختتام پر صائمہ بولیں۔ ”میں نے سید نور سے سچی محبت کی ہے۔ خوش نصیب ہوں کہ ان سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئی۔“

میں نے اخبار خاموشی کے ساتھ دوست کی طرف بڑھایا۔ اخبار واپس لے کر اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ ”شاہ جی کی دوسری خوبصورت پسند کا انٹرویو پڑھ کر تم نے کیا نتیجہ

اس فلم کی ریلیز سے ایک ہفتہ قبل ہی میں بنکاک سے پاکستان پہنچا تھا۔ اس فلم کے تقسیم کار کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ اس نے اس کی ذرا بھی پہلی سٹی نہیں کی ہے۔ جب میں نے اس سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا۔ ”آپ ٹی وی کے مارننگ شوڈ میں اس کی پہلی سٹی کرلو۔ میری یہ فلم بہت اچھی تھی۔ جس نے بھی دیکھی تعریف کی۔ مگر کچھ حفاشین نے میری اس فلم کے خلاف اس قدر ہر دیکھنا کیا کہ فلم بیٹوں کی اکثریت یہ فلم دیکھ ہی نہ سکی۔“ مجھے تعجب ہے اس کی گفتگو کے دوران شاہ جی نے ملٹی پلیکس سینما مالکان کے ناروا سلوک کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ جبکہ چین آئے نہ کی نمائش کے بعد انہوں نے محل کرملٹی پلیکس سینما آئرز کے خلاف کہا تھا کہ انہوں نے میری اس فلم اور ”جیوسر اٹھا کے“ کو مناسب شوڈ نہیں دیے۔ صرف مارننگ شوڈ یا آخری شوڈ دیے جبکہ 14 اگست کے دن بھی ہماری فلموں کی بجائے بھارتی فلم ”ٹائلٹ“ کی نمائش کی۔ آپ کو یاد ہوگا۔ اس موقع پر انہوں نے سنگل اسکرین سینما کپیری کی تعریف کی تھی کہ کپیری نے چودہ اگست کے دن چار شوڈ چلائے دو ”چین آئے نہ“۔ ”دوروپ“۔ ”جیوسر اٹھا کے“۔ آگے بات کرتے ہوئے شاہ جی بولے۔ ”اس فلم کی ناکامی سے میں حوصلہ نہیں ہارا ہوں۔ جب تک تن میں جان ہے فلم انڈسٹری کی خدمت کرتا رہوں گا۔ حالانکہ اس فلم سے مجھے مالی طور پر بہت نقصان ہوا ہے۔ میری بہت ساری دہشیں بک گئی ہیں۔ میں مالی طور پر بہت کراؤ میں آ گیا ہوں۔ لیکن فلم بنانے کا حوصلہ اور جرأت میرے اندراب بھی ہاتی ہے۔ میں انشاء اللہ ایک بار پھر ماضی کی طرح ظہور صورت اور کامیاب فلمیں اپنے فلم بیٹوں کو دوں گا۔ شاہ جی کے اس بیان سے ایسا لگتا ہے جیسے یہ فلم (چین آئے نہ) انہوں نے مکمل طور پر اپنے سرمائے سے بنائی ہے۔ اگرچہ فلم کی تکمیل اور نمائش کے دوران یہ بتایا گیا تھا کہ اس کے فلسفہ ان کے دو دوست جو پاکستانی نژاد امریکی ہیں۔ انہوں نے پروڈیوس کی ہے۔ ہاں کچھ سرمایہ انہوں نے بھی لگایا ہے اور وہ بھی شریک فلسفہ ہیں۔ اس سے پہلے کہ اس انٹرویو کی دیگر باتیں بتاؤں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جہاں اور جس گھر میں یادگار گفتگو ہوئی۔ اس عظیم الشان اور شاعرانہ گھر کے بارے میں بھی آپ کو معلومات فراہم کر دوں۔

سید نور صاحب نے ابھی حال ہی میں شہر سے کچھ

صائمہ

صائمہ نور نسلا پٹھان ہیں۔ ان کی مادری زبان پشتو ہے۔ مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ انہوں نے پشتو فلموں میں قسمت آزمائی کی بجائے پنجابی فلموں کو ترجیح دی اور اداکارہ انجن کے بعد سلطان راہی کے ساتھ ان کی ایسی جوڑی بنی کہ سلطان راہی کی حادثاتی موت کے بعد ایسا لگا کہ ان کا فلمی کیریئر ختم ہو گیا ہے مگر ایسے میں سید نور نے انہیں اردو فلم کھوتکھٹ میں پیش کیا تو وہ اور فلموں کی بھی کامیاب اداکارہ بن گئیں۔

☆☆☆

ڈاکورانی

”ڈاکورانی“ کہنے کو تو ایک فلم ہے لیکن سمجھنے والوں کے لیے ایک پیغام ہے۔ اس فلم کا موضوع استعمالی اور ظالم قوتوں کے خلاف کمزوروں کا ایک اعلان بغاوت ہے۔ فلم کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کرنے والی رانی کی کمزور آواز نے ڈاکورانی بن کر ظالموں کی کفایت کردار تک پہنچایا۔

یہ کہانی اس وقت تک دہرائی جائے گی جب تک ظالم اور مظلوم کا وجود باقی ہے۔ ظلم جب حد سے بڑھتا ہے تو پھر ڈاکورانی جیسے کردار جنم لیتے ہیں۔ انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونے والی ہماری قوم خان، وڈیروں، چوہدریوں، سرداروں کے ظلم سے اب بھی آزاد نہ ہو پائی ہے۔ سید نور نے اس فلم کے لیے جس جرأت مندانہ موضوع کا انتخاب کیا وہ قابل تحسین ہے۔

☆☆☆

سید نور کا کارنامہ

سید نور فنکاروں کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اپنی اس خوبی کے تحت انہوں نے کئی نئے فنکار متعارف کرائے اور کچھ کو گہرے نایاب بنایا۔ جیسے شان، صائمہ، ثناء، بابر علی، رشیم، معمر رانا، اریانہ خان، سعود، عندلیب، محمد اسلم شیخ وغیرہ ایسے فنکار جن میں سے کسی کو متعارف کرایا تو کسی کو امانول کر دیا۔

پاکستان آ رہی ہیں میری خواہش ہے کہ ان کے سری لنکا سے پاکستان آنے پر ایک فلم ان کے ساتھ کروں۔ لہذا آپ جلد از جلد مجھے کوئی ریڈیو میڈیا سکرپٹ بنادیں تو میں نے کہا۔
 ”اس وقت تو دبیز ہی کے چرچے ہیں۔ آپ کو یہی لکھ دیتا ہوں اس پر نذر شباب بولے۔“ شاہ جی! دبیز تو ابھی سینماؤں میں چل رہی ہے۔ اس پر میں نے کہا۔

دہلیز والی کہانی ہے۔ یہی ہوا بہت کم لوگ جان سکے کہ دہلیز اور بوبی ایک ہی کہانی پر مبنی ہیں۔ کیونکہ بوبی میں محمد علی کا کردار اور دیگر چیزوں نے بوبی کو ایک جداگانہ رنگ دے دیا تھا۔

محمد علی کے علاوہ سنے اداکاروں پر بھی میں نے خوب محنت کی میری ایک فلم تھی ”ہم سے بڑا زمانہ“ اس میں شیوا والا کردار میں نے جاوید شیخ کے لیے لکھا تھا۔ اس فلم کا تمام پونٹ کمٹنڈ و پینچ گیا تھا لیکن جاوید شیخ نہیں پہنچے۔ جاوید فاضل صاحب غصے کے بہت تیز تھے۔ انہوں نے کہا کہ جاوید شیخ کو چھوڑ دیں۔ ہم یہاں نیپال سے ہی اس کردار کے لیے کسی آرٹسٹ کو لے کر کام چلا لیتے ہیں۔ اس پر میں نے بھی انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ فلم کا اہم ترین کردار ہے اور یہ لکھا ہی جاوید شیخ کے لیے کیا ہے۔ قدیم خان صاحب نے بھی کہا کہ جب تک ہم دوسرے فنکاروں کا کام کا شوث کر لیتے ہیں۔ مگر جاوید فاضل صاحب کسی کی بات ماننے پر تیار نہ تھے۔ انہیں جاوید شیخ پر بہت غصہ تھا۔ انہوں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے پھر میں یہ فلم چھوڑا ہوں۔“

جاوید فاضل صاحب کے غصے کے آگے سب کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور ہم نے نیپالی نوجوانوں کے آڈیشن شروع کر دیے۔ مجھے یاد ہے، نوجوانوں کی ایک لمبی قطار آڈیشن دینے کے لیے کھڑی تھی۔ قطار کے درمیان میں کھڑے شیوا پر جیسے میری نظر پڑی مجھے یہ نوجوان سر پہ پاؤں تک مکمل قمی لگا اور میں قطار کے درمیان سے اس نکال لایا۔ اور یوں ہم سے بے زبانہ میں ہم نے شیوا کا سٹ کر لیا۔ قارئین کرام! اگر آپ نے قلم دیکھی ہے آپ کو یاد ہوگا کہ شیوا عظیم صاحب کے ساتھ اداکارا کرتے ہوئے کافی آگے کل گیا تھا۔

بالکل اسی طرح ”چیف صاحب“ میں جاوید شیخ نیلی والے کردار کے لیے پہلے مائتہ نور کو کاٹ کیا تا بعد میں یہ کردار نیلی سے کرایا۔

فاصلے پر ٹھوکر نیاز سے تقریباً 10 کلومیٹر آگے از میرٹھ ان میں ایک۔۔۔۔۔ شاعر اور عالی شان گھر سائنہ کو بنوا کر ہے۔ گھر اپنی طرز تعمیر کے حوالے سے سید نور کی ذہانت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس پورے گھر کو شاہ جی نے خود ہی ڈیزائن کیا ہے۔ اس گھر میں ان دونوں کا بیڈ روم بھی تخلیق کا بہترین نمونہ ہے۔ بیڈ روم کے ساتھ سائنہ نور کا ڈریسنگ روم ہے جس میں درجنوں الماریاں ہیں اور الماریوں میں سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں ان کے ڈریسز ہیں۔ پورے پاکستان میں اتنا وسیع ڈریسنگ روم شاید ہی کسی اور فنکارہ کا ہو۔ ڈریسنگ روم کے ساتھ ایک جدید جم بھی ہے۔ جس میں دنیا بھر کی جدید ترین ایکسرسائز مشینیں موجود ہیں۔ گھر کے اوپر والے حصے میں بنائی گئی آگھی ہے۔ اس آگھی کو بھی بہت ہی خوبصورت انداز میں ڈیزائن کیا گیا ہے۔ شاہ جی کے بقول اس پورے گھر کو انہوں نے خود ہی ڈیزائن کیا ہے اور ابھی چند روز قبل ہی وہ لوگ یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔

سید نور گھر سامنے کے لیے گھبراتے ہوئے کہا: ”مگر یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنی پہلی بیوی رخسانہ کو بھی شادی سے پہلے لاہور کے اقبال ٹاؤن میں ایک کوٹھی بنا کر دی تھی۔ ٹھیک ہے وہ اس نوع کی نہیں تھی جیسی صائمہ نور کی ہے۔ وقت کی بات ہے۔ وہ شاہ جی کا اور دور تھا۔ اب ان کا اور دور ہے۔ وہ رخسانہ نور تھی، اہل قلم تھی، صائمہ نور ہے، ایک پیرا اشارہ ہے۔“

مہمانوں نے شاہ جی سے پوچھا آپ کی ایک دو نہیں بلکہ درجنوں کھسی ہوئی ایسی فلیس ہیں جنہیں پڑوسی ملک نے کاپی کی۔ جسے دہلیز پر انہوں نے "اوٹو نیچے لوگ" بنائی مکران کی فلم دہلیز کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکی۔

شاہ جی بولے۔ ”دلہیز کا پورا اسکرپٹ سلی آغا ٹیڈا لے کر گئی تھیں۔ یوں سمجھیں میرے ہی کلمے اسکرپٹ پر قلم تیار کی گئی ہے۔ دلہیز اصل میں ایک انگلش ناول کی کہانی پر ہے اور اس ناول پر دلہیز سے قبل انڈیا میں دو فلمیں ”ہانچل“ اور ”بدلاوا“ بنائی جا چکی تھیں۔ مگر انہیں بھی وہ کامیابی نہ مل سکی جو ہماری قلم دلہیز کو ملی۔ دلہیز ہی نہیں، بلکہ اسی ناول پر سپر ہٹ فلم ”بونی“ بھی نکلی اور دونوں ہی فلموں نے ڈاسٹن جو جلی کا اعزاز حاصل کیا۔ جن دنوں دلہیز کا میانی سے زیرِ نمائش تھی نذرِ شباب مرحوم میرے پاس آئے اور کہا کہ آئندہ ماہ سیتہ

پنجابی زبان کی یہ تینوں ہی فلمیں آپ کی اور صائمہ جی کی نئی صلاحیتوں کی ایک اعلیٰ مثال ہیں۔ آپ کو ذاتی طور پر ان تینوں میں کون سی فلم زیادہ پسند ہے، ”مہمانوں میں سے ایک نے پوچھا۔

تینوں ہی وہ فلمیں ہیں جنہیں ایک دوسرے سے کبیر کرنا کسی طور پر بھی مناسب نہیں۔ تینوں ہی اپنی اپنی جگہ خوب سے خوب تر ہیں۔ لیکن جہاں تک میری پسند کا تعلق ہے مجھے ذاتی طور پر ”مہندی والے ہتھ“ بہت زیادہ پسند ہے۔ شاہ جی نے کہا تھا کہ صائمہ بول اٹھی۔

”مجھے ان سب سے زیادہ ”ڈاکورانی“ پسند ہے۔“
”ڈاکورانی میں آپ نے دونوں ہاتھ چھوڑ کر گھوڑا دوڑایا تھا۔ اس کی تعریف نہ کرنا بددعوتی ہوگی۔“

”ڈاکورانی کا یہ سین جب میں شوٹ کر رہا تھا اور اچانک سیم (صائمہ) نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر شارٹ دیا تو میں گھبرا گیا کہ شاید گھوڑا بدمعاش ہو گیا ہے۔ یا سیم کو کوئی مسئلہ ہو رہا ہے۔ میں نے فوراً کٹ کی آواز لگائی اور سیم کی جانب دوڑا تو انہوں نے بڑی مصومیت سے پوچھا۔

”شات آپ نے لے لیا؟“

میں نے کہا نہیں، میں تو گھبرا گیا تھا تو سیم نے کہا کہ سین میں ریٹش کے لیے میں نے خود دونوں ہاتھ بلند کر کے گھوڑا دوڑاتے ہوئے یہ شارٹ دیا تھا۔ (یہ بات قابل ذکر ہے کہ شاہ جی، صائمہ کو پیار سے سیم کہہ کر مخاطب کرتے ہیں) ڈاکورانی میں سیم کو بہترین اداکارہ کا قومی ایوارڈ بھی ملا تھا۔ لیکن ان کی عجیب طبیعت ہے، آپ نے دیکھا ہو گا یہ کبھی بھی نہ کسی ایوارڈ شو میں یا دیگر تقریبات میں جاتی ہیں نہ کسی کو انٹرویو دیتی ہیں۔ نہ کسی سے زیادہ بات چیت کرتی ہیں۔ بس اپنے کام سے کام رہتی ہیں۔ مجھے بے حد حیرت ہے کہ آج یہ اتنے اچھے موڈ میں اور اتنا فریڈیل آپ لوگوں سے خوب باتیں کر رہی ہیں۔

(صائمہ، شاہ جی کے بازو میں اپنا ہاتھ ڈالے ان کے کندھے پر سر رکھے بڑی مصومیت سے اپنے بارے میں ان کے یہ محسوس کر رہی تھیں)

شاہ جی نے ڈاکورانی کے حوالے سے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”جس روز قومی ایوارڈ کی تقریب تھی میں نے سیم کو سختی سے تاکید کی کہ یہ تقریب ضرور اینڈ کرنا۔ یہ تمہارے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ ایوارڈ اپنے ہاتھ سے وصول کرنا تو مجھے اس نے بڑی محبت سے کہا۔ ہاں میں

ہوایہ تھا کہ جن دنوں جاوید شیخ ”چیف صاحب“ شروع کر رہے تھے ان دنوں نیلی اور جاوید شیخ میں اختلافات چل رہے تھے۔ جاوید شیخ نے اس فلم کی بیرون ملک شوٹنگ پر جانے کے لیے، صائمہ کو راک پاسپورٹ بھی لے لیا تھا اور فیل کو لاک ڈر۔ یس کے لیے باپ بھی لے گئے تھے۔ مگر کچھ دنوں بعد پتا چلا کہ جاوید شیخ نیلی کو لے کر اپنے پورے یونٹ کے ساتھ ترکی چلے گئے ہیں۔ انہوں نے صائمہ کو بتانا تو درکنار پاسپورٹ تک واپس دے کر نہیں گئے۔ کیونکہ ان کی نیلی سے صلح ہو گئی تھی۔ یہ واقعہ بالکل دیا ہی تھا جیسے گھونگھٹ میں نیلی کی جگہ صائمہ آگئی تھی۔

”سلطان راہی کی وفات کے بعد صائمہ بالکل فارغ تھی۔ گھونگھٹ میں پہلے نیلی کو کاسٹ کیا گیا تھا۔ مگر اللہ جانے کس بنا پر نیلی سے جاوید شیخ کی نہ بین سکی تو شہزاد رفیق صائمہ کے پاس آئے اور کہا کہ آپ میری فلم ”گھونگھٹ“ میں کام کریں۔ ان دنوں صائمہ کو اردو فلم کرنا کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ٹھیک ہے آپ اپنے اسٹوری رائٹر کو کہیں کہ وہ آکر میرا کردار سنائے۔ اگر مجھے سمجھ آیا تو کر لوں گی۔ شہزاد صاحب نے جب یہ بات بتائی تو سید نور غصے میں آگیا۔ میں نے کہا کہ میں نے کبھی ندیم صاحب کو جاکر اسٹوری نہیں سنائی۔ میں اس کل کی لڑکی کو جاکر اسٹوری سناتاؤں گا؟“

بہر حال ان دنوں صائمہ کو کام کی ضرورت تھی۔ اس نے شہزاد رفیق کے کہنے پر فلم سائن کر لی۔ اس فلم میں اس کا ایک مختصر سا کردار تھا۔ وہ اپنے کردار کے حوالے سے کوئی بھی بات کرتی یا اپنا کوئی مسئلہ ڈسکس کرتی تو میں جھنجھلا کر کہتا۔ ”آپ کی جو بھی شکایت ہو، جو بھی مسئلہ ہو۔ آپ پروڈیوسر سے کہا کریں۔ جس پروہ شہزاد صاحب سے بولی۔ سیٹ پر ڈائریکٹر ہوتا ہے پروڈیوسر نہیں۔ میں کہاں ہار ہا آپ کو حوصلہ دینی مجھوں کی۔ لہذا میں آپ کے ڈائریکٹر کے ساتھ کام نہیں کر سکتی۔“

شہزاد صاحب نے اسے سمجھا بجا کر رام کیا۔ پھر جب اس نے فلم کا پہلا شارٹ دیا تو اس کی پر فارمنس دیکھ کر حیرت میں مبتلا ہو گیا۔ اور پھر میرا کارڈ میرے ساتھ خاصا بہتر اور دوستانہ ہو گیا تھا۔ اور اس کے بعد پر فارمنس کو دیکھتے ہوئے اس فلم میں مختصر کردار کو مزید بڑھا دیا۔ شاہ جی نے مکرراتے ہوئے کہا۔

”شاہ جی! چوڑیاں، مہندی والے ہتھ، اور بھاجن،

پھر میرے ذہن میں ایک بجلی سے کوئری کہیں یہ ایک شادی شدہ اور بال بچے دار خاتون کے حق پر ڈاکا ڈالنے کا احساس تو نہیں؟ شاید..... شاید..... شاید ایسا ہی ہو۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ رخسانہ نور جس طرح اس صدمے سے بیمار ہوئیں اور جس طرح اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ یہ بے حد تکلیف دہ واقعہ ہے۔ اس وقت شاید صائمہ کو بھی اس سنگینی کا احساس نہیں ہوگا۔ لیکن بعد میں دوسروں کی طرح وہ بھی اس بارے میں سوچنے لگی ہوں کہ انہوں نے حقیقتاً بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ شاید اس کا بھی کسی کے سامنے اظہار نہ کیا ہو۔ لیکن اندر سے یہ احساس انہیں ہمیشہ کچھ لگا تار رہتا ہو۔

شاہ جی کی بات ابھی ختم ہوئی تھی کہ صائمہ کے ہمراہ گھر کا ملازم چائے کی ٹرائی لے کر داخل ہوا۔ صائمہ جی نے سب لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے چائے پیش کی۔

ذرا دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد موضوع بدلے ہوئے ایک مہمان نے شاہ جی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ شاہ جی! ”چمن آئے نہ“ کی ہیر وئن کو لوگوں کی طرف سے سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟“

بات دراصل یہ ہے کہ جب مجھے پتا چلا کہ وہ کراچی میں کام تلاش کرتی پھر رہی ہے تو میرے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ اس فیملی کی لڑکی جس فیملی کے ہماری فلم انڈسٹری پر بہت احسانات ہیں۔ محترمہ صبیحہ خانم کی نواسی اور پھر سب سے بڑھ کر میرے استاد محترم سید سلیمان صاحب کی بھی وہ نواسی ہی ہیں تو میں نے انہیں فون پر ہی اپنی فلم کی ہیر وئن سائن کر لیا۔ مجھے آج بھی اپنے اس فیصلے پر کوئی شرمندگی یا ندامت نہیں ہے۔ لوگوں کا کام باتیں کرنا ہے سودہ ہر حال میں کرتے رہیں گے۔ تیسری اس فلم پر تو زیادہ تر ان لوگوں نے تنقید کی جنہوں نے یہ فلم دیکھی ہی نہیں۔

شاہ جی بول چلے تو ایک پرستار نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”بلاشبہ شاہ جی کی یہ بات سو فیصد درست ہے کہ اس فلم پر تنقید کرنے والوں میں ان لوگوں کی اکثریت شامل ہے جنہوں نے یہ فلم دیکھی ہی نہیں ہے۔ اور پھر ان کے حقائق میں اس فلم کی آڑ لے کر نہ جانے کیسے کیسے گھٹیا الزامات شاہ جی پر لگائے۔ وہ یہ بھول گئے کہ یہ وہی سید نور ہیں جنہوں نے ہمیشہ اس ڈوبتی ہوئی فلم انڈسٹری کو اپنی محنت اور لگن سے قسم، سگم، سرگم، جیوا، گھونگھٹ، چور چائے شور، چوڑیاں، ڈاکو رانی، مہندی

ضرور جادو کی۔ بس آپ میری سیٹ روک کر رکنا۔ میں آ جاؤں گی۔ میں تقریب کے دوران ان کا انتظار کرتا رہا۔ دوسرے ایوارڈ کے بعد جب بہترین اداکارہ کا ایوارڈ اناؤنس کیا گیا تو اس کو وصول کرنے کے لیے مجھے اسٹیج پر بلایا گیا۔ اور میں نے ان کا وہ ایوارڈ وصول کیا۔ یہ تقریب بی بی وی ٹیوڈیکھار ہاتھا۔ میں یہ تقریب اسٹیج کر کے جب گھر پہنچا تو دیکھا کہ یہ ملازمہ سے اپنے سر میں تیل لگوا رہی ہیں۔ مجھے بہت غصہ تھا۔ میں نے کہا۔ تم نہیں آئیں یا ایوارڈ شو میں۔ تو وہ بڑی معصومت سے بولی کہ میں بی بی وی پر یہ ساری تقریب دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنے غصے کا اظہار اس طرح کیا کہ وہ یہ ایوارڈ آج تک انہیں نہیں دیا اور ان کا وہ ایوارڈ آج بھی میں نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔“

اس اثنا میں صائمہ نور ایک دم کھڑی ہو گئیں اور پولیس۔ ”ناشتے کو کافی دیر ہو گئی ہے۔ میں آپ سب کے لیے اچھی کچل چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

ایک پرستار نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”صائمہ جی! ایک بڑی فنکارہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دیندار خاتون بھی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار شب معراج کے موقع پر سعودیہ نے ان کی لاکھ تیل کیں لیکن ان کا موقف تھا کہ۔ ”آج بڑی رات ہے۔ لہذا میں کام نہیں کروں گی۔“

”ہاں سعودیہ نے مجھے بھی فون کر کے کہا تھا کہ آپ کسی طرح صائمہ کو راضی کر لیں۔ میرا صرف ایک سین رہتا ہے۔ کل شان ملک سے باہر چلا جائے گا اور کافی عرصہ بعد واپسی ہوگی۔ میں نے بھی سیم کو سمجھانے کی بہت کوشش کی اور کہا کہ یہ کوئی گانا یا ڈانس وغیرہ کی شوٹنگ نہیں ہے صرف ایک سین رہ گیا ہے جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن سیم کا ایک ہی جواب تھا کہ یہ عبادت کی رات ہے اور اس رات میں میں ایسا کوئی کام نہیں کر سکتی۔ شاہ جی اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولے، ایک بار آدمی رات کو میری آنکھ مٹی کی مجھے سسکیوں سے کسی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ میں ہلڑ ہوا کر اٹھ بیٹھا تو دیکھا۔ سیم جاگے نماز پر بیٹھی رو رو کر اور گڑ گڑا کر اللہ کے حضور اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہی ہے۔ واضح رہے کہ سیم بڑی باقاعدگی سے ہمیشہ نماز پنج گانہ کا اہتمام کرتی ہے۔“

میں یہ واقعہ پڑھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ ”یہ کون سے گناہ ہیں جن کی معافی صائمہ نور رو رو کر اللہ سے مانگتی ہیں؟“

کینسر کے پھیلاؤ کی عکس بندی

جسم میں کینسر کے خلیوں کی نقل و حرکت کو جاپان میں ویڈیو کے ذریعے عکس بند کیا گیا ہے۔ اس ویڈیو میں جسم کے عام خلیوں کو بزرگ میں اور کینسر زدہ خلیے سرخ رنگ میں دکھائے گئے ہیں۔ یونیورسٹی آف ٹوکیو اور رین کوانٹیٹو بائیولوجیکل سینٹر کا کہنا ہے کہ اس ٹیکنالوجی کی مدد سے اس مہلک عمل کی وضاحت ہو سکے گی۔ اس تحقیق کے دوران چوہے کو استعمال کیا گیا ہے تاہم یہی طریقہ جلد ہی انسانوں کے علاج کے لیے استعمال کیا جاسکے گا۔ کینسر کے جسم میں پھیلنے کے عمل کو میناٹسس کہتے ہیں۔ کینسر کے پھیلنے سے پہلے ہی کینسر کو روکنا آسان ہوتا ہے لیکن اگر یہ پھیل جائے تو پھر کنٹرول بہت مشکل ہے۔ کینسر کا پھوڑا خود تو بڑھتا ہی ہے لیکن اس کے کچھ حصے الگ ہو کر جسم میں خون کے ساتھ گردش کرتے ہیں اور مزید جگہوں پر کینسر کے خلیے بن کر زخم بناتے رہے ہیں۔ تجربے کے دوران ڈاکٹرز نے چوہے کے جسم میں کینسر کے ٹشوز ڈالے۔ اس کے بعد اس بیماری کے پھیلاؤ کو جانچنے کے لیے ایسے کیمیائی مادے اس کے جسم میں ڈالے جس کی مدد سے چوہے کے جسم کے اندرونی اعضا بہت زیادہ شفاف ہو گئے۔ اور کینسر کے خلیوں کی شناخت ہو سکی۔ سیل رپورٹ نامی جریڈے میں شائع تحقیق میں کینسر کے خلیوں کی پھیپھڑوں، آنتوں اور جگر میں پھیلاؤ کی تفصیل شامل کی گئی ہے۔ تحقیق میں شامل ڈاکٹر کوہی میازو کو کا کہنا تھا، کینسر کے بیشتر خلیے دوران سفر مر گئے لیکن کینسر نے ان کے دوبارہ بڑھنے کے لیے پھر سے کیمیائی سنگنز بھیجنا شروع کر دیے۔ محققین نے ان میں سے ایک کے اثرات کو بھی پرکھا جسے ڈی جی ایف بیٹا، کہا جاتا ہے اور دیکھا کہ یہ ڈرامائی انداز میں بہتر ہوا اور پھیپھڑوں میں کینسر کے خلیوں کی کالونی بنادی۔ خیال کیا جا رہا ہے کہ اس ٹیکنالوجی کو خود بخود ٹھیک ہو جانے والی بیماریوں سمیت کئی دوسری بیماریوں کے لیے بھی استعمال کیا جاسکے گا۔

مرسلہ: وارث علی، ملتان

والے ہتھ، دیوانے تیرے پیار کے، دوپٹا چل رہا ہے۔ اور مجاہد جیسی سپر کلاس فلمیں دسے کر فلم انڈسٹری کو سہارا دیا۔ ان کی ایک فلم کی ناکاوی پر سوشل میڈیا پر ان کے خلاف جس طرح داویلا چھایا گیا وہ بے حد شرمناک ہے۔ انہیں اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ شاہ جی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے اس انڈسٹری سے ساری زندگی جو کمایا وہ اسی انڈسٹری پر لگایا ہے۔ آج بھی ”بھرا گون“ فلم اکیڈمی اور ان کی پروڈیوس کردہ فلمیں اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

قارئین! بھینا اس بات کا انتظار کر رہے ہوں گے کہ اب تک رخسانہ نور کے بچوں کا ذکر نہیں آیا تو آخر... میں ان کا ذکر بھی کر دوں۔

آج سے دس سال پہلے جب صائمہ نور نے سید نور سے ہونے والی شادی کو دو سال تک خفیہ رکھنے کے بعد اس کا اعلان کیا تھا تو وعدہ کیا تھا کہ میں شاہ جی کی مریدی بن کر رہوں گی۔ رخسانہ نور کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح رکھوں گی۔ بیٹیوں کو اپنے ہاتھ سے رخصت کروں گی اور ظل شاہ کے سر پر سہرا سجاؤں گی۔ ہو سکتا ہے انہیں اسی وقت یہ احساس ہو گیا ہو کہ یہ کام رخسانہ نور کی بجائے ان ہی کو کرنا پڑے گا۔

آج سے کوئی تین سال پہلے کی بات ہے۔ یعنی 2014ء کو جب رخسانہ نور حیات تھیں اور امریکا میں تھیں۔ ان ہی دنوں کی بات ہے۔ ایک مستند صحافی نے شاہ جی سے ان کے بچوں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا۔ میری تین بیٹیاں اپنے شوہروں اور بچوں کے ساتھ امریکا، برطانیہ اور جاپان میں ہیں۔ خیر سے نا بھگی بن چکا ہوں۔ وہ مجھ سے ادب اور پیار سے ملتے ہیں میں خود بھی ان سے ملنے جاتا ہوں۔ جبکہ میرا بیٹا ظل شاہ آج کل لاہور میں ہے اور میرے ساتھ ہی شاب اسٹوڈیو (بھرا گون) ... میں کام کرتا ہے۔ لوگ باتیں بناتے ہیں کہ میں نے 50 برس کی عمر میں صائمہ کے ساتھ شادی کر کے اپنی پہلی بیوی اور بچوں کو رلا لیا ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ سلطان راہی کی نگاہانی موت کے بعد لوگوں نے صائمہ کو سلطان راہی کی بیوہ قرار دے دیا تھا بے جاری کاکیر تیر جاہ ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ عدت کے دن گزار رہی ہے۔ انہی دنوں میں نے صائمہ کو اپنی فلم ”گھونگھٹ“ میں بالکل ایک نئے انداز میں متعارف کرایا۔ اردو زبان کی فلم میں صائمہ کے اس نئے روپ کو دیکھ کر فلم بین حیران رہ

مئے۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں خود صائمہ کے دام عشق میں پھنس گیا ہوں۔ آپ یقین کریں جب میں نے صائمہ سے پہلی بار اظہار محبت کیا۔ وہ ایک باشعور لڑکی تھی اور ٹاپ کی ہیر و رنگ وہ خود دل ہی دل میں مجھے آئینہ دل شوہر حلیم کر چکی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

کریں میں نے بڑی..... عمر کے قصے سے شادی کر کے دس سال کا عرصہ گزاردیا اس کے باوجود خوش ہوں۔ وہ ہم دونوں کے ساتھ مساوی سلوک کرتے ہیں جو ان کی شخصیت کے حوالے سے میری نظر میں کافی ہے۔“

غلطیاں جنگ کے میدان کی

ہلکر کے بارے میں سب ہی جانتے ہیں کہ وہ کیسا آدمی تھا۔

یہ کہنا بالکل درست ہے کہ جو جتنا بڑا انسان ہوتا ہے۔ اس کی حماقتیں بھی اتنی ہی بڑی ہوتی ہیں۔ ہٹلر نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ اس نے روس کو فتح کرنے کی پلاننگ کی اور فوجوں کو روس کی طرف روانہ کروایا۔ بہت زبردست فوج تھی۔ اور یہ جذبہ بھی تھا کہ ہر حال میں فتح حاصل کرنی ہے۔ لیکن تاریخ کی ایک بہت بڑی غلطی سرزد ہو چکی تھی۔ ایک تو سردی کا موسم۔ اور وہ بھی روس کی سردی۔ ان بے چاروں کو موسم گرما کی دریاں پہنا کر بھیج دیا گیا تھا۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ ایسی فوج کا کیا انجام ہوگا۔ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ پوری فوج سردی سے شہر کر رہ گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں فوجی ہلاک ہو گئے۔ اور فتح جانے والوں کا دشمنوں نے صفایا کر دیا کچھ غلطیاں ایسی بھی ہوتی ہیں۔

مرسلہ: نیاز کوکوسو، لبیلہ

یورپ میں ایک جنگ بہت مشہور ہوئی۔ یہ جنگ Agin court کی جنگ کہلاتی ہے۔ یہ جنگ فرانس اور برطانیہ کے درمیان ہوئی تھی۔ اس جنگ کا دل چپ پہلو یہ ہے کہ فرانس والوں کو عددی لحاظ سے فوقیت حاصل تھی۔ اس کے باوجود وہ بری طرح ہار گئے۔ اس ہار کی وجہ بھی بہت دل چپ تھی۔ فرانس کی فوجوں کے لیے اسلحہ ڈیزائن کرنے والا ایک شخص تھا۔ جس نے اس زمانے کے لیے کام کیا اور تیر بنا کر دیے۔ ان کمائوں کی خاص بات یہ تھی کہ وہ کمائیں انسانی قد سے بڑی تھیں۔ اس ماہر اسلحہ ساز کا کہنا تھا کہ ان کمائوں سے چلائے ہوئے تیروں میں بہت فورس ہوتا ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ عین جنگ کے وقت ان کمائوں کو کھینچنا ہی مشکل ہو گیا۔ بے چارے فرانس فوجی کمائوں سے تیر چلانے کی کوشش ہی کرتے رہے اور برطانوی فوجوں نے انہیں تباہ کر دیا۔

مرسلہ: واجد الحسن، کراچی

نے ہٹ، سپر ہٹ فلمیں ماضی میں بنا کر دیں۔ اس وقت وہ سب خوش وگمانی دیتے تھے جب میں نے لگہ بچ کو کروڑ پتی فلسا بنادیا تو وہ کرڈٹ مجھے کوئی نہیں دیتا ہے۔ آپ کو چتا ہے، میری سپر ہٹ فلم ”چھڑیاں“ کا بجٹ صرف 55 لاکھ روپے تھا اور اس فلم نے 50 کروڑ روپے کا بزنس کر کے برصغیر کی سب سے زیادہ چلنے والی فلم کا اعزاز حاصل کیا۔ میری اس فلم سے فلسا کروڑ پتی بن گیا۔ میں نے بھی فلسا کی رقم ضائع نہیں کی۔ ہمیشہ بجٹ میں رہ کر فلم بنائی۔ ایورینو پکچرز کی ”دیوانے تیرے پیار کے“ اپنے دور کی ایک سپر ہٹ فلم تھی۔ مگر برادران نے مجھے مالی طور پر جو بجٹ دیا تھا میں نے اس سے کم میں یہ فلم بنائی۔ اس فلم کی کامیابی اور اسے پیش کرنے کے انداز کو شہزاد مگل اور سجاد مگل نے بے حد پسند کیا۔ اور مجھے انعام سے نوازا۔ میرے کرڈٹ میں فلم اٹھ سڑی کے زوال کے وقت چند فلمیں ہیں۔ میں نے جس طرح فلم مکمل کر کے فلسا زوں کی ضد کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا بچن چلایا۔ اس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ مگر یہ میری مجبوری تھی۔ کیونکہ ہمیں فلسا زوں اور سینا سرکٹ نے مجبور کیا کہ اس ٹائپ کی فلمیں بنادیں۔ مگر مجھے بعد میں اس کا احساس ہو گیا۔ اس لیے میں نے قومی زبان کی فلم ”جمور“ بنائی۔ مگر اس فلم کی ناکامی سے میں بے حد مایوس ہو گیا تھا۔ کیونکہ سینا گھروں کے مالکان نے نا انصافی کا مظاہرہ کر کے اس خوبصورت اور اعلیٰ معیار کی فلم کو ہمیشہ کے لیے فلاپ ڈیکلئر کر کے ڈیو میں بند کر دیا۔ جس کی وجہ سے میں مایوس ہو گیا تھا۔“

”فلمی دنیا آپ کی ناکامی کی وجہ صائمہ کو قرار دیتا ہے کہ آپ نے صائمہ کے عشق میں اپنی ذاتی زندگی اور فلمی زندگی... سے ایک بہت بڑا اجرا کھیلایا ہے۔ آپ کی پہلی بیوی رخسانہ نور اور آپ کے بیٹے آپ کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے ہرون ملک شفٹ ہو گئے۔“ ایک دہکتا ہوا سوال کیا گیا۔

”یہ ایک نیا الزام ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ نے اگر عشق کیا دوسری شادی کی ہے تو کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ جو میرا ذاتی معاملہ بھی ہے۔ مگر ہم چونکہ پبلک پراپرٹی ہیں، لوگوں کو بالکل یہ حق ہے کہ وہ ہمارے حوالے سے گفت و شنید کریں مگر خدا را جھ پر میری ذاتی زندگی کے حوالے سے اس طرح فضولیات پر مبنی من گھڑت باتیں نہ کریں۔ ایسے الزامات پر مجھے دکھ ہوتا ہے۔ مجھے پتا ہے کہ یہ آپ کا الزام نہیں ہے۔ آپ مجھ سے وہ سوالات پوچھ رہے ہیں جو الزام

میرے مخالفین مجھ پر لگاتے ہیں۔“ شاہ جی نے سنجیدہ انداز میں جواب دیا۔

”شاہ جی آپ پر ایک بڑا الزام یہ بھی ہے کہ آپ گزشتہ سات سال سے لابی ورڈ میں موجود ہیں مگر سوائے چند روایتی پنجابی فلموں کے عملی طور پر کچھ نہیں کر رہے ہیں، باضی میں آپ نے بے شمار سپر ہٹ فلمیں قومی زبان کی تخلیق کیں پھر کیا وجہ ہے کہ آپ ہر چھ ماہ بعد چند فلموں کے اعلانات کر کے ٹھنک جھڑوں میں ان رہنے کے لیے ڈراما کر کے غائب ہو جاتے ہیں؟“

”ایک اور الزام کا تیر چلا۔ میں نے کوئی سلیمانی ٹوپی نہیں پہنی ہے؟ میں روزانہ آپ کو اسٹوڈیو، وی کے ٹاک شوز، فلم دالوں کی تقریبات، سینیما گھروں میں نئی فلموں کے پریئر کے حوالے سے ہر جگہ نظر آتا ہوں۔ جہاں تک مجھ پر الزام ہے کہ میں گزشتہ سات سال سے کوئی فلم نہیں بنا رہا ہوں، مانا کہ میں نے اس عرصے میں کوئی گھونگٹ، جیوا، ڈاکو رانی، سرگم، سنگم، چوڑیاں، مجاجن کی طرح بڑی فلمیں نہیں بنائیں۔ مگر یہ الزام غلط ہے کہ میں محض اپنے آپ کو خبروں میں زندہ رکھنے کے لیے یہ کرتا ہوں۔ میں اس کی نفی کرتا ہوں۔ فلم انڈسٹری کے حوالے سے ہمارے ملک کی جو حالت ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ جب بول، وار، میں ہوں شاید آفریدی جیسی فلموں نے کامیابیاں حاصل کیں۔ میں نے سب سے پہلے ان فلموں کو ویکم کوریا اور بڑے فخر سے کہا کہ ان فلموں نے بھارتی فلموں کو شکست دے کر یہ ثابت کر دیا کہ ہماری قوم آج بھی ہماری فلمیں دیکھنے کی خواہش مند ہے۔ اسی اثنا میں نے ایک ساتھ تین قومی زبان کی فلمیں شروع کرنے کا صرف اعلان نہیں کیا بلکہ باقاعدہ پلان کیا ہے۔ ان فلموں میں ”پرائس آف آرز“، ”بھائی واہڈ“ اور ”فرسٹ لو“ شامل ہیں۔ ان تینوں فلموں کے موضوع ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ جو لوگ مجھ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ سید نور کو خبروں میں زندہ رہنے کے لیے شوٹے کا شوق ہے۔ ان لوگوں کو میرا یہ جواب ہے کہ مجھے ان ہتھکنڈوں کی ضرورت نہیں ہے۔ جو لوگ مجھے قریب یا دور سے جانتے ہیں ان کو پتا ہے کہ سید نور ان فضولیات سے بالاتر ہے۔ میں نے 21 سال کی عمر میں جس ماحول میں شب و روز کی جہد و جد کی آج 67 سال کی عمر میں پاکستان فلم انڈسٹری میں عزت و شہرت اور دولت بٹھائی ہے اس کے لیے میں اپنے رب کا شکر بجالاتا ہوں اور سال رواں میں میری پہلی فلم

عاشورہ کے بعد ”پرائس آف آرز“ ریلیز ہو رہی ہے۔ اس سال 2015ء میں مزید دو فلمیں ”بھائی واہڈ“ اور ”فرسٹ لو“ پیش کر دوں گا۔ آج کل ہماری پاکستانی فلمیں زبردستی کامیابی سے ہمکنار ہو رہی ہیں اور میں ایک بار پھر سنیما انڈسٹری کی طرح فلم انڈسٹری کی بحالی کے حوالے سے کام کر رہا ہوں۔ میری یہ پہلی جہد و جد کچھ حاسدین کو شاید ہنسم نہیں ہو رہی ہے۔ اس لیے اس قسم کے الزامات الیکٹرونکس پرنٹ میڈیا کے علاوہ موبائل SMS کے ذریعے پھیلا رہے ہیں مگر آنے والے وقت میں میرا کام دیکھ کر ان لوگوں کے منہ بند ہو جائیں گے۔“

دانش رخ رہے کہ یہ باتیں، یہ وعدے شاہ جی نے اپنے ایک انٹرویو میں 2014ء میں کیے تھے لیکن آج تین سال بعد یعنی 2017ء میں نہ ان کی فلم ”پرائس آف آرز“ ریلیز ہوئی ہے نہ ”بھائی واہڈ“ البتہ ”فرسٹ لو“ غالباً ”جین آف“ کے نئے نام سے پیش کی جا چکی ہے۔ مذکورہ پہلی دو فلمیں کیوں تاخیر کا شکار ہوئیں؟ کہیں اس کی یہ وجہ تو نہیں جو ان کے کچھ مخالفین ان پر الزام لگاتے ہیں کہ صاحبزادہ کی وجہ سے ان کی فلمی زندگی متاثر ہوئی ہے۔ اگر کچھ لوگ یہ کہیں کہ اس دوران شاہ جی نے اپنی زیر تکمیل فلموں کو مکمل کر کے سے زیادہ دیکھی اپنی تحقیقی بیرونی کے لیے شیش محل کی تکمیل میں لی۔ کہنے والوں کے منہ کون بند کر سکتا ہے۔ ہم تو شاہ جی کی طرف سے یہی جواب دے سکتے ہیں کہ کچھ فلم میکرز ایک فلم بنانے میں تین چار سال لگا دیتے ہیں۔ شاہ جی نے تو ایک فلم ریلیز کر دی ہے اور دو فلمیں 2015ء میں نہ لگا 2017ء میں ریلیز کر دیں گے۔

شاہ جی نے مزید کہا کہ یہ بھی مجھ پر ایک بڑا الزام ہے کہ میں کراچی کی فلموں کو سپورٹ نہیں کرتا۔ جتنا میں پاکستانی فلموں کو سپورٹ کرتا ہوں شاید ہی کوئی کرتا ہوگا۔ آپ اندازہ لگائیں میں اپنی فلم ”بھائی واہڈ“ کو گزشتہ مہینے کے حوالے سے پلان کر چکا تھا۔ مگر کراچی کے مسلم اور گل حمید بلوچ نے اپنی بیوی بخت کی قومی زبان کی ”سلطنت“ کو کنفرم کیا۔ جس کے لیے میں نے اپنی فلم نمائش ملتوی کر دی تھی اور اس سال عید الاضحیٰ کے موقع پر قومی زبان کی فلموں ”021“ اور ”نامعلوم افراد“ کے سینیماؤں کے حصول اور دیگر امور کے لیے میں نے ام آپ کو مصروف کر رکھا ہے۔ آپ کو معلوم ہے زیبا بختیاں فلم ایک بھارتی فلموں کے تقسیم کار کے پاس ہے مگر

نے کراچی، سندھ میں ماٹری والا گروپ کے نواب صاحب اور پنجاب سرکٹ کے لیے ہم دونوں کمر بستہ ہیں۔ مالانگہ ہماری دونوں فلموں کے مقابلے میں بھارت کی دو فلمیں ہیں مگر ہم گھبرانے والوں میں نہیں۔ ہماری فلمیں انٹرنیٹ کران کا مقابلہ کریں گی۔“

وہ جو کہتے ہیں کہ بات سے بات نکلتی ہے تو صحافی کی اہمیت کا ادراک اب دیتے ہوئے شاہ جی نے جن نواب صاحب کا والد، ابا، کی نواب صاحب نے مذکورہ صحافی اور سید نور کی گفتگو شنید سے چند روز پہلے شاہ جی کے اعزاز میں ”ایک نام سید نور کے نام“ ترتیب دی تھی۔ یہ نواب صاحب کوئی نواب نہیں، ماٹری والا انٹرٹینمنٹ (پرائیویٹ لمیٹڈ) کے ایگزیکٹو ڈسٹری بیوٹن ہیں۔ عرصہ پچاس برسوں سے انٹرنیٹ اور فلم انڈسٹری سے وابستہ ہیں اور ایک مستند اور کی حیثیت سے تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں سے قومی اخبارات اور فلمی جرائد کو ایک نئی جہت اور نئی مہم ہے۔ سابقہ سینما نشاط اور موجودہ انٹریم سینما کے علاوہ زیادہ پہچانے جاتے ہیں۔ سید نور سے ملنے اور نواب کو ملانے کی اس تقریب کو نام تو ”شام“ کا دیا گیا مگر مقامی صحافی نے تقریب کی 12 ستمبر 2014ء کی شام 5 بجے فلم ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی میں واقع الحاح بندو بازار کٹوران کی بالائی منزل میں ایئر کنڈیشنز مٹی ہال میں منعقد کی۔ سید نور کی فلم ”پرائس آف آرز“ کراچی اور حیرت کے لیے سامن کی تھی۔ یہ تقریب غالباً ہی خوش الحاح کے طور پر تھی۔ نواب صاحب نے سید نور کے ابا کی ترتیب دی تھی۔

اب مہمان خصوصی سے بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ابا نے بڑے دکھ کے ساتھ ایک ایسے SMS کا دل اکڑا کر کہا جو انہیں اسی دن 12 ستمبر کو ملا تھا۔ انہوں نے SMS کچھ یوں تھا، سید نور نے 1969ء میں ایس کے اسٹنٹ بین کراٹر مشری میں قدم رکھا۔ اب ان کو 70 سال ہے۔ سب سے زیادہ مسلسل 28 لاپ قلمیں دینے والے کو ”شوین“ کا لقب دیا گیا ہے۔ سب سے زیادہ کامیابی کا اسکور 100 ہے۔ جن کی دو قلمیں ناکام اور باقی سب کامیاب ہیں۔ جبکہ شباب کیرانوی کی ہر دوسری یا تیسری کامیاب ہوا کرتی تھی۔ شباب کیرانوی نے قلمساز، گار، رائٹر اور شاعر اور اسٹوڈیو آرز کے طور پر قلم

کچھ ایسی غلطیاں بھی ہوتی ہیں جن پر برسوں تک یقین رکھا جاتا ہے۔ یعنی وہ غلطیاں بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ اور یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ کوئی غلطی نہیں ہے۔ ایسی غلطیوں کی تعداد گرجہ بہت کم ہوتی ہے لیکن یہ غلطیاں بہت عظیم الشان قسم کی ہوا کرتی ہیں۔ اور ایسی غلطیوں میں پوری قوم جتلا ہو جاتی ہے۔ آئیں ہم آپ کو ایک ایسی ہی غلطی کے بارے میں بتاتے ہیں۔ یہ زمانہ ہے 1553ء کا۔ اس وقت اسپین میں فورٹین نام کا ایک آدمی ہوا کرتا تھا۔ وہ ایک ملاح تھا۔ اس نے کوئی جرم کیا تھا جس پر اسے قید کی سزا ہو گئی تھی لیکن وہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ ایک بحری جہاز چرا کر فرار ہو گیا۔

بہت دنوں کے بعد یہ جہاز کیلی فورنیا کے ساحل سے آگیا۔ فورٹین نے سمجھا کہ اس نے کوئی بہت بڑا جزیرہ دریافت کر لیا ہے۔ اپنی اسی ”دریافت“ پر فورٹین کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس نے فوری طور پر جزیرہ کیلی فورنیا کا ایک نقشہ بھی تیار کر لیا۔ کچھ دنوں کیلی فورنیا میں گزار کر وہ اسپین واپس آ گیا۔

ایک بہت بڑے جزیرے کی دریافت پر نہ صرف اس کی سزا معاف کر دی گئی۔ بلکہ اس کی نگرانی میں کیلی فورنیا کے ہزاروں نقشے بھی تیار کروائے گئے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ یہ غلطی پورے دو سو برسوں تک برقرار رہی تھی۔ اس دوران اسپین سے ہزاروں افراد کیلی فورنیا آئے لیکن کسی نے آگے جا کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ یہ علاقہ مکمل طور پر جنوبی اور شمالی امریکا سے ملا ہوا ہے۔ بہر حال اس غلطی کی اصطلاح 1776ء میں اس وقت ہوئی جب جان ڈی انزانے جا کر اصل صورتحال بتائی اور یہ کہا کہ کیلی فورنیا جزیرہ نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ نقشہ واپس لیے گئے جو دو سو برسوں تک رائج رہے تھے۔ دیکھیں تاریخ کی کیسی عظیم الشان غلطی ہے جو دو سو برسوں تک دہرائی جاتی رہی۔

مرسلہ: نگار و سیم، کراچی

کیپٹن جارج کسٹرنے امریکی قبائل پر چڑھائی کا ارادہ کر دیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ”بہادرو۔ یقین کرو کہ تم ان چند سو لوگ کو برباد کر کے رکھ دو۔ اور امریکہ کی تاریخ میں تمہارا نام ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے گا۔ جارج کسٹرنہ آدمی تھا۔ جسے صرف اس بات سے دلچسپی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا نام تاریخ میں مشہور ہو جائے۔ وہ جلد سے گزرے لوگ اشارہ کریں کہ وہ دیکھو امریکا کا بہادر انسان جارہا ہے۔ ایک شخص نے سوال کیا۔ ”کیپٹن کیا ہمیں قبائلیوں کی تعداد کا قلم ہے۔“

”ہاں۔ وہ تین چار سو سے زیادہ نہیں ہیں۔“ کیپٹن نے جواب دیا۔ لہذا تین چار سو کے چکر میں وہ لوگ قبائلیوں سے جا نکلے۔

اور جب ادھر ادھر کی جھاڑیوں سے ہزاروں کی تعداد میں قبائلی نکل نکل کر سامنے آنے لگے تو کیپٹن اور اس کے آدمیوں کے ہوش اڑ گئے۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ قبائلیوں نے انہیں چن چن کر مار دیا۔ یہ واقعہ 1876 میں پیش آیا تھا۔

مرسلہ: نعیم الدین، لیبیلہ بلوچستان سیزرینیٹ میں جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ یہ کہانی ہے روم کے مشہور کردار جو لیس سیزر کی۔ جب وہ دروازے تک پہنچا تو اس کی بیوی اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ ”نہیں سیزر۔ آج تم سینیٹ میں نہیں جاؤ گے۔“

”وہ کیوں؟“ سیزر نے پوچھا۔ ”میں نے تمہارے لیے ایک برا خواب دیکھا ہے۔“ اس کی بیوی نے کہا۔ ”خواب؟“ سیزر مسکرا دیا۔ ”کیوں ایسے واہموں کو ہونہ میں آنے دیتی ہو۔“

”نہیں سیزر۔ بہت ہی بھیاک خواب تھا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگوں نے تم پر حملہ کر دیا ہے۔“ لیکن سیزر نے اس کی بات نہیں مانی اور اس کا مذاق اڑاتا ہوا سینیٹ کے اجلاس میں چلا گیا اور وہاں اسے اپنی اس غلطی کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ اس پر حملہ ہوا۔ بہت سے لوگوں نے اسے گھیر کر مار دیا۔

مرسلہ: انعام حفیظ، نویسنده

اغڑشری کی بے پناہ خدمت کی۔ پرویز ملک اور شاپ کیرانوی کی بجائے سید نور کو ”شوشین“ کہنا کہاں کا انصاف ہے۔ سید نور تو فلم آئینہ کو چار سال نمائش پذیر رہنے والی فلم نہیں مانتے۔ صرف ایک صوبے میں کامیاب ہونے والی اپنی فلم ”عجاجن“ کو پاکستان کی سب سے زیادہ چلنے والی فلم قرار دیتے ہیں اور پے در پے 20، 25 فلاپ فلمیں دینا والے سید نور کو ”شوشین“ کہتے ہیں۔ کیا آئینہ کی بجائے ”عجاجن“ زیادہ چلنے والی فلم ہے؟

عشایے کے تمام شرکاء نے کھل کر اس مضحکہ خیز بھونڈے اور حید آمیز SMS کی خدمت کی جس کے بوا شاہ جی کا موڈ کسی قدر نارمل ہوا اور انہوں نے اس SMS کے جواب میں انتہائی عاجزی کے ساتھ گفت و گو کرتے ہوئے کہا۔ ”پرویز ملک اور شاپ کیرانوی تو میرے لیے ولی ہیں۔ میں ان کی خاک پا بھی نہیں۔ پرویز ملک صاحب کی پہل آپ دیکھیں۔ ٹھیک ہے میری ناکا فلمیں بھی ہیں میں مانتا ہوں مگر وہ فلمیں جو میری کہانیوں مکالموں اور اسکرین پلے کی وجہ سے سرہٹ ہوئیں۔ ان یہ لوگ کیوں بھول جاتے ہیں۔ سید سلیمان کا میں نوع اسٹنٹ سے لے کر سینڈ اسٹنٹ تک تھا۔ محمد جاوید فاضل بھی میرے ساتھ سلیمان صاحب کے چیف اسٹنٹ کرتے تھے۔ فاضل صاحب کی صائمہ، دلہیز، لازوال حساب اور کنڈن وغیرہ آپ سب کے سامنے ہے۔“

شاہ جی نے اپنی یادوں کی راکھ کریدتے ہوئے کہا ”میں جس زمانے میں ”سوسائٹی گرل“ کی کہانی پر کام کر رہا تھا۔ اس وقت میری عمر بیس ایس سال تھی۔ آغا حسا انتقال صاحب نے محترم حسن طارق کو جا کر بتایا۔ اچہ نو جوان جس کا نام سید نور ہے۔ ایسی کہانی لکھ رہا ہے جو آ کی قلم ”اک گناہ اور سبھی“ سے ملتی جلتی ہے بلکہ اس کی کا ہے۔ ایک دن ایورینو اسٹوڈیو کے فوارے پر حسن طار صاحب مجھے دیکھ کر برس پڑے۔ مجھے مغلظات بھی سنائیں جنہیں میں نے بڑی خندہ پیشانی سے سن لیا۔ حسن طار صاحب بے حد خفے میں تھے کہ میری قلم کو تم سوسائٹی گر کے نام سے لکھ رہے ہو۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ ا کے بعد میں سیف الدین سیف صاحب سے ملاں کو سنا بات بتا کر اپنی کہانی سنائی تو انہوں نے کہا صرف کچھ کہ صیائی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ باقی دونوں کہانیاں عفا ہیں۔ میں نے ان سے عرض کیا۔ حسن طارق صاحب جا

دہی: بڑھاپے کا سہارا

زیادہ عمر کے افراد میں ڈیری خوراک کے استعمال پر ہونے والی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ خوراک میں دہی کا زیادہ استعمال بڑھاپے میں کوئی بڑی کو مضبوط بناتا ہے۔ مرنے کی وجہ سے بڑھاپے میں اس بڑی کے ٹوٹنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اس سے بعض اوقات مستقل معذوری پیدا ہو جاتی ہے۔ دہی کے استعمال سے بڑھاپے میں بڑیوں کی کمزوری کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ یہ تحقیق آئرلینڈ کے دو تعلیمی اداروں کے اشتراک سے ہوئی ہے۔

مرسلہ: ہنسی عزیز مئے۔ لندن واہڑی

کردیا۔ سخت سردی کے دن تھے سلیمان صاحب کے پوچھنے سے پہلے اپنا اکلوتا سوسٹر اتارا اور کیلے فرش کی، رگڑ رگڑ کر اس سوسٹر سے صفائی کر دی۔ سلیمان صاحب میری اس حرکت پر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور کہا کہ میں نے ایسی deediction کسی اسٹنٹ میں نہیں دیکھی۔ نور! تم بہت آگے جاؤ گے۔“

اب کوئی بھی کام ہوتا تو وہ مجھے بلالیتے۔ پان کھانے کے وہ شروع سے شوقین تھے۔ پان مجھ سے منگواتے تو فوراً لاکر دیتا۔ ایک دفعہ انہیں پان کی طلب ہوئی۔ مجھ سے کہا کہ پان لاؤ۔ تو میں نے جھٹ جیب سے پان نکال کر پیش کر دیا۔

سوسائٹی گرل کے زمانے میں کہانی سنانے طیب حسین زیدی کے گھر گیا تو سگیتا دروازے کی اوٹ سے چلی کہانی سن رہی تھی۔ زیدی صاحب نے کہا۔ کیوں نہ اس قلم کو جعفر شاہ بخاری سے بنوائیں۔ لہذا ایک دن زیدی صاحب مجھے ساتھ لے کر جعفر شاہ بخاری کے گھر پہنچ گئے۔ کہانی انہوں نے سنی تو کہا۔ ”یہ تو بہت bold سبکیٹ ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کال گرل پیسے لے کر آجائے اور اس کے ساتھ کچھ ہو بھی نہ۔ ہم بخاری صاحب کے گھر سے واپس آئے تو یہ طے ہوا کہ سگیتا بیگم سوسائٹی گرل کی ڈائریکشن دیں گی اور میں ان کو اسٹ کروں گا۔ اور آپ سب نے دیکھا کہ سوسائٹی گرل نے کیا رزلٹ دیا۔ اتفاق سے میری یہ قلم اور حسن طارق کی ”اولاد“ ایک ہی دن ریلیز ہوئیں۔ اولاد و فلاپ ثابت ہوئی اور سوسائٹی گرل کو کامیابی

آپ کا بے حد احترام کرتے ہیں لہذا آپ سے درخواست ہے آپ ان کی غلط فہمی دور کر دیں۔ اس طرح حسن طارق کا فہم کا فور ہوا۔“ یہ واقعہ سنا کر شاہ جی نے ایک لمبی سانس لی پھر بولے۔ ”دوستو اور ساتھیو! میں بے حد صابر و دشا کر بندہ ہوں۔ خیر سے 64 برس میری عمر ہوئی ہے۔ میں کسی کی بات کا برا نہیں مانتا مگر اس SMS سے مجھے دلی دکھ ہوا ہے۔“ پھر انہوں نے پانی کے چند گھونٹ پینے کے بعد کہا۔ جب حسن طارق کی کچھ فلمیں فلاپ ہوئیں تو انہوں نے مجھے اپنی سپر ہٹ فلم ”سنگدل“ کی کٹھالی مکا لے اور اسکرین پلے لکھنے کے لیے بلایا۔ میں سید نور بن کر ان کے پاس گیا۔ میں بھول چکا تھا 1971ء کے اوائل میں ہونے والے واقعات کو۔ سنگدل ہٹ بلکہ سپر ہٹ ہوئی۔ کامیابی کی خوشی میں حسن طارق نے چند دوستوں کو اپورینو اسٹوڈیو میں واقع اپنے آفس میں مدعو کیا۔ مجھے بھی بلایا تھا۔ میں پہنچا تو اٹھ کر گئے لگا یا اور یہ ملا کہا۔ ”یہ ہے میری قلم سنگدل کا رائٹر سید نور۔“ اللہ انہیں عزیق رحمت کرے۔

شاب کیرانوی صاحب نے بھی مجھ سے کہانی لکھوانی چاہی اور دس ہزار روپے مجھے ایڈوانس بھی دیے۔ جو میں نے شکریہ کے ساتھ واپس کر دیے کہ وہ میرے دلی تھے۔ بزرگ تھے۔ بد قسمتی کہ وہ جلد دنیا چھوڑ گئے۔ آج الحمد للہ میں ان کے شاب اسٹوڈیو کا آرمیوں جہاں پیراگون فلم اکیڈمی بھی فعال ہے۔ SMS..... جس نے بھی بتایا وہ بھول گئے۔ ”ہم سے ہے زمانہ“۔ ”بولی“۔ ”مس سنگاپور“۔ ”نچر“۔ ”روبی“۔ ”فیملہ“۔ ”فقیر یا“۔ ”بلندی“۔ ”خند“۔ ”آدمی“۔ ”پھول“۔ ”خشل“ اور بہت سی فلموں کو کامیابی ملی؟ جن کا مصنف میں ہوں۔

میں غریب گھرانے کا فرد تھا۔ 70 سال کی دہائی میں۔ میں اکثر پیدل اپنے گھر واقع مینلو وارڈ سے اسٹوڈیو جاتا تھا۔ میں خواب بنا کر تھا۔ سید سلیمان میرے محسن ہیں۔ ان کے ساتھ 18 فلمیں اسسٹ کیں۔ ایک دفعہ ”میری صورت میری آنکھیں“ کے سیٹ پر کام ہو رہا تھا۔ ٹھہر دیا کہ ساتھ والے فلور پر ”تاج محل“ کے سیٹ پر جا کر SWEEPEN کو بلا کر لاؤ اس سے فرش کی صفائی کرائی ہے۔ میں فوراً دوڑ کر گیا تو سوچر وہاں کام میں مصروف تھا۔ اس نے آنے سے انکار کر دیا۔ میں واپس آ گیا۔ سلیمان صاحب نے پوچھا۔ سوچر کیوں نہیں آیا؟ جاؤ اسے لے کر آؤ۔ میں پھر تاج محل کے سیٹ پر گیا تو سوچر نے پھر انکار

نصیب ہوئی۔ سوسائٹی گرل کے بعد تو اللہ کی کرم نوازی ایسی ہوئی کہ میں نے بیک وقت بیس بیس اسکرپٹوں کو پانچوں کی طرح لکھا۔ بس خبر کی امید رکھنی چاہیے کیونکہ کبھی کبھی چوٹی بھی ہاتھی کو کھاجاتی ہے۔

”آپ کو یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا۔“ ذرا توقف کے بعد شاہ جی بولے۔ ”جب حسن طارق صاحب نے مجھے سنگدل کے لیے بلایا تو ان کے کمرے میں جاتے ہی میں نے بے ساختہ رون شروع کر دیا۔ طارق صاحب گھبرا گئے۔“

”کیا ہو گیا بھائی؟ کیوں رو رہے ہو؟“ میں نے اپنے آنسو پوچھتے ہوئے کہا۔ ”کچھ نہیں ہوا۔ یہ خوشی کے آنسو ہیں کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ اپنی فلم کے لیے مجھے بلایا۔“

الحاج بندو خان ریلوے سٹیشن میں سارے شرکائے عشائیر ہمدن گوش تھے اور شاہ جی گزرے دلوں کی باتیں سن رہے تھے۔ اچانک انہیں صائمہ کی یاد آگئی اور بولے۔ ”سلطان راہی صاحب دنیا چھوڑ گئے تو لوگوں نے صائمہ کو سلطان راہی کی بیوہ کہنا شروع کر دیا۔ ایسے میں نے اسے سہارا دیا اور اپنی اردو فلم گھوٹکھٹ میں ایک مختصر کردار کروایا۔ جس کے بعد ان کا تباہ شدہ فلمی کیریئر دوبارہ بحال ہو گیا اور وہ باضابطگی کے ساتھ میری فلموں میں کام کرنے لگیں۔ میں نے اپنی فلم کی ڈائریکشن دیتے وقت، جب سین سمجھاتے ہوئے صائمہ کا ہاتھ تھاما تو اس نے برجستہ کہا۔ ”شاہ جی! اب یہ ہاتھ چھوڑنا۔۔۔۔۔۔“

اور پھر میں نے واقعی اس کا ہاتھ اور ساتھ نہیں چھوڑا۔ جنگل کوئین اور مجاہد کے درمیانی عرصے میں ہماری صائمہ سے شادی ہوگئی۔

کسی نے اس موقع پر ان سے یہ نہیں پوچھا کہ اس وقت آپ نے رخسانہ نور کے بارے میں کیوں نہیں سوچا کہ اس طرح ایک اداکارہ کو بیوی بنانے پر ان پر کیا گزرے گی؟ یہاں کا ماحول ذرا مختلف تھا۔ یہ کوئی انٹرویو کا سلسلہ نہیں تھا۔ مہمان خصوصی کے طور پر وہ اپنی یادوں کے دریچے کھول رہے تھے اور سارے حاضرین جن میں ہمارے صحافی بھائیوں کی محفل تعداد بھی تھی اور اس وقت وہ کہیں اور سنا کرے کوئی کا ماحول تھا۔ البتہ جب شاہ جی گویا تھک کر ذرا رکے تو میزبان نواب حسن صدیقی نے ایک واقعہ سنایا۔

”ان دنوں کی بات ہے جب لاہور کے گلستان سینما میں بھارتی فلم ”مغل اعظم“ گئی تھی اور میٹروپول سینما پر

مجاہد کے بڑے بڑے پوسٹر آویزاں تھے۔ شان پاؤں میں ٹھنک کر دبانے اور ڈھونڈتی تھامے کھڑا تھا (پوسٹر میں) ہم گلستان سینما کے مالک لالہ جی کے ہاں ناشتے پر مدعو تھے۔ دوران ناشتا میں نے کہا۔ ”لالہ جی! میں جب آپ کے پاس آ رہا تھا تو میٹروپول میں مجاہد کی زبردست پبلیٹی نظر آئی اور مجھے سید نور کے تیور رخ نہیں دکھ رہے تھے۔ کیونکہ شان ٹھنک کر دبانے اور ڈھونڈتی تھامے حب عشق میں ڈوب کر گانا گائے گا۔۔۔۔۔۔ تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا۔ تو لالہ جی! مجھے نہ جانے کیوں خوف ساعسوس ہو رہا ہے کہ کہیں ”مغل اعظم“ کے شہنشاہ اکبر کا تخت مجاہد جی نہ الٹ دے۔“ میری بات سن کر لالہ جی پریشان ہو گئے کیونکہ گلستان سینما میں ”مغل اعظم“ گئی تھی اور انہوں نے بڑا ایڈوانس دیا ہوا تھا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ مجاہد نے مغل اعظم کا جینا دو بھر کر دیا۔“

حاضرین نے مجاہد کی فتح پر خوشی کا اظہار کیا۔ شاہ جی کے چہرے پر بھی مسرت کا نور صاف نظر آ رہا تھا۔ نواب صاحب نے اپنی بات کا ری ایکشن دیکھ کر ایک اور واقعہ سنایا۔

ایک بار کارا فلم فیسٹیول میں شرکت کے لیے ہمیش بھٹ کراچی آئے ہوئے تھے۔ اکثر کارا فیسٹیول کی فلمیں نشاط میں دکھائی جاتی تھیں۔ ہمیش بھٹ نے مجھ سے کہا ”یہ سید نور کتنا بڑا فلمساز اور ہدایت کار ہے؟“ وہ اسی درجہ مجاہد دیکھ کر آئے تھے۔ ”یہ سید نور تو مجھ سے بھی بڑا فلمساز ہدایت کار لگتا ہے۔“

میں نے بھٹ صاحب سے کہا۔ ”آپ کے پاس FINANCE ہے وہ نور کو میسر نہیں اور اسے ٹیکنالوجی بھی حاصل نہیں۔ اب ان حالات میں اور اس کم بجٹ میں نور مجاہد جی جیسی فلمیں بناتا ہے تو میری نظر میں نور محبوب خان اور راج کپور سے کسی طور کم نہیں ہے۔“

نواب صاحب یہ واقعہ بتا کر گزار کے۔ پھر گویا ہوئے۔ ”لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ سید نور کو اس قدر کیوں چاہتے ہیں تو میں جواب دیتا ہوں۔“ دل ویاہ لگیاں توں کون جانداں۔ میں جاندی نے میرا رہ جانداں۔“

حاضرین نے کھل کر ہتھ پہ لگایا اور تقریب کشم زعفران بن گئی۔

سیریل کلر

شیراز خاٹ

ہر معاشرے میں ایسے افراد بھی جمل لیتے ہیں جو صرف ذہنی
آسودگی کے لیے انسانی جان لینے سے بچتے نہیں ہیں۔ ایک
جیتے جاگتے شخص کو موت کی نیند سلا دیتے ہیں کہ انہیں
خون بہانے سے لطف ملتا ہے۔ ایسے دہشت گرد نما اشخاص ایک
دو نہیں، پچاس پچاس اور سو سو انسانوں کو قتل کر دیتے
ہیں۔

انسانی شکل میں ایسا کوئی درندہ کہیں آپ کے قریب تو نہیں ہے۔

یہ اصطلاح ان کے لیے استعمال کی جاتی ہے جنہوں
نے دو یا زائد انسانوں کا خون کیا ہوا۔
لوگ گزرے ہیں جن کا کام ہی خون بہانا تھا۔ ان کا شکار
عورتیں، مرد، بچے سب ہوتے ہیں۔
یہ وہ لوگ ہیں جن کو خون بہا کر لذت محسوس ہوتی
ہے۔ سیریل کلر کی تعریف یوں ہے کہ وہ شخص جو تین یا زائد
انسانی مریض ہوتے ہیں۔ دنیا میں بہت سے ایسے مشہور



افراد کو قتل کرے۔ مختلف حکومتوں نے اس کی تعریف مختلف کی ہے۔ بعض کے نزدیک جو تین افراد کو قتل کر دے اسے سیریل کلر کی کیٹگری میں ڈال دیا جاتا ہے۔ بعض کے یہاں پانچ یا چھ افراد اور بعض کے نزدیک دس افراد لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے بھی سیریل کلر ہوئے ہیں جنہوں نے سو سو آدمیوں کے خون کیے تھے۔

یہ ایک شدید قسم کی نفسیاتی کیفیت ہے، اس کو نفسیات دان **psychopaths** کہتے ہیں۔ بظاہر یہ نارمل لوگ ہوتے ہیں لیکن ان کے وجود میں نفرت کی آگ دہکتی رہتی ہے۔ یہ ہر ایک کو مار دینا چاہتے ہیں۔ کسی دشمنی، کسی جواز کے بغیر۔

کچھ عرصہ پہلے ہمارے یہاں بھی ایسا ہی ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ جس کو ہتھوڑا گروپ کا نام دیا گیا تھا۔ یہ گروپ گھروں سے باہر سونے ہوئے لوگوں کے سروں پر ہتھوڑے مار کر انہیں ہلاک کر دیتا تھا۔

اس سبک کی بے شمار وجوہات ہو سکتی ہیں۔ یہ مذہبی جنونی بھی ہوتے ہیں۔ جنسی جنونی بھی اور خون دیکھ کر لذت حاصل کرنے والے بھی۔ امریکا کے ایک سیریل کلر دوائس نے بہت سی عورتوں کو اس لیے قتل کر دیا تھا کہ وہ ان عورتوں میں شیطان کے چہرے دیکھا کرتا تھا اور دنیا کو شیطان سے بچانے کے لیے اس نے عورتوں کا خون بہانا شروع کر دیا تھا۔

رچرڈ جیمس اپنے متحولین کا خون پیتا بھی تھا اور ایک ٹب میں خون جمع کر کے اس میں نہاتا بھی تھا۔

اس قسم کے قاتلوں کے چہروں پر ہرگز لکھا نہیں ہوتا کہ وہ ایک جنونی قاتل ہیں۔ بظاہر وہ عام سے ہوتے ہیں لیکن موقع ملنے ہی ان کے اندر کا درندہ جاگ اٹھتا ہے۔ وہ اپنے شکار کو مارنے لگتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ وہ خود کو گناہ گار بھی نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں جو کچھ ہوا ہے ٹھیک ہی ہوا ہے۔

انسانی خون بہانے کی بے شمار وجوہات ہیں تو اس قسم کے قاتل کا نام بھی الگ الگ ہے۔

assassination۔ یہ وہ قتل ہے جو کسی خاص مقصد سے کیا جاتا ہے۔ چاہے وہ مقصد سیاسی ہو یا پیسوں کے لیے۔ پاکستان میں محترمہ بے نظیر بھٹو کا سیاسی نیشن ہوا تھا۔ لیاقت علی خاں کا قتل بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔

cannibalism۔ آدم خوری یا مرد خوری، اس عمل کو کہتے ہیں جس میں ایک انسان دوسرے کا گوشت

کھائے۔ کہا جاتا ہے کہ آج سے تقریباً پانچ لاکھ سال سے ساڑھے تین سال پہلے کے انسانوں نے اس عمل کا آغاز کیا۔ دو ہجریہ کے انسانوں میں بھی کئی کروہ ایسے نکلے جنہوں نے اس قبیلہ عمل کو دہرایا۔ پوری دنیا میں اس عمل کو دہرایا جاتا رہا۔ بلکہ ”جی“ کو تو کسی زمانے میں آدم خوروں کا جزیہ کہا جاتا تھا۔

آدم خوری بنیادی طور پر دو طریقوں کی ہوتی ہے۔ اندرونی آدم خوری اور بیرونی آدم خوری۔

اندرونی آدم خوری وہ ہوتی ہے جس میں اپنے ہی قبیلے یا برادری کے انسان کو مار کر کھایا جاتا ہے اور بیرونی آدم خوری باہر کے کسی بندے کو پکڑ کر اس کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ اس کی وجوہات میں سے شدید قحط، پاگل پن وغیرہ ہیں۔

child murder۔ بچوں کا قتل، یہ انتہائی گھناؤنا جرم ہے۔ اس میں چھوٹے بچوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں جیسے کسی سے دشمنی ہو، تو اس کے بچے کو مار کر دشمن ساری زندگی کے لیے نرٹایا جاتا ہے۔

آپ نے اس قسم کی خبریں سنی ہوں گی کہ ایک سوکن نے دوسری سوکن کے بچے کا خون کر دیا ہے۔ یا سونگلی ماں باپ نے مار ڈالا۔ یا پھر نام نہاد جادوگر کسی سے بچے کا خون طلب کر لیتے ہیں اور عقل کے اندھے کسی معصوم کا خون کر کے پی لیتے ہیں کہ ان کی مراد پوری ہو جائے گی۔

بھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی بچہ یا بچی کسی جرم یا گناہ کا معنی شاہد بن جاتا ہے تو اس کو مار کر خاموش کر دیا جاتا ہے۔

concensual homicide۔ بعض علاقوں میں اس قسم کی موت یا قتل کو قانونی شکل دے دی گئی ہے۔ یہ عام طور پر اس وقت ہوتا ہے جب کوئی مریض کرب کی حالت میں ہو۔ اس وقت وہ التجا کرتا ہے کہ اسے موت دے دی جائے اور ڈاکٹر زکو بھی اس کے زندہ نہ جانے کی امید نہ ہو۔ تو اس حالت میں اس کو تکلیف سے بچانے کے لیے اسے مار دیا جاتا ہے۔ (ہمارے یہاں اس کی دوسرا شکل سامنے آئی۔ اگر کوئی اپنے کسی پیارے کو مسلسل تکلیف میں دیکھتا ہے تو اس کے لیے دعا کی جاتی ہے کہ خدا اس کی موت آسان کر دے)

کرائے کے قاتل یا کرائے کے قتل۔ اس کا رچالہ پوری دنیا میں ہے۔ خود ہمارے یہاں بھی اس کی شکل

ہال ہے۔

Honor killing - غیرت کے نام پر قتل۔ یہ وہاں بھی تقریباً پوری دنیا میں ہے۔ ہر سال دنیا کے کسی سے اندھا مالک میں ہزاروں عورتوں کو ان ہی کے عزیز و اقارب کی جانب سے خاندان کی عزت و آبرو کے تحفظ کے نام پر قتل کر دیا جاتا ہے۔ قاتلوں کا خیال ہوتا ہے کہ ان کی عزت اور فہرت خاندان کے نام سے جڑی ہے۔ اسی لیے انہیں جب اسی خاندان کی بدنامی کا اندیشہ ہونے لگتا ہے تو وہ عزت کے نام پر قتل کرنے لگتے ہیں۔ یہ رسم بھارت، انسان اور عرب ممالک میں بہت حد تک پھیلی ہوئی ہے۔

یہ رسم پاکستان میں بلوچستان اور سندھ میں عام ہے۔ امرواج کے مطابق اپنے خاندان کی (ان کے نزدیک) گمراہ عورت اور اس کے شرک جرم کو قتل کرنا جائز ہے اور اہل مزا سے صاف بچ جاتا ہے۔

سندھ میں اس رسم کو کارودکاری کہتے ہیں۔ پنجاب میں کالا کالی، خیبر پختونخواہ میں طور طورہ اور بلوچستان میں سیاہ لاری۔

اس رسم کا غلط استعمال کچھ یوں تھا کہ اپنے کسی دشمن کو ہلاک دیکھ کر مار دیتے تھے اور اپنے خاندان کی کسی زیادہ عمر کی اورت یا بیٹی کو مار اس کی لاش دشمن کی لاش کے پاس ڈال کر لہو دیتے تھے کہ دونوں کو غلط کام کرتے دیکھا تھا اسی لیے مارا اور ان کا کچھ بگڑتا بھی نہیں تھا۔

قتل کی ایک اور رسم بھی یہ ہے اور ہو سکتا ہے کہ بہت ہلکوں میں اس قسم کے قتل ہوتے ہوں۔ یہ قتل دیویوں اور ہاتھوں کو خوش کرنے کے لیے ہوا کرتے ہیں جس کو بھینٹ اٹھانا کہتے ہیں۔ عام طور پر بچوں کو اس دردنگی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

infanticide - شیرخوار کا قتل۔ یہ قتل عام طور پر مکہ ہے۔ ایک گھنٹے سے لے کر چوبیس گھنٹوں تک کے ان کو غیرت یا مفلسی کے خوف سے قتل کر دیا جاتا ہے یا اہلی کیفیت میں یہ معصوم دنیا سے رخصت کر دیے جاتے۔

mass murder قتل عام۔ ایک مختصر عرصے کا عام طور پر ایک ہی وقت میں بہت سے لوگوں کو قتل کرنے کا عمل ہے۔ اس کی بھی تاریخ بہت پرانی ہے۔ عام طور پر لوں میں قتل عام ہوا کرتا تھا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ چنگیز خان اور ہلاکو جیسے لوگوں نے

قتل عام کر دیا تھا۔ حالیہ دنوں میں برما میں ہونے والے فسادات ہیں جن میں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ اس کے علاوہ (مشرقی پاکستان میں چلنے والی) بنگلہ دیش کی تحریک کے دوران ہزاروں مردوں اور عورتوں کو مار کر پھینک دیا گیا تھا۔ تقسیم ہند کے وقت لاکھوں افراد۔۔۔ اس وحشت اور بربریت کا نشانہ بنے تھے۔

بدقسمتی سے ہمارے یہاں جو آرمی پبلک اسکول کا سانحہ ہوا تھا وہ بھی اسی کیلنگری میں آتا ہے۔ آج بھی ایسی خبریں آیا کرتی ہیں کہ دشمنی کی بنا پر گھر میں گھر کے کپورے کے پورے خاندان کو مار دیا گیا۔

ایسے قاتل نفسیاتی طور پر اس درجے حس ہوتے ہیں کہ مقتول کے تڑپنے، مقتول کے جسم سے اگلے خون کو دیکھ کر لطف محسوس کرتے ہیں۔ خوش ہوتے ہیں اور خود کو نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی چند قاتلوں کا مختصر مختصر تعارف کرادوں۔

Zodiac killer

اس قاتل نے اپنا یہی نام مقرر کیا تھا۔ وہ ہر قتل کے بعد ایک خط پولیس ڈیپارٹمنٹ کو بھیج دیا کرتا تھا۔ جس میں وہ بتاتا تھا کہ اس نے فلاں مقام پر کسی کو مار کر ڈال دیا ہے اس کی لاش جا کر اٹھا لو۔

یہ قاتل 1960ء اور 1970ء کے درمیان کیلی فورنیا میں فعال رہا تھا۔ اس کے اپنے بیان کے مطابق اس نے 37 افراد کو قتل کیا تھا۔ وہ اپنے خطوط میں ایک خاص قسم کی علامت بناتا تھا وہ علامت ایک دائرہ ہوتا تھا جس کو کر اس کر دیا جاتا تھا۔ اس کے بارے میں ابھی تک کچھ پتا نہیں چل سکا کہ اس کی اصل شناخت کیا ہے۔ اس کی حالات زندگی اس لیے دستیاب نہیں ہے کہ یہ شخص بھی قانون کی گرفت میں نہیں آیا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس کی فائل بند کر دی گئی کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کو پھر ایک خط موصول ہو گیا اور فائل کھول دی گئی۔ اس کی فائل ابھی تک کھلی ہوئی ہے۔ وہ جو خطوط لکھتا تھا وہ اس قسم کے ہوتے تھے۔ ”میں زوڈیاک ہوں اور یہ اعتراف کر رہا ہوں کہ میں نے فلاں شخص کو فلاں مقام پر مار کر ڈال دیا ہے اس کو مارنے کی وجہ یہ بھی کہ وہ ایک انسان تھا اور مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔ کیوں کہ وہ زمین پر انسان سے بری کوئی مخلوق نہیں ہے۔ اس کو مر جانا چاہیے اور میں یہی کام کر رہا ہوں۔ یہ جو تیس مرد بچے سب کے سب غیبی ہیں۔ میں ان کا خاتمہ کر رہا ہوں۔“

اس نے زیادہ تر نوجوانوں کو مارا تھا۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ ڈبویڈ آر تھر (سترہ برس) اور بیٹی لوجینسن (سولہ برس)۔ ان دونوں کو بیس دسمبر 1968ء کو ”کوہیل ہراں“ کے پاس گولی مار کر ہلاک کیا گیا۔ ہانگیل رینالٹ کو پارکنگ میں گولی ماری گئی۔ پال لی کو سر میں گولی ماری گئی۔ اس قسم کے بیسیوں قاتل ہیں جن کے نام مضمون کی طوالت کی وجہ سے دے نہیں پایا۔ یہ قاتل یا تو اب تک آزاد گھوم رہا ہے یا پھر مر چکا ہے اس بارے میں کسی کو نہیں معلوم۔

یہ نام خوف اور دہشت کی علامت بن گیا تھا۔ اس کے اپنے بیان کے مطابق اس نے اتنی سے نوے لوگوں کو قتل کیا ہے (سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں یہاں اگر کسی حساس شخص کی کار کے پیچھے جلی بھی آکر مر جائے تو اس کا افسوس کرتے رہتے ہیں)۔ ڈوٹا لڈ ہنری ماسکن ایک ایسا شخص تھا جو دیکھنے میں بہت مہذب دکھائی دیتا تھا لیکن کون جانتا تھا کہ اس کے وجود میں کیسا بھیڑیا چھپا ہوا ہے۔ اس کا طریقہ واردات یہ تھا کہ یہ ہائی ویز سے لوگوں کو انخوا کر کے اپنے ساتھ لے جاتا تھا اور انہیں تشدد کے ذریعے مار دیتا تھا۔ اس کا طریقہ بہت بے رحمانہ تھا۔ یہ شخص 1933ء میں ساؤتھ کیرولینا میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی زندگی بہت ستم زدہ گزری ہے۔ جب وہ صرف ایک سال کا تھا تو اس کی ماں نے اس کے باپ کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ہی رہا لیکن اس دوران اس کی ماں شادیاں کرتی رہی اور اس کے ہر نئے شوہر کا رو بہ ماسکن کے ساتھ بہت بے رحمانہ ہوتا تھا۔ وہ سب اسے بری طرح پہنچتے تھے۔ جب وہ صرف ایک سال کا تھا تو اس نے ایک بوتل مٹی کا تیل لی لیا تھا جس کے اثرات اس پر عمر بھر رہے۔ وہ بیمار رہنے لگا۔ اس کے علاوہ وہ راتوں کو اٹھ کر چیخنے بھی لگتا تھا۔ اسے بھیا تک خواب سنایا کرتے تھے۔ اس کو معاشرے نے ایک عرفیت دی تھی ”ٹی وی“۔ یہ نام اتنا مقبول ہوا کہ ماسکن کو اپنے اصل نام کا پتا اس وقت چلا جب اسے پہلی بار عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔ اس نے اپنا پہلا جرم بارہ تیرہ برس کی عمر میں کیا تھا۔ اس نے کچھ لڑکوں کے ساتھ مل کر چوریاں شروع کر دی تھیں۔ اس کے علاوہ اس نے ایک لڑکی کا رپ بھی کیا تھا۔ اس کو یہ جرم کرتے ہوئے دیکھ لیا گیا تھا۔ اس کی عمر کو دیکھتے ہوئے اسے اصلاح خانے بھیج دیا گیا۔ ہوتا یہ ہے کہ مغرب میں انسانی ہمدردی اور

انسانی حقوق کے نام پر ایسے مجرموں کو سخت سزا نہیں مل جاتی۔ دو تین سال کی سزا ہوتی ہے اور جب وہ باہر آتا ہے پہلے سے زیادہ مکروہ بن جاتا ہے۔

جن دنوں وہ اصلاح خانے میں تھا تو وہاں بھی اس کے ساتھ مسلسل زیادتی ہوتی رہی۔ یہ زیادتی اس کے سامنے کیا کرتے تھے جو اس سے زیادہ طاقت ور تھے شاید ان سب باتوں نے اسے اتنا تلخ کر دیا تھا۔

1951ء میں جب وہ اٹھارہ سال کا تھا تو اصلاح خانے سے فرار ہو گیا۔ اسے تمباکو کے کھیتوں میں کام کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہیں اس نے ایک کم عمر لڑکی ہتھوڑے مار کر ہلاک کر دیا۔ تحقیق کے دوران اس نے کہا کہ اس لڑکی نے اس کی توہین کی تھی جو وہ برداشت نہیں سکا۔ اسی لیے اس کا خون کر دیا۔ 1953ء میں اسے گرا کر لیا گیا تھا۔ اسے چھ سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا جہاں اس نے ایک سرکاری اہل کار کا خون کر دیا۔ اس بار ا مزید تین سال کی سزا ہو گئی۔

1955ء میں وہ کچرے کے ٹرک میں چسپ کر کے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن جلد ہی وہ پھر گرا ہو گیا اور بے رول پر رہا ہوا لیکن کچھ عرصے بعد پھر گرفتار عمل میں آئی۔ اس بار اس کا جرم اور بھیا تک تھا۔ اس تین قتل کیے تھے۔ انتہائی تشدد کے ساتھ۔ اس پر ایک الزام یہ بھی تھا کہ وہ اپنے شکار کو بار بار ان کا گوشت کھاتا تھا اس نے خود اعتراف کیا تھا کہ اس نے اتنی سے لے کر نو انسانوں کا خون کیا ہے۔ ان میں دو سال کی بچی بھی شامل تھی۔ اس نے ولن ار لے نام کے ایک اخباری رپورٹر کو پوری کہانی سنائی تھی۔

اس کی زندگی پر کئی کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں۔ انہیں انجام یہ ہوا کہ اسے موت کی سزا دے دی گئی۔

سوتومومیازاکی: utomu Miyazaki اس کا تعلق جاپان سے تھا اور یہ موجودہ دور کا انتہائی بے رحم سیریل کٹر تھا۔ اس کو انسانی ڈیکولا بھی کہا تھا۔ کیوں کہ یہ اپنے شکار کا خون پیتا تھا اور سب سے ظالم بات یہ تھی کہ صرف چھوٹی چھوٹی بچیوں کا خون کرتا تھا۔ ایسی بچیاں جو دس گیارہ برس سے زائد کی نہیں تھیں۔ یہ بے رحم نہ صرف ان کا خون کرتا بلکہ ان کے بے زیادتی بھی کرتا تھا۔ اس نے بھی ایک محرم اور انتشار زندگی گزاری تھی۔ اس کی پیدائش 1960ء میں ٹوکیو

ایک نواحی علاقے میں ہوئی تھی۔ یہ premature پیدائش تھی۔ اس کا ایک ہاتھ مفلوج جیسا تھا۔ اس لیے یہ احساس اس کے ساتھ زندگی بھر رہا تھا۔ پھر گھر کے بڑے بڑے حالات نے اسے اور ذہنی طور پر منتشر کر دیا تھا۔ وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ابتدا میں نوکیوں کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ وہ ایک ذہین طالب علم ثابت ہو رہا تھا لیکن پھر اس کی رہنمائی خراب ہونے لگی۔ اس کو نیکی پر آمیزش میں داخلہ نہیں مل سکا۔ پہلے وہ انگلش بڑھ کر استاد بننا چاہتا تھا لیکن داخلہ نہیں ملا تو اس نے فونو میکنگ بننے کے لیے داخلہ لے لیا۔ اس کے باپ کا ایک اخبار تھا۔ مقامی طور پر وہ ایک معروف صحافی تھا لیکن ساتھ ساتھ موکو صحافت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس کے اندر ہر وقت ایک طوفان برپا رہتا تھا۔ ایک بار اس نے اپنی ایک بڑی بہن کو اس وقت دیکھنے کی کوشش کی جب وہ غسل خانے میں تھی۔ بہن نے جب شور مچایا تو سو تو مومنہ اس پر حملہ کر دیا۔ اس کو گھر سے نکال دیا گیا۔ اس کا سب سے بڑا پر اہم احساس کمتری تھا۔ وہ عام سی محل کا آدمی تھا جس کی خواہشات پوری نہیں ہو رہی تھیں۔ ایک تو اس کا ہاتھ مفلوج تھا پھر وہ بچی ہوئی جنسیت کا انسان تھا۔ اسی لیے اس نے محسوس کیا کہ وہ بڑی عورتوں کے لیے نہیں ہے۔ اس نے چھوٹی عمر کی بچیوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی اور پھر اس کی درنگی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ہوتا ہی ہے۔ اس قسم کے لوگ عام طور پر ذہنی مریض ہوا کرتے تھے۔ یہ ایسا مسئلہ ان کی شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے اور وہ اس قسم کی وارداتیں کرنے لگتے ہیں۔

1988ء سے لے کر 1989ء کے دوران (یعنی صرف ایک سال میں) اس نے چار لڑکیوں کا بہیمانہ خون کیا۔ ان لڑکیوں کی عمریں چار سے نو برس تک تھیں۔ اس نے اپنے ایک شکار کا خون بھی پیا تھا اور اس کا ایک ہاتھ بھی کھا گیا تھا۔

اخبارات چیخ اٹھے تھے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ ان کے وقت اس کے معمولات نارمل ہوا کرتے تھے۔ مزاحہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ بظاہر اس پر ضرر نظر آنے والے سامان کے اندر ایک خبیث روح موجود ہے۔

ایک انتہائی بے رحمانہ فعل یہ تھا کہ وہ ہر قتل کے بعد اپنے شکار کے گھر والوں کو ایک خط بھیج دیتا تھا جس میں سے لے لے کر بتایا کرتا کہ اس نے کس طرح ان کو کیا۔ کس

واوی سندھ کی تہذیب میں بڑے شہر بنانے کا رجحان 2500 ق م میں اپنے عروج کو پہنچ گیا جیسا کہ ہڑپہ اور موئن جو دڑو کی مثالوں سے ظاہر ہے۔ اس تہذیب کی زیادہ معروف اور نمایاں خصوصیات یہ ہیں، شاندار شہری منصوبہ بندی، بڑی بڑی سرکاری عمارتیں اور چھوٹے چھوٹے گھر، وسیع پیمانے پر اجتماعی پیداوار، ثقافتی چیزوں کی بناوٹ کا اعلیٰ معیار، مثلاً بت، مجسمے، مہرے، مٹی کے برتن، دور دراز فاصلوں تک بیرونی تجارت کا اہتمام، معاشرے کی طبقاتی تقسیم اور رسم الخط کی ترقی۔ آب کھاسی کا نظام موجودہ بہترین شہروں کے مقابلے پر تھا۔ چھوٹی چھوٹی نالیاں بڑی نالیوں میں آکر ملتی تھیں۔ ہرنالی پختہ اور اوپر سے اینٹوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ حفظان صحت کے اصولوں کا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ ان قدیم کھنڈروں میں موئن جو دڑو کا حمام اور ہڑپہ کا ناچ گھر قابل ذکر ہیں۔ ہڑپہ اور موئن جو دڑو میں واوی و جلد و فرات کے سومیری شہر، بابل و نینوا کے عمارت کی طرز کے محلات نہیں ملتے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ طرز حکومت جمہوری اور عوامی تھا لیکن ان لوگوں کی مذہبی زندگی پر کسی طرح کی روشنی نہیں پڑتی کیونکہ کوئی مندر وغیرہ نہیں ملتا اور نہ قدیم مصر کی طرح یہاں اہرام اور مقبرے تعمیر کیے گئے۔ یہاں گندم اور جو بکثرت ہوتا تھا۔ لوگ گھریلو پالتو جانوروں کے علاوہ دریائی جانور مگر مچھ، مچھلی، بھجوا اور گھنے جنگلوں کے درندے چیتا، گھڑیاں، ہاشمی، گینڈا، زبیرا وغیرہ سے واقف تھے کیونکہ مہروں پر یہ تمام جانور نہایت مہارت سے بنائے گئے ہیں۔

مرسلہ: قرۃ العین، اقراسی، کراچی

طرح قتل کیا اور کس طرح ان کے ساتھ زیادتی کی۔ جس دن اس کی چھبیسویں سالگرہ بھی اس دن اس نے ایک اور چار سالہ بچی کو اپنی درنگی کا نشانہ بنایا۔ وہ بچی اپنی ایک دوست کے گھر کے باہر کھیل رہی تھی۔ وہ اس کے قریب گیا اور اسے

لاٹج دے کر اپنی گاڑی میں بٹھالیا۔ وہ اسے ایک لمبے نیچے لے گیا جہاں اس نے بچی کو مارا پھر اس کی لاش کی بے حرمتی کی۔

اس نے اس بچی کے کپڑے اتار کر اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ اس نے بچی کی ہڈیوں کا سفوف بنا کر ایک پارسل میں وہ کپڑے اور وہ سفوف اس بچی کے گھر بھیج دیئے۔ اس نے ایک خط بھی لکھا تھا کہ اپنی بچی کی باقیات سنبھال کر رکھ لو۔

اس طرح کی اور بھی وارداتیں وہ کرتا چلا گیا۔ اس نے ایک دہشت پھیلا دی تھی۔ والدین بچوں کو تنہا نہیں جانے دیتے تھے۔ اس کی گرفتاری بھی اتفاق سے ہوئی۔ ایک پارک میں ایک بچی کھیل رہی تھی۔ وہ دور بین سے اس بچی کا جائزہ لے رہا تھا۔ بچی کے والدین نے یہ دیکھ لیا۔ انہوں نے پولیس کو اطلاع دے دی۔ پولیس نے آکر اسے گرفتار کر لیا۔

وہ کوئی جواز نہیں پیش کر سکا بلکہ اٹلے سیدھے بیان دینے لگا۔ پولیس نے اس کے فلیٹ کی تلاشی لی، اس تلاشی میں انہیں اس درندے کے خلاف بہت سے ثبوت مل گئے۔ اس نے جن بچیوں کو ہلاک کیا تھا ان کے کپڑے ویڈیو فلمیں، ہڈیوں کے سفوف اور سب سے بڑھ کر اس قسم کے خطوط جو وہ والدین کو بھیجا کرتا تھا۔ جب تفتیش کی گئی تو اس نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا۔

30 مارچ 1990ء کو اس کی ٹرائل شروع ہوئی اور 2001ء میں موت کی سزا سنائی گئی۔

احمد سراجی: Ahmed Suradji

ایک انڈونیشی سیریل کلر۔ اس کی پیدائش انڈونیشیا کے علاقے میڈان میں دس جنوری 1949ء کو ہوئی۔ اس کے اپنے بیان کے مطابق اس نے چالیس عورتوں اور لڑکیوں کو قتل کیا تھا۔ جن کی عمریں سترہ سال سے چالیس کے درمیان تھیں۔ یہ بے رحم شخص جادو کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ اسے یہ بتایا گیا تھا کہ وہ اگر ستر عورتوں یا لڑکیوں کو موت کے گھاٹ اتار دے تو اسے بے پناہ قوت حاصل ہو جائے گی۔

اس کے گھر کے پیچھے گئے کا کھیت تھا جہاں وہ لاشوں کو اس ایگل سے دفن کرتا تھا کہ ان کے رخ اس کے گھر کی طرف رہیں۔ اس طرح اس کے خیال کے مطابق جادو کا اثر جلدی ہو سکتا تھا۔

اس نے اپنے اعترافی بیان میں کہا کہ ایک بار اس

کے مرحوم باپ کی روح اس کے خواب میں آئی تھی جس نے اسے بتایا تھا کہ وہ اگر ستر عورتوں کو مار کر ان کا خون پی لے لے اس کو بے پناہ طاقت مل جائے گی۔

اس نے کہا کہ تفتیش کے درمیان بتایا کہ وہ جلد از جلد یہ کتنی پوری کرنا چاہتا تھا لیکن صرف چالیس ہی کو مار سکا ہے۔ یہ اس کی ناکامی ہے اگر وہ ستر کی کتنی پوری کر لیتا تو اس کی طاقت مل جاتی پھر پولیس اس کو بھی گرفتار نہیں کر پاتی۔

24 اپریل 1997ء کو سری دیوی نام کی ایک لڑکی نے ایک رکشا ہار کیا۔ اس نے رکشا چلانے والے کو اپنا منزل بتائی اور گھنے کے کھیتوں کے پاس اتر گئی۔ وہ دونوں کے بعد اس کی لاش دریافت ہوئی۔ یہ لاش ایک مقامی شخص نے دیکھی تھی۔ اس نے پولیس کو خبر کر دی۔ پولیس نے ثبوت کی تلاش میں چاروں طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ احمد سراجی کا گھر قریب ہی تھا۔ پولیس والے یوں ہی سرسری معلومات کے لیے احمد کے گھر پہنچ گئے۔

پہلے تو وہ انکار کرتا رہا کہ اسے نہیں معلوم کہ کس نے قتل کر کے لاش کھیتوں میں پھینک دی ہے لیکن اتفاق سے تلاشی کے دوران احمد کے گھر سے سری دیوی کا ہینڈ بیگ اور اس کے برآمدے دستیاب ہو گیا۔ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔ ابھی تک یہ صرف شہد تھا لیکن جب اس نے اپنے جرائم اور قتل کو وارداتوں کے بارے میں بتانا شروع کیا تو پولیس والے م پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اس نے اسی کھیت میں چالیس لاشوں دفن کرنے کا اعتراف کیا تھا۔ کھدائی کے دوران ان لاشوں کا باقیات مل گئی تھیں۔

اسی اعتراف میں اس نے بتایا تھا کہ اس کے باپ کی روح اس کے خواب میں آکر کہا کرتی ہے کہ بس شاباس تھوڑا خون اور اس کے بعد قوت مل جائے گی۔ اس نے بتا کر وہ مارنے کے بعد اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق لاش خون بھی پیتا تھا۔

جولائی 2008ء میں اس بے رحم شخص کو فائرنگ اسکوڈ کے سامنے کر دیا گیا جہاں درجنوں گولیوں نے اسے بھونک کر رکھ دیا۔

اس قسم کے پاگل اور جنونی بد قسمتی سے ہمارے یہاں بھی ہیں۔ جو دولت کے لیے طاقت کے لیے بچوں قربانیاں دیا کرتے ہیں اور وہ یہ سارا فعل باپاؤں کے کہنے کیا کرتے ہیں۔ اس قسم کے جرائم کی اصل وجہ بابا

سیلفی لیتے ہوئے ہلاکتیں

ایک رپورٹ کے مطابق دنیا میں سیلفی لیتے ہوئے سب سے زیادہ افراد بھارت میں ہلاک ہوئے۔ موبائل کیمرہ ایجاد ہونے کے بعد سیلفی کی وبا نے ہر کسی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ بچے ہو یا بڑا ہر شخص سیلفی کے نشہ میں مبتلا نظر آتا ہے۔ لیکن دیگر نشیات کی طرح بسا اوقات سیلفی کا نشہ بھی جان لیوا ہوتا ہے۔ خطرناک جگہوں پر سیلفی کی کوشش کے دوران ہزاروں افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور زخمی ہو چکے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق مارچ 2014 سے ستمبر 2016 تک سیلفی لیتے ہوئے 127 افراد ہلاک ہوئے جن میں سے سب سے زیادہ 76 ہلاکتیں بھارت میں ہوئیں۔ امریکی حکومت کے اعداد و شمار کے مطابق 2014 کے دوران ملک بھر میں 33 ہزار افراد ڈرائیونگ کے دوران سیلفی لیتے ہوئے زخمی ہوئے۔ امریکا کی کارنگی میلن یونیورسٹی اور بھارتی جامعہ اندرا پراسٹا انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن دہلی کے محققین نے "سی، مائی سیلف اینڈ مائی کل فی" کے نام سے مشیز کے طور پر یہ تحقیق کی ہے۔ جان لیوا سیلفی کو "کل فی" کہا جاتا ہے۔ 2013 میں آکسفورڈ ڈکشنری نے سیلفی کو سال کا لفظ قرار دیا۔ انسان میں مشہور، مقبول اور ہر دل عزیز بننے کا فطری جذبہ موجود ہوتا ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں۔ انہی جذبات کے تحت انٹرنیٹ صارفین اپنی بہترین سے بہترین انفرادی یا اجتماعی تصاویر شیئر کر فیس بک، ٹویٹر، انسٹا گرام سمیت سماجی رابطوں کی مختلف ویب سائٹس پر اپ لوڈ کرتے ہیں اور لوگوں سے لائکس اور شیئرز کی شکل میں خوب واہ واہ وصول کرتے ہیں۔ نوبت یہاں تک آچکی ہے کہ لوگ مقدس مقامات پر بھی عبادات میں دل لگانے اور توجہ مرکوز کرنے کی بجائے سیلفی کھینچنے میں مصروف رہتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ لائکس اور شیئرز کے حصول کے لیے خطرناک مقامات پر بھی سیلفی لینے کا رجحان بڑھ رہا ہے جو جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔

مرسلہ: جلی سبانی، ملتان

گرتے ہیں۔ خدا جانے ہمارے معاشرے کو ایسے باباؤں سے کب نجات ملے گی؟
لوئیس گراوٹیو:-

یہ سیریل کٹر شاید سب سے بازی لے گیا تھا۔ اس نے ادا ادا تین سو بچوں کا خون کیا تھا جب کہ اس نے اپنے اعزاز میں صرف ایک سو چالیس کا ذکر کیا ہے۔

یہ شخص 1957ء میں کولمبیا میں پیدا ہوا تھا۔ یہ اپنے والدین کی ساتویں اولاد تھا۔ اس کا باپ شرابی تھا اور اس اور بچے کا کہ اسے اپنا کوئی ہوش نہیں رہتا تھا۔

نفس میں وہ لوئیس کو بے تحاشا مارا کرتا اور اس کی ماں بھی اس کا ساتھ نہیں دیتی تھی۔ ان سب باتوں نے اسے گھر سے ہٹ کر دیا۔ باپ کے خلاف نفرت تو جتنی ہی۔ ایک بار وہ اپنے باپ کو زخمی کر کے گھر سے فرار ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر نوے برس تھی۔

اس کے بعد اس کی زندگی بہت دشوار رہی۔ اس نے مہدی موٹی نوکریاں شروع کر دیں اور اپنے آپ کو کسی طرح امداد رکھنے لگا۔

دیکھا بھی گیا ہے کہ اس قسم کے محرکات کی جڑیں بچپن سے جا کر ملتی ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی شخص جوان ہو کر چانچ ہی اس قسم کا مجرم بن گیا ہو بلکہ اس قسم کے جرائم کے تانے بانے بچپن کی عمر و میوں سے جا کر مل جاتے ہیں۔

لوئیس کے جاننے والے اسے ایک ہمدرد اور پر خلوص انسان سمجھتے تھے۔ یعنی اس کے دو چہرے تھے۔ ایک چہرہ مہربان اور رحم دل تھا جب کہ دوسرا انتہائی بے رحم اور سنگ دل۔ وہ دوستوں کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ ہنسنا بولنا، یعنی اس میں کوئی ایسی علامت نہیں پائی جاتی تھی جو اس کے قاتل ہونے کا پتا دے سکے۔ وہ عام انسان کی طرح رہا کرتا تھا۔

لوئیس کا طریقہ واردات کچھ یوں تھا کہ وہ چھ سال سے لے کر سولہ سال تک کے بچوں کو اپنا شکار بنایا کرتا۔ سب سے پہلے، جیسے ہوئے بچے۔ اس زمانے میں کولمبیا میں خانہ جنگی چلی ہوئی تھی۔ اس لیے بہت سے بچے بے گھر ہو گئے تھے۔ لوئیس ایسے ہی بچوں کو نشانہ بنایا کرتا تھا۔ وہ ان سے امدادی کا اظہار کرتا۔ ان کو کھانے پینے کی چیزیں دلواتا، پیسے دیتا اور وہ اسے اپنا ہمدرد سمجھنے لگتے تھے، تو ان کو اپنے ساتھ لے جا کر ان کا خون کرتا تھا۔

وہ اپنے شکار کو سنسان علاقوں میں لے جاتا اور اس پر

قابو پاک کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر بے بس کر دیتا تھا۔ منہ میں پکڑا ٹھوس دیتا تھا۔ اس کے بعد اپنا شیطانی کھیل کھیلتا، پھر کل کر دیا کرتا تھا۔

جائے واردات پر شراب کی خالی بوتلیں بھی پائی گئی ہیں یعنی وہ اذیت دینے سے پہلے شراب نوشی بھی کرتا تھا۔

1992ء کے آغاز میں کولمبیا میں لگیوں سے چھ سے

سولہ سال تک کے بچے جب غائب ہونے لگے تو ایک ہنگامہ

بچ گیا لیکن اس وقت تک حکام نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

کیوں کہ ہر طرف انفراتری مچی ہوئی تھی۔ ان واقعات کو

گمشدگی کا کیس سمجھ لیا گیا۔ یہ سلسلہ 1998ء تک چلتا رہا۔

پھر ایک دن ایک پہاڑی کے پاس دو بچوں کی لاشیں برہنہ

حالت میں پائی گئیں۔ دونوں کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے

اور انتہائی بے رحمی سے ان کی گردنوں کو کاٹ دیا گیا تھا۔ اب

پولیس متوجہ ہوئی۔ ایک ہفتے کے بعد اسی مقام سے کچھ قاصدے

پرائیک اور لاش ملی۔ اس کی بھی یہی حالت تھی۔ اس لاش کے

پاس ایک نوٹ بک بھی ملی جس پر ایک پتا اور نام درج تھا۔ یہ

نام ایک لڑکی کا تھا جو لوئیس کی دوست تھی۔ پولیس فوری طور پر

اس پتے پر پہنچی۔ وہ لڑکی مل گئی۔ اس نے بتایا کہ اس نے کئی

مہینوں سے لوئیس کو نہیں دیکھا ہے۔

اس لڑکی نے پولیس کو ایک بڑا سا بیک دیا جو لوئیس اس

کی تحویل میں دے گیا تھا۔ لڑکی نے بتایا کہ اس نے اب

تک اس بیک کو کھول کر نہیں دیکھا۔ اس بیک کو جب کھول کر

دیکھا گیا تو اس میں سے لوئیس کے خلاف بے شمار شواہد اور

ثبوت مل گئے۔ لڑکوں کی تصویروں۔ ہر خون کے بعد ایک

لذت بھرا اعتراف اور ابھی بہت کچھ۔ اس نے یہ بھی لکھ رکھا تھا

کہ اس نے فلاں لڑکے کو کہاں سے اٹھایا تھا۔ اس کو کہاں

لے گیا تھا وغیرہ وغیرہ۔

لڑکی نے لوئیس کا پتا بتا دیا تھا۔ کیوں کہ وہ خود بھی یہ

سب دیکھ کر چکرا کر رہ گئی تھی۔ لوئیس کے پتے پر چھاپہ مارا گیا

لیکن وہ مکان خالی تھا۔ لوئیس جنہیں مل سکا تھا۔ لوئیس کی

گرفتاری 22 اپریل 1999ء کو ہوئی۔ اس قسم کے ہر قاتل

کی طرح اس نے بھی شروع میں خود کو بے گناہ ثابت کرنے

کی کوشش کی لیکن جب اس کی ڈائری اسے دکھائی گئی اور اس

کی دوست لڑکی نے جب اسے یہ بتایا کہ اس کا بیک اسی نے

پولیس کے حوالے کیا تھا تو اس نے اپنے جرائم کا اعتراف کرنا

شروع کر دیا۔ اس نے ایک اجتماعی قبر بھی تیار کر رکھی تھی۔ اس

میں سے ساٹھ بچوں کی باقیات ملیں۔

کولمبیا میں چونکہ موت کی سزا نہیں ہے اس کے علاوہ

تیس سال سے زیادہ کسی کو قید میں بھی رکھا نہیں جاسکتا۔ اسی

لئے اسے تیس سال کی انتہائی سزا دی گئی لیکن جب اس کو سزا

دی گئی تو اس کے خلاف کولمبیا میں ایک شدید قسم کا احتجاج

شروع ہو گیا۔ مطالبہ تھا کہ ایسے بے رحم درندے کے لیے

قانون کو بدلا جائے۔ موت کی سزا ہوئی چاہیے۔

الیکو ٹر پی چسکن: Alexander Pichushkin

روس کا سیریل کلر۔ اس کی نوعیت ہی سب سے الگ

تھی۔ الیکو ٹر شرطنج کا کھلاڑی تھا۔ وہ شرطنج کی بساط

سامنے رکھ کر نہ جانے کیا کیا سوچتا رہتا۔ اس کی پیدائش

1974ء میں ماسکو کے نواح میں ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ

کچھ بھی ہوا وہ حیرت انگیز اور غیر معمولی ہے۔ وہ ایک تارل

بچہ تھا۔ جس طرح کے دوسرے بچے ہوا کرتے ہیں۔ ہتھ کھیلا

ہوئے۔ ایک بار وہ ایک پارک میں بچوں کے ساتھ جموا

جموالتے ہوئے منہ کے بل گر پڑا۔ اس کے سر کے اگلے حصے

چوٹ لگی تھی۔ اسے فوری طور پر ہسپتال لے جایا گیا۔ پتا چ

کہ اس کے دماغ کا وہ حصہ متاثر ہو گیا ہے جو ذہنی توازن

پر قرار رکھتا ہے۔ اس قسم کی چوٹ کے بعد عام طور پر حزاز

میں تشدد کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔

وہی ہوا۔ الیکو ٹر کے مزاج میں ضد شامل ہو گئی۔ لڑ

بھڑنا شروع کر دیا۔ گھر والے بھی پریشان ہو گئے تھے۔ اس

کے اسکول سے شکایات آیا کرتی تھیں۔ اس کی ماں نے اسے

اس اسکول سے ہٹا کر ایک دوسرے اسکول میں داخل کر د

لیکن اس کے مزاج کی تبدیلی بڑھتی چلی گئی۔

دوسرے اسکول میں اس کے ساتھی بچوں کا رویہ اس

کے ساتھ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ اسے پاگل پاگل کہہ کر بھینچا کر

تھے۔ اس بات نے اس کے اندر ایک درندے کی پرواز

شروع کر دی۔ اب وہ بظاہر خاموش ہو گیا تھا لیکن اس کے

اندر ایک خونخوار درندہ پروان چڑھنے لگا تھا۔

ماہرین نفسیات نے اس کے باپ کو مشورہ دیا کہ اسے

کوئی گیم سکھائیں۔ شاید اس طرح اس کے مزاج کا رخ بد

جاسکے۔ اس کا باپ شرطنج کھیلا کرتا تھا۔ اس نے الیکو ٹر

بھی سکھانا شروع کر دیا۔ یہ کھیل الیکو ٹر کو اپنے مزاج

مطابق معلوم ہوا۔ اس نے دلچسپی لینی شروع کر دی اور اس

کے باپ کو محسوس ہوا کہ وہ اچھا خاصا کھیلنے لگا ہے۔

یہ ضروری ہے جتنا تمہارے لیے کھانا اور سانس لیتا۔
ماہرین نفسیات نے اس عمل کو اینٹی سوشل پرسنالٹی
ڈس آرڈر قرار دیا تھا۔

ایلیوینڈر اس وقت گرفتار ہوا جب ایک عورت کی لاش
اس پارک میں پائی گئی جہاں وہ وقت گزارا کرتا تھا۔ اس لاش
کے پاس ماسکو میٹرو کا ٹکٹ تھا۔ اس کی مدد سے پولیس
ایلیوینڈر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

اس نے پچاس کے قریب قتل کا اعتراف کیا اور اس
بات پر افسوس کا اظہار کرتا رہا کہ اسے ٹارگٹ مکمل کرنے کا
موقع نہیں ملا۔ اس نے بتایا کہ وہ شطرنج کے چوتھہ خانوں
کے حساب سے چوتھہ قتل کرنا چاہتا تھا۔

چارلس ایلمنڈ۔

اس شخص کو قاتل فرشتہ کا نام دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس نے
اپنے آپ کو فرشتہ سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ ایسا فرشتہ جو بیمار اور
پریشان انسانوں کی مدد کے لیے آسمان سے اتارا گیا ہے۔
چارلس 1960ء میں نیو جرسی میں پیدا ہوا تھا۔ وہ اپنے
والدین کی آٹھویں اور آخری اولاد تھا۔ جس وقت وہ پیدا ہوا
اس کا باپ ایک بس ڈرائیور تھا اور جب وہ سات مہینوں کا تھا
تو اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی نفسیات کچھ عجیب
ہی تھی۔ اس میں بچپن ہی سے خودکشی کا رجحان تھا۔ اس نے
پہلی کوشش اس وقت کی جب وہ صرف نو برس کا تھا۔ اس کے
بعد وہ جب تک زندہ رہا۔ اس قسم کی کوششیں کرتا رہا تھا۔ اس
نے تعلیم حاصل کی اور اسے امریکن نیوی میں ملازمت مل
گئی۔ وہ پٹی آفسر کے عہدے تک پہنچ گیا۔

اپنی ملازمت کے دوران اس نے سات مرتبہ خودکشی
کی کوشش کی تھی۔ بالآخر اسے میڈیکل گراؤنڈ پر 1984ء
میں نیوی سے فارغ کر دیا گیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر اس
نے نرسنگ کی ٹریننگ حاصل کرنی شروع کر دی۔ اپنی کلاس
میں وہ واحد مرد تھا۔ اس کے علاوہ سب عورتیں تھیں۔ اس کی
ماں کا بھی ایک حادثے میں انتقال ہو چکا تھا۔ وہ اکیلا ہی
تھا۔ بھائی بہن تو تھے لیکن اس کا کسی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔
اس کو اپنی زندگی خود ہی گزارنی تھی۔

اس نے نرسنگ کا امتحان پاس کر لیا اس کے بعد ایک
ہسپتال میں اسے میل نرس کی ملازمت مل گئی اور یہاں سے
اس نے اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا۔ نہ جانے ایسے لوگوں
کے ذہنوں میں کیا ہوتا ہے۔ یہ خود کو نجات دہندہ سمجھنے لگتے
ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کو دکھوں سے نجات

شہر کے ایک پارک میں شطرنج کا مقابلہ ہوا کرتا تھا۔
اس کے باپ نے اس کو ان مقابلوں میں شریک کر دیا جہاں
اس نے اپنے سے کئی گنا زیادہ عمر کے شاطروں کو شکست
دے دی۔ اب اس کے جارجا نہ پن کو ایک راستہ مل گیا تھا۔
اسی دوران اس کے دادا کا انتقال ہو گیا۔ ایلیوینڈر
اپنے دادا سے بہت قریب تھا۔ دادا کی موت نے اس کے
ذہن پر برا اثر ڈالا۔ اس نے ووڈ کا چینی شروع کر دی۔ وہ
نئے میں رہنے لگا تھا۔ اس کے دو ہی مشاغل تھے۔ شراب
لوٹی اور شطرنج کھیلنا۔ وہ پارک میں جا کر مقابلہ کیا کرتا۔ اس
پارک میں بہت سے شاطر آیا کرتے تھے۔ ایک دن اس پر
ایک انکشاف ہوا کہ چھوٹی عمر کے بچے اس کو بہت
attract کرتے ہیں۔ اس نے بچوں کے ساتھ کھیلنا
شروع کر دیا۔ ان کو لالچ دینے لگا۔ ایک دن وہ ایک کم عمر
بچے کو اپنے ساتھ اپنے فلیٹ پر لے گیا۔ اس کا فلیٹ ساتویں
منزل پر تھا۔ بچہ اس کے بھکاوے میں آکر اس کے ساتھ چلا
آیا تھا۔ اس نے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی بچے کو بے بس کر
کے اس کی ٹانگیں باندھ کر اسے کھڑکی سے لٹکا دیا اور دمکی دی
کہ اگر اس نے اس کی بات نہیں مانی تو وہ اسے نیچے گرا دے
گا۔ بچہ رونے لگا اور اس کی بات ماننے پر مجبور ہو گیا۔
اس طرح اس کے ایک گناؤں نے شطرنج کا آغاز ہو گیا۔
اس نے پہلا معلوم قتل 1992ء میں کیا تھا۔ یہ سلسلہ
2001ء تک جاری رہا۔

اس کا طریقہ واردات مختلف تھا۔ وہ پارک میں جا کر
یہ بچوں کو تلاش کرتا جو آوارہ گرد یا بھکاری ہوں۔ وہ ان کو
ووڈ کا لالچ دے کر اپنے فلیٹ میں لے آتا۔ جی بھر کر ووڈ کا
آتا اور جب وہ نہش میں مدھوش ہو جاتا تو ان کو قتل کر کے
ان کی کھوپڑی میں سوراخ کرتا اور ووڈ کا کی بوتل اس شکاف
سے ٹھونس دیتا۔

اس کے بیانات بھی بہت عجیب ہیں۔ اس نے کہا کہ
وہ کسی کو قتل کرتا ہے تو خود کو حاکم محسوس کرنے لگتا ہے۔
یونکہ وہ پہلے اپنے شکار کو بے ہوش کرتا ہے اور جب وہ شکار
بے ہوش کی حالت میں اس کے سامنے پڑا رہتا ہے تو اسے ایسا
نہا ہے جیسے اس شخص پر اس کو مکمل اختیار ہے چاہے تو زندگی
سے دے یا چاہے تو موت کے گھاٹ اتار دے۔

اس وقت وہ اپنے اندر ایک ہیجان، ایک سرشاری سی
وس کرتا تھا۔ وہ خود کو خدا سمجھنے لگا تھا کہ زندگی اور موت پر
کو اختیار ہے۔ اس نے کہا کہ کسی کو مارنا میرے لیے اتنا

دلانے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔

چارلس کا خیال تھا کہ قدرت نے اسے ایک خاص مشن پر اسپتال کی ملازمت دلوائی ہے۔ لہذا قدرت کی مرضی کو پورا کیا جائے۔ اس نے اپنی بے رحمی کا آغاز اسی اسپتال سے کر دیا۔ اس کا تعلق چونکہ میڈیکل کے شعبے سے تھا۔ اسی لیے ہر قسم کی دوائیں وہ حاصل کر لیتا تھا۔

اس نے اپنے مشن کا آغاز ایک بوڑھے مریض سے کیا تھا۔ وہ بے چارہ اسپتال کے بیڈ پر تھا۔ چارلس کی ذمہ داری اس کی دیکھ بھال تھی۔ اس نے اپنے طور پر یہ سوچا کہ یہ مریض اب ٹھیک تو ہونے سے رہا تو کیوں نہ اسے تکلیف سے نجات دلا دی جائے۔ یعنی وہ کام کیا جائے جس کے لیے اسے بھیجا گیا ہے۔ لہذا اس نے ایک دن اس بوڑھے کو ہر کا انجکشن لگا دیا۔ بوڑھا کچھ دیر بعد ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ سینٹ بارن باس کے اسپتال میں اس نے اس طرح کئی وارداتیں کیں۔ اس نے ایڈز کے مریضوں کو قوت سے پہلے موت کی نیند سلا دیا۔

اسپتال والوں کو اس کے خلاف شبہ ہونے لگا تھا۔ کیوں کی اس کے چارج میں جو دوائیں ہوتی تھیں ان میں کمی آنے لگی تھی۔ اس نے جب محسوس کیا کہ شبہ یقین میں بدل رہا ہے تو اس نے اسپتال کی ملازمت چھوڑ دی۔

اس نے ایک اور اسپتال میں ملازمت کر لی۔ یہاں بھی اس نے کئی مریضوں کا خاتمہ کیا۔ ایک بار اسے نہ جانے کیا سوچھی کہ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والی ایک نرس کی رہائش گاہ میں رات کے وقت داخل ہو گیا۔ وہ نرس اور اس کا بیٹا اس وقت سو رہے تھے۔ نرس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کو جانتا دیکھ کر چارلس فرار ہو گیا۔ نرس نے پولیس میں رپورٹ کر دی۔ چارلس کو گرفتار کر لیا گیا لیکن اس پر کسی کے گھر میں داخل ہونے کا الزام تھا۔ اسی لیے اسے صرف ایک سال کی سزا دی گئی۔

ایک سال قید میں رہنے کے بعد اس نے نیوجرسی کے ایک اور اسپتال میں ملازمت کر لی۔ جس کا نام ”سمریٹ میڈیکل سینٹر“ تھا۔ اس کی حرکتیں یہاں بھی جاری رہیں۔ یہاں اس کو پھر شبہ کا سامنا کرنا پڑا۔ کیوں کہ دوائیں غائب ہونے لگی تھیں۔ اس کے ساتھ کام کرنے والی ایک نرس کو اس پر شبہ ہو گیا تھا۔ اس نے رپورٹ کر دی۔ چارلس سے انکو انری ہوئی۔ اس نے اقرار کر لیا کہ وہ دوائیں چوری کرتا رہا ہے۔ اس جرم پر اسے اسپتال سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد اس نے ایک جگہ ملازمت کی اور اس وقت پکڑا گیا جب وہ

ایک ایسے مریض کے کمرے میں موجود تھا جس کے کمرے میں اس کی ڈیوٹی نہیں تھی۔ اس کے پاس سے انجکشن برآمد ہوا تو اسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔

اس کے بعد جو اس نے اپنے کیے ہوئے قتل کی فہرست منواری شروع کی ہے تو پولیس والے حیران رہ گئے اس کے مطابق اس نے اپنے سولہ سالہ کیریئر میں تین سو سے زائد افراد کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

علی امصر برود جردی۔

اس ٹھنڈے دل و دماغ کے بے رحم قاتل کا تعلق ایران سے تھا۔ اس کی پیدائش ایران کے شہر ہمدرد میں 1893ء میں ہوئی تھی۔ اس کا باپ مرزا ایک رجزن تھا۔ وہ قاتلوں کو لوٹا تھا اور قتل کرتا تھا۔ یعنی علی امصر کو جرم اس کی وراثت میں ملا تھا۔ اس شخص کے بے رحمانہ کارناموں پر ناؤں بھی لکھے گئے ہیں۔ ایران میں بیسویں صدی کا وہ پہلا سیریل کھڑ تھا۔

اس کے گھر والے عراق منتقل ہو گئے تھے۔ اس نے صرف 14 برس کی عمر سے بچوں کے ساتھ زیادتی کرنے اور انہیں ہلاک کرنے کا آغاز کیا تھا۔ وہ ایسا قاتل تھا جس نے پولیس کو پیچھے دے رکھا تھا کہ اس کے خلاف کوئی ثبوت ہو تو سامنے لائیں۔

وہ بچوں کی لاشوں کو تیزاب میں ڈال کر کھل دیا کرتا تھا۔ مرنے والوں کی باقیات بھی باقی نہیں رہتی تھیں۔ اس کی گرفتاری اس وقت عمل میں آئی جب وہ ایران واپس آکر اپنے مکروہ قتل میں مشغول تھا۔

اس نے ایک پارک میں ایک بچے کو اپنا نشانہ بنایا اور جب وہ اس کو ہلاک کر رہا تھا تو ایک دوسرے بچے نے یہ سب کچھ دیکھ لیا۔ اس نے جا کر اپنے والدین کو بتا دیا۔ اس کے باپ نے پولیس کو رپورٹ کر دی۔ امصر کی حرکتیں تو پہلے ہی سے مشکوک تھیں۔ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔

اس نے اپنے جرائم کا اعتراف کر لیا اور پولیس کو وہ جگہیں بھی دکھادیں جہاں وہ بچی کھچی چیزیں دفن کیا کرتا تھا۔ اس نے ستر بچوں کے قتل کا اعتراف کیا تھا۔ جنوری 1934ء میں اسے موت کی سزا دے دی گئی۔

یہ چند لوگ تھے۔ تاریخ ایسے مکروہ اور بے رحم ناموں سے بھری ہوئی ہے۔ اجتماعی قاتل ہوں یا انفرادی قاتل۔ سب انسان کے دشمن ہوتے ہیں۔ چاہے وہ کسی نام سے ہوں۔

گمشدہ شہزادی

فرزانہ نگہت

یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ وہ جن کے ساتھ رہ رہی تھی ان سے اس کا کوئی رشتہ نہیں اور وہ کوئی معمولی بستی بھی نہیں ہے۔ اس کا تعلق تو ایک شاہی خاندان سے ہے۔ وہ ایک گمشدہ شہزادی ہے۔



خانہ جنگی سے پیدا ہونے والا ایک دلچسپ واقعہ۔

اپریل 2004ء میں بالآخر سارہ کلیرن کو وہ کال مل ہی گئی جس کا وہ تیس سال سے انتظار کر رہی تھی۔ اس وقت وہ لاس اینجلس میں اپنی ایک دوست کے ساتھ ایک پرجوش ساحلی کیفے میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ وہاں ایسا شور مچا ہوا تھا کہ اسے دوسرے سرے سے بولنے والے کی آواز بمشکل ہی سنائی دے رہی تھی۔ جو گیارہ ہزار کلومیٹر دور افریقہ سے بول رہا تھا۔
”یہ تمہارا باپ جوزف کو نیا کیا سووا ہے۔“ اس آواز نے سارا نے اسے ہولڈ آن کرنے کو کہا اور کیفے سے نکل کر پرجوش سڑک پر دوڑتی ہوئی کپڑے کے ایک اسٹور میں داخل ہو گئی۔ وہاں نئے اور پرانے کپڑے تختوں پر ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے۔ لیکن شور نہیں تھا اور وہ فون کی آواز صاف سن سکتی تھی۔
”معاف کرنا۔ میں نہ جانتا تھا کہ تمہیں کیسے تلاش

کروں۔“ فون کرنے والے نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

”معذرت خواہ ہوں۔ میں تمام عمر آپ سے شاکر رہی لیکن اب ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔“ سارا بولی۔

اٹھائیس سالہ سارا کا اس سے پہلے بھی اپنے والدین سے رابطہ نہ ہو پایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جان بوجھ کر اسے تلاش کرنے اور اس سے رابطہ کرنے سے مجتنب تھے۔ امریکا میں اس کے والدین جم اور جوڈی کلبرن نے اسے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ اس کا باپ سلیم کان مغربی ورجینیا یونیورسٹی میں سیرالیون سے متبادل طالب علم کے طور پر پہنچا ہوا تھا۔ وہاں اس کے ایک سفید فام لڑکی سے تعلقات قائم ہو گئے جس کے نتیجے میں وہ حاملہ ہو گئی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد وہ اسے کسی بے اولاد جوڑے کو دے دیں گے۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ سارا کا باپ اپنے وطن لوٹ گیا۔

اب وہ اپنی بیٹی کو مجبور کر رہا تھا کہ وہ اس کے پاس چلی آئے اور اس سے ملے۔

”ایک شاہی خاندان کے فرد کی حیثیت سے تم ایک نہ ایک دن یہاں کی حکومت سنبھالو گی۔“ اس نے اس سے کہا۔

اس لمبے سارے محسوس کیا کہ اس کی زندگی ہمیشہ کے لیے تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کا مہذب دینا سے کوئی واسطہ نہ رہا تھا۔ وہ اب چھوٹے جنگ زدہ غیر محروف سے گاؤں سے جڑ گئی تھی۔

سارا مغربی ورجینیا میں ایک نابل امریکی لڑکی کی طرح پبلی بوجی، جم، ورجینیا ویسٹ یونیورسٹی کے پروفیسر اور جوڈی خصوصی تعلیم کی کیمپ کے اس پر محبت اور حوصلہ افزائی کے بھرپور

خزانے لٹائے۔ اس کے باوجود وہ اس احساس سے بھی چھٹکارا نہ پاسکی کہ وہ اپنے خوب صورت بالوں والے خاندان یا کمیونٹی سے ہرگز تعلق نہیں رکھتی تھی۔ پیشتر گوئیے بچوں کی طرح وہ بھی

ایک طرح کے احساس عدم تحفظ اور بے چینی میں جٹ گئی۔ ایسی صورتوں میں یہ ہوتا ہے کہ گود لینے والے والدین میں سے اگر

ایک چھوڑ دیتا ہے تو پھر دوسرا بھی کیوں کر رکھے گا یا وہ سوچا کرتی تھی کہ مجھے زیادہ سے زیادہ اچھی بچی بننے کی کوشش کرنی چاہیے

تاکہ وہ مجھے چھوڑنے کا مجھی نہ سوچیں۔

سارا اچھی طالبہ اور بلند پایہ تحلیل تھی۔ وہ طلبہ عظیم کی صدر بھی تھی اور قلاچی کاموں کی شوقین بھی۔ ”وہ لوگوں کو خوش

کرنا جانتی ہے۔“ جوڈی کا کہنا تھا۔ ویسٹ ورجینیا یونیورسٹی میں تھیمز کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ سان فرانسسکو میں

امریکن کنزرویٹری تھیمز کے گریجویٹ اسکول چلی گئی۔ وہاں 1999ء میں اس نے اپنے اصل والدین کی تلاش کا آغاز کیا۔ اس کے گود لیے جانے والے کاغذات میں اس کے حقیقی والدین کے نام جس طرح درج کیے گئے تھے اس سے ان کا پتا چلانا مشکل تھا لیکن اس نے اس سلسلے میں تلاش و جستجو کی ٹھان لی۔

جب اس نے جوڈی کو بتایا کہ وہ اپنی ماں کو تلاش کرنا چاہتی ہے تو جوڈی نے اسے بتایا کہ جس عورت نے اسے جنم دیا تھا وہ دس سال پہلے انتقال کر چکی تھی۔ اس کے باپ کے بارے میں البتہ وہ کچھ نہ جانتی تھی۔ سارا کو خاصی مایوسی ہوئی اس نے اپنے اصل باپ کی تلاش و جستجو میں اپنے آپ کو تذبذب اور ہچکچاہٹ کا شکار ہوتے محسوس کیا۔

2001ء میں وہ لاس اینجلس پہنچی اور ٹیلی ویژن اور فلموں میں چھوٹے چھوٹے رول ادا کرنے لگی۔ اس دوران اس نے ہائی اسکول کے طلباء کو قرض کی تعلیم دینا بھی جاری رکھا۔ پھر جب وہ بیس سال سے اوپر کی عمر کو پہنچی تو اس پر ایک بے نام سی اداسی اور مایوسی طاری رہنے لگی۔ وہ جب کسی مرد کے قریب ہوتی تھی تو بے خوف کہ وہ کہیں اسے چھوڑ ہی نہ دے اسے خود اس سے اپنے تعلقات توڑنے پر مجبور کر دیتا تھا۔

2004ء میں سارا نے ایک قیادت تربیتی کورس میں داخلہ لے لیا۔ ایک سیشن پر انسٹرکٹر نے اس سے پوچھا۔

”تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ اپنے آگے بیٹھے ہوئے آدمی کو بتاؤ۔“ وہ آدمی اس کا پرانا دوست آرٹ تھا۔ ”میں اپنے حقیقی باپ کی تلاش سے خوف زدہ ہوں۔“ سارا نے اس کے سامنے اعتراف کیا۔

آرٹ نے اسے تسلی دی کہ اس کی تلاش اسے اطمینان و سکون عطا کرے گی۔ آرٹ نے اسے بتایا کہ وہ ایک ایسے سرافرساں سے واقف تھا جو صرف سوڈا میں اس کے باپ کے تلاش کر سکتا تھا۔

اس سرافرساں نے صرف تین گھنٹے کی گفتیش و جستجو کے بعد میری لینڈ میں ایک نام جوزف کو نیا کپا سودا و موٹو نکالا۔

سارا نے ایک تعارفی نوٹ پر محنت کی اور انتہائی بے چینی اور اضطراب کے عالم میں اسے پہنچ دیا۔ جلد ہی اسے ایک عورت کی طرف سے کال موصول ہوئی۔ ”میں ایولین ہوں تمہاری

خالہ۔ میں تمہاری پیدائش کے موقع پر موجود تھی۔“

سارا سسکیاں لے کر رو نہ لگی۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ یہ جوزف دراصل اس کا چچا تھا۔ رابطہ ہونے پر اس نے اسے

فون کیا اور بولا۔ ”کیا تم جانتی ہو کہ تم ایک شہزادی ہو؟“ اسی نے اسے بتایا کہ وہ سیرالیون کے جنوب میں مینڈے قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔ تیرا عظیم افریقا میں بحرا قیقانوس کے کنارے واقع ساتھ لاکھ کی آبادی کے ملک سیرالیون میں اس کا دادا چھتیس ہزار نفوس پر حکمران تھا جب وہ مرا تو سارا کا باپ اپنے آپ کو اس کا وارث قرار دیتے ہوئے مینڈے قبیلے کا حکمران بن سکتا تھا لیکن اس نے حکمرانی پر ایک مقامی ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر کی ملازمت کو ترجیح دی اور اس کا بھائی جو اس کا ہم نام تھا۔ قبیلے کا سردار بن گیا۔ یہ قبیلہ جنوبی سیرالیون کے ایک بہت بڑے گاؤں میں آباد تھا جس کا دارالحکومت پیسے تھا۔

ان اطلاعات نے سارا کا دماغ ہلا دیا۔ پھر جب دو ہفتے بعد اس کے باپ نے اس سے رابطہ کیا تو وہ تمام معاملات کو زیادہ صاف اور واضح طور پر سمجھنے لگی۔

جب سارا حصولِ تعلیم پھر ملازمت میں مشغول تھی تو اس عرصے میں جوزف کو نیا کپا سودا افریقا کی انتہائی خونریز خانہ جنگی میں بھٹا کی جنگ لڑ رہا تھا۔ 1999ء اور 2002ء کے درمیان انقلابی متحدہ محاذ کے گوریلے جن میں زیادہ تعداد بگڑے ہوئے بچوں اور جوانوں کی تھی، نے سیرالیون میں خوف و دہشت کا راج قائم کر رکھا تھا۔ اس خانہ جنگی میں مرنے والوں کی تعداد کا اندازہ پچاس ہزار کے لگ بھگ لگایا جاتا ہے۔

یہ خانہ جنگی چمڑنے سے پہلے جوزف نے ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھی تھی۔ 1994ء میں جب شری پند پیسے میں داخل ہوئے تو وہ اپنے بیوی بچوں اور مٹی بھر رشتے داروں کے ساتھ پیسے سے فرار ہو گیا تھا۔ یہ لوگ چار سالوں تک قرب و جوار کے دیہاتوں میں چھپتے، دوسرے مہاجرین کے ساتھ تنگ و تاریک گھروں میں رہتے رہے۔

پھر جب باغی پسا ہو گئے تو جوزف پیسے واپس آ گیا جو اس وقت مہیب جاہلی و بربادی کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ باغیوں نے آدھے سے زیادہ گاؤں جلا کر رکھ کر دیا تھا اور جوزف کی ایک بہن بھی ان کے ہاتھوں ماری گئی تھی۔ پیسے ہائی اسکول کی جست کی چھت باغیوں نے ہتھیار بنانے کے لیے اتاری گئی تھی اور ڈیک اور کتا میں چولہے جلانے کے لیے استعمال کر لیے تھے۔ انہوں نے لیبارٹری کا سامان بھی توڑ پھوڑ دیا تھا۔

اس اسکول کی بنیاد 1963ء میں رکھی گئی تھی۔ اس وقت سے وہاں سیرالیون پھر سے اور آس پاس کے ملکوں سے جھوس کے لگ بھگ طلباء آ کر تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اب یہ طے ہے ڈیمر بن چکا تھا۔ جوزف اور اس کے رفقاء نے اس کی تعمیر نو کا

آغاز کیا مگر اس کی رفتار سست تھی۔

جوزف کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ اپنی اس بیٹی سے رابطہ کرے جسے وہ امریکا میں چھوڑ آیا تھا۔ اب اس نے اسے تلاش کر لیا تھا۔ اس نے موبائل پر سارا کو کال کی۔ پھر جب اس نے اس کی ہنسی کی آواز سنی تو اسے بے اختیار وہ عورت یاد آگئی جس سے اس نے نئی سال پہلے محبت کی تھی۔ اس نے سارا کو بتایا کہ وہ اور اس کی ماں اسے دوسرے لوگوں کے حوالے کر کے گتے دھکی اور مغنوم ہوئے تھے لیکن ان کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ وہ اسٹوڈنٹ ویز اپرایا ہوا ایک تہی دست طالب علم تھا اور اس کی ماں ایک چائے خانے میں ملازمہ تھی۔ ان کے لیے اس کی پرورش و پرداخت ممکن نہیں تھی۔

اس نے سارا کو اپنے خاندان کے ساتھ پیش آنے والے حادثات اور مصائب کے بارے میں بتایا اور کہا کہ ان کی بدولت وہ طویل عرصے تک اس سے رابطہ نہ کر پایا تھا۔ جب اس نے کہا کہ وہ مجھ سے ملنے آئے گی تو اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس سے بڑھ کر اہم اور مہم سرت دن میری زندگی میں کبھی نہ آیا تھا۔ اس نے بعد میں بتایا تھا۔

اس ماہ دسمبر میں سارا اپنے دوست اور کوچ جان ولرے کے ہمراہ سیرالیون کے دارالحکومت فرنی ٹاؤن کے ایئر پورٹ پر اتری۔ اس کا باپ جس کے بارے میں اس نے تصور کر رکھا تھا کہ وہ ایک دراز قد اور وجیہ شخص ہو گا وہاں اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اس کے تصور کے برعکس وہ ایک کوتاہ قامت معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا۔ اس نے اسے سینے سے لگایا اور آبدیدہ ہوا۔ سارا کے جذبات بھی اس سے مختلف نہ تھے۔ ”وہ مجھے بے حد قابلِ محبت معلوم ہوا تھا“۔ سارا نے بعد میں بتایا تھا۔

پھر جوزف نے سارا کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک طرف کھڑے درجن مہاجر افراد خاندان سے ملوانے لے چلا۔

رات بہت اندھیری تھی۔ شدتِ جذبات سے مغلوب سارا ہوائی کی طرف جاتے ہوئے گرد و پیش کے ماحول کی طرف کوئی توجہ نہ دے رہی تھی۔ اگلی صبح وہ ورائے اور اس کا باپ جوزف کی کھٹار سی لینڈ روور میں سوار ہوئے اس وقت سارا کو گرد و پیش کا ماحول دیکھنے کا موقع ملا۔ شہر کا بیشتر حصہ ابھی تک کھنڈر بنا ہوا تھا۔ عمارات پر گولیوں کے نشانات تھے۔ سڑک کے کنارے چھتروں میں ملبوس بچے مالے فروخت کر رہے تھے۔ سڑکیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں۔

پانچ گھنٹوں کی مسافت پر واقع پیسے ڈھلوان چھتوں

والے گھروں پر مشتمل ایک مختصر سی بستی تھی جس کے ارد گرد دور دور تک اردو اور آلودوں کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ بستی کے باہر بے شمار لوگ ان کی آمد کے منتظر کھڑے تھے۔ انہوں نے لینڈ روور کو گھیر لیا اور اپنی زبان میں بلند آواز سے گیت گانے لگے۔ جوزف نے سارا کو کوس کر ترجمہ سنا۔ ”خوش آمدید شہزادی۔ خوش آمدید سارا۔ تم اپنے آبائی گھر آ گئی ہو۔ ہم تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ ہم تم سے بہت محبت رکھتے ہیں۔“

سارا اپنے آنسو پونچھتی ہوئی گاڑی سے اترتی اور وہاں مجمع عورتوں کی ہمراہی میں ایک بڑی سی سرخ عمارت کی طرف ہوئی جو گہکی بنی ہوئی تھی جس کے گرد بلند و بالا گھنے درخت اُگے ہوئے تھے۔ وہاں شاندار خیافت کا انتظام تھا۔ وہ اپنے باپ اور دیگر عمائدین کے ساتھ ایک میز پر جا بیٹھی۔ خیافت کے اختتام پر رقص و موسیقی کی محفل برپا ہوئی جو غروب آفتاب تک جاری رہی۔

بچے میں سترہ دن قیام کے دوران سارا اور جوزف کی بیوی بھری کے دو میاں گھر سے دوستانہ تعلقات استوار ہو گئے۔ سارا کی سوتیلی بہن بیس سالہ حنیہ اور پندرہ سالہ بھائی ہائیڈرو بھی اس سے بے تکلف ہو گئے۔ سارا نے انہیں خاصا ذہین و فہم اور مہذب و تیز اور پایا۔ دوسرے رشتے دار بھی اس سے ملنے آتے رہے۔ جب وہ آتے اس کے لیے مرغی ضرور لاتے کیونکہ سارا نے بتایا تھا کہ مرغی اور چاول اس کی پسندیدہ خوراک ہے۔

یہ بات اسے بعد میں معلوم ہوئی کہ وہاں مرغیاں شاذ ہی عام لوگوں کی خوراک میں استعمال ہوتی تھیں۔ انہیں صرف نہایت معزز مہمانوں کے لیے مخصوص سمجھا جاتا تھا۔

”میں نے اپنی زندگی اس احساس کے ساتھ گزاری تھی کہ مجھے کوئی بڑا فائدہ بخش کام کرنا چاہیے۔ جب میں اس گاؤں میں پہنچی تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ جگہ میرے اس مقصد کے لیے بہترین تھی۔“ سارا نے بعد میں کہا تھا۔

سارا کو یہ دیکھ کر افسوس ہوا تھا کہ وہاں ایسے بچے اور بڑی عمر کے لوگ بھی تھے جو باغیوں کے ہاتھوں اپنے مختلف اعضاء سے محروم ہو چکے تھے۔ صاف پانی اور ضروری ادویات بہت کم دستیاب تھیں اور گاؤں کی بیشتر آبادی طبر یا میں مبتلا تھی۔ اس کے باپ کے اسکول کے دو سو طالب علم بغیر صحت کے کمروں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان کے حوصلے بلند تھے۔ وہ زندگی میں اپنا مقام بنانا چاہتے تھے۔ ”یہ لوگ تو جہنم سے گزر کر آئے ہیں۔ پھر بھی یہ کہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں خواہ کتنی ہی قیامتیں ہم پر ٹھیں ہم تعلیم سے مستنہ موزیں گے۔“ سارا

نے انہیں دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

پھر ذمہ داری کے سوالوں سے جنگ کرتی سارا اس انجیلز لوٹ آئی۔ ”وہ اس ماحول میں اپنا کردار تلاش کر رہی تھی۔“

جان ولرے نے کہا تھا۔ ایک جزوقتی رقص کی تعلیم دینے والی، اپنا مقام بنانے کی جدوجہد میں مصروف اداکارہ ان لوگوں کے لیے کتنی توانائی اور رقم خرچ کر سکتی تھی؟

ولرے نے اس سلسلے میں سارا کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اور سارا نے مل کر پیسے کے ہائی اسکول کے لیے دو لاکھ ڈالر جمع کرنے کے لیے کپاساؤ فاؤنڈیشن قائم کی۔ سارا جس اسکول میں رقص کی تعلیم دیتی تھی۔ وہاں اس نے ایک میلہ منعقد کیا جس سے اسے ساڑھے آٹھ سو ڈالر کی آمدنی ہوئی۔ ایک کنسرٹ کے انعقاد سے اسے سولہ ہزار ڈالر مل گئے۔ اس کے گوریلے والدین بھی مختلف طریقوں سے فنڈ جمع کرنے میں اس کی مدد کرتے رہے۔

مارچ 2007ء میں سارا اور ولرے افریقا پہنچے۔ وہاں انہوں نے ایک این جی او قائم کی جس نے گاؤں والوں کو اس قابل کر دیا کہ وہ اسکول کی تعمیر نو کے لیے کچھ کر سکیں۔ اس وقت تک فاؤنڈیشن کے فنڈ میں چوبیس ہزار ڈالر جمع ہو چکے تھے۔ اس رقم سے اسکول کے کمروں پر چھتیں ڈالی گئیں۔ کمریاں اور دروازے بنوائے گئے۔ کتابیں خریدی گئیں۔ آج وہاں طلباء کی حاضری پینتالیس فی صد سے بھی تجاوز ہے۔

جب سارا نے بچے کا دوسرا دورہ کرنے کا ارادہ کیا تو اس نے اپنے اختیاری والدین سے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ ”سارا اپنے دونوں باپوں کو ایک جیسا پسند کرتی ہے اسی لیے اس نے ہماری آپس کی ملاقات کا سوچا۔“ جم کلبرن نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

جوزف کپاساؤ بھی اس سے متفق تھا۔ ”میں کلبرن میاں بیوی کامنوں احسان ہوں جو کچھ ہوا ہے اسے ایک بڑا انعام ہی کہنا چاہیے۔“

جہاں تک سارا کا تعلق ہے تو اس نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ قدرت اس سے اتنا بڑا کام لے گی کہ اس کے ہاتھوں پسماندہ افریقا کا ایک تباہ شدہ گاؤں تعلیم کی روشنی سے منور ہونے لگے گا۔ وہ کہتی ہے۔ ”میں نہیں جانتی تھی کہ میں یہ سب کچھ کیونکر کر سکوں گی لیکن اب میں جو جانتی ہوں وہ یہ ہے کہ یہ میرا خاندان ہے۔“





شمشال ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمین پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر و کوہسار سب کے سب بے نظیرو بے مثال ہیں۔ لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔

ایک جدا گانہ انداز کی دلچسپ سرکہانی کا انیسواں حصہ

پری جمال کی والدہ اس رشتے سے خوش نہ تھی لیکن اس کے پاس انکار کرنے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔

پھر کسی دور کے رشتے دار کی شادی میں پری جمال اپنی ماں کے ساتھ شریک ہوئی۔ وہاں ایک اور خاندان بھی شریک تھا جو اپنے امریکا میں مقیم لڑکے کے لیے کسی انتہائی

پری جمال کا رشتہ اس کے پھوپھی زاد سے بچپن میں طے پا چکا تھا۔ وہ شروع سے ایک ساتھ لے بڑھے تھے اور دلوں میں چاہت بھی گہر کر چکی تھی۔ یہ شکل کی بہت اچھی تھی اور پھوپھی زاد بھی اس کے جوڑ کا تھا۔ وہ میٹل لاہور میں باپ کے ساتھ کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹاتا تھا اور مالی طور پر ان لے بہتر بھی تھا۔

دس لاکھ روپے دیئے اور کسی اور کے پاسپورٹ پر فوٹو تبدیل کر کے لڑکی کو کینیڈا پہنچا دیا جہاں کینیڈا ایجنٹ کر ایک اور ایجنٹ نے دو ہزار ڈالر لے کر پری جمال کو امریکا کی بارڈر پار کروا دی تھی مگر سوئی قسمت کہ وہ امریکیوں کے ہاتھ پکڑی گئی۔ انہوں نے اس کی فائل چیک کی تو معلوم ہوا کہ وہ کینیڈا ابھی غیر قانونی طور پر غلط طریقے سے آئی ہے۔ انہوں نے اسے کینیڈین امیگریشن کے حوالے کر دیا اور انہوں نے کل اسے ہولڈنگ سینٹر میں بند کر دیا اور آج وہ بیٹھی مجھے اپنی کہانی رو رو کر سن رہی تھی۔

اس کی کہانی جب ختم ہوئی تو رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ اسی دوران میں نے بریک بھی نہ لی تھی۔ بیدی نے ایک دو بار فون کر کے مجھ سے بریک کا پوچھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ پری جمال کو اس کا کھانا کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔

میں نے اس سے کہا کہ تم یہ کھانا کھاؤ اور میں خود بریک روم میں بیٹھا سوچوں میں ڈوبا چاہئے یا نہ رہا تھا۔ وہ مجھ سے مدد مانگ رہی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس کی مدد کیا ہے نہیں کر اسے واپس پاکستان بھیج دیا جائے۔ مجھے یہ قوی امید تھی کہ امیگریشن کینیڈا والے بھی اس کے سامنے یہ امر رکھیں گے کہ یا تو وہ ڈی پورٹ ہو جائے یا پھر وکیل کی بھاری فیس ادا کر کے جج کے ہاتھوں ڈی پورٹ ہو۔ میں دل سے چاہتا تھا کہ وہ پھر سے اپنے پھوپھی زاد کی ہو جائے۔ امریکا میں اس کا شوہر اسے بلو انہیں سکتا اور اگر کسی طرح سے بلو ابھی لیا تو ساری عمر اس سے سپراسٹوروں یا ریلٹوٹورنٹ پر کام کروائے گا۔

میں نے چائے ختم کی اور دوبارہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے سامنے یہی تجویز رکھی اور کہا کہ اب بھی وقت ہے اس فراڈ سے باہر آ جاؤ۔ اس سے طلاق تم با آسانی لے سکتی ہو اور اپنی زندگی کو جنم مت بناؤ۔

میں تو سمجھا تھا کہ اس کو سمجھانے پر مجھے بہت محنت کرنی پڑے گی مگر وہ تو پہلے ہی سے تیار بیٹھی تھی۔ وہ دل سے راضی تھی تو باتی کا کام میرے لیے آسان تھا۔ اس سے کہا کہ یہاں کے امیگریشن آفیسر کو صرف یہ کہنا کہ کسی بھی طرح اسے واپس پاکستان بھیج دیا جائے۔ اس کے علاوہ مگر پاکستان میں فون کر کے یہ بتانا کہ کس فلائٹ سے تم واپس آ رہی ہو۔ میں نے پری جمال کو نصیحت کی کہ گھر پہنچ کر ڈٹ جانا کہ اس سے طلاق لینی ہے یہ بھی اسے بتایا کہ یہ مطالبہ

خوب صورت لڑکی کی تلاش میں تھا۔ ان کی تلاش جب ختم ہوئی جب وہاں انہوں نے حسین ترین لڑکی پری جمال کا جمال دیکھا۔ لڑکے کی ماں نے پری جمال کی ماں سے فون نمبر اور گھر کا ایڈریس مانگا۔ اپنا تعارف کر دیا اور پری جمال کی ماں کے ذہن میں ایک اور منصوبے نے جنم لیا امریکا میں کسی کا بیٹا ہو تو پاکستان میں اس کی ماں ہمیں اس کی شادی کے لیے پاکستان کی سب سے خوب صورت لڑکی تلاش کرتی ہیں۔ اس طرح سے پری جمال لڑکے کی ماں کی نظروں میں بھاگئی۔

لڑکی کی ماں کے دماغ میں یہ منصوبہ پروان چڑھ رہا تھا کہ اس کی بیٹی کی شادی امریکا میں مقیم لڑکے سے ہو جائے گی تو وہ دو طرح کے حدف حاصل کر سکے گی ایک تو پری جمال کا رشتہ اس کے پھوپھی زاد سے ختم ہو جائے گا اور دوسرا یہ کہ بہن اپنے بھائیوں کو امریکا بلوا لے گی۔ اس طرح ایک تیسرے دور شکار ہو جائیں گے۔ پری جمال کے والد نے آواز اٹھانے کی کوشش کی مگر اب تو لڑکے بھی اپنی لالچ میں ماں کے ساتھ مل گئے۔ پری جمال کی تو آواز دیسے ہی دب گئی جب والد بھی اپنے ہتھیار پھینک بیٹھا۔

کچھ عرصے بعد اس منصوبے پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ پھوپھی زاد کے رشتے کو ٹھکانے لگانے کے لیے دو چار ٹکڑے بھٹکڑے ہی کافی تھے۔ عید، شب برات کے کپڑوں میں نقص نکال کر واپس منہ پر مارنے سے بھی یہ رشتہ کمزور پڑ گیا اور باقی کے دو جھٹکے اس کو دوخت کر گئے۔ اب راستہ صاف تھا۔

لڑکے کو لڑکی کی تصویریں بھیجی گئیں۔ اس نے جھٹ پٹ لڑکی کو پسند کر لیا۔ ادھر لڑکی کی ماں اور بھائیوں نے یہ بھی نہ دیکھا اور نہ معلوم کیا کہ لڑکا امریکا میں کیا کرتا ہے اور اس کی اسٹیٹس کیا ہے۔ فون پر نکاح ہوا اور لڑکی اس کا سب پر رخصت ہو گئی۔ بہت مٹھائیاں بیٹیں، لڑکی کی قسمت پر رشک کیا گیا۔ ایک بڑے ہوٹل میں دعوت دی گئی تو لڑکی کی ماں نے جھومڑ ڈالی کہ ایسی نیک جنت لڑکی اللہ ہر ایک کو دے۔

اب پری جمال اپنے گھر میں امریکا جانے کے لیے سہاگن بنی بیٹھی تھی۔ لڑکے نے بہانہ کیا کہ وہ چھٹی نہ ملے گی وجہ سے پاکستان نہیں آ سکتا حالانکہ وہ سیاحتی ویزے پر امریکا میں آ کر ٹھہر گیا تھا۔ اس کے پاس امریکا میں کوئی اسٹیٹس نہ تھا۔ وہ امریکا چھوڑتا تو واپس داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ پری جمال کو امریکا بلوا بھی نہیں سکتا تھا۔ لڑکے نے کسی ایجنٹ کو

مسکرا رہے تھے۔ عمارتیں سفید برف کی چادر میں کھڑی زیادہ دلفریب نظر آ رہی تھیں۔

”کیا موسم ہے یہاں کا؟“ ابھی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک بارش ہوئی تو ساری عمارتیں، سڑکیں اور پارک دھل گئے اور نئے نئے ٹکڑے نظر آنے لگے۔ پھر برف باری نے منظر تبدیل کر دیا۔ قدرت نے سب محدود دھلا کر اسے سفید لباس پہنا دیا، ماحول بھر نظر آنے لگا۔ سب کو معلوم تھا کہ یہ موسم زیادہ دن رکنے والا نہیں ہے۔ چند دن کا مہمان اگر خوب صورت ہو تو بھلا محسوس ہوتا ہے۔

بدلتے موسم کس طرح سے انسان کے مزاج پر اثر انداز ہوتے ہیں، اس کا اندازہ پہلے بھی کئی بار ہوا تھا اور آج بھی ہو رہا تھا۔ برف کے نئے نگاروں سے بسورتے سرخی چہک رہے تھے اور چہکتا سفیدی منہ بسورے بیٹھا تھا۔ برف کی سفید چادر مجھے میرے بچوں کے پاس لے آئی تھی اور شہباز پر نہ موسم اثر کرتا تھا اور نہ گل و رنگ، اس کا مزاج کھانوں کی خوشبو پر خوشگوار ہوتا اور بچن کے برتن دھونے پر سوگوار..... زندگی اپنے حسین اور دلکش پہلو دکھلاتے ہوئے آہستگی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اگر کچھ سخت موڑ بھی آئے تو وہ بھی یادگار لمحات میں بدل گئے۔ دکھوں کی چادر اوڑھے نہیں رکھی بلکہ اسی چادر میں قدرت کے رنگوں کے پھول بھرنے کی کوشش کرتا رہا۔

آج بیوی اور بچے بے انتہا یاد آ رہے تھے۔ قدیل میری چار سالہ بیٹی اپنی توہلی آواز میں پوچھتی۔ ”بابا ہمارا دینا کب آئے گا؟“ یہ الفاظ مجھے بے چین کرویتے کہ اپنی بیٹی کو اپنے سینے سے لگا کر اس کے سر اور ماتھے کو بوسے دوں۔ اریہ ابھی چند ماہ کی تھی اور نہ اپنے بابا کو پہچانتی تھی اور نہ بابا اس سے مانوس ہوئے تھے۔ میری شریک حیات سمجھ بھی مجھ سے اس لیے لڑتی کہ میں خود مزے میں ہوں اور بھی مجھ پر ترس کھاتی کہ آپ کی کتنی مشکل زندگی ہے۔ وہ دونوں صورتوں میں مجھے اس لیے قبول بھی کیونکہ میں اسے چند سال پہلے تین بار قبول کر چکا تھا۔ اب وہی میرے لیے سب کچھ تھی۔

بچوں کی یاد نے دل پارہ پارہ کر دیا تھا۔ دل رورہا تھا جدائی مکمل رہی تھی لیکن کوئی چارہ نہیں تھا۔ ابھی اپریل کا مہینا تھا دوستوں کا اندازہ تھا کہ دیر اٹھنے میں چھ ماہ لگ جائیں گے مگر مجھے یقین تھا کہ میری فیملی دو تین ماہ کے اندر پہنچ جائے گی۔ یہیں میرے پاس ہوگی۔ ان کا میڈیکل تو

کرنے سے پہلے اپنے چھوٹی زاد سے بات کر لیتا۔ ٹکٹ کے پیسے اس کے پاس تھے، مجھے دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس کی آنکھوں میں اب تشکر کے آنسو تھے۔

جب میں ڈیوٹی ختم کر کے واپس جا رہا تھا۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور دعائیں دیں۔

اگلے ہفتے ہولڈنگ سینٹر پہنچا تو معلوم ہوا کہ پری جمال پچھلے منگل کو پاکستان واپس چلی گئی ہے۔

بے وفا کے تپور اور کینیڈا کا موسم ایک جیسا ہے۔ دونوں کو... بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ہم بہار کی ہواؤں سے لطف

اندوز ہو رہے تھے کہ ایک شام بادل گھر آئے۔ آسمان ڈھک گیا اور اندھیرا سا چھا گیا۔ پھر بارش ہوئی اور اگلی صبح تک ہوئی رہی۔ درجہ حرارت گر گیا اور بہار کی آمد ایک بار پھر موقوف ہوئی نظر آنے لگی۔ درجہ حرارت گرا تو دھند کے بادل زمین کی سطح پر اترنے لگے۔ ماحول دھواں دھار ہو گیا اور سرخی دوبارہ جاڑے کی آمد سے جھوم اٹھی۔ اپنی جیکٹس جوتہ کر کے افسردہ دل سے اپنے بیگ میں رکھ چکے تھے دوبارہ سے نکال لی۔ شہباز پتھرائی نظروں سے سرخی کی حرکات دیکھ رہا تھا اور وہ اپنی جیکٹ کو سونگھ کرین کو یاد کرتے جا رہے تھے۔

شہباز سرخی سے مخاطب تھا۔ ”میری مایا اور تمہاری بین کو ندیم بھائی یا نسرین کی بد دعا لگ گئی ہے۔ ورنہ وہ اتنی بے وفا کبھی نہ تھیں۔“

سرخی شہباز سے بولے۔ ”بے وفا مایا نہیں بلکہ تم تھے جو اس کے اتنے بڑے گھر کا رکھ رکھاؤ بھی نہ دیتے تھے۔“

یہ صورت حال کسی جھگڑے کی جانب جانے ہی والی تھی کہ اچانک برف باری شروع ہو گئی۔ اپریل کی برف باری پر مفتی حیران تھا۔ میں نے حیرانگی کی وجہ پوچھی تو بولا۔ ”اس سال اپریل میں برف باری نہیں ہونی چاہیے تھی۔“

میں نے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“

تو مفتی کی بجائے سرخی بولے۔ ”اپنے بہنوئی سے شرط لگائی ہوگی۔“

مفتی غصے میں آ گیا اور اس حالت میں چائے کا کپ ختم کر گیا اور پھر بولا۔ ”پچھلے سال اپریل میں برف پڑی تھی۔ اگر ایک سال پڑے تو دوسرے سال نہیں پڑتی۔“

سرخی نے مفتی کی بات سنی ان کی کردی اور باہر پڑی برف کو دیکھتے رہے جس نے ساری زمین پر چند منٹوں میں ایک سفید چادری بچھا دی تھی۔ درخت بھی یہ لباس پہن کر

بگ بینک سے کائنات کیسے وجود میں آئی؟

انسان شاید اس دنیا کی وہ سب سے عجیب مخلوق ہے، جو ہر وقت نہ صرف اپنے ماحول بلکہ اس وسیع کائنات کی ہر شے کو کھوجے، اس کی حقیقت جاننے کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔ یہی کھوج اسے آج چاند ستاروں اور کروڑوں نوری سالوں کے فاصلے پر واقع کہکشاؤں تک لے گئی ہے۔ جو سوال ہمیشہ سے اس کے دماغ میں کھلبلا رہے ہیں ان میں اول کائنات کے ان سر بہ رازوں کا حصول ہے جن میں سے کچھ سے پردہ اٹھایا جا چکا ہے اور بہت سوں کی کھوج ابھی باقی ہے۔ ہزاروں سال سے جاری سائنسی تحقیق، سوال و جواب اور رویاؤں کا سلسلہ اپنی جگہ، مگر آج سے تقریباً چار سو سال پہلے یورپ میں جو سائنسی انقلاب برپا ہوا، اس کی وجہ سے ہزاروں سال پرانے نظریے اور مفروضے غلط قرار پائے، وقت کے بہتے دھارے کے ساتھ فزکس میں نئے اصول وضع کیے گئے، اور ایسے آلات وجود میں آئے جن سے کائنات کی اصلیت اور ابتدا کو کافی حد تک سمجھنے میں مدد ملی۔ انسان آج بھی نئے طریقوں سے اس کوشش میں ہے کہ کائنات کی ایک جامع اور واضح تصویر عیاں ہو جائے بگ بینک کا نام تو آپ نے سنا ہوگا، اور ہو سکتا ہے اس حوالے سے کھوڑا بہت بڑھا اور سنا بھی ہو، چلیے آج میں آپ کے سامنے اس کی واضح تصویر کھینچ دیتا ہوں۔ بگ بینک انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی بڑے دھماکے کے ہیں۔ بگ بینک دراصل وہ دھماکا ہے جس سے ہماری یہ کائنات وجود میں آئی ہے۔ اس نظریے کے مطابق کائنات کے وجود میں آنے سے پہلے تمام مادہ ایک سوئی کے ہزاروں حصے کے برابر نہایت خفیف جگہ میں قید تھا۔ اگر مادے میں بہت زیادہ توانائی ہو، دنیا کے کسی بھی ذریعے سے حاصل کردہ توانائی سے زیادہ، تو کوشش شکل یعنی گریوٹی چیزوں کو اپنی جانب کھینچنے کے بجائے ایک دوسرے سے دور دھکیلنے والی قوت بن جاتی ہے۔ چنانچہ سائنس کے مطابق یہی بگ بینک کا وہ نکتہ آغاز تھا، جب تمام مادہ ایک دھماکے جیسی صورت حال کے بعد انتہائی تیزی سے ایک دوسرے سے دور ہونے لگا اور خلا میں پھیل گیا۔ اس وقت اس کی رفتار اس قدر زیادہ ہونے کی وجہ سے یہ کائنات تیزی سے پھیلنے لگی۔ آج اب بگ بینک، یعنی ہماری کائنات کے طبعی آغاز کو 13.8 کھرب سال ہو چکے ہیں۔ آپ میں سے اکثر لوگ یہ سوچیں گے کہ بھلا کائنات کی عمر کوئی کیسے بتا سکتا ہے؟ تو اس کا جواب ہمیں "جہل خلائی دورین" نے دیا ہے۔ اس دورین کی مدد سے لی گئی تصاویر میں ہمیں جو سب سے پرانی کہکشاں ملتی ہے، وہ زمین سے 13.4 کھرب نوری سال دور واقع ہے نوری سال "دراصل وقت کا پیمانہ نہیں ہے بلکہ فاصلے کا پیمانہ ہے اور ایک نوری سال کا فاصلہ تقریباً 10 کھرب کلومیٹر کے برابر ہے۔ یہ فاصلہ روشنی ایک سال میں طے کرتی ہے۔ اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جہاں ایک نوری سال ہی 10 کھرب کلومیٹر کے برابر ہے تو 13.8 کھرب نوری سال کتنے کلومیٹر کے برابر ہوں گے۔ اگر ہم پیمائش کر سکیں کہ کسی دور دراز ستارے یا کہکشاں سے روشنی ہم تک آنے میں کتنے سال لگے ہیں، تو ہم اس طرح قدیم سے قدیم تر کہکشاؤں کا پتا لگا سکتے ہیں۔ اب تک ہم نے جس قدیم ترین کہکشاں کا مشاہدہ کیا ہے، وہ چوں کہ 13.4 کھرب نوری سال کے فاصلے پر واقع ہے، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ کائنات کی عمر اس کے آس پاس ہی بنتی ہے۔

سائنس کا کہنا ہے کہ 13.8 کھرب سال پہلے نہ یہ سورج تھا، نہ یہ ستارے، نہ یہ کہکشاں، نہ یہ نظارے، بلکہ صرف

میرے ہی ساتھ ہو گیا تھا۔ تمام کاغذات مکمل تھے اب ہمیں میں پہنچ چکے تھے۔ فیس بھی میں نے جمع کرادی تھی۔ اب صرف پیپر ملنے تھے اور جیسے ہی پیپر ملے، میں کلٹ کفرم کروادیتا لیکن اس سے پہلے مجھے رہائش کا انتظام کرنا تھا جو ایک مشکل اور تھکا دینے والا مرحلہ تھا۔

یہاں اگر کسی کو کوئی چیز پہنچی ہو یا خریدنی ہو، کرائے پر لین ہو یا دینی ہو تو وہ ایک کاغذ پر اشتہار بناتا ہے اور اسے مختلف بس اسٹاپ پر لگا دیتا ہے۔ اس اشتہار کے نیچے اپنے فون نمبر کی متعدد اسٹریپ بھی لٹکا دی جاتی ہیں غرض منہ

اشتہار دیکھ کر اسٹریپ پھاڑ لیتا ہے اور بعد میں اسی نمبر پر فون کے ذریعے رابطہ کرتا ہے۔ میری تین بجے بیس سال سے وابستہ ہوئی۔ اپنی جاب سے واپس آتے ہوئے میرے دل میں خیال آیا اور میں اپارٹمنٹ کی بجائے گلابی مارکیٹ میں اتر گیا، مجھے کچھ گرومری کرنی تھی۔ اس دن سردی نے بدحواس کر دیا تھا۔ کبھی میں ابریل کے مہینے کو کوستا جس میں یہ سردی اٹھ آتی تھی اور کبھی ٹورنٹو سے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتا۔ گو میری یہ ساری آہ و بکا ریاں کبھی مگر اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے میں لگا تار بڑبڑا رہا تھا۔

دھماکے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بڑے بڑے ہائیڈروجن کیس کے بادل تھے۔ خلا میں موجود ان بادلوں کے جن حصوں میں ہائیڈروجن اور ہیلیم کی مقدار زیادہ تھی، ان حصوں میں گیسز سکڑنے لگیں اور سکڑتے سکڑتے کافی گرم اجسام کی شکل اختیار کر گئیں جنہیں ”ہم ستارے“ کہتے ہیں۔ مزید برآں ان ستاروں کے آس پاس چہاں گیسز کی مقدار کم تھی، وہاں بھی گیسز سکڑتی گئیں اور گرم (ستاروں سے کم گرم) اجسام بنے جو ستاروں سے چھوٹے تھے، اور کسی اپنے سے بڑے نزدیکی ستارے کی بہت زیادہ کشش کی وجہ سے اس (ستارے) کے گرد مدار میں چکر لگانے لگے۔ ان اجسام کو ”ہم سیارے“ کہتے ہیں۔ کئی ستارے آپس کی کشش کی وجہ سے جھرمٹ کی شکل اختیار کر گئے اور اس طرح کھکشا میں وجود میں آئیں۔ ہمارا سورج اور زمین جس کھکشا میں ہے اس کا نام ”مکلی دے“ ہے۔ اس کا نام مکلی دے اس لیے رکھا گیا ہے کیوں کہ اس کے بہت سے ستارے سفید نظر آتے ہیں، اس کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دودھ کی نہر یا راستہ ”ہو“ ”مکلی دے“ کا اردو ترجمہ ہے دودھ یا راستہ۔ جب زمین بنی تو اپنے نمودار اور سورج دونوں کے گرد بہت تیزی سے چکر لگا رہی تھی اور آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہوتی چلی گئی۔ زمین کی اپنی پیدائش کے وقت شکل بالکل ایسی تھی جیسے ہر جگہ آتش فشاں پھٹ رہے ہوں۔ لیکن جیسے ہی درجہ حرارت کم ہونے لگا تو زندگی بھی جنم لیتی گئی۔ تب نہ کوئی انسان تھا نہ جانور یہاں تک کہ سب سے چھوٹے جاندار یعنی بیکٹیریا تک کا وجود نہ تھا۔ لیکن تب بھی زمین پر ان سب کو جنم دینے والے عناصر یعنی معدنیات موجود تھیں۔ پھر کیمیائی ارتقاء کا آغاز ہوا جس میں ان معدنیات کے چھوٹے خلیے ملے اور مالیکیولز بنے اور پھر ان لاکھوں مالیکیولز کے ملنے سے ایسے خلیے وجود میں آئے جو خود سورج کی روشنی استعمال کر کے اپنی خوراک بنانے کے قابل تھے اور ان میں سے ہر ایک کا ایک بنیادی اصول تھا کہ مرنے سے قبل ہر خلیہ ایک سے دو ہو جاتا، اس طرح ان کی تعداد بڑھتی رہی۔ یہ بیکٹیریا ایسے جاندار تھے جنہیں زندہ رہنے کے لیے آکسیجن کی ضرورت نہیں تھی، البتہ یہ خود آکسیجن پیدا کرتے تھے۔ چون کہ ان کی تعداد کافی زیادہ تھی اس لیے زمین پر فضا میں آکسیجن کی مقدار بڑھنا شروع ہو گئی۔ فضا میں آکسیجن کی مقدار جیسے جیسے زیادہ ہوتی چلی گئی، ویسے ویسے کیمیائی ارتقاء (یعنی مادے سے خلیے بننے کا عمل) تھمتا گیا، یہی وجہ ہے کہ آج کوئی جاندار بے جان چیزوں سے نہیں بنتا۔ ارتقاء کھنٹوں، دلوں، یا سالوں پر محیط کوئی عمل نہیں ہے بلکہ یہ ایسی طویل زنجیر ہے جس کی ایک ایک کڑی کے جڑنے میں صدیاں گزر جاتی ہیں۔ اب کیمیائی ارتقاء کے بعد حیاتیاتی ارتقاء یعنی چھوٹے جانداروں سے دوسرے بڑے جانداروں کے بننے کا عمل شروع ہوا۔ بیکٹیریا سے شروع ہونے والا ارتقاء فی عمل بہت سے خلیوں پر مشتمل جانداروں کی تشکیل کا سبب بنا، جن میں سب سے پہلے مچھلیاں پیدا ہوئیں، ان کے بعد یعنی خشکی اور تری دونوں میں رہنے والے جاندار (جن میں مینڈک بھی شامل ہے) بنے، پھر یعنی رینگنے والے جانور (جن میں چھپکلیاں، مگر چھ وغیرہ شامل ہیں)، پھر پرندے، اور سب سے آخر میں ممالیہ جانور (بھڑ بھڑ، بکری، گائے، انسان وغیرہ شامل ہیں) بتدریج وجود میں آتے گئے۔ ان بھرپور معلومات اور تیز ترین ٹیکنالوجی کے ذرائع میسر ہونے کے باوجود آج بھی انسان کائنات کے سرایت رازوں کی گتھیاں مکمل طور پر سلجھانے سے قاصر ہے، کیوں کہ اس طویل ترین زنجیر کی کئی کڑیاں اب تک غائب ہیں۔

مرسلہ: ابو دیم، ملتان

گرومیری کرنے کے بعد میں بس اسٹاپ پر آیا تو متحدہ دو خاتین و حضرات کچکپاتے ہوئے ایک دوسرے سے جڑے کھڑے تھے۔ وھند آسمان سے اتر کر میرے سر کے اوپر منڈلا رہی تھی جسم میں سرد دلہر دوڑ رہی تھی۔ میں نے ذہن کا رخ موڑنے کے لیے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا تبھی میری نظر ایک اشتهار پر پڑی جو بس اسٹاپ کے شیشے پر چپاں تھا۔ کسی نے اپنے کھری بیسمنٹ (دکانہ) کرائے پر دینے کے لیے یہ اشتهار لگا دیا تھا۔ میرے سامنے سولہ منزلہ ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ تھی جس کا نام 20- ریڈر گ تھا۔ اس

کے پیچھے مکانات تھے اور وہ بیسمنٹ انہی مکانوں میں سے کسی ایک کی تھی۔ مجھے اپنی فیکلی کے لیے رہائش کی ضرورت تھی اور بیسمنٹ کا کرایہ اپارٹمنٹ سے سستا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے میں نے اس اشتهار میں دلچسپی لی اور آگے بڑھ کر فون نمبر کی اسٹرپ چاڑھی۔ اس بیسمنٹ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ بلڈنگ کا اسکول بالکل ساتھ تھا اور میرے بچے بہ آسانی اسکول آ اور جا سکتے تھے۔ اس وقت میرے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ میں اس بیسمنٹ کی بجائے سامنے 20- ریڈر گریو بلڈنگ کے چودھویں فلور پر

ایک بیڈروم کا اپارٹمنٹ لے لوں گا۔ خبر وہ تو آگے کی کہانی ہے۔ اس وقت تو میں اس بیسمنٹ میں دلچسپی لے رہا تھا۔

یہاں ہر گھر کی ایک بیسمنٹ ہوتی ہے جس کا دروازہ باہر سے بھی کھل سکتا ہے۔ ایک بیڈروم، کچن، ٹی وی، فریج

اور باتھ روم کی سہولت ہر ایک میں ہوتی ہے۔ اگر بیسمنٹ راؤنڈ لیول پر ہو تو کوئی نہ کوئی چھوٹی سی کھڑکی باہر کی روشنی کے لیے کھلتی ہے ورنہ تازہ ہوا کی کوئی آمد و رفت نہیں ہوتی۔ سردیوں میں زیادہ نمی کی وجہ سے بیسمنٹ سرد رہتی ہے۔ گوکہ ہیٹنگ کا نظام خود کار ہوتا ہے۔ پھر بھی ٹھنڈا جان کا عذاب جسم سے چپکی رہتی ہے بیسمنٹ میں رہنے والے لوگ تازہ ہوا کی نایابی کے باعث ہمیشہ متھل رہتے ہیں۔ الرنج کی شکایات بھی بہت ہوتی ہیں مگر کرایہ اپارٹمنٹ سے بہت کم ہوتا ہے تو لوگ شروع میں بیسمنٹ کو ترجیح دیتے ہیں۔

میں تھا کہ ہوا اور ڈھال سا اسٹریپ ہاتھ میں لیے اپنے اپارٹمنٹ پہنچا تو سر جی نے حسب معمول ایک دیکچا چولھے پر چڑھایا ہوا تھا اور اسے لپٹائی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے جینٹ اتاری، گر دوسری سر جی کے حوالے کی اور تھا کا ماندہ کار پٹ پر لیٹ گیا پھر سر جی سے بولا۔ ”جو لطف تھا کاٹ کے بعد اپنی جگہ پر لیٹنے میں ہے وہ کسی بڑے ہوٹل کے آرام دہ بستر پر بھی نہیں ہے۔“

سر جی بچن میں گر دوسری کے تھیلے کے اندر جھانکتے ہوئے بولے۔ ”تھا کاٹ ہوا اونٹ سرانے کو دیکھتا ہے۔“

میں نے ملتیانہ لہجے میں ان سے درخواست کی۔ ”سر جی! قسم سے سر میں بہت سخت درد ہے خدا کے لیے آپ محادروں کا بوجھ میرے ناتواں کندھوں پر مت بھیجیں۔“

وہ لہک کر بولے۔ ”نسرین سے ملنے جاتے ہو تو نہیں تھکتے اور ہمارے محادرے طبیعت پر گراں گزرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”شرافت سے آپ کھانا بنائیں۔ پھر باہر کسی کام سے بھی جانا ہوگا۔“

باہر حملہ آور ہوئی سرد ہواؤں کو سر جی نے خشے کے پار دیکھا پھر بولے۔ ”قسم سے موسم بہت سہانا ہو رہا ہے۔ میرا جی کر رہا ہے کہ باہر گھوم آؤں۔“

میں نے حسرت بھری نظروں سے انہیں دیکھا پھر ڈولتا ہوا شاور لینے کے لیے باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ باگل بن کی ہزار ہا قسمیں ہوتی ہیں۔ پتا نہیں سر جی کس قسم کے باگل بن کو گلے لگائے ہوئے تھے۔

گرم پانی کا شاور لینے سے روم روم میں تازگی بھرا آتی تھی۔ باہر نکلا تو بشارت سے کھلا پڑ رہا تھا بھی شہباز پر نظر پڑی۔ وہ بھی جاب سے آ رہا تھا۔ جب سے اس نے جاب شروع کی تھی اس کا چہرہ متھل ہو گیا تھا۔ لیکن ساتھ کپڑوں میں بہتری آگئی تھی۔ بقول سر جی کہ ان اچھے کپڑوں کے پیچھے راز یہ ہے کہ وہاں بہت سی ”مایا“ کام کرتی ہیں۔

میں نے بیسمنٹ کے لیے اسٹریپ پر دیے گئے نمبر پر فون ملایا۔ دوسری جانب افغانستانی لہجے میں آواز آئی۔ ”جی فرمائیں۔“ میں لہجی بول رہا ہوں۔ وہ بھی مجھے میری انگریزی کے لہجے سے پہچان گئے کہ میں پاکستانی ہوں۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا تو انہوں نے نہایت ادب اور خوش اخلاقی سے مجھے گھر آنے کا کہا تاکہ میں نہ خانہ خود دیکھ لوں۔ میں نے کچھ دیر میں آنے کی ہائی بھری اور فون رکھ دیا۔

سر جی تو پہلے سے تیار تھے مگر جب شہباز کو ساتھ چلنے کا کہا تو وہ ٹال مول کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بھی میری طرح تھا کہ ہوا آیا ہے مگر میں یہ چاہتا تھا کہ ایک کی بجائے تین رائے ہوں تو زیادہ مناسب رہے گا۔ میں نے شہباز سے کہا۔ ”تھوڑی دیر میں واپس آجائیں گے۔ تو بس منہ ہاتھ دھو لے۔“

وہ کراہ کراٹھا اور منمنایا۔ ”کیا سیسا ہے۔ نہ جاب پر چین اور نہ گھر میں سکون۔“ وہ ابھی مغموں کھڑا تھا کہ سر جی نے اپنا محاورہ پھینکا۔ ”ٹھو کوڑا اور تازی کو اشارہ۔“

بس یہ سنتا تھا کہ شہباز کے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی اور وہ سچ کچ شہباز نظر آنے لگا۔ اس نے لپک کر سر جی کو گردن سے پکڑ لیا اور بولا۔ ”یہ ٹھو کوں ہے اور تازی کیا ہوتا ہے۔“ اب سر جی کی چٹنی چٹنی آواز نکل رہی تھی اور اپنا مطلب سمجھا رہے تھے۔ ”بے وقوف کو مار مار کر تیار کیا جاتا ہے اور عقل مند کے لیے اشارہ بھی کافی ہے۔“

شہباز کو مطلب سمجھ میں آیا تو اس کی گرفت اور سخت پڑ گئی اور سر جی ہاتھ پاؤں چلابنے لگے۔ اب میری مداخلت ضروری ہو چکی تھی۔ میں نے بمشکل سر جی کی گردن آزاد کرائی پھر شہباز کو پندرہ منٹ میں تیار ہونے کا کہا اور میں خود سب کے لیے جانے تیار کرنے لگا۔

ہم باہر نکلے تو سردی میں آ رہے جیسی کاٹ تھی ہم

کچھ چٹکلے کچھ باتیں

غالب کو آم بہت پسند تھے اس ضمن میں ان کی ایک مشہور نظم بھی ہے جو کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے
نامہ نہ کوئی یار کا پیغام بھیجے
بس اس فصل میں بھیجے تو آم بھیجے
اس سے متعلق ایک لطیف زبان زد عام ہے
کہ ایک دفعہ غالب مزے لے لے کر آم کھا رہے
تھے کہ ایک دوست آٹکا - غالب نے کہا حضرت
آئیے آم کھائیے۔

دوست نے انکاری سے کہا۔ ”میں آم نہیں
کھاتا۔“ اتفاق کی بات کہ سامنے گلی میں آوارہ گدھا
فرش پر پڑے آموں کے چٹکلوں پر منہ مار رہا تھا۔ کھا
نہیں رہا تھا۔ دوست کو مذاق سوچا تو گدھے کی
طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”وہ کیسے آم تو گدھے ہی
نہیں کھاتے۔“

غالب بلا کے حاضر جواب تھے جواب دیا۔
”واقعی گدھے آم نہیں کھاتے۔“

☆☆

ایک بار غالب کے ایک دوست جو کہیں باہر
سے آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ غالب نہیں
دعوت کھا کر واپس آ رہے تھے کہ ایک تنگ سے
کوچے میں قدم رکھا تو گدھا نظر آیا۔ دوست کو مذاق
سوچا تو انہیں مخاطب ہو کر کہا۔ ”مرزا صاحب دلی
میں گدھے بہت ہیں۔“

غالب نے برجستہ جواب دیا۔ ”باہر سے
آ جاتے ہیں۔“

حنیف ادیب۔ لاہور

جوش میں بغیر مقلد اور کیپ کے نکل آئے تھے گوکہ جیکٹ نے
جسم ڈھانپ رکھا تھا پھر بھی میں سر ہواؤں کی زد پر تھا۔ میں
نے سوچا کہ واپس اپارٹمنٹ جا کر ٹوپیاں لے لی جائیں مگر
معلوم نہیں کیا سوچ کر یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ سر جی
نے ہلکا سا احتجاج ریکارڈ کرایا مگر شہباز کی ایک ہنکار کے
سامنے وہ ڈری ہوئی لمبی کی طرح دبک گئے۔ اس پر مستزاد یہ کہ

ہم نے فیصلہ یہ کر ڈالا کہ پیدل گلائی مار کیت تک جانا ہے
جو کہ شاید ایک کلومیٹر سے ذرا ہی کم ہوگا۔ ہمارے پاس بس
کا ماپانہ پاس بھی تھا مگر ہمیں اس ٹخنڈ میں بھی اٹھلیاں سوچھ
رہی تھیں۔ ہم نے ہنستے مسکراتے بس اسٹاپ کو کراس کیا اور
ٹورنٹو کے فریزر میں گھس گئے۔ یعنی کہ ٹھلے علاقے میں
آ گئے۔ کچھ دیر تو بی مذاق میں معلوم بھی نہ پڑا کہ بلا کی ٹخنڈ
ہے مگر جب آدھا راستہ طے کیا تو سر اور ہاتھ آہستہ آہستہ
ٹخنڈا ہونے لگا جیسے کوئی برف سے ٹکرا رہا ہو۔ مجھے کچھ
محسوس ہوا کہ ایسا کچھ ہورہا ہے جو ٹھیک نہیں ہے مگر وقت کی
ریت ٹھنی سے پھسل چکی تھی۔ اب کچھ بھی ہو نہیں سکتا تھا۔
جبکہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دماغ اور ماتھے کے پیچھے جو کچھ
بھی ہوتا ہے وہ جبنے لگا ہے۔ پھر یوں لگا کہ میں چکر اکر گر
پڑوں گا۔ یہ ایک واضح موت تھی جس کو ہم نے گلے لگا لیا
تھا۔ شہباز اور سر جی جسم میں گرمی لانے کے لیے اچھل رہے
تھے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا کہ شاید ہماگ کر بس اسٹاپ تک پہنچ
جائیں گے مگر وہ بہت دور نظر آیا۔ گلائی والا اسٹاپ دیکھا تو
وہ پیچھے والے سے بھی زیادہ دور نظر آیا۔ دائیں ہاتھ پر ایک
کھلا پارک تھا جس کے بعد چند مکانات تھے اور پھر گلائی کے
ساتھ جڑی ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ تھی۔ ہم بیچ محمد ارمین
پھنس چکے تھے نہ آگے کے رہے تھے اور نہ پیچھے کے۔ کبھی
بھاگنے لگتے اور جب کوئی افاتے کی صورت نہ نکلتی تو رک
جاتے اور ہاتھوں سے سر کوڑھانچنے لگتے۔

میں نے دیکھا، سر جی اور شہباز کی حالت بھی بہت
بری ہے دونوں کے رنگ فق ہیں، بلاشبہ میرا بھی یہی حال
تھا۔ شہباز کی کراہیں اور سر جی کے محاورے تک جم چکے
تھے۔ میں بھی خوف زدہ بکری کی مانند اچھل کر دوڑ رہا تھا۔
تا کہ جسم بھی کچھ گرم ہو جائے، ہم سب کو اپنی اپنی جان کی
پڑی تھی۔ آتی جاتی گاڑیوں کی توجہ بھی ہماری جانب نہ تھی
کہ ڈرا کر تین مصحوم جانیں بچالیں۔ اب اندازہ ہو رہا
تھا کہ ڈوبتے وقت ہر ایک کو اپنی جان کی کیسے پڑی ہوئی

ہے۔ اب سوچتا ہوں کہ وہ کیا اپریل تھا جو دبیر کے کوڑے
کی طرح ہم پر برس رہا تھا۔ یہ کیسی بہار تھی جس نے ہمارے
چودہ طبق روکن کر دیے تھے۔ اب ایک ہی صورت ہمارے
سامنے بچی تھی کہ دماغ کو جبنے سے بچانے کے لیے پوری
طاقت سے دھڑلگا دی جائے۔ دماغ کا خورمان لیا۔

شہباز جس کو میں مذاق میں بے ڈول بتلایا کرتا تھا،
اس کی رفتار ہم سب سے تیز تھی۔ وہ آگے آگے دوڑ رہا تھا۔

20- ریڈر گروڈ رائیڈ کو کراس کر کے اس کی پارکنگ میں آئے۔ اس بلڈنگ کی وسیع پارکنگ کے عقبی حصے میں تھی۔ پارکنگ کو عبور کیا اور کھلے حصے میں آگے اس طرف یہاں سے وہاں تک چھوٹے چھوٹے مکانات تھے جو سڑک کی دونوں جانب دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ لوگ گھروں میں دیکھے ہوئے تھے کیونکہ باہر سردی کا تازیانہ لہرا رہا تھا۔ خاموشی چھائی تھی۔ میرے پاس مکان کا نمبر تھا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے آگے بڑھتے ہوئے مجھے دائیں جانب سفید رنگ کا ایک چھوٹا سا گھر نظر آیا جس کے دروازے پر وہ نمبر چسپاں تھا۔ میں نے ڈورنیل پر ہاتھ رکھ کر ہٹایا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک شخص برآمد ہوا۔

درمیانہ قد، کمزور جسم، ہلکے سیاہ بال اور آنکھوں پر نظر کا چشمہ۔ یہ بھی صاحب تھے اس گھر کے مالک۔ رنگ ان کا سرخ تھا اور چہرے پر مسکراہٹ، اہنایت تھی۔ ہمارے چہروں سے سردی کا اثر جھانک رہا تھا۔ شاید اسی لیے انہوں نے فوراً دروازہ کھول کر ہمیں گھر کے اندر آنے کی دعوت دی۔

ہم نے دعوت اس طرح سے قبول کی کہ اگر وہ راستے سے نہ ہٹتے تو ہم انہیں دھکا دے کر گھر میں گھس جاتے ہماری حالت ہی کچھ ایسی تھی کہ ہم سردی کے مارے کسی آرام دہ اور گرم گھر کے منتہی تھے۔

یہ گھر دو منزلہ تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ہم لیونگ روم میں کھڑے تھے۔ جہاں صوفے رکھے تھے۔ فرش پر افغانی قالین بچھا تھا اور دیوار کے ساتھ ایک بڑی دی بند پڑا تھا۔ لیونگ روم کے بعد ایک کچن تھا اور ساتھ ایک کمرہ نظر آتا تھا۔ میز چیاں اوپر جاری تھیں اور بقول نبی صاحب وہاں تین کمرے اور ایک ہاتھ روم تھا۔ وہی میز چیاں ڈرامہ گھر کے نیچے پیمنٹ میں بھی جاری تھیں اور ایک بند دروازے پر ان کا اختتام ہو رہا تھا۔ ہمیں صوفوں پر بٹھا کر نبی صاحب اپنے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کچن کی جانب نکل گئے۔ اس وقت ہمیں ہر بات ناگوار لگ رہی تھی اسی لیے آنکھیں بند کر کے ہم سب نے صوفے سے سر نکا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم حواسوں میں آئے تو سراٹھا کر کبھی چمت کو دیکھتے اور کبھی دیوار پر لگی پینٹنگ کو اور پھر ایک دوسرے کی جانب مطمئن نظروں سے دیکھ کر سر جھکا لیتے۔ کچھ ہی دیر بعد نبی صاحب کچن سے برآمد ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں ٹرے تھے اور ٹرے میں گرم چائے سے بھرے بھاپ اڑاتے کپ تھے۔ قریب

سرجی بھی جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔ ایک بار تو ہانپتے ہوئے مجھے کراس کر کے آگے نکل گئے۔ یہ آگے پیچھے آگے پیچھے کودتے ہوئے دوڑتا رنگ لایا اور ہم کسی نہ کسی طرح اس اپارٹمنٹ بلڈنگ پہنچ ہی گئے۔

بلڈنگ کے کوریڈور میں پہنچتے ہی ایسا لگا جیسے حملہ آور سردی پسا ہو گئی ہے۔ پھر بھی اس کا اثر باقی تھا۔ جسم کا ہر موئے تن جمد ہو رہا تھا اسی لیے ہم سب ایک قطار میں فرش پر بیٹھ گئے۔ سب نے اپنا اپنا سر پکڑ رکھا تھا۔ ہمارے دماغوں کی قفل بننے بننے رہی تھی۔

سرجی نے زمین کے ساتھ لگی ڈک سے خارج ہوتی حرارت کے سامنے اپنا ہاتھ لٹکایا دیا تھا۔ شہباز اور میں اف اف کہتے ہوئے ہتھیلی سے سر گزرتے رہے تھے تاکہ کچھ حرارت کھوپڑی کے اندر پہنچ جائے۔ لانی سے گزرتے لوگوں نے ہمیں حیرت سے دیکھا پھر بغیر کچھ کہے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گئے۔ کسی نے حال تک نہ پوچھا۔

سب سے پہلے سرجی نارل ہوئے۔ اس کا اندازہ ہمیں اس طرح ہوا کہ ان کے صبح و سلاطین دماغ سے ایک محاورہ نکلا۔ ”آج تو تمہاری حالت ایسی ہے کہ جیسے تین ٹائٹ کا گلدھا اور ٹوٹن کا بوجھ۔“

میں سمجھ گیا کہ صرف سرجی نارل ہو گئے ہیں پھر اس کی دیکھا دیکھی شہباز بھی وہیں شہباز بن چکا تھا وہ گدھے پر اڑ گیا اور ایک نئی نگرار شروع ہو گئی کہ یہ گدھا کس کو کہا گیا ہے۔

سرجی اپنی اور میری جانب اشارہ کر رہے تھے لیکن جب میں نے کھورا تو شہباز کو بھی اس حلقے میں شامل کر لیا۔ بار بار مطلب پوچھنے پر یہ بتایا کہ اپنی اوقات سے زیادہ مشکل کام میں ہاتھ ڈالنے پر یہ محاورہ بولا جاتا ہے۔

اب سوال یہ تھا کہ باہر کیسے نکلا جائے کیونکہ سڑک پر سردی کا بدست ہاتھی آوارہ پھر رہا تھا۔ گلابی اسٹور میں سپر مارکیٹ میں آخری شاپ ہائی وے اسٹور کی بھی جہاں سے دو ڈالر میں ہر سامان مل جاتا تھا۔ ان کے پاس گرم ٹوپیاں اور مظفر بھی تھے۔ سرجی اور شہباز دونوں نے میرے کھاتے سے یہ اشیاء خرید لیں پھر ٹوپیاں مظفر پہن کر خشے میں خود کو بار بار دیکھا اور مطمئن ہو کر میری جانب دیکھا کہ ادا ہو چکی کر دوں۔ میں اس وقت اپنی خریدی ہوئی کیپ درست کر رہا تھا۔ فوراً جب سے رقم نکالی اور ادا ہو چکی کر دوں مطمئن ہو کر باہر نکل آئے۔

کونچے ہی انہوں نے ٹرے کو میز پر رکھا، ہمیں مسکراہٹوں سے نوازا اور بدلے میں ہم سب ایک ساتھ مسکرائے۔ ہمارے مسکرانے پر وہ بے تحاشا مسکرائے اور دوبارہ کچن کی طرف چل دیے۔

سرجی نے کپ اٹھایا، کھونٹ بھر اور ماشاء اللہ کہہ کر کپ دوبارہ میز پر رکھ دیا پھر فرمایا۔ ”لگتا ہے اب کھانا لینے گئے ہیں۔“

شہباز بولا۔ ”یہ کھانے کا وقت نہیں ہے۔ شاید جلیبیاں لے آئیں۔“

”سردیوں میں گرم چائے کے ساتھ ٹھنڈی جلیبیاں خوب مزہ دیتی ہیں۔ دماغ کو طاقت بھی دیتی ہیں۔“ سرجی بولے۔

اتنے میں نیکی صاحب ایک اور ٹرے اٹھا کر لے آئے جس میں پٹیلیں تھیں اور پٹلیوں میں سٹک، کشمش اور قیتے کے کباب تھے۔ کبابوں کی شکل تو ہم نے سالوں سے نہیں دیکھی تھی۔ اسی لیے ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ شہباز قہقہے لگتے ہوئے بولا۔ ”سریہ آپ نے بہت زیادہ کلفٹ کر لیا ہے۔“

سرجی کشمش کا ایک دانہ منہ میں رکھ کر بولے۔ ”اتنا زیادہ تو ہم کھا بھی نہیں سکتے۔“

”کباب بھابی نے بنائے ہیں؟“ میں نے پوچھا تو مسکراہٹ کو زیادہ پھیلا کر وہ بولے۔

”دراصل بیگم جاب سے ابھی واپس نہیں آئی ہیں اس لیے فرنگ میں جو کچھ ملا لے آئے۔“ وہ صاف اور شستہ اردو بول رہے تھے کیونکہ کینیڈا آنے سے قبل وہ اسلام آباد میں کئی سال گزار چکے تھے۔

افغانستان میں فارسی بولتے تھے اور یہاں انگریزی۔ اردو سن کر ہم نہال ہو رہے تھے کہ انہوں نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ”دراصل بیگم ایک فیکٹری میں کافی پیک کرنے کی جاب کرتی ہیں۔“

شہباز نے پوچھا۔ ”آپ کیا جاب کرتے ہیں؟“ تو جواب دیا:

”مسز ابھی آتی ہی ہوں گے۔“

سرجی یہ سن کر کشمش کا ایک اور دانہ چباتے چباتے رک سے گئے۔ سوال گندم اور جوا چٹا کیا ہوتا ہے وہ آج مجھے معلوم ہو رہا تھا۔ ایک دو بار شہباز نے کباب کھاتے کھاتے دوبارہ کریدا تو وہ جواب دینے سے گریز اس نظر

آئے۔ میں نے شہباز کو اشارہ کر کے خاموش کر دیا۔ اتنے میں سرجی نے کباب اٹھایا۔ سوکھا اور پھر کتر کتر کر کھانے لگے۔ ابھی آٹھ سال کی بیاری سی بیٹی میز جیوں پر سے بھاگتی ہوئی نیچے اتری۔ ہمارے پاس آکر سلام کیا۔ ہم نے مسکرا کر جواب دیا۔ شہباز نے ہاتھ ملانے کے لیے اپنا بازو آگے بڑھایا تو بیٹی خاموش کھڑی رہی۔ شہباز کا ہاتھ فضا میں ہی بلند رہ گیا۔ لڑکی نے کہا کہ میں کسی غیر اور اجنبی سے ہاتھ نہیں ملاتی۔ یہ کہہ کر وہ دوبارہ بھاگتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

شہباز نے ادھر ادھر دیکھا اور سب کو متوجہ پایا تو شرمندہ ہو کر زرد تر ہونے لگا۔ میں نے بات کا رخ بدلا اور نیکی صاحب سے کہا۔ ”آپ نے ہمیں اتنا سارا کھلا دیا ہے۔ اب تو آپ ہمیں ڈیمنٹ کا راستہ بھی دکھا دیں۔“

یہ سن کر نیکی صاحب خوش ہو گئے اور بولے۔ ”ابھی ٹرے کچن میں رکھ کر آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ جلدی سے اٹھ گئے۔

میں سمجھ رہا تھا کہ یہاں بھی پاکستان کی طرح کرائے دار کو مالک مکان کی منت سماجت کرنی پڑتی ہوگی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہاں کرائے دار کی وقعت مالک مکان سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ مالک مکان کرائے دار کو اپنے حسن سلوک سے متاثر کرتا رہتا ہے کیونکہ کرائے پر لینے کے لیے کئی اپارٹمنٹ بلڈنگ موجود ہیں۔ دس سے تیس منزلہ بڑی بڑی عمارتوں میں اپارٹمنٹ خالی ہوتے رہتے ہیں۔ کرایہ دار کو کسی مالک مکان کے غرے اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اگر کوئی کرایہ دار اپارٹمنٹ کا کرایہ برداشت نہ کر سکتا ہو تو وہ ڈیمنٹ کا رخ کرتا ہے اور جیسے ہی اس کی جیب اجازت دیتی ہے تو وہ ڈیمنٹ چھوڑ کر اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیتا ہے۔ اسی طرح سے مالک مکان کو دوبارہ ڈیمنٹ کے لیے نئے کرایہ دار کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ مالک مکان کو ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں کرایہ دار ڈیمنٹ چھوڑ کر چلا نہ جائے۔ ڈیمنٹ کو کرایہ پر اٹھانا اس لیے بھی ضروری پڑ جاتا ہے کہ برصغیر اور مڈل ایسٹ کے مالک مکان گھر کی سالانہ قسط ادا کرنے کے لیے کرایہ دار پر سارا انحصار رکھتے ہیں جیسے نیکی صاحب تھے انہوں نے دولاکھ کا گھر لے لیا تھا جس کی اٹھارہ سو ڈالر ماہانہ قسط تھی۔ وہ آٹھ سو پر ڈیمنٹ کرائے پر دے دیتے تھے اس طرح ان کی جیب سے صرف ایک ہزار ڈالر چارہ ہوتے تھے۔ بیوی اور وہ کما کر دو ہزار ڈالر لاتے تھے۔ اگر ڈیمنٹ کا کرایہ نہ ملے تو گھر کے دیگر

لوگ بھی آ رہے ہیں اور جو بھی فیصلہ کرتا ہے آج ہی کر لوں۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بزرگ فرماتے ہیں کہ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔“

اس جواب پر وہ سر ہلا کر رہ گئے۔ میں نے وعدہ کیا کہ دو چار دن میں ضرور بتا دوں گا پھر ہم نے گرم جوش سے ہاتھ ملائے اور 20- ریڈ کرویو اپارٹمنٹ بلڈنگ کے سامنے والے بس اسٹاپ پر آکھڑے ہوئے۔

آتے وقت پیدل چلنے کے تجربے نے جو گت بنائی تھی، واپسی پر ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

موسم ابر آلود تھا دھند نے ریڈ کرویو بلڈنگ کا اوپری حصہ اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ فضا غناک تھی اور ہم جلد از جلد اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچنا چاہتے تھے۔ سرجی کی نظریں 20- ریڈ کرویو بلڈنگ کے اوپر دھند پر جمی تھیں۔ کچھ دیکھنے کے بعد سوچ کر بولے۔ ”ہر اپارٹمنٹ کی یہاں ہالکونی بھی ہے اور لوگوں نے اپنا سامان بھی رکھا ہوا ہے۔“

میں نے دیکھا کسی ہالکونی میں سائیکل کھڑی تھی تو کسی میں کرسیاں پڑی تھیں اور کمریلو سامان رکھا ہوا تھا۔ جیسے گھر کا کوئی اسٹور ہوتا ہے سرجی بولے۔ ”ہیسمنٹ لینے سے پہلے یہاں اپارٹمنٹ کا کرایہ بھی معلوم کر لو۔ شاید کرایہ مناسب ہو۔“

بات ان کی ٹھیک تھی۔ اگر اپارٹمنٹ کا کرایہ پچاس یا سو ڈالر زیادہ بھی ہوتا تو بھی مناسب تھا۔ محل وقوع بھی ایک ہی تھا۔ سامنے گلائی اسٹور سڑک کے پار تھا۔ اسکول اور پارک بازو میں تھے۔ اپارٹمنٹ ہیسمنٹ سے کافی کشادہ ہوتا ہے۔ سرجی کا مشورہ مناسب تھا۔ ان کے مشورے پر میں اگلے تین سال تک اسی بلڈنگ میں رہا بعد میں سرجی بھی یہاں شفٹ ہو گئے تھے۔

ہم وہاں سے نکلے تو سیدھے اپنے اپارٹمنٹ پہنچے۔ مفتی کے ساتھ خان اور مطیع اللہ بھی موجود تھا۔ جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے مطیع اللہ بخیر بخیر کہتا اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”تم ان دونوں کو لے کر کہاں گئی تھی؟“

خان قیصر بھی پوچھنے لگا کہ سردی میں کہاں مارے مارے پھر رہے ہو۔ ان کو ہیسمنٹ کی بابت بتایا تو خان پھر گالیوں پر اتر آیا کہنے لگا۔ ”بچوں کو ہیسمنٹ میں رکھو گے، کیا انہیں بیمار کرنے کا ارادہ ہے؟“

وہ کہتا چاہ رہا تھا کہ وہاں تازہ ہوا کی آمدورفت نہیں ہوتی۔ زیادہ نمی کی وجہ سے جراثیم زیادہ ہوتے ہیں اور ہر

اخراجات پر اثر پڑتا تھا یوں سمجھیں کہ پورا مہینا مشکلات کا شکار ہو جاتا۔

نعمی صاحب ٹرے رکھ کر فوراً واپس آ گئے۔ ہمیں ایک اعزاز سے اٹھایا اور ہم ان کے پیچھے پیچھے لیونگ روم سے نیچے جاتی ہوئی سیڑھیاں اتر گئے۔ سامنے دروازہ آیا جسے انہوں نے نہایت آہستہ سے کھولا اور ہم ان کے پیچھے ہیسمنٹ میں اترے۔

جہاں ہم موجود تھے اس کو لیونگ روم کہا جاتا ہے۔ ہمیں بائی تیس فٹ چوڑا ایک کمر تھا جس میں کوئی کھڑکی نہ تھی۔ روشنی اور ہوا کا واحد ذریعہ وہ دروازہ تھا جو کچھ سیڑھیاں چڑھ کر باہر کی جانب کھلتا تھا۔ یہاں سردی کچھ زیادہ تھی۔ دائیں ہاتھ پر ایک چھوٹا سا کچن تھا جس میں اسٹور، فریج اور مائیکرو ویو موجود تھے۔ ساتھ میں ایک ہاتھ روم تھا۔ لیونگ روم کے پیچھے ایک کمر اور تھا جس کو بیڈ روم کہا جاسکتا ہے اس میں ایک عدد الماری تھی۔ بیڈ روم میں ایک ڈبل بیڈ بیغ میٹر میں پڑا تھا۔

نعمی صاحب کہہ رہے تھے کہ یہ بھی کرائے میں شامل ہوگا۔ یہ جگہ ایک ایسے مقام پر تھی جہاں سے شمال جنوب اور مشرق مغرب کی بسیں بہ آسانی مل جاتی تھیں۔ ڈاؤن ٹاؤن جانے کے لیے مشرقی سمت کی بس ہے ڈیڑھ گھنٹے میں ڈاؤن پہنچا جاسکتا تھا۔ یہ معلومات بھی نعمی صاحب دے رہے تھے۔

ہم کمرے کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ اوپر کی ڈور تیل بجی اور نعمی صاحب دروازہ کھولنے اوپر چلے گئے۔ میں نے شہباز اور سرجی کی جانب ان کی رائے جاننے کے لیے دیکھا۔ وہ میری نظروں کا مطلب جان گئے۔ شہباز بولا۔ ”اتنا کھلا یا پلایا ہے تو ہیسمنٹ یعنی ہی پڑے گی۔“

سرجی نے اپنی رائے دی۔ ”کہیں شرم شرم میں کام ہی تمام نہ ہو جائے۔“

میں ان دونوں کی ہمتی رائے سے مستفیض ہونے کے بجائے تملتا اٹھا۔ اس سے پہلے میں کچھ بولتا یہی صاحب آ گئے۔

میں نے ہیسمنٹ کی تعریف کی اور پھر کرائے کی بابت پوچھا۔ انہوں نے انکساری سے آٹھ سو ڈالر بتایا۔ میرے خیال میں یہ مناسب تھا مگر میں نے فوری طور پر کوئی بھی فیصلہ کرنے سے احتراز کیا۔ نعمی صاحب سے کہا کہ دو چار دن میں بتا دوں گا۔ وہ کہنے لگے کہ میرے پاس دوسرے

وقت الہی کی حکایت رہتی ہے۔ مفتی خاموش تھا مگر مطیع اللہ بڑی دانشمندی سے خان کی باتوں پر اپنا سر ہلارہا تھا۔
شہباز، مطیع اللہ سے پوچھنے لگا۔ ”تم تو ایسے خان کی ہاں میں ہاں ملارہے ہو جیسے بیسٹ میں رہنے کا بڑا تجربہ ہے۔“

مطیع اللہ نے چہرے پر ایسے سنجیدگی طاری کر لی جس طرح آج کل کسی ٹاک شو میں سیاست دان طاری کر کے بیٹھا ہوتا ہے۔ شہباز کی بات پر بولا۔ ”منطق کے لیے تجربے کی نہیں، عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔“
میں نے ارادہ پختہ کر لیا کہ پہلی فرصت میں اپارٹمنٹ بلڈنگ (20-ریڈ گریو) جا کر معلومات لوں گا۔

باہر سردی بڑھ رہی تھی۔ خان قیصر جب کبھی بور ہوتا تو گپ لگانے آ جایا کرتا تھا۔ مطیع اللہ بہت دنوں بعد آیا تھا۔ میں پوچھ بیٹھا کہ اتنی سردی میں تم کہاں مارے مارے پھر رہے ہو۔ جواب میں وہ بولا۔ ”میں سے گزر رہی تھی تو سوچا کہ چکر لگا لوں۔“

میں نے کہا۔ ”خان صاحب! ٹھیک ٹھیک بتاؤ، ماجرا کیا ہے؟“ دراصل میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ کہیں غریب سے گزر رہا تھا اور ہم سے ملنے آ گیا۔ یہ کوئی چھوٹا سا سرخس نہیں کہ کوئی آپ کے آس پاس ہی رہتا ہو۔ میں نے اسے بخور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے کہ بیسویں سال میں جاب ہو گئی ہے۔“

میرے سوال پر سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کی جاب ہو گئی ہے اور وہ یہاں شفٹ ہونے کی بات کرنے آیا ہے۔ میرے سوال پر مطیع اللہ مسکرایا اور بولا۔ ”ہاں ان کا کوئی لیٹرو غیرہ تو آیا تھا۔“
وہ اب بھی کھل کر بات نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”بیسویں سال کب جوائن کر رہے ہو؟“
وہ ہنس پڑا اور بولا۔ ”سوچ رہا ہوں کہ اگلے ہفتے جوائن کر لوں۔“

اس بات پر مفتی کے علاوہ سب اسے مبارک باد دینے لگے۔ مفتی فق پڑ چکا تھا۔ اسے صاف نظر آرہا تھا کہ اب مطیع اللہ بھی بور یا بستر لے کر یہاں شفٹ ہو جائے گا۔
مطیع اللہ ہمیشہ بات ادھوری کرتا ہے جسے آپ کو خود مکمل کر کے کوئی نہ کوئی مطلب نکالنا پڑتا ہے۔ مجھے خوشی تھی کہ آخر کار اس کی جاب کسی اچھی جگہ ہو گئی ہے۔ ہم ایک کمرے میں تین بندے تھے۔ اس کی منجائش بہت کم تھی۔

لیونگ روم میں مفتی کسی اور کو برداشت نہیں کرتا تھا مگر مطیع اللہ کو صاف جواب دینا بھی آسان نہ تھا۔

خان مفتی کو چڑھانے کے لیے بولا۔ ”یہ بے چارہ دو گھنٹوں کا سفر کر کے بیسویں سال تو جا آ نہیں سکتا یہیں نہیں کونے میں پڑا رہے گا۔“

مطیع اللہ نے پوری طرح سے اپنے آپ کو مصنوعی سنجیدگی میں جکڑ رکھا تھا، خان کی بات پر اس کی زبان حرکت میں آئی اور بولا۔ ”خان بالکل ٹھیک کہتی ہے۔ ہم تو نکیلے کر میز کے نیچے بھی سو جائے گی۔“

خان قہقہہ لگا کر بولا۔ ”خان کہتا ہے، کہتی نہیں ہے۔“
مطیع اللہ بولا۔ ”میری تو کہہ رہی تھی کہ خان ٹھیک کہتی ہے۔“ اس پر مفتی بھی ہنس پڑا۔

مفتی مجھے، شہباز اور سرخی کو صلاح مشورے کے لیے کمرے میں لے آیا۔ پہلے بخور کمرے کو دیکھا اور پھر بولا۔ ”یہ کمراتو تین کے لیے بنی کم ہے اور مطیع اللہ کہاں سوئے گا۔“

میرے ذہن میں فوراً ایک جھماکا ہوا۔ میں نے مفتی کی دیکھتی رگ پکڑ لی تھی کہ وہ لیٹ ٹائٹ شو دیکھنے کا شوقین ہے اور بھی کھار منہ کا اور دماغ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کلب کوک بننے بھی جاتا رہتا ہے۔ میں نے اسی خانے میں مطیع اللہ کو فٹ کرنے کا اچانک سے فیصلہ کر لیا اور مفتی سے بولا۔ ”مطیع اللہ شوقین مزاج پٹھان ہے۔ رات گئے لیٹ ٹائٹ شو بڑے شوق سے دیکھتا ہے۔ کبھی کبھار دیر سے گھر آتا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے مفتی کے چہرے کا جائزہ لیا تو میری بات میں خاصی دلچسپی لے رہا تھا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی اور بولا۔ ”وہ تو چند گھنٹے ہی سوتا ہوگا۔“

مفتی اب غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے آخری پتا پھینکا۔ ”تم کہتے ہو تو اسے منع کر دیتے ہیں اور ویسے ہم اس کے گناہوں میں کیوں شریک ہوں۔“

شہباز اور سرخی دلچسپی سے میری بات سن رہے تھے۔ شہباز مسکرا رہا تھا اور سرخی بات سمجھنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہے تھے۔ اتنے میں مفتی بولا۔ ”یہ اچھا بھی تو نہیں لگتا کہ اس کو سپیدہ منہ سے منع کر دیں۔ آخر پا کستانی ہے اور ماشاء اللہ مسلمان بھی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مگر اس کی عادات.....“
میری بات کاٹ کر مفتی بولا۔ ”آؤ کو اللہ راہ راست پر لے بھی آتا ہے۔“ اور یہ کہتے ہوئے مفتی تیزی

جاتے میں نے شیر کے آفس کا پوچھا تو ایک دیسی بندے نے کہا کہ پیچھے پارکنگ سے اندر آنے کا دروازہ کھلا ہوگا۔ میں محکمہ کر بلڈنگ کے پیچھے اس پارکنگ میں آیا جہاں سے ہم گزر کر تیسری صاحب کے گھر بمسٹ دیکھنے کے لیے گئے تھے۔ بلڈنگ کے نیچے ایک چھوٹا دروازہ کھلا تھا اور وہاں سے آمد و رفت جاری تھی۔ میں نے کئی پاکستانیوں کو آتے جاتے دیکھے۔ کئی ایک مشرقی یورپ کے بھی تھے۔

اندرواغل ہوا تو اگلے ہاتھ پر قطار سے میل باکس تھے جن پر ہر اپارٹمنٹ کا نمبر لکھا ہوا تھا۔ یقیناً پوسٹ مین اسی باکس میں ڈاک ڈال جاتا ہوگا۔ گریہ دار چالی سے اپنے باکس کو کھول کر دروازہ کی ڈاک نکالتے ہوں گے۔ سیدھے ہاتھ پر ایک چھوٹا سا آفس تھا جس میں مشرقی یورپ کی عمر رسیدہ خاتون بیٹھی تھی۔ چھوٹے قد کی لی لی اس بلڈنگ کی شیر یعنی نگراں تھی۔ میں نے پہلو کہا اور وہ سر اٹھا کر مجھے دیکھنے لگی۔

اس نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا کہا اور میں شکریہ ادا کر کے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ اب سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا کہ مجھے ایک بیڈروم کا اپارٹمنٹ چاہیے۔ اس نے میری جھلی کا پوچھا کہ بچے کتنے ہیں۔ میں نے کہا کہ دو بیٹیاں ہیں تو وہ سر جھٹک کر بولی۔ ”محترم کو دو بیڈروم کا اپارٹمنٹ ہی مل سکے گا۔“

میں نے کہا کہ مجھے تو ایک بیڈروم کا چاہیے تو وہ بولی۔ ”دو بچے ایک بیڈروم کے اپارٹمنٹ میں نہیں رہ سکتے۔“

دو بیڈروم کے اپارٹمنٹ کا کرایہ دو سو ڈالر زیادہ تھا اور مجھے ابھی اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ میں نے وجہ پوچھی تو وہ بولی۔

”ہر اسکول میں بچوں کی مخصوص تعداد ہی داخلہ لے سکتی ہے۔ اگر ہم ایک اپارٹمنٹ میں چار چار بچے رکھ لیں تو اسکول میں بچوں کی تعداد تخمیناًئش سے بڑھ جائے گی۔“

میں نے جب یہ کہا کہ میری ایک بیٹی صرف ایک سال کی ہے تو اس نے زور سے اوکے، اوکے کہا اور بولی۔ ”اب تمہیک ہے مگر جب وہ چار سال کی ہو تو دو بیڈروم میں شفٹ ہونا ہوگا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس نے ایک فارم میرے حوالے کیا۔ کہنے لگی کہ اپنے سارے کوائف، جاب کی تفصیل، تنخواہ اور ریفرنس کے ساتھ دو ماہ کا ایڈوانس چیک

سے باہر نکل گیا۔ مفتی کے جاتے ہی شہباز، سرجی سے بولا۔ ”ندیم بھائی نے اسے یہاں رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ ہم کمرے سے باہر لیونگ روم میں آئے تو مفتی، مطیع اللہ سے کہہ رہا تھا۔ ”آپ کو انکار بھی نہیں کر سکتا بس آپ کو گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانا ہوگا۔“

مطیع اللہ بڑی سنجیدگی اور متانت سے بولا۔ ”گھر کے کام تو میں سب کر لیتی ہوں اور روٹیاں بھی بنا لیتی ہوں۔“ میں مطیع اللہ کی سنجیدگی کے پیچھے جھپی چالاکی کو سمجھ رہا تھا۔ مفتی نے بات فاصل کرتے ہوئے کہا۔ ”تو تمہیک ہے تم کل سے شفٹ ہو جاؤ۔“

مطیع اللہ بولا۔ ”وہ تو میں آج سے ہی ہو رہی ہوں۔ سامان کل میں اور آپ اٹھا کر لے آئیں گے۔“ اس بات پر مفتی فن چہرے کے ساتھ مجھے دیکھنے لگا اور میں منہ پھیر کر کھڑا مسکراتا رہا۔

رات میں تمہیک سے نہ سو سکا کیونکہ اب شہباز کے خرانے، سرجی کی بیٹیاں اور اس کے ساتھ اب مطیع اللہ کی تمام جانوروں کو ملا کر بنی کسی نامعلوم آواز نے ایک مفتی جاری کر دی تھی۔ میں نے اپنا تکیہ اور کمر بٹا اٹھایا اور باہر لیونگ روم میں آکر لیٹ گیا جہاں مفتی اپنے لیٹ ٹائٹ شو کے غسل میں مشغول دیدے پھاڑے لی دی کو دیکھ رہا تھا۔

ایک دن میں بیسویں سال سے 3 بجے سہ پہر نکلا اور بس سے 20- ریڈر کیوڈرائیڈ اپارٹمنٹ کے سامنے کچھ معلومات لینے کے لیے اتر۔ بلڈنگ کے سامنے بہت بڑا لان تھا جو مارٹن گرورڈ تک پھیلا تھا۔ گوگھاس ابھی مگر بھائی پڑی سو رہی تھی مگر اعزاء ہما کے گرمیوں میں لیے گرین ہو کر سر اٹھائے گی۔ لان میں سرو کے متعدد پودے اور چڑی کے درخت ایسا تھے۔ یہاں کسی بس یا کار کو ہارن بجانے کی اجازت نہیں اسی لیے شور بلڈنگ تک بالکل نہیں آتا۔ یہاں گاڑیوں کی ہر سال آپکیشن ہوتی ہے کہ آیا کوئی انجن شو تو نہیں کرتا یا دھواں تو نہیں چھوڑتا۔ کسی میں ایسی خامی ہو تو وہ گاڑی بند کر دی جاتی ہے۔ اسی لیے کسی گاڑی کا بے تحاشا شور یا دھواں آپ کو کسی روڈ پر نہیں ملے گا۔ ٹورنٹو یا کسی بھی مغربی شہر کی صاف و شفاف آب و ہوا کی ساری وجہ بھی یہی ہے کہ علاقے کی فضا کو ہر قسم کی کشاف سے پاک رکھا جاتا ہے۔ میں نے اپارٹمنٹ کا کمر زری دروازہ کھولا اور ایک لابی میں کھڑا تھا جس کے آگے کا دروازہ لاک تھا۔ اندر جاتے لوگ جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولتے اور داخل ہو

لگا کر اسے دے جاؤں۔ وہ کہنے لگی کہ چودھویں فلور پر ایک بیڈروم اپارٹمنٹ کیم جولائی سے خالی ہو رہا ہے۔ پھر مجھ سے سوال کیا۔ ”تم کو کب شفٹ ہوتا ہے۔“

میں نے کچھ سوچا اور اندازہ لگایا کہ جون کے شروع میں میری پہلی کو لینڈنگ پیپر ذل جائیں گے اور جولائی کے پہلے مہینے میں ان کو یوٹا لوں گا۔ میں کیم جولائی پر راضی ہو گیا اور فارم لے کر باہر نکل آیا۔ کرایہ اٹھ سو ڈالر ماہانہ تھا۔ جو ٹیسٹ کے برابر تھا اور سہولتیں وہاں سے بہت زیادہ تھیں۔ ٹیسٹ کی وہ پرائیویسی نہیں ہوتی جو اپارٹمنٹ کی ہوتی ہے۔ اپارٹمنٹ کی ایک بڑی بالکونی بھی فری تھی جس کا رخ مارٹن گرووڈ کی جانب تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہاں ہنگ اور پاور بلڈنگ کی جانب سے فری تھی۔ وہ تو ٹیسٹ میں بھی تھیں مگر وہاں ان کا ٹائم لم رکھنے کے لیے مالک مکان ہر وقت آپ کو نوٹ کر رہتا ہے۔ اسی بنیادوں پر میں نے اپارٹمنٹ لینے کا فیصلہ کر لیا۔

یہاں اسکولوں کا نظام ایسا ہے کہ ہر اسکول میں بچوں کی تعداد کا اندازہ لگا کر اتنی ہی تنجاش رکھی جاتی ہے یہاں ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ ایک گھر میں دو بچے ہوں اور ساتھ والے میں دس۔ اگر ایسا ہو تو اسکولوں کا حشر پاکستان جیسا ہو جائے۔ اگر کہیں زیادہ بچے ہوں تو سٹی گورنمنٹ آپ کو وارنٹک دے دیتی ہے۔ ہم دیسی اور مڈ ایسٹ کے لوگ اپنے گھروں کی ٹیسٹ کرائے پر غیر قانونی طور پر اٹھا دیتے ہیں۔ اس لیے جس گلی میں سو بچے ہونے چاہئیں۔ وہاں ڈیڑھ سو بچے برآمد ہوتے ہیں۔ اسکول کی تنجاش پانچ سو کی اگر ہے تو وہاں اٹھ سو بچے داخلے کے امیدوار ہوتے ہیں پھر اسکول بچوں کے ایڈریس کے مطابق اپنا ڈیٹا گورنمنٹ کو دیتا ہے اور اسی طرح انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک گھر میں کتنی فیملی ٹھہری ہوئی ہیں۔ ایسے گھروں کو بھاری جرمانے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دوسری سب سے اہم اور اچھی بات یہ ہے کہ اسکول اور تعلیم کا نظام سب کے لیے ایک ہی ہے اور بارہویں کلاس تک بالکل فری ہے۔ ایسا نہیں کہ تین تین قسم کے اسکول ایک ساتھ چل رہے ہوں اور سب کا نصاب بھی مختلف ہو۔ بچوں کے والدین کی جو بھی آمدن ہو بھلے امیر ہوں یا متوسط یا غریب۔ ان سب کے بچے ایک ہی اسکول میں جائیں گے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ امیروں کے لیے الگ نظام تعلیم اور غریب کے لیے الگ نظام، تعلیم ہو صحت اور تعلیم کے

موانع سب کے لیے برابر ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن نہیں کہ آپ کا بچہ کسی دوسرے علاقے کے اسکول میں داخلہ لے سکے۔ ہر علاقے کا اپنا اسکول ہوتا ہے۔ بچوں کو صرف اسی اسکول کی جانب رجوع کرنا پڑتا ہے جو سڑک کر اس کرنے کے لیے سب سے زیادہ محفوظ ہو۔ کسی بچے کو پیدل سڑک کر اس کرنے نہیں دیا جاتا۔ اگر کسی بھی وجہ سے بچے کا گھر چوراہے کے دوسری جانب ہے تو پھر اسکول اس کو بس مہیا کرتی ہے۔ کسی مخصوص فاصلے کے باہر کسی کا گھر ہے تو بس اسکول کی جانب سے مفت مہیا کی جاتی ہے۔

اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کا یہ فائدہ تھا کہ بارنگ کے عین سامنے اسکول تھا اور ایک ڈیڑھ سڑک کر اس کرنا تھی۔ بچے دومنٹ میں پیدل اسکول پہنچ سکتے تھے۔

میں فارم لے کر اپنے اپارٹمنٹ میں ایسے داخل ہوا جیسے میرے پاس الاٹمنٹ لیزر ہو۔

مطیع اللہ دو دن پہلے شفٹ ہو گیا تھا۔ ابھی اس نے بیسویں سال جو ان نہیں کی تھی۔ وہ کمپوڑی کی جاب پر جاتا اور واپس آتا تو مفتی اس کے کانوں کے پاس کچھ نہ کچھ بکھارتا اور وہ اپنی نظریں چھت پر بجائے اثبات میں سر ہلاتا رہتا۔ ایک دو بار شہباز مجھ سے بول چکا تھا۔ ”گلتا ہے کہ کوئی نئی کچھڑی پک رہی ہے۔“

سربئی کو اپنی بڑی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ ان کی چھٹی ہو جائے۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہونے والا ہے۔ دراصل میں نے جو جج بویا تھا کہ مطیع اللہ شوقین مزاج اور کلبوں کا رسیا ہے تو تب سے مفتی اس سے کچھ اگھواتا چاہتا تھا یا پھر اپنا ہوا بنانا چاہتا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ مطیع اللہ ایسا کوئی شوق نہیں رکھتا مگر اب بات چل پڑی تھی تو میں اس کا انجام خیر دیکھنا چاہتا تھا۔ مفتی بھی کوئی ایسا رنگین مزاج نہ تھا۔ اس کی کیفیت اس سے بچے جیسی تھی جو قیمتی کھلونے دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے مگر ان سے ٹھیکنے کی ہمت نہیں رکھتا۔

میں اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو مفتی اور مطیع اللہ کے درمیان بقول شہباز کوئی ”کچھڑی“ پک رہی تھی۔ مفتی اب مطیع اللہ کے کان میں کسی سازشی انداز میں کچھ کہہ رہا تھا اور وہ بے پروا ہو کر ”تم ٹھیک کہتی ہو۔“ کہے جا رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”اپارٹمنٹ میں کوئی نہیں ہے اور پھر سرگوشیاں کیوں ہو رہی ہیں۔“

مطیع اللہ بولا۔ ”سنا نہیں کہ دیواروں کی بھی کان ہوتی ہے۔“

میرے آنے کے بعد مفتی انجمن بن کر بیٹھ گیا۔ میرے ہاتھ میں مطیع اللہ نے فارم دیکھا تو اس کی بابت پوچھا۔ میں نے جب اپارٹمنٹ کے بارے میں بتایا کہ ڈھائی ماہ بعد یکم جولائی سے اسے لیز کر رہا ہوں تو مفتی بڑبڑانے لگا۔ ”کیا ضرورت ہے بچوں کو بلانے کی، پہلے یہاں تھوڑی مشکلات ہیں جو ایک اور روگ پال لیں۔“ مفتی دو سال سے اپنی فیملی نہیں بلوارہا تھا وہ اکیلے رہنے کا عادی تھا۔ اس کی نظر میں یہی بہتر تھا کہ بچے پاکستان میں رہیں اور آپ انہیں ہر ماہ خرچ بھیجتے رہیں۔ وہ میرے ساتھ بھی کئی بار بحث کر چکا تھا۔ میرا نقطہ نظر اس سے مختلف تھا۔ میں اس بات پر قائل تھا کہ بچے اور بیوی آپ کے ساتھ رہنی چاہیے تا آنکہ کوئی بڑی وجہ نہ ہو۔ مطیع اللہ بھی شادی شدہ تھا لیکن بچے نہ تھے۔ وہ بھی مفتی کا ہموا تھا اور یہی کہہ کر اپنی جان چھڑا جاتا تھا کہ کافروں کے ملک میں بچے نہیں لانے چاہئیں۔ (اب مطیع اللہ کے ماشاء اللہ بچے بھی ہیں اور سب مل جل کر کنیڈا میں رہتے ہیں) مفتی پہلے تو مجھے سمجھا تا رہا۔ جب میں اس کی بات نہ سمجھ سکا تو میری بات بغیر کہے ہی سمجھ گیا۔ (اس کے بیوی بچے پہلے ہی کنیڈا آ کر اپنا ایٹینشن لے چکے تھے۔ پھر میری فیملی کے آنے کے بعد مفتی نے بھی اپنی فیملی کو بلوا لیا تھا) کچھ دیر بعد شہباز اور سرہی اپنی جابیں ختم کر کے مجھے ہارے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ میں نے ان کے لیے چائے تیار کی۔ وہ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ مطیع اللہ بولا کہ ندیم بھائی نے اپارٹمنٹ لے لیا ہے۔

شہباز ایک دم زرد پڑ گیا اور سرہی خاموش ہو گئے۔ چائے کے کپ کارپٹ پر رکھے وہ مجھے دیکھنے لگے تھے۔ دراصل پچھلے چھ ماہ میں ہم تینوں نے مشکل وقت ایک ساتھ کاٹا تھا۔ کہیں سے بھی آتے تو واپس آ کر ایک دوسرے کی باتیں سنتے جس میں جدوجہد اور تکلیفیں بھی ہوتیں اور ساتھ ہی ہنسی مذاق کے قصبے بھی ہوتے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے کی عادت ہو گئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم چھ ماہ سے نہیں بلکہ مدتوں سے ایک ساتھ رہ رہے ہوں۔ آج جب انہیں میرے جانے کی خبر ملی تو وہ اداس ہو گئے تھے۔ میں خود بھی ان کی کمی کو ابھی سے محسوس کر رہا تھا۔ شہباز بولا۔ ”ندیم بھائی! ہر شام کو آپ کے گھر میں آیا کروں گا۔“ مفتی بولا۔ ”وہ ندیم سے ملنے نہیں بلکہ گھر کی تازہ

روٹیاں کھانے جائے گا۔“ سرہی بولے۔ ”میری فیملی بھی جیسے آئی تو اسی بلڈنگ میں اپارٹمنٹ لوں گا۔ جہاں ندیم بھائی ہوں گے۔“ جب میں یہاں سے شفٹ ہو گیا تو بعد میں یہ لوگ میرے پاس آتے رہے ہم آپس میں بیٹھ کر کپ شپ کرتے۔ اکٹھے سفر میں بہت کیے۔ رابطہ جو بن گیا تھا وہ تو ابھی تک برقرار ہے۔

اپریل کا مہینا اب ختم ہو رہا تھا۔ سردی کی لہر جو دو ہفتے پہلے اچانک اٹھ آئی تھی، وہ ختم ہو گئی تھی۔ برہمن پھر سے پھل چلی تھیں۔ ہیموسال میں میری ٹریننگ ختم ہو گئی تھی اور مجھے کراس ٹریننگ میں میری توقع کے برخلاف رکھا لیا گیا تھا۔ ہر ایک میری قسمت پر رشک کر رہا تھا کہ اتنے ہائی ٹیک سیکشن میں مجھے کام کرنے اور سیکھنے کا موقع ملے گا۔ ہفتے کے پانچ دن ہیموسال میں اور ویک اینڈ پر ہولڈنگ سینٹر جاب کے لیے جایا کرتا تھا۔ نسرین سے دو تین بار فون پر بات ہوئی۔ وہ بھی میرے شیڈول کو جاننے لگی تھی۔ اس نے میری بہت ہمت افزائی کی۔ پاکستان اپنے بچوں اور بیوی سے ہر دوسرے تیسرے دن بات کر لیا کرتا تھا۔ ہر ہفتے اسے خط بھی لکھا کرتا تھا۔ اس کے جواب بھی مسلسل آتے تھے۔ وہ میرے ہل دو ہل سے واقف تھی اور مجھے اپنے اور بچوں کے بارے میں آگاہ بھی تھی۔ قندیل میری بیٹی ہر وقت ایک ہی بات مجھ سے پوچھتی کہ بابا آپ نے گاڑی لے لی ہے۔ اسے ماں نے بتایا تھا کہ جیسے ہی بابا گاڑی لیں گے تو ہمیں بلوالیں گے۔ اسی لیے وہ ہر بار گاڑی کا پوچھتی تھی اور پھر میری چھوٹی بیٹی ابھی دس ماہ کی ہوئی تھی ایک نظام چل رہا تھا اور ہم اس کے ساتھ بھاگ رہے تھے۔

مفتی کے توقعات تب ٹوٹنا شروع ہوئے جب مطیع اللہ اس کے پسندیدہ لیٹ نائٹ شو سے منہ پھیر کر سونے لگا تھا۔ مفتی کے کان میں یہ میں نے ڈالا تھا کہ مطیع اللہ شوقین اور رنگین مزاج پشمان ہے۔ اس کے بدلے میں مفتی نے اسے لیونگ روم میں سونے کی اجازت دے دی تھی۔ اسے توقع تھی کہ وہ بھی اسی کی طرح جاگ کر یہ شو دیکھے گا اور پھر رنگین تبصرے بھی کرے گا۔ مگر مطیع اللہ وہ ذوق و شوق نہ رکھتا تھا جو مفتی کے اندر پایا جاتا تھا۔ ایک بار تو مطیع اللہ نے حد کر دی ہم سب نے رات کا کھانا ابھی ختم کیا تھا، سرہی اپنے گرم کپڑے تہ کر کے دو پارہ اپنے سوٹ میس میں ٹھونس رہے تھے اور برف باری ختم ہونے پر بہت دکھی بھی تھے۔

فہماذ، مطیع اللہ کو اپنی نبض دکھلا رہا تھا کہ اسے کہیں بخار تو نہیں تو مطیع اللہ نے کہا تھا۔ ”لگتا ہے تمہارے اندر دو ہارس اور کی کوئی شین چل رہی ہے۔“
اسنے میں مفتی نے مطیع اللہ سے پوچھا۔ ”آج بہت اچھا شو آ رہا ہے۔“

اس پر مطیع اللہ نے ہمیشہ کی طرح چھت کو اداسی سے گھورا اور بولا۔ ”یہ خنزیر شور و زانہ لگتے ہیں؟“
مفتی یہ بے ادبی برداشت کرتے کرتے برداشت کر گیا مگر اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اس کے باکمال شو کو لڑ کر لقب ملا تو وہ شرم اور غصے میں خود سر جھکا گیا تھا۔ میں نے مفتی کو تسلی دی کہ ہم جس چیز کو معیوب کہتے ہیں تو پٹھان اسے خنزیر کہتے ہیں۔ مفتی نے سراپے ہلایا کہ بات اس کی سمجھ میں آگئی ہے مگر شک کی پرچھا میں ابھی اس کے ہرے پر نمایاں نہیں۔

مفتی مطیع اللہ کے کان میں ہر وقت جو سرگوشی کرتا رہتا تھا ایک دن وہ سرگوشیاں آشکارہ ہو گئیں۔ ہو اس طرح کہ مفتی کچھ اس کے کان میں بولتا اور وہ کہتا۔ ”انشاء اللہ جولائی میں جائے گی۔“

سرہنی نے مجھ سے پوچھا۔ ”جولائی میں مطیع اللہ کیا پاکستان جا رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اب چند سالوں تک وہ بیہوش سال کے ملاوہ کہیں بھی نہیں جائے گا۔“

سرہنی بولے۔ ”کیا مطلب؟“
”خود ہی سمجھ جاؤ گے۔“

مجھے شک تھا کہ مفتی اسے کلب چلنے کا کہتا رہتا ہے اور مطیع اللہ بھی کہتا کہ جون میں جاؤں گا اور بھی جولائی پر ٹال دیتا۔ مفتی اب عاجز آچکا تھا۔ وہ اب باقاعدہ ناراض ہونے لگا تھا۔ آج جولائی جولائی کر رہا تھا تو میں نے سرہنی کے سامنے اس سے پوچھ لیا۔ ”یہ جولائی میں کہاں جا رہے ہو؟“
مطیع اللہ نے بھی مفتی کے راز عیاں کر دیے اور بولا۔ ”مفتی ٹورنٹو کے آؤٹ آف باؤنڈ علاقے میں جانے کا بولتی ہے اور میں کہتی ہوں کہ جولائی میں جائے گی۔“

میں نے کہا۔ ”چلو یہ اب بتاؤ کہ جولائی کی کس تاریخ میں جاؤ گے؟“

اب مفتی کو میری شکل میں اپنا حمایتی نظر آیا تو وہ بات میں دلچسپی لینے لگا۔ مطیع اللہ نے بنید کی سے میرے سوال کا راب یہ دیا۔ ”کیا جولائی کی تیس تاریخ ہوتی ہے۔“

میں اس کے جواب میں چھپی شرارت کو سمجھ گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”جولائی کی تیس تو نہیں پر سنا ہے تینتیس تاریخ ہوتی ہے۔“
مفتی نے پھر لمبی ہمت نہیں ہاری اور اپنی قسمت آزمائی پر لگا رہا۔

بیہوش سال میں جب بھی کسی کی نئی جاب ہوتی ہے تو لٹج روم میں لگے نوٹس بورڈ پر ایک نوٹس لگا کر نئے آنے والے کو خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ میں دوپہر کی شفٹ میں ایک بچہ بیہوش سال پہنچا تو دیکھا کہ نوٹس بورڈ کے گرد ایک مجمع جمع ہے۔ سب گورے، کالے، اور دیسی کچھ پڑھ رہے ہیں۔ کچھ ہنس رہے ہیں اور کچھ تہرے کر رہے ہیں۔ منظر اور آخر بھی وہاں موجود تھے۔ یہودی فزیکا بھی سونی عینک کے پیچھے نظریں جھپکا رہا تھا۔ بھیڑ پھٹی تو میں نے منظر سے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے؟

وہ بولا۔ ”خود دیکھ لو۔“
وہ مسکرا رہا تھا۔ نوٹس بورڈ پر دیکھا تو لکھا تھا۔ ”ہم مطیع اللہ، مطیع اللہ کو بیہوش سال جوائن کرنے پر خوش آمدید کہتے ہیں۔“

اصل ماجرا مجھے معلوم تھا۔ مطیع اللہ جب کینیڈا کی امیگریشن کے لیے فارم بھر رہا تھا تو پہلی لائن میں درج تھا کہ مدعی کا پہلا اور آخری نام کیا ہے۔ اب وہ آخری نام پر اللہ تو نہیں لکھ سکتا تھا پٹھان بھائی پریشان ہو گیا مجھے خط لکھا کہ وہ اس معاملے پر مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ پھر دور صدفیق کے گمن گانے لگا جب بیٹے اور باپ کے نام کے بیچ ”بن“ لگا دیتے تھے۔ اس طرح مطیع اللہ کا پہلا نام مطیع اللہ اور آخری نام شیر اللہ ہو سکتا تھا۔ میں نے مشورہ دیا کہ نام تبدیل کرے۔ اس نے ایک اور سوات کے دوست سے مشورہ لیا تو اس نے بھی تبدیل کرنے کا مشورہ دیا۔ اس دوسرے پٹھان دوست نے تو ایک قدم بڑھ کر اس پر یہ احسان بھی کر دیا کہ اس کا نام تبدیل کر کے مطیع اللہ مطیع اللہ رکھ دیا۔ اب اسے ایک مطیع اللہ کی مصیبت ختم ہوئی اور ہر جگہ اپنا نام تبدیل کر کے کینیڈا میں دو مطیع اللہ لے آیا تھا۔ اب ایک سختی وجود جس میں ایک مطیع اللہ کی بھی منجائش نہ تھی اور وہ اس میں دو مطیع اللہ لے پھر تھا۔ یہ وجود دو مطیع اللہ کا بوجھ نہ اٹھا سکتا تھا اور اسی لیے اس نے جہاں کہیں بھی جاب کے لیے درخواست دی تو آگے والوں نے نام دیکھ کر یہ بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پر ایک مطیع اللہ سخت

پریشان تھا کہ دوسرے مطیع اللہ سے جان کیسے چمڑائے۔ اس سے پہلے کہ ایک مطیع اللہ دوسرے مطیع اللہ کا بوجھ اتارنے کے بارے میں کچھ سوچتا کہ اس کی جاب ہیموسال میں ہوگئی اور اسے اس غور و فکر سے نجات ملی۔

اب یہودی فزیکا کو نام کی صورت حال سے آگاہ کیا گیا تو وہ بہت متحیر تھا۔

فزیکا کی پیدا کٹی طور پر دونوں آنکھیں ایک دوسرے سے نہیں ملتی تھیں پھر گھر کے شیشوں والی نظر کی عینک بھی لگاتا تھا۔ قد چھوٹا اور جسم موٹا تھا۔ وہ ہمیشہ ہم پاکستانیوں کے درمیان بیٹھتا تھا۔ شکل سے جاوگر نظر آتا تھا۔ جب ہم میں سے کوئی میز پر طبلہ بجاتا ہوئے یہ گانا گاتا۔ ”جادوگر سیاں جھوڑ میری ہاتھیاں“ تو فزیکا اس کی تال پر تپتے لگتا تھا۔ اسے معلوم بھی نہ ہوتا کہ وہ جادوگر کے نام سے پکارا جا رہا ہے۔ اسے تو بس دھن سے سروکار تھا۔ فزیکا لچ میں صرف گھبروں کا اجارلاتا اور اسے بڑی رعبت سے کھاتا تھا۔ ایک بار اس کی بیوی اسے لینے آئی، کسی نے دیکھ لیا تو اندر آ کر شور مچا دیا کہ فزیکا کی بیوی تو بہت ہی خوب صورت ہے پھر سب جلدی جلدی باہر کا ڈریس تبدیل کر کے لائن میں کھڑے ہو کر اس کی بیوی دیکھنے لگے۔ وہ واقعی بہت خوب صورت تھی یا پھر فزیکا کے مد مقابل اس کا حسن زیادہ گھرا تھا۔ سب تعریف کر رہے تھے فلپائن کا چھوٹے قد کا مگنچا فریڈی تو یہ کہتے پایا گیا کہ یہ فزیکا کی بیٹی ہے۔ میں نے فریڈی سے کہا کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھو کہ کہیں فزیکا مرنے مارنے پر نہ اتر آئے۔ مگر دیکھا تو فزیکا خوشی اور عاجزی سے دوہرا ہو رہا تھا پھر ہم نے مڑے لیٹا شروع کر دیے کوئی کہتا کتنی حسین ہے، کوئی کہتا کہ بہت پُر وقار ہے۔ منظر نے تو حد کر دی اور بول دیا کہ سبکی بھی ہے۔ اس پر فزیکا نے منظر کو گلے لگالیا اور دوسرے دن سب کے لیے گھبروں کے اچار کی پوری بوتل لے آیا۔

کہیں میں نے سنا تھا کہ بہاروں کی خبر ہواؤں سے آتی ہے۔ خوشبو بھری ہوائیں کسی ہوتی ہیں، اس کی پہلے مجھے خبر نہ تھی۔ کینیڈا میں بہار کی آمد ہواؤں پر بندوں اور اپنے اندر کی تہلیوں سے ہوتی ہے۔ ایک صبح میں اپارٹمنٹ سے باہر آیا تو پہلی بار یہ ہوائیں مجھے چھو کر گزریں اور میں رک گیا تھا۔ ایک انجانا کس تھا۔ جس سے میں آشنا ہوا تھا۔ حیرت اور مسرت سے میں وہیں پتھر بن گیا تھا۔ بہار کبھی ایسے بھی آتی ہے۔ مجھے یہ اندازہ نہ تھا۔ ایک تھری ہوئی خوشبوؤں

سے بھری اور تازہ ہوا کسی بھی مردہ دل کو زندہ کر سکتی ہے۔ میں تو پھر بھی زندہ آنکھوں سے آسمانوں پر نظرے گاڑے بیٹھا بہار کے دنوں کا منتظر تھا۔ میں اس ہوا کے سحر سے باہر بھی نہ نکلا تھا کہ سامنے درختوں پر دیکھا تو کوئٹیں پھوٹ رہی تھیں۔ درختوں نے جیسے گلابی پتوں کے ہار پہن لیے تھے۔ آسمان کی جانب دیکھا تو ایسا نیلا کہ جیسے نیل گھول دیا گیا ہو۔ کہیں کہیں ابلے بادل جو مستی میں ہواؤں کے زور پر اٹھیلیاں کرتے پھر رہے تھے۔ سورج ابھی طلوع ہونے کو تھا کیونکہ عمارتوں کے بیچ ایک سرخی چھائی تھی۔ شاید اسی منظر کے لیے تو اقبال نے کہا تھا۔

گھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
یہ وہ بہار تھی۔ جو آج نورنٹو میں اتری تھی۔ اپنے رنگوں اور خوشبوؤں سمیت۔ اس نے مجھے سحر زدہ کر دیا تھا۔ میں ہیموسال جا رہا تھا مگر پھلٹ کر اپارٹمنٹ آیا اور خدائے ذوالجلال کے آگے سجدہ ریز ہو گیا۔ میں سجدے میں تھا اور ڈور وال کے باہر جھانپوں میں چھپی چڑیوں نے چپکنا شروع کر دیا۔ باہر آیا تو جھانپوں سمیت تمام درختوں کے پرندے اپنا اپنا درد با آواز بلند بیاں کرنے لگے۔ بہار ایسے بھی اترتی ہے مجھے اندر اک نہ تھا۔ محبتیں ایسے بھی بچھاو ہوتی ہیں میں اس سے آشنا بھی نہ تھا۔ ہوائیں ایسے بھی چھوٹی ہیں میں ایسے کس کا عادی کبھی نہ تھا۔ پرندے ایسے بھی چپکتے ہیں میں ایسی اذانوں سے واقف نہ تھا۔ رشتیں ایسے بھی برکتی ہیں میں اس کا شاہد کبھی نہ تھا۔ آج سب کچھ مجھ پر اتر اتر میں بندے سے بندہ خدا بننا چلا گیا۔

چڑیوں کی چھپا ہونے کی خبر ہواؤں میں اپنے ہاتھ روم کا روشن دان یاد آ گیا۔ جہاں بہار کی آمد کی خبر مجھے ان پرندوں کی بولیوں سے ہوتی جو نئے نئے کھلتے موسم میں اپنا پہلا گھر بنایا کرتے۔ ان کی تکراریں سنتا۔ مجھے معلوم ہو جاتا کہ بہار آ رہی ہے۔ اور پھر میں کمرے سے باہر فرا کو سونگھتا خوشبو میرے منتھوں سے ٹکراتی اور مجھے معلوم ہو جاتا کہ بہار آ رہی ہے۔ میں بہار کی نویدوں پر پُر مسرت ہو جاتا یہ پرندے میری بہاروں کے پیامبر تھے کیونکہ خود میں بھی ایک پرندہ تھا۔ میرے ٹھکانے مختصر ہوتے تھے۔ میری پرواز بھی مختصر اور کبھی دراز ہوتی تھی۔ چند لمبے سانس درست کرتا اور پھر اپنی نئی دواؤں کو پرواز کر جاتا تھا۔

ہمارے بس اسٹاپ کے پیچھے ایک پارک تھا میں

غالب

غالب روزے نہیں رکھتے تھے۔ ایک بار کسی نے کہا۔

”آپ روزے کیوں نہیں رکھتے۔“

محبت جواب دیا۔ ”شیطان غالب ہے۔“

حنیف ادیب۔ لاہور

☆☆

غالب کو ایک بار جیل کی ہوا کھانا پڑی جس کے متعلق ان کا کہنا تھا کہ کوتوال شہر کو ان سے دشمنی تھی جس نے جوئے کے الزام میں انہیں جیل بھجوا دیا۔ غالب کا یہ شعر اس دور کی یادگار ہے۔

ہم کہ جس دن سے گرفتار بلا ہیں
جو میں دامن کے بخیوں سے بھی سوا ہیں
انہیں تو کرسی سے چڑھی اے اچھا نہیں سمجھتے
تھے۔ غالب کا یہ شعرا سی حقیقت کا عکاس ہے۔

غالب وعلیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے تو کر نہیں ہوں میں

☆☆

غالب کے آباؤ اجداد فوج سے وابستہ رہے۔ ان کا آبائی پیشہ سپاہ گری تھا۔ یہ شعرا سی حقیقت کا غماض ہے سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے نہ صرف اردو بلکہ فارسی کے بھی اس قادر الکلام اور سلسلہ بند شاعر کا سورج نصف النہار پر چمکتا رہا اور آخر وہ وقت بھی آگیا جب اسے آخری وقت نے اپنی گرفت میں لے لیا اور بظاہر حرف و لفظ کا یہ سورج ہمیشہ کے لیے کہنا گیا مگر اس کی چمک دکھ تا ابد قائم و دائم رہے گی۔

☆☆

غالب کے بارے میں ایک صاحب نے کیا خوب فقرہ چست کیا کہ ”غالب تھے غالب مگر ساری عمر مغلوب رہے۔“ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ وہ ہمیشہ غم و اندوہ کے زخموں میں رہے۔ تمام عمر انہیں آلام و مصائب نے سر نہ اٹھانے دیا۔ دکھ و درد سے نبرد آزما رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تمام کلام رنج و آلام کے بیان سے بھرا پڑا ہے۔ خوشی کی کوئی نظر نہیں آتی۔

حنیف ادیب۔ لاہور

اسے برف زدہ موسموں میں بھی آتے جاتے دیکھا کرتا تھا۔ وہ ایک طرح سے میرا سا بھی بن گیا تھا۔ اس کے تلے کی زمین عموماً برف سے ڈبی رہتی تھی برف پانی بنتی تو مردہ گھاس بھی نظر آتی تھی۔ اس کی ٹہنیاں سوکھی اور بے برکتیں وہ پارک کے درمیان بالکل تنہا کھڑا تھا۔ اس درخت کا حسن اس کی تنہائی تھی۔ آس پاس میدان تھے اور شاید کسی کا منتظر تھا مگر آج جب میں اسٹاپ پر آیا تو ایک نیا منظر دیکھا۔ پورے پارک اور فٹ پاتھ کے ساتھ بھی گھاس پر ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے پیلے پھول سر نکالے مسکرا رہے تھے۔ پیلے پھول ادھ گھاس کا منتظر تازہ رنگ ل کر ایک عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ میں اس منظر کو کسی بھی چیز سے لطیف دینے سے قاصر ہوں۔ میں اسٹاپ پر کھڑا اس منظر کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ یہ قدرت کا ایک انعام تھا جو مجھے وطن سے ہجرت پر ملا تھا۔

میں بس اسٹاپ پر کھڑا ان پھولوں میں کھوبا ہوا تھا کہ ملی میری جانب چلی آئی۔ ملی ایک سیکورٹی گارڈ تھی۔ اس بس اسٹاپ کی بھی اپنی کہانی تھی۔ کئی کردار مختصر سے اور کئی ایک مستقل۔ ان میں ملی مجھے ہر روز ملتی۔ جب میں صبح کی شفٹ میں بیسویں سال جا رہا ہوتا یا اس ٹائم پر نہیں اور جا رہا ہوتا تھا۔ وہ سیاہ فام تھی اپنے مقررہ وقت پر ایک بیک کاندھے سے لٹکائے اور اپنے آپ کو پوری طرح لپیٹے وہ ہر روز اسی وقت اپنی جاب پر روانہ ہوتی تھی۔ اسٹاپ پر ہر روز ملنے والے ایک دوسرے سے شاسائیدوں کی طرح ملتے ہیں اور مل کر اپنے رستے پر چل پڑتے ہیں۔

میں نے ملی سے پوچھا۔ ”ان پھولوں کا نام کیا ہے؟“

وہ بولی۔ ”یہ پھول تو نہیں ہیں۔“

اس کی نظر میں پھول وہ ہوتے ہیں جو گملوں یا کیاریوں میں خود لگائے جائیں۔ خود سے اگ جانے والے پھول دراصل پھول نہیں وہ کانٹے ہوتے ہیں۔ جو اکھاڑ کر پھینک دیے جاتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ”اگر یہ پھول نہیں تو یہ اتنے خوشنما کیوں ہیں؟ اگر یہ پھول نہیں تو اتنے خوش رنگ کے کیوں ہیں؟ اگر یہ پھول نہیں تو ایسے کیوں لگ رہے ہیں؟“

وہ حیران ہو کر میرا منہ دیکھنے لگی۔

پھر دوسرے دن یہ پھول پہلے سے دو گئے ہو گئے تھے وہ زمین سے پھوٹ رہے تھے۔ جیسے مشر دم نکلتے

ماہنامہ سرگزشت

ہیں۔ تیسرے دن اور بھی زیادہ تھے۔ اب میں بھی عادی ہو گیا تھا۔ چوتھے دن دیکھا تو گھاس کاٹنے والی مشین اس پر بھیس کر ان کا صفایا کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ یہ پھول تو نہ تھے بلکہ کانٹے تھے۔ پھول تو وہ ہوتے ہیں جو خود اہتمام سے لگائے جائیں، ان کی آبیاری کی جائے، وہ پھول کہاں ہوتے ہیں جو چھوٹے پڑیوں، ویرانوں یا کسی کی منشاء کے بغیر نکلتے ہیں۔ اس بس اسٹاپ پر مستقل آنے والے ایک مخصوص وقت پر اور تقریباً ایک ہی طرح کے لباس میں لمبوس آپ کو ملتے ہیں۔ ایک مخصوص انداز میں ایک دوسرے کو پہلو کہتے ہیں۔ اور اپنی مخصوص جگہ پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان میں گورے بھی تھے مگر زیادہ تر کالے تھے۔ میں جب صبح ٹی شفٹ میں جاتا تھا تو ایک گوری اور موٹی اپنے آفس ڈریس میں ہماری ساتھ والی بلڈنگ سے آتی دکھائی دیتی تھی۔ بس آنے سے تین منٹ پہلے وہ بس اسٹاپ پر موجود ہوتی تھی۔ کئی بار میں سوچتا کہ اگر کھڑی کا ٹائم سیٹ کرنا ہو تو بس دیکھ کر کروں یا اس عورت کو سڑک پار کھڑے ہونے کروں۔ دونوں اپنے وقت کی پابند تھیں۔ ایک تھکے نقش و نین والی چھٹی لڑکی نظر آتی اور آنے کے ساتھ اس موٹی عورت کے ساتھ کھڑی ہو جاتی۔ وہ زیادہ تر ہلکے رنگ کا لمبا کوٹ پہنے ہوئی تھی۔ ایک اور کالی دراز قد لڑکی اپنے وقت پر کہیں سے نمودار ہوتی، وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہوتی یا کوئی دعا تھیں کہلاتی ادا کر رہی ہوتی، اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اس کے ساتھ میں بائبل ہوتی، پاؤں میں اونچی نیل والی جوتی ہوتی اور اس کے ہوائے کٹ ہال تھے، آتے ہی سب کو گڈ مورنگ کہتی اور کہیں کے شیشے سے ٹپک لگا کر اپنے ہونٹ چبانے لگتی۔

اس اسٹاپ کے موسم بھی مختلف تھے۔ کبھی برف باری اور کبھی بارش، کبھی برفانی جھگڑ اور کبھی جھلکا ہوا سورج، کبھی دھوپ اور سائے اور کبھی باد بہار۔ لباس بھی اسی مناسبت سے بدلتے رہتے تھے۔ ایک شام میں اپارٹمنٹ کے لیونگ روم میں کارپٹ پر نیم دراز ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ سرجی مکن میں چولہے پر پیاز بھون رہے تھے۔ شہباز پر اچھے موسم کا اثر نہ ہوتا تھا کیونکہ اس کے اپنے دماغ میں بکولے اٹھتے رہتے تھے۔ وہ سفید بنیان پہنے سفید کارپٹ پر لیٹے بھوں بھوں کر رہا تھا۔ مفتی کی نظریں تو ٹی وی پر تھیں مگر اسے کی ٹکٹیں بتاتی تھیں کہ دماغ کہیں اور الجھا ہوا ہے۔ اس پر ان دنوں پریشر بڑھ رہا تھا کہ اپنی فیملی کو جلد از

جلد بلوائے۔ دوسری جانب مطیع اللہ فرج کا دروازہ کھولے جلیبیوں کے متعدد لفافے دیکھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سر جی جلیبیاں پسند کرتے ہیں مگر اتنی مقدار میں پسند کرتے ہیں وہ اس سے بے خبر تھا۔ وہ سرجی سے مخاطب ہوا۔ ”اگر تمہیں دمہ ہے تو مجھے بتائیں میرے دادا کے پاس کالے یرقان اور دمہ کے بہترین نسخے ہیں۔“

اسی بات پر سرجی نے چولہے کی گیس بند کی اور واہلا کرتے لیونگ روم میں آگئے۔ میں نے اپنی کتاب کو سامنے پر رکھا شہباز یہ کہتا۔ اٹھ بیٹھا۔ ”اب سیاپا شروع ہوا۔“ مفتی نے ٹی وی کی آواز کم کر دی مطیع اللہ بھی سرجی کہ پیچھے پیچھے لیونگ روم میں آگیا۔

اب پھر سے دربار سجا۔ مفتی سرخ بتا۔ سرجی نے اپنا مقدمہ پیش کیا۔ مظلومان میں مطیع اللہ کے ساتھ ساتھ خلاف توقع شہباز بھی شامل تھا، وہ کہہ رہے تھے۔ ”پیاز بھی میں چھیلوں، فٹائر بھی میں کاٹوں اور کچھ کام چوروں کی طرح اب مطیع اللہ بھی دانت مجھ پر تیز کرنے لگا ہے۔“

سرجی کام چور کہتے ہوئے کن انکھیں سے شہباز کو بھی دیکھ رہے تھے۔ مفتی نے پوچھا کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ سرجی نے کہا۔ ”مطیع اللہ نے مجھ پر الزام لگایا ہے کہ مجھے کالی کھاسی ہے۔“

مطیع اللہ صفائی پیش کرنے لگا کہ میں نے کالا یرقان کہا تھا اور یہ کہا تھا کہ اس کے دادا کے پاس اس کے علاج کا بہترین نسخہ ہے۔

ادھر شہباز اپنی بولی بول رہا تھا کہ سرجی مجھے کام چور کہہ رہے ہیں۔

سرجی مفتی سے کہہ رہے تھے کہ مطیع اللہ نے کالی کھاسی کے ساتھ ساتھ کالے یرقان کا الزام بھی مجھ پر لگا دیا ہے۔

اب مطیع اللہ گڑبڑا گیا تھا اور وہ اپنی صفائی میں کہہ رہا تھا کہ اس نے تو دمہ کا بولا تھا اب سرجی نے دونوں بیماریوں کے ساتھ ساتھ دمہ بھی اپنے پر لے لیا اور بولے۔ ”میری جلیبیاں تو ہر ایک کی نظر میں چھہ رہی ہیں اور اپنا نشہ نظر نہیں آتا۔“ وہ مطیع اللہ کے سوار کو اب اپنی زور پر لے رہے تھے۔ اب مطیع اللہ حیران پریشان بیٹھا اعلان کر رہا تھا۔ ”یہ تو بہت لڑاکا ہے۔“

اب تو سرجی کا مجھے بھی پتا نہ چلتا تھا کہ واقعی بخیدہ ہیں یا بخیدگی دکھا رہے ہیں۔ آخر مفتی نے پہلے شہباز کو خاموش

گما اور پھر مطیع اللہ سے کہا کہ سرجی نے جھڑی اٹھا رکھی ہے اگر چتا چاہتے ہو تو سب پر دواغ کر دو کہ جلیبیاں صحت کے لیے بہت مفید ہیں۔

مطیع اللہ نے کہا۔ ”میں اعلان کرتا ہوں کہ جلیبیاں لازمی شدہ لوگوں کے لیے بہت مفید ہیں۔“

سرجی نے یہ سن کر کچھ غور کیا پھر بولے۔ ”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ پھر سکرارتے ہوئے مچن میں کھس گئے۔

مطیع اللہ میرے کان کے قریب آیا اور بولا۔ ”سرجی اچھا ایسے ہی رہتے ہیں؟“ میں جواب دینے ہی والا تھا کہ اچھا سرجی مچن کی کھڑکی سے ہمیں دیکھ رہے ہیں تو میں اٹھ کر کمرے میں بند ہو گیا۔

میں نے 20۔ ریڈیو ڈرائیو وال اپارٹمنٹ ملاؤگ میں اپارٹمنٹ 1408 کے لیے کرایہ نامہ بمعہ دو سیٹ کا ایڈوانس اور اپنا جاب لیٹر لگا کر دے دیا تھا۔ یکم اگست کو اس نے خالی ہونا تھا۔ میرے پاس ڈھائی ماہ باقی تھے۔ مجھے امید تھی کہ فیلی جولائی کے پہلے ہفتے تک مل جائے گی میرے اپارٹمنٹ لینے سے مفتی، شہباز اور سرجی خفا تو نہیں بلکہ اساتذہ مطیع اللہ بھی کہہ رہا تھا کہ ہم بھائی کے بغیر پورا ماحول سونا ہو جائے گا۔ ہم کھانا کھا کر بیٹھے جائے گی رہے تھے۔ ڈور وال کے باہر اندھیرا مہلک ہوا تھا مگر لیپ کی دودھ ماروٹنی نے دن کا سما باندھ رکھا تھا۔ بہار کھل کر نورتنوں میں کھس آئی تھی، درختوں اور لہاریوں میں گلے کوئٹیں چھوٹ پڑی تھیں، گرم جینکوں سے ہماری جان چھوٹ چکی تھی، ہم نے ڈور وال کی ایک لڑکی کھول دی تھی تاکہ خوشگوار ہوا کی آمد و رفت جاری رہے۔ سرجی نے اس کھڑکی کے ساتھ اپنی جگہ بنائی ہوئی تھی اس پر مستزاد گرم جیکٹ بھی پہنی ہوئی تھی۔ ہم سب اپرنگ جیکٹ پہنتے تھے۔ یہاں بہار کا مقصد یہ نہیں کہ ہم الٹ شرٹ میں ٹھومتے پھرتے نظر آئیں۔ دن میں اور خاص کر شام میں موسم خشک ہو جاتا ہے۔ کھڑکی کھلی ہو تو لگی طاری ہو جاتی ہے۔

سرجی ٹھنڈی ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں اتارنے کے لیے مفتی سے مخاطب ہوئے۔ ”ہم بھی یہاں سے ندیم بھائی وال بلڈنگ میں شفٹ ہو جاتے ہیں۔“ پھر تائیدی نظروں سے شہباز کی جانب دیکھا۔ شہباز نے بھی ہاں میں ہاں ملائی مطیع اللہ نے بھی مدبرانہ اعزاز سے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم بہت دیر تک اسے دیکھ اور سن رہا تھا۔ میں نے اس پہلو پر

کبھی غور نہیں کیا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ شفٹ ہو جائیں۔ اب مجھے بھی اشتیاق ہو رہا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ دیں چلے آئیں مگر میں اپنا فیصلہ ان پر لا دانا نہیں چاہتا تھا۔ میں یہ صرف چاہتا تھا کہ وہ یہ فیصلہ اپنی مرضی سے کریں۔ یہ وہاں پر دو بیڈروم کا اپارٹمنٹ لینا چاہتے تھے کرایہ اس کا زیادہ تھا مگر یہ سب اچھی جاب کرتے تو سو ڈالر زیادہ ادائیگی انہیں گراں نہیں گزرتی رہی تھی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے سب نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ کل ہی جا کر اپارٹمنٹ کی بات پھر سے کریں گے۔ مفتی بھی رازی ہو گیا اور سرجی نفوشی میں شہباز کو چھٹی ڈال دی۔ میں نے دوستوں کے اس خلوص اور محبت کو تحسین بھری نظروں سے دیکھا۔

دوسرے دن میں شام کی جاب سے واپس پہنچا تو مفتی اور شہباز بارہویں فلور پر یعنی مجھ سے دو فلور نیچے ایک اپارٹمنٹ کی بات کر آئے تھے۔ اور اب بیٹھے قادم مگر رہے تھے۔ سرجی خوشی میں مطیع اللہ کو جلیبیاں کھلا رہے تھے۔ جلیبیاں کھلا کر شہباز سے بولے۔ ”اب عیدہ بن مت دکھانا کہ ہر روز ندیم بھائی کے گھر کھانا کھانے پہنچ جایا کرو۔“

شہباز ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ”ہم اپنا سالن بھائی کو دے آیا کریں گے اور ان کا کھانا لے آیا کریں گے۔“

اس رات ہم ٹی وی کے آگے خبریں سن رہے تھے۔ یہ خبر اخبار میں بھی پڑھ لی تھی۔ اس خبر نے مفتی کے تن بدن میں کینیڈا کی محبت چکا دی تھی اور پاکستان سے اس کے تقابل کا ایک اور موقع اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ ایک بیت نامی خاتون جو کینیڈا کی شہری ہیں وہ جب ویت نام کی توفیات کی اسفٹنگ میں دھری گئی، مقدمہ چلا اور ویتنامی حکومت نے سزائے موت سنا دی۔ ادھر کینیڈا کی حکومت پھر گئی کہ یہ ہماری شہری ہے اور اسے غلط طور پر پھنسا گیا۔ ایک سفارتی جنگ شروع ہوئی جو میڈیا کی زینت بن گئی۔ ویت نام کی حکومت نے اس عورت کو سزائے موت دے دی اور کینیڈا نے اپنا سفیر واپس بلا لیا۔ مفتی بہت خوش تھا کہ کینیڈا کی حکومت اپنے شہریوں کا کس طرح سے خیال رکھتی ہے۔ پاکستان کی مثالیں دیں کہ کس طرح کس کس کو امریکا کے حوالے کیا گیا۔

کہہ دو وہ ٹھیک رہا تھا مگر اس میں ان حکمرانوں کا قصور ہے جو اس میں ملوث تھے۔ پاکستان تو ان حکمرانوں کے ہاتھوں میں ٹینس کی بول بنا رہا، کبھی ایک کے اور کبھی

دوسرے کے چنگل میں رہا۔ مفتی کے ساتھ ساتھ ہم میں سے کوئی بھی کینیڈا کا شہری نہیں تھا مگر ایک قافرخ کے جذبے سے ہم اکٹھے بیٹھے تھے۔

شہباز نے آواز لگا کی مطیع اللہ بھائی۔ ”اب تم پاکستان سے چس آسانی سے لاسکتے ہو پکڑے بھی گئے تو کینیڈا نہیں چھڑوالے گا۔“

مطیع اللہ مطمئن ہو کر بولا۔ ”اس کام پر ضمیر تو نہیں مانا مگر پھر بھی سوچے گی۔“

سرجی کا نون کو ہاتھ لگا کر بولے۔ ”اللہ عارت کرے میرے چڑا اسی کو اس نے اس پکر میں بیوی سے خاصی جھاڑ کھائی تھی۔“

میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا کہ معاملہ کیا تھا تو سر جی با ادب بیٹھ کر بتانے لگا۔ ”میرے چڑا اسی نے پکے سگریٹ کا ایک کش مجھ سے لگوایا تھا تو میری تحترمہ نے بڑی بے عزتی کی تھی۔“

شہباز نے پوچھا۔ ”بھائی کو کیسے معلوم ہوا کہ آپ چڑھائے ہوئے ہیں؟“

سرجی گویا ہوئے۔ ”دراصل میں نے سالن میں نمک کی جگہ چینی ملا دی تھی۔“

مطیع اللہ بولا۔ ”قربان جاؤں سرجی تمہاری مصومیت پر۔ پکا سگریٹ پی کر چو لھے پر چڑھ بیٹھے۔“

سرجی بولے۔ ”انسان خطا کا پتلا ہے۔ ایک بار غلطی کی مگر پھر بھی بھی ہانڈی روٹی سے پہلے کش نہیں لگایا۔“

یہ سن کر اپارٹمنٹ نمبر 103 قہقہوں سے گونج اٹھا۔ مجھے اپنی فیملی کے کینیڈا آنے کا بہت انتظار تھا۔ ہم نے اکٹھے پچھلے سال میڈیکل کروایا تھا جو ایک سال کے لیے درست مانا جاتا ہے اگر 8 جولائی تک میری فیملی کا ویزا نہیں آتا تو انہیں پھر سے میڈیکل کروانا پڑتا۔ مجھے

فکر اس لیے تھی کہ ابھی مئی کا دوسرا ہفتہ چل رہا تھا۔ میرے حساب سے ان کو ویزا جون کے شروع میں مل جانا چاہیے اگر وہ دوبارہ سے میڈیکل کرواتے تو بات 6 ماہ

آگے بڑھ سکتی تھی۔ میں ادھر ایک ایک دن کا انتظار کر رہا تھا اور اپارٹمنٹ بھی لے لیا تھا۔

آج سمیعہ سے فون پر بات کی تو اس نے بھونچال برپا کر دیا، وہ بتا رہی تھی کہ کل ایمبسی والوں کا لیٹر آیا ہے کہ جلد سے جلد اپنا میڈیکل کروا کر انہیں بھیجیں۔ بات صاف تھی کہ وہ اب چھ مہینے سے پہلے فورنو نہیں آسکتے۔ میں

آج سمیعہ سے فون پر بات کی تو اس نے بھونچال برپا کر دیا، وہ بتا رہی تھی کہ کل ایمبسی والوں کا لیٹر آیا ہے کہ جلد سے جلد اپنا میڈیکل کروا کر انہیں بھیجیں۔ بات صاف تھی کہ وہ اب چھ مہینے سے پہلے فورنو نہیں آسکتے۔ میں

آج سمیعہ سے فون پر بات کی تو اس نے بھونچال برپا کر دیا، وہ بتا رہی تھی کہ کل ایمبسی والوں کا لیٹر آیا ہے کہ جلد سے جلد اپنا میڈیکل کروا کر انہیں بھیجیں۔ بات صاف تھی کہ وہ اب چھ مہینے سے پہلے فورنو نہیں آسکتے۔ میں

آج سمیعہ سے فون پر بات کی تو اس نے بھونچال برپا کر دیا، وہ بتا رہی تھی کہ کل ایمبسی والوں کا لیٹر آیا ہے کہ جلد سے جلد اپنا میڈیکل کروا کر انہیں بھیجیں۔ بات صاف تھی کہ وہ اب چھ مہینے سے پہلے فورنو نہیں آسکتے۔ میں

آج سمیعہ سے فون پر بات کی تو اس نے بھونچال برپا کر دیا، وہ بتا رہی تھی کہ کل ایمبسی والوں کا لیٹر آیا ہے کہ جلد سے جلد اپنا میڈیکل کروا کر انہیں بھیجیں۔ بات صاف تھی کہ وہ اب چھ مہینے سے پہلے فورنو نہیں آسکتے۔ میں

تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ سرجی اور شہباز ہمیشہ کی طرح میرے آس پاس موجود تھے۔ شہباز نے کہا۔ ”یہ تو بہت سیبا پکڑا ہو گیا ہے۔“

سرجی گویا ہوئے۔ ”یہ ایمبسی والے ہمیشہ شعلہ آگ سے جلاتے ہیں۔“

میں نے سرجی سے غصے میں کہا۔ ”ادھر اہل پریشانیوں پر سوچنے کے لیے دماغ کام نہیں کر رہا اور اب آپ کے محاوروں پر کون سر کھائے۔“

سرجی خفا ہو کر بولے۔ ”میرا مطلب تھا کہ یہ ایمبسی والے دھوکا دیتے ہیں۔“

شہباز بولا۔ ”کون سا دھوکا دیا ہے۔ کیا رشتہ ہے انکار کر دیا ہے؟“

سرجی روٹھے ہوئے انداز میں منمنائے۔ ”رٹا سے تو انکار نہیں کیا مگر محنتی بھی تو نہیں دے رہے۔“

مطیع اللہ بھی کہیں سے آکر ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ اس نے صرف رخصتی نہ دینے کی بات سنی تھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح اپنے ہونٹوں پر ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ سجائی اور سرجی بولا۔ ”ہمارے علاقے میں جو رخصتی نہ کرے تو پوری برادری کو بیس دنیوں کی دعوت دیتا ہے۔ اور پھر رخصتی بھی دے ہے۔“

میرے لیے اب ان کے بیچ بیٹھنا مشکل ہو گیا اور میں بڑبڑاتا ہوا اٹھ کر کمرے میں آ گیا۔

اگلا دن سنجہ کا تھا اور مجھے ہولڈنگ سینٹر بارہ بجے میں جاب کے لیے جانا تھا۔ کمرے میں ڈور وال کو ذرا کھولا تو بہار کی تازہ اور خوشبو بھری ہوئی میرا دل دماغ معطر کر دیا۔ اس معطر جھونکے نے مجھے اللہ کی یاد دی۔ اسی وقت وضو کیا اور عشاء کی نماز پڑھ کر اسی سے

مانگی جس کے اشارے پر ہوائیں چلتی ہیں۔ دل تو سجد ہی میں مقیم ہو گیا۔ دعائے میرے دماغ کو دل سے جوڑ دے دل میں سکون کا دریا موجزن ہوا تو میں نے پوئلنگ جانے کی تیاری شروع کر دی۔

ابھی میں جوڑے استری کر رہی رہا تھا کہ فون کی بجی۔ مفتی فون کے قریب تھا۔ اس نے ریسپونڈ کیا۔ اس کی بات سنتے ہی اس کے چہرے پر کھبراہٹ چھا گئی اس چیخ کر کہا۔ ”ندیم فوراً نرسین کے فلیٹ پر پہنچو سہ کا

ہے ہری اپ جلدی کرو!“

ہے ہری اپ جلدی کرو!“

ہے ہری اپ جلدی کرو!“

ہے ہری اپ جلدی کرو!“

ہے ہری اپ جلدی کرو!“

ہے ہری اپ جلدی کرو!“

ہے ہری اپ جلدی کرو!“

ہے ہری اپ جلدی کرو!“

عکاس بنیاد

شکیل صدیقی

فوٹوگرافی ایک فن تھا۔ اچھی تصویر کشی صرف منجھے ہوئے عکاس کر سکتے تھے۔ ایسے افراد جو روشنی، زاویہ وغیرہ کا صحیح اندازہ کر سکتے تھے۔ لیکن اب ایسے خود کار کیمرے آچکے ہیں جن سے ایک بچہ بھی اچھی تصویر اتار سکتا ہے۔

معلومات کے شائقین کے لیے تحفہ خاص



پہلے بتادوں کہ ماضی کے کیمرے اور آج کے کیمرے میں بہت فرق ہے۔

پہلے ماضی کے کیمرے کا تعارف کردوں۔

ماضی کا کیمرہ ایک بند ڈبے کی طرح ہوتا تھا، جس میں کسی طرف سے روشنی داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے سامنے ایک لینز لگا ہوتا تھا اور اندر فلم کا رول پڑا ہوتا تھا۔ جس چیز کی تصویر لینا مقصود ہو کیمرے کے لینز کا رخ اس طرف کر کے بنی دیا جاتا تھا۔ تصویر کھینچ جاتی۔ پھر ایسی بہت سی تصویریں کھینچ کر کیمرہ اسٹوڈیو میں لے جاتے اور ریل نکلا کر اسٹوڈیو والے کو دے دیتے۔ وہ اس کے پرنٹ نکال کر دو ایک روز بعد حوالے کر دیتا۔ بعض تصویریں اچھی اترتیں اور بعض خراب۔ اس کی بھی

کیمرہ اب بے حد عام سی ایجاد بن گیا ہے۔ اس لیے کہ اب یہ ہر کس ونا کس کی جیب میں پڑا رہتا ہے۔ میرا اشارہ وہاں یا سیل فون کی طرف ہے، جس میں کیمرہ بھی ہوتا ہے۔ جیب سے جب جی چاہا، نکالا اور تصویریں کھینچنا شروع کر لیا۔ مگر ایسا بھی تھا جب تصویر کھینچنا ایک فن تھا۔ ہر کس ونا کس تصویر کھینچ نہیں سکتا تھا۔ اس کام کو باضابطہ سیکھنا پڑتا تھا، جنہیں اس کام پر عبور حاصل ہو جاتا وہ کیمرہ مین کہلاتے تھے۔ تصویر کھینچانے والے بن سنور کر کیمرے کے سامنے پوز دیتے تھے اور تصویر کھینچوانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ پھر ان تصاویر کو فریم لے کر کیمرے کی دیواریں پر آویزاں کرتے تھے۔ یہ جادو کی ڈبہ کیسے کام کرتا تھا اس پر روشنی ڈالنے سے

وجہ ہوتی تھی، جو بعد میں بتائی جائے گی۔

کیرا خواہ کیسا بھی ہو، سادہ، رنگین یا مودی، سب کا بنیادی اصول ایک ہی ہے۔ ان کے بنیادی پڑے بھی ایک جیسے ہوتے ہیں، چاہے وہ مہنگے ہوں یا سستے۔ کیرے کی قیمت کا انحصار اس کے لینز پر ہوتا ہے۔ جتنا اچھا لینز ہوگا تصویر اتنی ہی اچھی اترے گی۔

ماضی کے کیرے کے آگے لینس کے سامنے کے حصے میں شٹر لگا ہوتا تھا جو بہت کم وقفے کے لیے کھلتا اور روشنی کو کیرے کے اندر جانے دیتا۔ کیرے میں قلم رول کے لیے مناسب جگہ ہوتی اور رول کو گھمانے کا انتظام بھی ہوتا۔ ایک چھوٹا سا پڑا ہوا ہے جسے ویو فائنڈر کہتے تھے۔ جس چیز کی تصویر لینا ہوتی ہے اسے اسی پڑے کی مدد سے دیکھتے تھے۔

ابتدائی کیرے کی پن کو ہول کیرا کہا جاتا تھا جو بہت سادہ ہوتا تھا۔ اسے پن ہول کیرا اس لیے کہتے تھے کہ اس میں لینز کی بجائے ایک سوراخ ہوتا تھا۔ سب سے پہلے 1856ء میں ایسا کیرا ایجاد ہوا، جس کا موحد ڈیوڈ ریڈیئر تھا۔

پن ہول کیرے کو گھر بیٹھے بنایا جاسکتا ہے۔ مگر یا لکڑی کا ایک چھوٹا سا ڈبائے لیں اس کے اندر سیاہ کاغذ لگا دیں تاکہ روشنی بالکل اندر نہ جاسکے۔ احتیاطاً سیاہ رنگ بھی پھیر دیں۔ کیرے کا سائز اتنا بڑا ہونا چاہیے کہ قلم کا ایک ٹکڑا اس میں لگ سکے۔ قلم کے ٹکڑے کو جہاں لگانا مقصود ہے، اس کے بالکل سامنے ایک چھوٹا سا سوراخ کر کے پنی چپکا دیں۔ پنی میں پن سے سوراخ کر کے اسے بھی شپ سے بند کر دیں۔

اب فوٹو گرافر سے قلم کا ایک ٹکڑا لے لیں اور اسے اندھیرے کمرے میں جا کر پنی کے سوراخ کے سامنے لگا دیں۔ وہ سائڈ سامنے کے رخ پر ہونا چاہیے جس پر سالٹ لگا ہوتا ہے۔

جب کسی کا فوٹو لینا مقصود ہو تو کیرے کو میز پر رکھ دیں تاکہ وہ بل نہ سکے۔ اس کے بعد اس شخص کو کیرے کے سامنے بٹھا کر پنی پر لگا ہوا شپ ہٹا دیں اور پندرہ منٹ تک روشنی اندر جانے دیں۔ اس کے بعد تاریک کمرے میں لے جا کر قلم کا ٹکڑا نکال لیں اور کاغذ میں لپیٹ کر فوٹو گرافر کی دکان پر لے جائیں۔ وہ اسے دھو کر قلم کا پرنٹ نکال دے گا۔ تصویر اچھی اترے گی۔

حقیقت میں کیرے کا اصول وہی ہے جو ایک ہزار برس پیشتر مشہور سائنس داں ابن الہشیم نے بتایا تھا یعنی یہ کہ جب روشنی کی شعاعیں کسی باریک سوراخ سے گزر کر کسی پردے پر

پڑتی ہیں تو اس پردے پر اس جسم کا الٹا عکس ڈالتی ہے جس کا شکل کروہ آ رہی ہے۔ ابن الہشیم نے ایک موسم ختی کا الٹا عکس ایک پردے پر ڈال کر اس اصول کا عملی مظاہرہ بھی کیا تھا۔

پن ہول کیرے سے تصویر اس طرح سے چلتی جاتی کہ جب پنی پر لگا شپ ہٹایا جاتا تو روشنی کی کرنیں کیرے میں داخل ہو جاتیں۔ ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ روشنی خط مستقیم میں سفر کرتی ہے۔ سوراخ کے تنگ ہونے کی وجہ سے وہ شخص جسے کیرے کے سامنے بیٹھا ہوا اس کے سر پر سے گزرنے والا روشنی قلم کے نچلے حصے پر پڑتی۔ جب کہ نچلے حصے سے آنے والا روشنی اوپری حصے پر پڑتی۔ اسی طرح سے دائیں طرف سے آنے والی روشنی بائیں اور بائیں طرف سے آنے والی روشنی دائیں طرف پڑتی۔ گویا قلم پر جو عکس بننا وہ الٹا ہوتا۔ اسے نگینہ کہتے تھے۔ اس عکس کو فوٹو گرافک پیپر پر نقل کیا جاتا تھا تاکہ نگینہ کا پازیشن بن سکے۔

پن ہول کیرے میں سوراخ چونکہ کافی باریک ہوا ہے، اس لیے طویل وقت دیا جاتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ روشنی اندر داخل ہو۔ اس عمل کو ایکسیپوز کہتے ہیں۔ جس شخص کی تصویر لی جاتی اسے سبجیکٹ کہتے تھے۔ قلم پر روشنی زیادہ ڈالنے کے لیے کافی دیر تک کیرے اور سبجیکٹ کو سامنے رہنا پڑتا ہے۔ اگر کیرے کے سوراخ کو کشادہ کر دیا جاتا تو روشنی کی زیادہ مقدار کیرے میں داخل ہو جاتی اور تصویر دھندلا جاتی کیونکہ شعاعیں آپس میں ٹکراتی تھیں۔

پن ہول کیرا دقت طلب تھا، اس لیے کہ کیرے کے سوراخ میں سے زیادہ سے زیادہ روشنی اندر جانے کے لیے ضروری ہوتا تھا سبجیکٹ اور کیرا دیر تک ساکت رہیں اور اب ہونا ممکن نہیں تھا۔ کوئی شخص اتنی دیر تک ساکت نہیں بیٹھ سکتا اور جب وہ بل جانے کا تو تصویر خراب ہو جانے کی۔ ان دشوار یوں کے باوجود پن ہول کیرا کافی عرصے تک استعمال ہو رہا۔ جس شخص کو تصویر چھوٹا ہوتی تھی اسے اپنے چہرے پر کھڑا سی کر میبل کر کے کیرے کے سامنے ساکت بیٹھنا پڑتا تھا۔

اس دشواری پر قابو پانے کی کوشش کی جاتی رہی کہ روشنی کی زیادہ مقدار لینز سے گزر کر اندر جائے لیکن سبجیکٹ کو زیادہ دیر تک ساکت نہ بیٹھنا پڑے۔ یہ مقصد لینز سے حاصل ہوا۔ لینز شیشے کا بنایا جاتا۔ اسے زیادہ سے زیادہ فیس بنایا جاتا تاکہ وہ روشنی کی شعاعوں کو تیزی سے گزاردے۔

جب کیرے کے عدسے سے گزرنے والی روشنی اندر آتی تو سیدھی جا کر قلم کے رول یا ٹکڑے پر پڑتی۔ وہ نقطہ

حافظ محمد یوسف آزاد

اردو اور ہندی کے ممتاز شاعر سکندر راؤ علی گڑھ (یو۔ پی) میں شیخ ظفر الدین کے علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ فیصلہ شیخ انقریش کے چشم و چراغ تھے جو قصی بن کلاب اول حاکم کدہ کمرہ کی نسل مبارک سے ہے۔ شاعری میں اپنے تایا اللہ راہی راہبر کے شاگرد ہوئے۔ سلسلہ محمد امیر مینائی سے جاملتا ہے۔ آپ عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم گلوکار موسیقار بھی تھے۔ ترنم کے ساتھ مشاعروں میں کلام سنایا کرتے تھے اور سحر طاری کر دیتے تھے۔ حفظ قرآن آپ نے علامہ سید محمد ابراہیم سے کیا۔ ابتدائی دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کاروبار کو ذاتی پیشہ بنا لیا۔ سرکاری ملازمت پسند نہیں کرتے تھے۔ تحریک پاکستان میں اہم کردار ادا کیا اور مسلم لیگ کے جلسوں میں اپنی پرسوز نظموں سے مسلمانوں کے دل کو گرماتے تھے۔ آپ عربی فارسی اردو ہندی گجراتی پنجابی میں مہارت رکھتے تھے لیکن شاعری اردو اور ہندی میں کرتے تھے۔ کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے۔ 1950ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے اور سرگودھا میں مستقل سکونت رکھی۔ آپ انجمن ترقی اردو پاکستان کے اہم رکن تھے۔ آپ کے ہم عصر شعراء میں حضرت علی سکندر جگر مراد آبادی علامہ عاشق حسین سیب اکبر آبادی، سید محمد حسین زیدی قمر جلالوی پروفیسر مولانا سید علی احسن ماہروی، حکیم صغیر حسین زبیر ناروی تھے۔ آپ نے اہم ادبی خدمات انجام دیں۔ 30 دسمبر 1979ء میں سرگودھا میں انتقال کر گئے۔ آپ کا اردو شعری مجموعہ ”آئینہ آزاد ہے“ آپ کے کافی شاگردوں جو آپ کا شمن جاری و ساری رکھے ہوئے ہیں۔

مرسلہ: سید امتیاز حسین بخاری۔ سرگودھا

قدر کا زندہ معجزہ

زم زم کا چشمہ چار ہزار سال قدیم ہے۔ تیرہ فٹ چوڑا اور گیارہ فٹ لمبا ہے۔ ایک پاور فل موٹر 8000 لیٹر پریکینڈ کے حساب سے اس میں 24 گھنٹے پانی پمپ کرتی رہتی ہے۔ اس میں آج تک کافی نہیں لگی ہے اور نہ ہی پانی کا ذائقہ بدلا ہے۔ پورا دن پانی پمپ کرنے کے بعد صرف گیارہ منٹ میں پانی اپنے اصل لیول پر آجاتا ہے اسی قدرت کی بناء پر آج تک زم زم خشک نہیں ہوا، (سبحان اللہ)

مرسلہ: قرة العین، اقراسی، کراچی

جہاں پر شعاعیں مرکوز ہوتی ہیں، اس لینز کا فوکل پوائنٹ کہلاتا تھا جس چیز یا شخص کی تصویر لینا مقصود ہوتا، اسے لازم تھا کہ اس پر روشنی پڑ رہی ہو۔ یعنی دن کا وقت ہو۔ اگر رات ہو چکی ہے تو روشنی کا انتظام کمرے میں کرنا پڑتا تھا۔ جو ایک لمبے کے لیے بجلیکٹ پر پڑتی اور اسے منور کر دیتی تھی۔ اسے فلیش لائٹ کہتے تھے۔

مقصد یہ ہوتا ہے کہ روشنی بجلیکٹ سے منعکس ہو کر لینز میں داخل ہو جائے اور فلم پر مرکوز ہو کر عکس کو اس پر جما دے۔ لینز کو بجلیکٹ سے ٹھیک فاصلے پر رکھا جاتا تو داخل ہونے والی شعاعیں سیدھی جا کر فلم پر ہی مرکوز نہیں اور تصویر اچھی آتی۔ لیکن فاصلہ کم یا زیادہ ہونے سے یا فوکس درست نہیں ہوتا تو کمرے میں داخل ہونے والی شعاعیں فلم سے پہلے ہی مل جاتیں یا بعد میں یعنی عکس ٹھیک فلم پر نہیں بنتا تو عکس دھندلا ہو جاتا۔

عام طور پر پانچ میٹر کے فاصلے سے تصویر لی جاتی تھی، لیکن ڈیڑھ میٹر سے تین میٹر تک بھی اس سے اچھی خاصی تصویر آ جاتی تھی۔

اب بھی بہت اچھے کمروں میں قیمتی لینز لگے ہوتے ہیں اس لینز کو آگے پیچھے حرکت دینے کا انتظام ہوتا ہے۔ تاکہ دور اور نزدیک کی چیزوں کو آسانی سے فوکس کیا جاسکے اور عمدہ تصویر بن سکے۔

تصویر لینے وقت لینز جتنا کھلتا یعنی وہ سوراخ جس میں سے روشنی گزر کر کمرے میں جاتی ہے لینز کا پرچہ کہلاتا۔ اچھے کمروں میں اپرچہ کو چوڑا اور تنگ کرنے کا انتظام ہوتا ہے۔ اگر دن کا وقت ہے اور خوب روشنی ہو رہی ہے تو اپرچہ کو گھٹ کر دیا جاتا ہے تاکہ کم روشنی اندر جائے، جب کہ موسم ابر و لودھو ہے تو اپرچہ چوڑا کر دیا جاتا تھا۔ تاکہ زیادہ روشنی اندر آ جاتی۔

لینز کے بعد کمرے میں سب سے زیادہ ہنگی چیز اس کا ٹرے ہے جو لینز کے پیچھے لگا ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے لینز کا پرچہ کھولتے اور بند کرتے تھے۔ شٹر ایک پرزے کی مدد سے تھا جو کمرے پر لگا ہوتا۔ شٹر ایک سیکنڈ کے سوئیں حصے تک لے لیے کھل سکتے ہیں۔ ان میں تین سے پانچ تک بلائی لگے ہوتے ہیں جو ایک ساتھ کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ ان میں روشنی وقفہ ایک سیکنڈ سے ایک سیکنڈ کے تین سوئیں حصے تک ہو سکتا ہے۔ اب بھی اچھے کمروں میں شٹر کی رفتار اور اپرچہ کے بیان ایک تعلق موجود ہوتا ہے۔

کمرے کے سامنے کا وہ فاصلہ جس کی وہ صاف تصویر

لے سکتا ہے اس کے فیلڈ کی گہرائی کہلاتا تھا۔ چھوٹے لینز اور کم اپرچر سے زیادہ فاصلے کی تصویریں بھی آجاتی تھیں، اس لیے کہ دور سے آنے والی شعاعیں متوازی رہتے ہوئے لینز میں داخل ہوتی ہیں۔ بڑے لینز اور زیادہ اپرچر سے فیلڈ کی گہرائی کم ہوجاتی ہے۔

فوٹو کھینچ وقت تین باتوں کا خیال کرنا ضروری ہے۔ فاصلے کے مطابق لینز کو فوکس کرنا پھر روشنی کا لحاظ کرتے ہوئے لینز کا اپرچر کم یا زیادہ کرنا۔ آخر میں شری رفتار ایسی کرنا کہ دور روشنی کو درست وقفے کے لیے گزرنے دے۔

اگر اپرچر بڑا ہے تو ایکسپوزر زیادہ ہونا چاہیے۔ عام طور پر تعویذ اپرچر اور زیادہ ایکسپوزر اچھا رہتا ہے۔ کیمرا کیسے بھی ہو فلم کے بغیر کوئی تصویر نہیں لی جاسکتی تھی۔ سادہ تصویر جو سفید اور سیاہ رنگوں میں ہوتی ہے حقیقت میں وہ عکس ہوتا ہے جو چاندی پر آتا ہے۔ فلم سالے کی بنی ہوئی تھی، لیکن اس پر ایک شفاف مادے کی انتہائی پتلی نہ چڑھی ہوتی تھی، جو چاندی کی فلموں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ مادہ بہت حساس ہوتا ہے اس سالے میں بہت سے رنگ بھی شامل کیے جاتے تھے تاکہ تصویر لیتے وقت مختلف رنگ بھی فلم پر آجائیں۔

جب فلم پر روشنی پڑتی تو چاندی کے سالے کا لے ہو جاتے مگر فلم دھونے کے بعد ظاہر ہو جاتے۔ نگینوں میں عکس اور سیاہی سفیدی الٹی آتی تھی مگر جب پر شنگ پیپر پر نگینو پر عکس لیا جاتا تھا تو تصویر میں اصل منظر آ جاتا۔

عام طور پر کیمرے میں 35 ملی میٹر چوڑی فلم استعمال ہوتی تھی۔ یہ فلم کا رٹج کہلاتی تھی جسے کیمرے میں لگانا نہایت آسان ہوتا تھا۔ کیمرے کو پیچھے سے کھول کر فلم کا رول رکھ دیا جاتا تھا پھر کیمرے کو بند کر دیا جاتا تھا۔ کیمرے میں رول یا کا رٹج کو گھمانے اور تصویر کشی کے لیے درست جگہ پر لانے کے لیے کھل اور پرزے لگے ہوتے تھے۔ فلم کے رول کے پیچھے ایک لمبا سا کاغذ لگا ہوتا تھا جس پر نمبر پڑے ہوتے تھے۔ یعنی اب تک کتنی تصاویر کھینچ گئیں۔ کیمرے کے عقبی حصے میں ایک چوکور سا سوراخ ہوتا تھا جس کے ذریعے دیکھا جاسکتا تھا کہ اب تک کتنی تصویریں کھینچ گئیں اور کتنی باقی ہیں۔ تصویر کھینچنے کے بعد ہینڈل کو گھما کر پازینو کو گھمایا جاسکتا تھا۔ بعض کیمروں میں یہ طریقہ آٹو میک ہوتا تھا۔ یعنی جب تصویر اتر جاتی تو اگلا پازینو خود بخود آ جاتا۔

35 ملی میٹر کے کیمروں میں ایک خالی اسپول بھی لگا ہوتا تھا جس پر کا رٹج کا ابتدائی حصہ پھنسا دیا جاتا تھا اور جب فلم

کے کا رٹج کو آگے بڑھانا مقصود ہوتا تو ہینڈل کو گھمایا جا تھا۔ جب سارا رول تصویر کشی کے بعد ختم ہو جاتا تو تاریک کمرے میں اس رول کو الٹا چلا کر ابتدائی جگہ پر لے آتے تھے اور اسے کیمرے سے نکال لیتے تھے۔ پھر اس رول یا کا رٹج اسٹوڈیو والے کے حوالے کر دیتے تاکہ وہ پرنٹس بنادے۔

فلم کے کا رٹج پر جو سالے لگا ہوتا تھا اس کی بھی بہت آ قسمیں ہوتی تھیں۔ اسے کیمرے میں لگاتے وقت اس کی رفتار کا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا۔ وہ رنگوں کو کس حد تک قبول کر رہے یہ بھی ذہن میں رکھنا پڑتا تھا۔ ان ساری چیزوں کا دار و مدار کا رٹج کے سالے پر ہوتا تھا۔

وہ کا رٹج جس کی رفتار تیز ہو اور زیادہ حساس ہو دھندلے موسم کے لیے مناسب ہوتی ہیں پھر گھر کے اندر تصویر کشی کے لیے استعمال کی جاتیں۔ سست رفتار فلموں سے اچھا تصاویر اتر آتی تھیں۔ فلموں کی رفتار اس پر پڑے ہوئے نمبر۔ ظاہر ہوتی۔ نمبر جتنا زیادہ ہوگا رفتار اتنی ہی تیز ہوگی۔ فلم کی رفتار کیمرے کا اپرچر اور ایکسپوزر سٹین کرتے وقت دھیان میں رکھنا پڑتا تھا۔

چھوٹی تصویر میں رول گرین نمایاں نہیں ہوتے تھے بلکہ جب تصویروں کو بڑا کیا جاتا تو گرین یعنی نقطے نمایاں ہو جاتے۔ عام طور پر یہ نقطے تیز رفتار فلموں میں زیادہ نمایاں ہوتے ہیں لیکن سست رفتار فلموں میں زیادہ نمایاں نہیں ہوتے بعض افراد فلم کو دکان پر نہیں دینا چاہتے اور اسے ڈیولپ کرنا چاہتے تھے تو فلم کو مخصوص کیمیکل میں ڈبو۔ اس محلول میں ڈبونے کے بعد اسے صاف پانی سے اچھوٹ کر دھویا جاتا تھا اس کے بعد ایک اور محلول میں ڈالا جاتا جسے فلچر کہتے تھے۔ یہ محلول فلم پر سے چاندی کے تمام کرسٹل اتر دیتا تھا جو روشنی سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔ فلم پر صرف عکس با رہ جاتا تھا۔ اسے دوبارہ دھو کر لٹکا دیا جاتا تھا تاکہ وہ خشک ہو جائے۔ یہ نگینو کہلاتا اور بعد میں اس سے پازینو بنانا پڑا ہے۔

پازینو بنانے کے لیے پرنٹ پیپر استعمال کیا جاتا تھا جسے فوٹو گراہک پرنٹ کہا جاتا تھا۔ فوٹو گراہک پیپر اسی طرح بنایا جاتا تھا، جس طرح فلم بنائی جاتی تھی۔ اس کا چاندی یا سیاہ سالہ روشنی کے لیے اتنا حساس نہیں ہوتا جتنا کہ فلم کا، اس لیے کاغذ کے کٹڑے پر نگینو رکھ کر جب روشنی ڈالی جاتی تو کا پر الٹا عکس آ جاتا تھا۔ یہ الٹا عکس ہی اصل تصویر ہوتی۔ پرنٹنگ کے وقت اس بات کا خیال رکھا جاتا کہ نگینو کے سالے و

اسمارٹ فون

اب یہ بات اکثر دیکھنے میں آرہی ہے کہ بچے بہت زیادہ غصے میں نظر آتے ہیں۔ مطالبہ پورا نہ ہونے کی صورت میں وہ چیزوں کو ادھر ادھر پھینکنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ان وجوہ کی بناء پر والدین پریشان دکھائی دیتے ہیں لیکن ایسے تمام پریشان حال والدین کے لیے امریکی اکیڈمی برائے اطفال نے نئے رہنما اصول پیش کیے ہیں جس میں والدین کو اپنے بچوں کو سختی سے اسمارٹ فون دینے سے منع کیا ہے۔ امریکا میں واقع یونیورسٹی آف مشی گن کی جانب سے جاری کی گئی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ کچھ وقت ایسے ہوتے ہیں جب والدین اپنے بچوں کو محل اور سکون سے بٹھانے کے لیے انہیں اسمارٹ فون دے دیتے ہیں لیکن بچوں کو سکون سے بٹھانے کا یہ طریقہ بالکل غلط اور نقصان دہ ہے۔ رپورٹ کے مطابق بچوں کو سکون میں لانے کے لیے اگر اسمارٹ فون استعمال کیے جائیں تو وہ اپنے جذبات اور احساسات کو قابو میں نہیں رکھ سکتے، ہم سب یہ بات جانتے ہیں کہ بچوں کی نشوونما چھوٹی عمر میں ہی ہوتی ہے۔ یہی وہ عمر ہوتی ہے جب بچہ کھیلتا، پڑھتا، اپنے جذبات پر قابو پاتا اور لوگوں سے تعلق قائم کرنے کے طریقے سیکھتا ہے لیکن اسمارٹ فون کا زیادہ استعمال بچوں کو ان کی صلاحیتوں پر منفی اثر ڈالتا ہے۔ رپورٹ میں شائع کیے جانے والے رہنما اصول میں بتایا گیا ہے کہ دو سے پانچ سال کی عمر کے بچوں کو میڈیا کی کوئی بھی ڈیوائس دن میں ایک گھنٹے سے زیادہ استعمال کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دینی چاہیے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو بچے کی نیند اور اس کی نشوونما اور ذہنی و جسمانی صحت پر غلط اثر پڑتا ہے۔

احسان عمر۔ میانوالی

ماہ کاغذ کے سالے والی سائڈ کی طرف ہو۔ اس طرح سے ایف بی بڑی تصویر کا پرنٹ حاصل ہو جاتا جتنا کہ فلم کا سائز ہوگا۔ مگر بڑی تصویر حاصل کرنے کے لیے اتنا رول جگنا پڑتا تھا۔ پرنٹنگ پیپر پر جو کس بنا وہ نظر نہیں آتا، لہذا اسے بھی لمبیل میں ڈبو کر ڈیولپ کیا جاتا تھا، جس طرح فلم کو کیا گیا تھا۔ ڈیولپنگ اور پرنٹنگ کے لیے تارک کرے یعنی ڈارک روم میں کام کرنا پڑتا تھا تاکہ روشنی میں کام خراب نہ ہو جائے۔ لیکن سرخ رنگ کا بلب جلا لیا جاتا تو کوئی فرق نہیں پاتا اور کام کرنے میں دشواری نہیں ہوتی تھی۔

آج کے کیمروں کی قسموں کا انحصار آئیوٹیک اور فلیکس ہوتا ہے۔ ان کی نفاست اور قیمت کا انحصار ان کے اپرچر، سٹریز، لینز اور رفتار پر ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں باریکٹ میں تیز رفتار لمبرے بہت آتے تھے۔ ان میں لینز کو فوکس کرنے کا اچھا انتظام ہوتا تھا۔ ماہر فوٹوگرافر ان سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ چاہے موسم اور وقت کیسا ہی ہو وہ اچھی تصویر بنالیتے تھے۔

اب بلیک اینڈ وھائٹ کا زمانہ نہیں رہا۔ ہم رنگین تصاویر کی پسند کرتے ہیں۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ سفید روشنی میں وہ مارے رنگ ہوتے ہیں جو ہم قوس قزح میں دیکھتے ہیں۔ رنگین فوٹوگرافی میں وہ سب رنگ آجاتے ہیں جو ہم اپنے اطراف میں دیکھتے ہیں۔ بہر حال بنیادی رنگ صرف تین تھے ہیں۔ سرخ، ہبز اور نیلا۔ انہیں پرائمری رنگ کہا جاتا ہے۔ اگر تین رنگوں کو ملا کر کسی پردے پر پھینکا جائے تو سفید کی ظاہر ہوگی۔ اگر اس میں سے نیلی روشنی نکال دی جائے تو دروشتی ظاہر ہوگی، اس لیے کہ زرد رنگ نیلے رنگ کو مکمل کرتا ہے۔ اگر سفید روشنی میں سے ہبز روشنی نکالی جائے تو نیلی اور سرخ روشنیوں کا امتزاج دکھائی دے گا۔ اگر سفید روشنی میں سے سرخ روشنی نکالی جائے تو نیلی اور ہبز روشنیوں کا مرکب ظاہر

ہے۔ پرائمری رنگوں کو ملانے سے دوسرے رنگ بن جاتے ہیں۔ رنگین فوٹوگرافی کا تعلق پرائمری رنگوں کو آپس میں ملانے سے ہے۔ اس فن نے بہت ترقی کی اور رنگین فلمیں آسانی سے باب ہونے لگیں۔ ان فلموں پر سارے رنگ اپنی اصلی رنگین فلموں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک سے کاغذ پر بنائے جاتے ہیں جنہیں ہم بھی اپنے اہم میں لگاتے دوسری قسم کلر ٹرانسپیرنسی کہلاتی ہے۔ جنہیں پردے پر

دیکھا جاسکتا ہے یا پھر دیو فائنڈر میں لگا کر دیکھا جاسکتا ہے۔
 کلر پرنٹس تیار کرنے کے لیے رنگین ٹینٹو درکار ہوتے ہیں۔ رنگین ٹینٹو پر تین سالوں کی ہمیں چڑھی ہوتی ہیں۔ ہم جس چیز کی فلم لیتے ہیں اس کا نیلا رنگ سب سے اوپر والی تہ کو متاثر کرتا ہے۔ سبز رنگ درمیانی تہ کو اور سرخ رنگ سب سے نیچی تہ کو متاثر کرتا ہے۔ ہر تہ میں ایک کیمیکل چھپا ہوا ہوتا ہے جو ہلکے کھلاتا ہے۔ جب فلم کو محلول میں ڈالا جاتا ہے تو کیمیائی رد عمل سے دوسرے رنگ بھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح سے پرنٹنگ بھی پر بھی تین کیمیائی نہیں چڑھی ہوتی ہیں جن میں سے ہر ایک ایک رنگ کے لیے حساس ہوتی ہے۔ جب کاغذ کو عکس لینے کے بعد دھویا جاتا ہے تو سب رنگ ابھر آتے ہیں اور بعد میں ایک خاص طریقے سے رنگین عکس ابھارے جاتے ہیں۔

جو تصاویر ہم اتارتے ہیں وہ بظاہر تو اچھی ہوتی ہیں، لیکن ان میں بہر حال اصل رنگ نہیں ہوتے جو منظر میں دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر بادل جیسے کہ نظر آتے ہیں دیے فوٹو میں نہیں آتے۔ اس ابھرنے پر قابو پانے کے لیے فلٹر ایجاد کیا گیا۔ یہ رنگین شے کا ٹکڑا ہوتا ہے جسے کمرے کے لینز کے سامنے لگا دیا جاتا ہے، یعنی لینز میں سے گزرنے والی ساری روشنی کو پہلے فلٹر میں سے گزرتا پڑا ہے۔ فلٹر بعض رنگ جذب کر لیتا اور بعض کو آزادی سے گزر جانے دیتا ہے۔

وہ فلٹر جو سیاہ و سفید فوٹو گرافی میں استعمال کیے جاتے ہیں وہ رنگین فوٹو گرافی میں استعمال نہیں کرنا چاہئیں۔ رنگین فوٹو گرافی کرتے وقت روشنی کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ تصویر آؤٹ ڈور ہے یا ان ڈور اس کا بھی دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ ان سب چیزوں کو ذہن میں رکھ کر ہی فلٹر کا استعمال کیا جاتا ہے۔

کمرے کے چند آلات اور بھی ہوتے ہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے۔ مثلاً دیو فائنڈر جس سے منظر کو دیکھا جاتا ہے۔ جتنا منظر اس سے نظر آتا ہے اتنا ہی فوٹو میں آ جاتا ہے۔ چنانچہ ضرورت کے مطابق کمرے کو آگے پیچھے کر لیا جاتا ہے۔ دیو فائنڈر کی بھی کافی قسمیں بنائی گئیں۔ ایک میں لینز لگا ہوتا ہے اور ایک آئینہ بھی لگا ہوتا ہے جو سامنے والے عکس کو ایک چھوٹے سے پردے پر منتقل کر دیتا ہے۔ بعض کیمروں کے دیو فائنڈر میں چار خطوط کا ایک فریم نظر آتا ہے۔ جتنی تصویر لینا مقصود ہو اسے اس فریم میں بند کر لیتے ہیں۔

اس کے علاوہ ریٹج فائنڈر بھی ہوتا ہے۔ اس آلے کے ذریعے فاصلہ آسانی سے پاپا جاسکتا ہے۔ تاکہ اندازہ ہو سکے کہ

کتنے فاصلے سے تصویر کھینچی جا رہی ہے۔ اس آلے میں دو کمرے ہوتے ہیں ایک قائم اور دوسرا متحرک۔ دوسرے عکس کو حرکت دے کر پہلے والے عکس پر لایا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تصویر فاصلے کے مطابق درست طریقے سے فوکس ہو چکی ہے۔ بس چند دپانے کی دیر ہے۔

فوٹو گرافی کے مزید آلات میں فلیش ایکسپوژر بھی شامل ہے جو لینز میں غیر ضروری روشنی داخل نہیں ہونے دیتا۔

1891ء میں ٹامس ایڈیسن کے معاون نے جو اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا اور جس کا نام لاوری ڈکسن تھا، ایک کیمرا متعارف کرایا جسے کانٹو گرافر نام دیا گیا۔ کیمرے کو طاقت دینے کے لیے بجلی کی موٹر استعمال کی جاتی تھی۔ یہ کیمرا سیکلا کے 400 دیں حصے میں تصویر کھینچنے پر قادر تھا۔

1923ء میں ایسٹ مین کوڈک نے 16 ملی میٹر کا کیمرا متعارف کرایا جس کی قیمت ایک ڈالر تھی مگر۔ جب عام لوگوں کو یہ پتا چلا کہ اب وہ خود بھی تصاویر کھینچ سکتے ہیں تو اس پر ٹوٹ پڑے۔

دوڑتی بھاگتی چیزوں کی تصویر لینے کے لیے شکاری رفتار، زیادہ رکھنا پڑتی ہے۔ روشنی جیسی ہے، اس کا بھی دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ اگر روشنی کم ہے تو پرچہ کا کشادہ ہونا ضروری ہے۔ سلیو رفتار چیزوں کی تصویر لینے کے لیے آٹھ کو دیو فائنڈر پر رکھے ہوئے کیمرے کے ذریعے دوڑتی ہوئی چیز کا تعاقب کیا جاتا ہے۔ چاہے وہ رینگ کار ہو یا تیز رفتاری سے بھاگتا ہوا درندہ۔ ایسی تصویر لینے وقت فوٹو گرافر تجربہ کام آتا ہے۔

عام کیمرے اور سینما فوٹو گرافی کے لیے استعمال ہونے والے کیمرے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ عام کیمرے سے ایک وقت میں ایک ہی تصویر لی جاسکتی ہے۔ جبکہ سینما فوٹو گرافی کیمرے کے ذریعے یکے بعد دیگرے ایک لمبی فلم پر بہت سی تصاویر اتاری جاتی ہیں۔ اس کیمرے کے برقی نظام کے ذریعے فلم کا رول مطلوبہ رفتار سے چلتا رہتا اور تصویریں تیزی سے اترتی رہتی ہیں۔ کیمرے میں دو اسپول ہوتے ہیں۔ ایک پر سے فلم اترتی رہتی ہے اور دوسرے پر چھتی رہتی ہے۔ کیمرے میں دو ٹیمپل بھی ہوتی ہیں جو اسپول کو سیدھا رکھتی ہیں۔ تاکہ فلم ٹھیک سے فوکس ہو سکے۔ جب فلم کیمرے میں چلتی ہے تو ہر فریم علیحدہ عکس لیتا ہے۔ تصویر لینے وقت کیمرا ہلکا نہیں چاہیے۔ یعنی ہر فریم کی تصویر لینے وقت اس کا ساکن ہونا ضروری ہے، اسی لیے وہ اسٹینڈ پر رکھا جاتا ہے۔ کیمرے میں دو چار پرزے لگائے جاتے ہیں جو اس کام کو آسان بنا دیتے

ہونے لگے ہیں۔ جس سے دیکھنے والا خود کو اس منظر کا حصہ سمجھتا ہے اور اسے قطعی خیال نہیں ہوتا کہ وہ کوئی مصنوعی چیز دیکھ رہا ہے۔ سارا منظر مطابق بہ اصل ہوتا ہے۔

موبائل اب اتنا عام ہو چکا ہے کہ اس کے بارے میں سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ مگر اس میں جدت نگاروں نے فوٹو گرافی کے لیے کیرا بھی منسلک کر دیا اور اسے اپنی جیب میں رکھا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلا کیرا فون جاپان میں 2000ء میں فروخت کیا گیا۔ یہ ڈیجیٹل کیرے سے زیادہ سادہ ہوتا ہے اور لینز کی بنا پر کم روشنی میں بھی فوٹو کھینچ لیتا ہے۔ اس میں علیحدہ سے فلیش لائٹ نہیں لگی ہوتی ہے بلکہ فلیش اندر ہی ہوتی ہے۔ اس میں میموری کارڈ ہوتا ہے جسے حسبِ منشا نکالا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں بلیو ٹوئچ اور ہائی فائی بھی ہوتا ہے۔ کیرے کو آپریٹ کرنے کے لیے اس کا بٹن علیحدہ ہوتا ہے۔ کیرے کی کارکردگی بڑھانے کے لیے باہر سے بخٹری یا فلیش لائٹ لگائی جاسکتی ہے۔ اس سے جتنی بھی تصاویر کھینچی جاتی ہیں وہ اندرونی میموری میں جمع ہو جاتی ہیں۔ اس میں ایکسپلرٹل میموری بھی ہوتی ہے اس لیے تصاویر اس میں بھی جمع کی جاسکتی ہیں۔ پہلا اسمارٹ فون نوکیا نے مارکیٹ میں متعارف کرایا تھا۔ اسی کمپنی نے اب تک دنیا میں سب سے زیادہ کیرے فروخت کیے، جن کی تعداد تقریباً ایک ارب ہے۔ جس میں پاور بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ آج کل فروخت ہونے والے کیرا فون میں سی ایم او ایس (CMOS) ایجنسٹر فیکٹوری استعمال ہو رہی ہے۔ اس کے ذریعے سات منٹ تک کی ویڈیو بھی بنائی جاسکتی ہے۔

وہ تصاویر جو اسمارٹ موبائل فون سے کھینچی جاتی ہیں نہایت آسانی سے کمپیوٹر میں محفوظ کی جاسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ دوسروں کو بھیجی جاسکتی ہیں، کہ جس میں تار استعمال نہیں ہوتا۔ چنانچہ (غیر ملک میں) قانون کے رکھوالوں نے عام افراد کی حوصلہ افزائی کی ہے کہ وہ چھپ چھپا کر ایسے اشخاص کی تصویریں کھینچ سکتے ہیں جو کسی جرم میں ملوث ہیں۔ اس کے بعد فوراً ہی ان تصاویر کو پولیس اسٹیشن کی ای میل پر روانہ کر سکتے ہیں۔

اب تک جن کمپنیوں نے موبائل کیرا فون بنایا ہے، ان میں تو شیبا، شارپ، نوکیا، سانیو، ہیسنگ، موٹرولا، ایپل اور ایل جی الیکٹرونکس شامل ہیں۔

فلم کے کنارے پر جو سوراخ ہوتے ہیں وہ بھی اس میں آسانی پیدا کر دیتے ہیں۔ ہر فریم ایک لمحے کے لیے ٹھہر جاتا ہے اور تصویر اتر جاتی ہے۔ ایک سیکنڈ میں 24 فریم نزلر جاتے ہیں۔ مودی کیرا فرانس رونا لڈس نے 1845ء میں متعارف کرایا تھا۔

جب مودی کیرا ایجاد ہو گیا تو گھروں میں فلم دیکھنے کے لیے پولینڈ کے ایک سائنسدان نے بریجکٹرا ایجاد کیا۔ جس پر پہلے سے چھٹی ہوئی فلم لگا کر چلائی جاتی تھی اور سامنے اسکرین ہاپدہ رکھ کر فلم دیکھی جاتی تھی۔

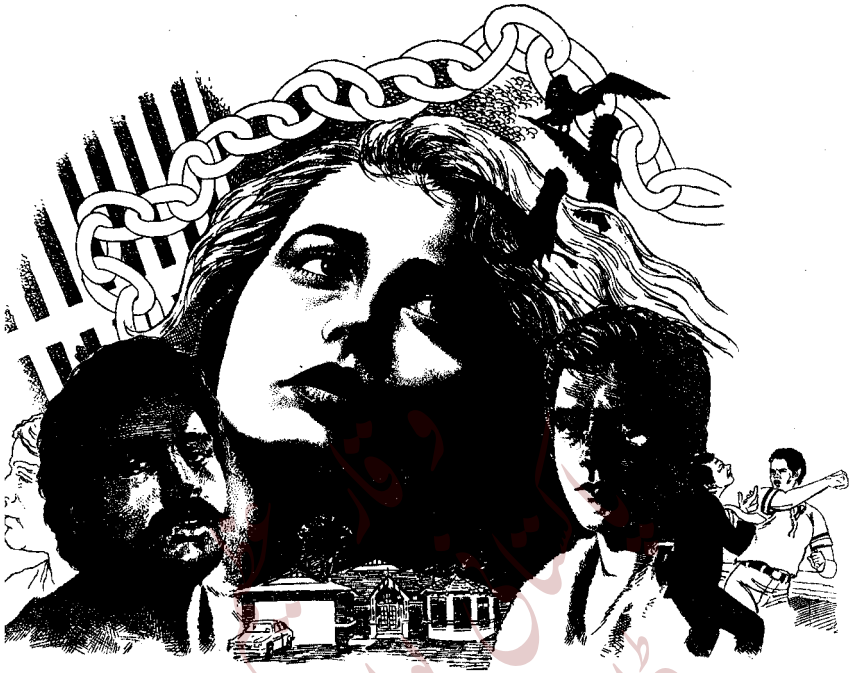
اس کے بعد ویڈیو کیرا (کمیکوڈر) اور ویڈیو ریکارڈر متعارف ہوا جس کی مدد سے آپ اپنے ٹیلی ویژن پر فلمیں دیکھا کرتے تھے۔ یہ چھوٹا ہوتا تھا اور اسے کاندھے پر رکھ کر بھی فوٹو گرافی کی جاسکتی تھی۔ اس کا بنیاد مودی کیرے کی سی تھی۔ جسے فلمیں دیکھنے کے علاوہ شادی بیاہ اور دوسری تقریبات میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اس میں فلم شیپ استعمال کیا جاتا تھا۔ ویڈیو کیرے کو ٹیلی ویژن کی براڈ کاسٹنگ میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے 1983ء میں سونی کمپنی نے عام افراد کے لیے کمیکوڈر بنایا۔ اسی سال بے وی سی نے بھی کمیکوڈر متعارف کرایا۔ اس کے بعد چٹا سوک اور پٹاچی نے بھی اپنے کمیکوڈر مارکیٹ میں فروخت کے لیے پیش کیے۔

اس کے بعد 2006ء میں اس میکینک نے ترقی کی اور ایجیٹل کیرا متعارف ہوا۔ جس میں شیپ کے بجائے کیٹ استعمال ہونے لگا۔ سب سے پہلے ویڈیو کیٹ ریکارڈر کو بے وی سی اور سونی کمپنی نے بنایا۔ جب کہ 1992ء میں امپکس نے بھی یہی چیز متعارف کرائی۔ اس میں میموری کارڈ لگائے جاتے تھے، جسے ایکسپلرٹل اسٹوریج بھی کہتے ہیں۔

مزید ترقی یہ ہوئی کہ میموری کارڈ کی جگہ بلیٹن اسٹوریج نے لے لی۔ اس میں یہ سہولت بھی تھی کہ زیادہ تصاویر محفوظ کرنے کے لیے ایکسپلرٹل میموری کارڈ بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد قمری ڈی متعارف ہوئی۔ اس میں بیک وقت تین کیرے ریکارڈنگ کرتے تھے۔ دائیں بائیں اور سامنے۔ ان تینوں کو یکجا کر کے جو فلم بنائی گئی اسے قمری ڈی کہا جاتا ہے۔ 2010ء میں جنہو کیروں نے اپنی فلم ”اوتار“ اسی میکینک پر بنائی تھی۔ 2011ء میں چٹا سوک کمپنی نے ایسا کمیکوڈر متعارف کرایا جو قمری ڈی شوٹنگ کر سکتا ہے۔

بات یہاں ختم نہیں ہوئی۔ میکینک نے مزید ترقی کر لی ہے، اب کسی منظر کو شوٹ کرنے کے لیے چھ کیرے استعمال



قسط نمبر: 10

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تار عنکبوت میں پھنسا چلا جا رہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لیا۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

رانا بشیر کی بیوی کا قتل ہو گیا تھا اور الزام آیا تھا احمد حسین پر۔ اس جرم میں اسے پھانسی ہو گئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ زبیرہ کے ساتھ مل کر اصل قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بشیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اب بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری اڈے کی یونین میں نائب ضلعی صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈا ختم ہو جائے اور اس کی زمین پر عمارت بنا کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ شدید ہی سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی چال نعمان اپنی پرانت دیتا، ابھی وہ اس مسئلے پر غور کر ہی رہا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو جتوئی لکھی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کر ہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی فہیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی ہیں جسی ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہن کو اکثر رات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔ فہیم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحانہ کا منہج آگیا کہ اسے ڈائری کا پارٹ ٹول کیا ہے۔ اگلے دن زبیرہ کے ساتھ میں فرحانہ کے گھر گیا تو ڈائری کے واقعات سنے جس نے رفعت ٹکڑے کے واقعے کو مزید الجھا دیا تھا۔ اس دن میں اڈے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آگئے۔ ان میں عزیر خان بھی تھا جس کو اکثر کی بہن ٹوبیہ کی کشمکش کا ڈسے اور سہرا جا رہا تھا۔ میں نے عزیر خان سے کہا کہ آپ سے مل کر خوش ہوئی ہے۔ میں خود بھی جا رہا تھا کہ کاروباری حضرات کو بھی سہولت ملے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ معاہدہ پانچویں پر ہو لیکن ان لوگوں نے منہج کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں سہرا جا رہا تھا کہ کالیا کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ عارف محمد رنیل سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر سننے ہی میں الجھ گیا۔ گڈز ٹرانسپورٹ کی گاڑیاں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ سہرا بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گڈز کی آڑ میں خفیات کا کاروبار ہوتا تھا۔ سہرا کو رخصت کر کے میں بیٹھا ہی تھا کہ کالیا آگیا۔ اس نے بتایا کہ میری ضمانت منسوخ ہو چکی ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے ایس ایچ او اور خان آ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلا اور اس کی ہائیک پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ کالیا کے اڈے پر پہنچا تھا کہ بہن کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس گھر پر آئی تھی اور فہیم کو لے گئی ہے۔ مجبوراً میں نے گرفتاری دے دی۔ وہاں مجھے پر تشدد دیا ہوا۔ میں حالات میں بیٹھا تھا کہ ایک سیای نے آکر ایک اخبار دیا۔ اخبار میں چھپی خبر دیکر کہ میں پریشان ہو اٹھا۔ فہیم کے چھپنے نے مجھے اٹکلا دیا تھا۔ وہ تھپڑ مار کر باہر نکل گیا تھا۔ میں اڈے پر پہنچا تو وہاں صوبیہ کے قتل میں ملوث عزیر نظر آگیا۔ میں اس کے دفتر میں پہنچا اور ان سے صوبیہ کے منتقلی پر چھا۔ وہ گھبرا اٹھا۔ میں نے کہا کہ یہ سوال پولیس بھی پوچھتی کہ اور وہاں سے اٹھا آیا رانا بشیر کے ہاں پہنچا پھر میں نے ٹرک ڈرائیور کی گھوغھاسی کرا دی جس کے ٹرک نے زبیرہ کی کار کو ٹکرایا تھا۔ گھر آیا تو کاشف ملے آگیا جو میری بہن کو جا رہا تھا۔ وہ مجھ، آغا، کاسن کر پریشان ہو گیا۔ پھر اسی رات کالیا کے ساتھ میں سہرا ستار کے بیچے میں داخل ہوئے۔ وہاں روزی نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ سہرا ستار نے کہا کہ اس نے میری بہن کو ایک جگہ چھپا رکھا ہے ابھی بلواتا ہوں کہہ کر اس نے کسی کو فون کیا کہ لڑکی کو لے کر آجائے۔ یہی روزی نے کہا کہ سہرا ستار جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے لڑکی کو قلعہ حدید میں نہیں کہیں اور رکھا ہے پھر اس نے بتایا کہ میں سہرا ستار سے اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لیے اس کے ساتھ ہوں۔ بعد میں اس کا کہا جگہ نکلا۔ اس کے آدمیوں نے مجھے بھی زخمی کر دیا۔ ساتھیوں سے شک کر میں نے سہرا سے اٹھو الیسا کہ حاصرہ کو کہاں رکھا ہے اسے باحفاظت نکال لایا پھر روزی کے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ یہ اس کی کنبلی کا قلعہ تھا۔ ہم اس سے بات کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر باہر سے آواز آئی۔ ”کیبل والا بلے لے کر آیا ہوں۔“ روزی نے دروازہ کھولا تو کیبل والے کو دھکا دے کر دروازہ بند کر دیا۔ اس سے شک کر میں نے اسپیکٹر کا مہران کو فون پر کہا کہ روزی کی حفاظت کے لیے دو پولیس والے منہج دو۔ پھر میں... کالیا کے ساتھ باہر آگیا۔ اسپیکٹر کا مہران کی معرفت گئی ایک کو گرفتار کر لیا پھر زبیرہ کے گھر پہنچا۔ کچھ ضروری باتیں کر کے میں باہر نکلا تھا کہ ایک ٹیکسی پر نظر پڑی۔ میں اسے نظر انداز کرتا کہ اس ٹیکسی میں بیٹھا ایک شخص اتار کر زبیرہ کے دروازے پر پہنچا۔ میں ہوشیار ہو گیا اور بھاگتا ہوا زبیرہ کے پڑوس والے گھر میں داخل ہو گیا اور چھت کے ذریعے زبیرہ کے گھر میں اتر گیا۔ ٹیکس اسی وقت بچے سے گولی چلنے کی آواز آئی اور ایک نساوئی چلنے لگی دی۔

(اب آگے پڑھیں)

متوقع منظر دیکھا تھا۔ ایک سٹیل جسم کا شخص، جس کے دائیں پہلو سے خون رس رہا تھا، اپنے زخم پر ہاتھ رکھتے ہوئے، لڑکھڑاتے قدموں سے نکاسی کے دروازے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ میں ہکا بکا سارہ گیا تھا۔

”ٹرک جاؤ ورنہ دوسری گولی چلا دوں گی۔“ اچانک اسی کمرے سے میں نے ایک اور ناقابل یقین منظر دیکھا، وہ زبیرہ تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں اسٹیل کا ایک اعشاریہ ڈبل ٹوبر کا لیڈر پہنل تھا۔ اس کے عقب میں خالہ نجو ہراساں

گولی چلنے کی آواز اور اس کے ساتھ ہی ایک نساوئی چلنے ابھری جسے سن کر میرے تیزی سے دھڑکتے دل میں پہلا بولناک خیال زبیرہ کے سلسلے میں یہی ابھرا تھا کہ کہیں وہ خدا نخواستہ دوسری بار دشمنوں کی سفاکی کا نشانہ نہ بن گئی ہو؟

میں تب تک نیچے ٹھکن میں جانے والی میز میوں کے قریب پہنچ چکا تھا کہ گویا میری شاگوں میں جیسے بجلیاں بھر گئی تھیں۔ میں دو، دو، تین، تین قدم چھلانگ ہوا مگر میں تقریباً آگرا تھا اور سٹیل سٹیل میں نے ایک چوٹکا دینے والا غیر

انداز میں پہنچی ہوئی لپکی تھیں۔ وہ زہیرہ کو اس اجنبی کے پیچھے جانے سے روکنے کی کوشش میں تھیں۔ گولی چلنے کے بعد وہ نسوانی چیخ شاید خالہ نجمہ کے ہی حلق سے برآمد ہوئی تھی۔ دونوں خواتین مجھے دیکھ کر چونکی بھی تھیں۔

تب ہی میں ہل کے ہل میں معاملے کی تہ تک پہنچ گیا، تب ہی میرے دم پر خود جود میں جیسے لاوا سا دھوکا گیا۔ وہ آدمی ابھی دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ میں نے اپنی جگہ سے جست بھر کر اسے دبوچ لیا۔ وہ پہلے ہی زہیرہ کی چلائی ہوئی گولی سے بے حال تھا اور تیزی اس کے وجود سے عقاب تھی۔ میں نے اسے دبوچ کر پٹائی بھی دے ڈالی۔ وہ گھومتا ہوا زہیرہ کے قدموں میں جا کر۔

زہیرہ کے چہرے کی دکھائی اور صباحت کی جگہ پر غیظ نے لے رکھی تھی۔ اس نے ہنوز اپنے لیڈرینسٹل کارخ اسی کی طرف کر رکھا تھا اور وہ اسی لہجے میں حملہ آور کو دھمکاتے ہوئے بولی۔ ”خبردار! اب اگر کوئی حرکت کی تو گوئی تمہارے سر میں اتار دوں گی۔“

”زہیرہ! یہ پستول مجھے دو اور تم جلدی سے ری لے آؤ۔“ میں نے اس سے کہا تو زہیرہ نے فوراً میری ہدایت پر عمل کیا۔ وہ پستول مجھے تھما کے اندر سے ری لے آئی۔ اس آدمی کی حالت پہلے ہی غیر ہو رہی تھی۔ پھر بھی احتیاط کے پیش نظر میں نے صرف اس کی دونوں ٹانگیں ہی پکڑنا ضروری سمجھا تھا۔

”تم پولیس کو فون کرو۔“ میں نے زہیرہ سے کہا۔ اسی وقت باہر سے دروازہ زور زور سے دھڑکا جانا لگا۔

”دروازہ کھولو کیا ہو رہا ہے اندر۔“ وہ محلے ہی کے لوگ تھے اور کوئی بعید نہ تھا کہ ان میں وہ پختہ عمر شخص بھی شامل ہو جس کے گھر میں زبردستی گھس کر میں نے ان کے مکان کی چھت ٹاپی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔

”کیا ہوا ہے بھائی؟“ خیریت ہے؟“ کسی نے مجھ سے پوچھا۔ ان سب کی نظر میں میں تھکیک کے سائے تھے جبکہ مذکورہ شخص شے کی کڑوی سیکی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

”اندر دیکھ صاحبہ رہتی ہیں، وہ تو تھک ہے نا؟ آخر ہوا کیا ہے، یہ گولی چلنے اور چیخوں کی آوازیں کیسی تھیں؟“

”بھائیو! کوئی چور گھسا تھا اندر مگر دیکھ صاحبہ نے اپنے پستول سے اسے زخمی کر دیا ہے۔“ میں نے انہیں بتایا۔

”بھائی! تم خود کون ہو؟ پہلے بھی تو محلے میں نظر نہیں

آئے؟“ ایک نے پوچھا تو وہی پختہ عمر آدمی بولا۔

”یہ بھی چور کا ساتھی ہے۔ اپنے ساتھی کو بچانے کے لیے زبردستی میرے مکان کی چھت پر اور۔۔۔۔۔۔“

”آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ یہ میرے عزیز ہیں۔ میں انہیں جانتی ہوں۔“ زہیرہ نے کہا۔ باتوں کی آوازیں سن کر وہ بھی دروازے پر آگئی تھی۔ زہیرہ کی بات سن کر خاموش ہو رہا۔

”ہم نے پولیس کو فون کر دیا ہے، وہ ابھی پہنچنے ہی والی ہے۔“

”میں نے ون فائیو پر اطلاع دے دی ہے۔“ وہی شخص بولا۔

”ابھی بات ہے۔“ زہیرہ نے کہا اور پھر ان کا شکریہ ادا کر کے دروازہ بند کر دیا۔ ہم دونوں واپس ہوئے۔ زخمی حملہ آور صحن کے فرش پر پڑا کر رہا تھا۔

باہر ابھی تک لوگوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ انہیں تو تماشا چاہیے باتوں کی جھینبا نہیں سنائی دے رہی تھیں۔

”اسے مرنا نہیں چاہیے۔ ہمیں کم از کم اسے فرسٹ ایڈ تو دے دینی چاہیے۔“ میں نے خاصے نظر سے کہا۔ مخاطب زہیرہ تھی، وہ جواب دہی بولی:

”پولیس کے ساتھ میں نے ایبوی لنس کو بھی فون کیا ہے۔“

”مددگار“ تھانہ قریب ہی تھا۔ پولیس آن پہنچی، ایبوی لنس بھی ساتھ تھی۔ تھانہ انچارج ایک نوجوان سائیس آئی تھا۔ سینے پر اختر کے نام کا کچ لگا تھا۔ اس نے ہم دونوں سے بیان لیا۔ زہیرہ نے اپنا تعارف جب ہائی کورٹ کی وکیل کی حیثیت سے کروایا تو وہ خاصا مرعوب نظر آنے لگا۔

زہیرہ اور میں نے اسے صرف متعلقہ حالات کے بارے میں مختصر بتایا اس کے بعد اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ایڈووکیٹ زہیرہ پر یہ دوسرا قاتلانہ حملہ ہے۔ پہلے والے حملے کے کیس سے متعلق تھانہ پلیر شرٹی میں تفتیش جاری ہے۔ یہ اسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ ہمارے دشمن کون ہیں یہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں اور بہ احسن خوبی ہم ان تک قانونی تقاضے پورے کرتے ہوئے پہنچنے والے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ خود کو کسی آزمائش میں ڈالنے بغیر ہماری گزارش کے، جو آل ساتھ اس کیس کو انسپکٹر کامران کے سپرد کر دیں گے، جو آل ریڈی اس کیس پر کام کر رہے ہیں۔“

سب انسپکٹر محمد راجا ثابت ہوا، وہ میری بات کا اشارہ سمجھ گیا اور پھر اس نے وہی کیا۔

اگلے چند گھنٹوں بعد ضابطے کی کارروائی مکمل ہو چکی تھی۔ حملہ آور کو پولیس کسٹڈی میں اسپتال لے جایا گیا تھا۔ وہاں سے خبر آئی کہ انسپکٹر کامران نے تین پولیس اہلکاروں کو متعین کر دیا ہے۔

”ڈشمنوں کے جتنے گماشتے پکڑے جائیں گے اتنی ان کے گرد گھیرا تنگ ہو جائے گا۔“ زئیرہ نے مجھ سے کہا۔ موجودہ حالات نے اسے کافی غرور بنا دیا تھا۔ اس کے ہرے سے لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے ایک اور قاتلانہ حملے سے بال بال بچي تھی، البتہ خالہ نجو ابھی تک فکر مند اور ہراساں نظر آ رہی تھیں۔ پھر بھی انہوں نے چائے کا انتظام کر دیا تھا اور ضروری دودھ و چوب کے بعد ہم بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

”ہاں!“ میں نے جواب میں خالی کپ تپائی کر رکھے ہوئے کہا۔ ”اسی لیے میں ہر وقت انسپکٹر کامران کے ساتھ رابطے میں رہتا ہوں۔ عزیز خان بھی پولیس کی گرفت میں ہے۔ ثوبیہ کے قتل کا اس پر کیس پکا ہے۔ مہران خان اپنے لاڈلے بیٹے کی ضمانت کے لیے بھاگ دودھ میں مصروف ہے، سیٹھ ستار کا نائب نامی آدی قابو میں آ گیا ہے۔ اسے ڈراما کر اور کچھ اس کا ضمیر جگا کے اس کی مدد حاصل کی جانے کی اُمید تو ہے مگر یہ قول کا لیا نائب براتی جلدی بھروسہ کرنا خطرناک ہوگا جبکہ روزی کی شکل میں بھی سیٹھ ستار کے گلے کی رسی پہلی ہی تیار ہے۔“

”اوائس کریٹ۔“ زئیرہ متاثر کن انداز میں مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”ایک دم فاسٹ چار ہے ہو نوی تم! میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“ ایک لمحہ توقف کے بعد وہ بارہ بولی۔ ”تمہارے بھائی، فیہم کی کوئی خبر؟“

بھائی کے ذکر پر میرا چہرہ اداسی کی تصویر بن گیا۔ میں نے فیہم سے متعلق تازہ صورت حال سے آگاہ کیا تو بل کے بل اس کے چہرے سے تھوڑی دیر پہلے والی متوقع کامیابی کی خوش اُمیدی عطا ہونے لگی اور اس کی جگہ فکر و تشویش نے لے لی، پھر وہ اسی لہجے میں بولی۔ ”نوی! یہ اچھا نہیں ہوا۔ ڈشمن ہمارے کامیابی کی طرف بڑھتے سفر کو نام بنا سکتے ہیں۔ تم سمجھ رہے ہونا میری بات؟“

ایڈووکیٹ زئیرہ کے دل میں بھی وہی خدشہ ابھرنا مین امر تھا جو میرے اندر بھی بل رہا تھا۔ میں نے کہا۔

”اسی بات کی تو مجھے فکر ہے لیکن ایسا تب ہوگا جب فیہم سیٹھ ستار یا مہران خان کی قید میں ہو۔“

”کیا مطلب؟“ زئیرہ نے قدرے چونک کر اچھے

ہوئے انداز میں کہا۔ ”ان کے علاوہ بھلا اور ایسا کون سا نیا دشمن پیدا ہو گیا؟“

”ڈشمن تو وہ بھی پرانا ہی ہے میرا۔“ میں نے اسرار بھرے انداز میں کہا۔

”کون؟“ زئیرہ نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”پردہ نشین۔“

”پردہ نشین؟“

”ہاں۔“

”یہ کون ذات شریف ہیں؟“

”میرا اصل دشمن جس کی مجھے تلاش ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے وہی لوگ جنہوں نے تمہارے والد کو بے گناہ بھانسی کے پھندے پر چڑھایا؟“

”ہاں!“

”کیا تمہارا اس سے کوئی رابطہ ہوا ہے؟“

”تم شاید بھول رہی ہو یا میں تمہیں بتانا بھول گیا۔ ایک شخص کا کچھ روز پہلے فون آتا تھا۔ میں اس وقت اپنی مہران میں تھا اور کالیا بھی میرے ساتھ تھا، پولیس اسٹیشن چار ہے تھے کہ راستے میں اس کی میرے موبائل پر کال آئی تھی۔ وہ مجھ سے یہی کہہ رہا تھا کہ ”جو ہو گیا اسے جانے دو اور جو ہو رہا ہے اسے مت روکو ورنہ تمہارا انجام بھی تمہارے باپ سے مختلف نہ ہوگا۔“

”اوہ۔“ زئیرہ کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔

”میں اسی لیے اسے پردہ نشین کہتا ہوں کیونکہ پردے کے پیچھے رہتے ہوئے وہ میری ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے ہے اور میں اسے نہیں دیکھ پا رہا ہوں۔“

”لیکن اتنے عرصے بعد اس کا تم سے رابطہ کرنا۔ بتا رہا ہے کہ وہ تمہاری مہم جونیوں سے پریشان ہو گیا ہے جس کا ثبوت اس کی فون کال ہے۔“ زئیرہ نے کہا۔

”درحقیقت وہ پردے کے پیچھے نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بلکہ اس نے ایک ڈری کبھی بی بی کی طرح خود کو قہیلے میں بند رکھا ہوا ہے۔ میری کوششیں اسے باہر نکلنے پر مجبور کر دیں گی۔“

زئیرہ میری بات پر بے خیال انداز میں اپنے سر کو جنبش دیتے گئی۔

”میں آج شام رانا بشیر کے ہاں جانے کا ارادہ رکھتا

ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اس معاملے کو جتنی تیزی سے آگے بڑھاؤں گا اتنا ہی وہ پردہ نشیں بے چین ہو کر پردے سے باہر آنے پر مجبور ہو جائے گا۔“

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک میرے سیل کی بیل منگنٹی۔ یہ سدو بھائی کی کال تھی۔

”ہاں! کہو کیا رپورٹ ہے؟“ میں نے دھڑکتے دل مگر کبیر لہجے میں پوچھا۔

”جناب! اس لڑکے کا میں نے پتا لگا لیا ہے۔“ اس

نے جواب دیا اور میری ساری حیات جیسے سمٹ کر کانوں کے

پردوں سے چپک گئیں۔ ”اس لڑکے کا نام خمیر ہے۔ وہ ایک

بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ باپ کا نام شاہ میر ہے جو ایک چھٹی

ریاست کی بڑی آکل کمپنی کا چیئر مین ہے۔ وہ عموماً ملک سے

باہر اور چھٹی ریاستوں کے دورے پر ہوتا ہے۔ رہائش ڈینش

نفر فائو میں ہے۔ ایک حالیہ شان کوٹھی ہے۔ جہاں صرف تین

افراد مستقل طور پر رہتے ہیں۔ شاہ میر کی بیوی لکلی مصاد جو

ایک عربی خاتون ہے۔ اس کا جوان بیٹا خمیر شاہ اور اس سے

ایک سال چھوٹی بیٹی کافہہ۔ شاہ میر مبینے دو مبینے بعد اپنے

پرائیویٹ طیارے میں آتا جاتا رہتا ہے۔“

میں نے غور سے سدو بھائی کی ان معلومات کو ذہن

نشیں کیا اور توصیفی لہجے میں بولا۔ ”گڈ! اب مجھے ذرا رانا

بشیر کے بارے میں بتاؤ کہ اس سے متعلق تم نے اب تک کوئی

غیر معمولی بات محسوس کی؟“

”جی جناب! وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

”بولتے جاؤ، میں سن رہا ہوں۔“

”جناب! رانا بشیر امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتا

ہے۔ شاہراہ فیصل میں اس کا دفتر ہے۔ اس کے پاس

کاروباری افراد آتے جاتے رہتے ہیں۔ بڑی مشکلوں سے

صرف ایک ہی غیر معمولی بات کا پتا لگا سکا ہوں جناب! وہ

بتانے لگا اور لمحہ بھر کو سانس لینے کے لیے رکا۔ میں پورے

دھیان اور دھڑکتے دل سے اس کی منتظر رہا۔ اگلے لمحے وہ مزید

بتانے لگا۔ ”وہ کسی ایسے شخص کی وجہ سے پریشان ہے جو اسے

دفتر کے نمبر پر فون کرتا ہے، میرا خیال ہے وہ رانا بشیر کو کسی وجہ

سے بلک میل کر رہا ہے اور اس سے اپنا کوئی مطالبہ منوانا چاہ رہا

ہے۔“

”وہ اس سے کیا باتیں کرتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تین بار اس آدمی کی کال آئی تھی۔ پہلی بار جی گفتگو

میں نہیں سن سکا تھا، دوسری بار دھوری سنی تھی البتہ تیسری بار کی

گفتگو اگرچہ مختصر تھی اور میرا خیال ہے یہی زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔“

”کسی لیے اہمیت کی حامل تھی؟“

”اس شخص نے رانا بشیر کو کل ایک فائو اشار ہوٹل کے

کمر نمبر 57 میں بلایا ہے، شاید کوئی اہم گفتگو کرنی ہے۔“

”کتنے بجے بلایا ہے؟“ میں نے فوراً پوچھا۔

”نوب بجے۔“

”کچھ ساتھ لانے کو کہا تھا رانا بشیر سے؟“ میں نے کسی

خیال کے تحت پوچھا۔

”جی جناب! کوئی اہم نوعیت کا کاغذ تھا وہ۔ یا پھر

شاید کسی معاہدے کا کاپی یا خط وغیرہ۔“

”سدو!“

”جی جناب!“

”اس ہوٹل تک ساتھ رہ سکتے ہو؟“

”بالکل سہرا مگر میں دوسرے ہمیں میں ہوں گا۔“

”چلے گا۔ ایک بات اور۔“ میں نے کہا۔ ”کوئی ایسا

طریقہ سوچ کر رکھو جس سے ہم مذکورہ ہوٹل میں داخل ہو کر

آرام سے ان دونوں کی گفتگو سن سکیں۔“

”جناب! آپ اس کے لیے کل ٹھیک آٹھ بجے میرے

پاس پہنچ جائیں۔“

”گڈ۔ میں آ جاؤں گا۔“

”میں منتظر ہوں اور کوئی طریقہ بھی تیار کیے رکھوں

گا۔“ سدو بھائی نے جواب دیا اور میں نے ایک بار پھر اس

کے لیے توصیفی انداز میں اختتامی جملہ ادا کیا اور رابطہ منقطع

کر دیا۔

میں نے اپنی رست و اچ میں وقت دیکھا۔ رات کے

دس بج رہے تھے۔

”کس کی کال تھی؟“ زئیرہ نے پوچھا۔

”میرے ایک خبر کی۔“

”کوئی خاص بات بتا رہا تھا تمہیں۔“ اس نے کہا۔

”ہاں! باقی کل۔ میں اب چلوں گا۔ اپنا خیال رکھنا۔“

”ٹھیک یونوی!“ وہ آخر میں کھڑے ہو کے مجھے

رخصت کرتے ہوئے بولی۔

”کس بات کا؟“ میں نے حیران مگر مسکراتی نظروں

سے اس کی طرف دیکھا۔

”تم میری مدد کو پہنچ گئے تھے۔“

”یہ اتفاق ہی تھا کہ مجھے اچانک ان دونوں افراد پر شبہ

ہو گیا تھا، افسوس کہ اس کا دوسرا سہمی جو باہر ٹکسی میں بیٹھا تھا، فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

”نہیں نوی! یہ اتفاق نہ تھا بلکہ میرے لیے تمہاری غیر معمولی احتیاط کا زیادہ دل تھا اس میں۔“ وہ بولی۔

”اب میں چلوں گا۔ بہنا اکیلی ہے گھر میں۔ کل بہت کچھ واضح ہو جائے گا۔“ میں نے ایک دبے دبے جوش تلے کہا اور پھر اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔

میں زہرہ کے کمرے نکلا تو چند لوگوں کو باہر کھڑے پایا۔ وہ میری جانب عجیب عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگے۔ میں ان کی پروا کیے بغیر اپنی کار میں بیٹھا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ طبر جانے کے لیے میں جیسے ہی شاہراہ فیصل پر آیا تو یہاں ٹریفک کا سیلاب لہاڑا اڑا تھا۔ ٹریفک کا یہ سیلاب شام چھ بجے کے بعد سے ہی ٹپ ٹپ کرنے لگا اور رات بارہ بجے تک عروج پر ہوتا۔

گراچی میں کل گری زور دروں پر تھی جس کی کیفیت سوا تھی۔ میں نے کار کے شیشے چڑھا کر اسے ہی آن کر لیا تھا کیونکہ ٹریفک سست روی کا شکار بنی بلکہ کہیں پر تو بہرہ نوسر چل رہی تھی، بالکل چیونٹی کی رفتار سے۔ باوجود اس کے میرا ذہن ان محنت سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مافیانی چٹیس دشنوں (سیٹھ ستار اور حاجی مہراں خان وغیرہ) کو چھوڑ کر اب میرا سارا دھیان اپنے اصل دشمن، اس پردہ نشین کی طرف چلا گیا تھا۔ اس کی ایک باریک بال کی آنکھیں اور مجھے اس کا لبہ دلچسپ آواز سب اچھی طرح سے ذہن نشین ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی اصل آواز میں ہی مجھ سے بات کر رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ میں جیسے جیسے رفعت خان مرڈر کیس پر چھائی ہوئی گرد کو تہہ در تہہ صاف کرنے میں مصروف تھا، اس نے ”پردہ نشین“ کو گھبراہٹ میں جتلا کر دیا تھا۔ اس سے پہلے بھینا وہ پردے کے پیچھے خاموش بیٹھا تھا شاید کچھ رہا تھا مگر جب اسے میرے کامیابی کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کا اندازہ ہوا تو وہ ہلکا اٹھا اور گنہ گار کا ڈر لینے مجھے دھمکانے پر اتر آیا۔ یہ کامیابی اپنی جگہ مگر مجھے محض اسی خوش فہمی میں جتلا رہے ہوئے احتیاط کا دامن بھی نہیں چھوڑنا تھا کہ جو محض بڑی صفائی سے نہ صرف رفعت خان کا لٹل کر سکتا ہے بلکہ خود کو بچا کر کسی بے گناہ کو تختہ دار پر بھی چڑھا سکتا ہے تو وہ کتنا چالاک اور خطرناک مجرم ہوگا۔

اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ میں نے اسکرین میں دیکھا اور چونک پڑا۔ وہ ثاقب کی کال تھی۔

”ہاں! ہیلو کوئی خاص بات؟“ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”جی! نعمان بات کر رہے ہو؟“ دوسری جانب سے ثاقب کی آواز ابھری، اس کا لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا، کچھ گٹا گٹا سا، جیسے آواز دھیمی رکھنے کی کوشش میں ہو۔

”ہاں۔ نعمان ہی بات کر رہا ہوں۔ آگے بولو۔“ میں نے فوراً کہا۔

”آپ کہاں ہیں اس وقت؟“

”میں شاہراہ فیصل پر ہوں۔ اصل بات کرو جلدی۔ ہوا کیا ہے آخر؟“ میں نے بے چینی سے کہا۔

”یاسر آیا ہوا ہے۔ سیٹھ صاحب کے پاس۔“ اس نے جیسے چونکا دینے والا انکشاف کیا۔

”کیا اس وقت۔ کہاں؟ آفس میں؟“ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

”جی ہاں، بوٹ بیسن کے بلیومون ہائٹس آفس میں۔“ اس نے بتایا۔ ”بڑی مشکلوں سے باہر نکل کر آپ کو فون کر رہا ہوں۔“

میرا ذہن تیزی سے سوچنے لگا اور پھر یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ ”میں ابھی پہنچتا ہوں۔“

کہیں پہنچنے کی جلدی ہو تو ٹریفک کا رش اور زیادہ جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ شکر تھا کہ سڑک پر موجود چیونٹی کی رفتار سے رینٹی ہوئی گاڑیوں کے آڈیو میں، میری کار بائیں جانب کے ایک ”کٹ“ سے گزر رہی تھی۔ یہ ایک ذیلی راستہ تھا جو لال قلعہ ہوٹل اور دیگر راستوں کو ”بچ“ کرتا تھا۔ میں نے فوراً اسٹیرنگ بائیں جانب گھمائی اور رفتار بڑھا دی۔ میں تیزی کے ساتھ آگے سے ایک چمکرات کر دوسری شاہراہ پر آ گیا۔ یہاں نسبتاً کم رش تھا۔ تاہم میں ”فاست لائن“ میں کار دوڑاتا ہوا ڈیفنس اور وہاں سے بوٹ بیسن جا پہنچا۔

میں نے ثاقب کو منہج کر دیا کہ میں آچکا ہوں اور بلیو مون آفس کے سامنے اپنی کار میں موجود ہوں۔ یاسر جیسے ہی باہر نکلے مجھے اس کے حلیمے سمیت اس کی ڈرینک کے بارے میں بھی آگاہ کر دے۔

جلد ہی اس کار پلائی آگیا۔ یعنی ”اوکے“ میں نے اپنی کار بلیومون ہائٹس کی عمارت کے سامنے ڈرا در دو دیگیوں کے قریب کھڑی کر دی۔ روڈ لائٹ روشن تھیں۔ گاڑیوں کی گزرتی ہوئی تیرہیڈ لائٹس نے بھی اس

شاہراہ پر روشنیوں کا سیلاب سا اُڈا رکھا تھا۔ اچانک میٹج کی ہلکی ٹون بجی۔ میں نے جھپٹ کر براہر کی سیٹ پر رکھا موبائل اٹھالیا۔

”وہ باہر نکل رہا ہے۔ درمیانی جسامت کا بی آدی ہے۔ عمر پینتیس چالیس کے درمیان ہے۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کی شلوار قمیض پہن رکھی ہے۔

میں نے فوراً کار اشارت کی اور عقابلی نظروں سے بلیومون کے شیشے والے دروازوں کی طرف دیکھنے لگا، چند ہی سیکنڈوں بعد مجھے ایک درمیانی جسامت کا شخص جس نے ہلکے نیلے رنگ کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی، دروازے سے باہر نکلتا دکھائی دیا۔ میرے اعصاب یکھت تن گئے۔

میں نے اسے ایک بار بردار سوزو کی ”منی ٹرک“ میں سوار ہوتے دیکھا جو خالی تھی، میں نے سب سے پہلے نہایت ہوشیاری اور چابک دستی کے ساتھ اپنے کمرے کے ذریعے اس کی دو تین تصاویر لیں۔ جب وہ بلیومون کے دفتر کے صدر دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔

وہ بار بار اپنی قمیض کی پہلو والی جیب کو تھپتھپاتا تھا۔ ذرا ہی دیر میں اس نے سوزو کی اشارت کر کے آگے بڑھائی۔ میں نے فوراً اپنی کار اس کے تعاقب میں لگائی۔ میرا چہرہ جوش سے متمتع رہا تھا۔ سیٹھ ستار کے خلاف ایک اور اہم کلیو میرے ہاتھ لگنے والا تھا۔ میں نے احتیاط کے پیش نظر۔ کالبا کے سیل پر رابطہ کیا مگر اگلے ہی لمحے مجھے چونکنا پڑا۔ اس کا فون بند چار ہا تھا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی، کیونکہ وہ کبھی بھی اپنا سیل فون آف نہیں کرتا تھا۔ ممکن تھا اس کی بیٹری ختم ہوگئی ہو مگر جلد ہی میں نے اپنے اس خیال کو رد کر دیا کیونکہ وہ چار جنگ پر لگا کر بھی بات کر لیتا تھا۔

بہر طور۔ میرے پاس اس وقت زیادہ سوچنے کا وقت نہ تھا، اس وقت میری اینٹنن اسی سوزو کی منی ٹرک پر مرکوز تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ گزری کے علاقے کی طرف مڑ گئی تھی جو وہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ پاسرنا یہ یہ گماشتہ۔ اسی علاقے کا رہائشی تھا۔ ایک اور ریڈیو بج جواگے زمر زما اور ڈینس کی طرف جاتا تھا اس کے نیچے ”گزری“ کی آبادی تھی۔

سوزو کی ایک گلی میں مڑ گئی۔ سوزو کی منی ٹرک زیادہ بڑا نہیں ہوتا۔ میں نے بھی اپنی مہراں کار گلی میں داخل کر دی۔ سوزو کی کچھ آگے جا چکی تھی۔ یہاں زیادہ تر متوسط اور مزدور طبقہ آباد تھا۔ گلی میں عام سے چھوٹے بڑے مکانات نظر آرہے

شرم

ایک دفعہ ایک خاصی عمر کے آدمی کی آنکھوں کا آپریشن ہوا۔ ڈاکٹر نے احتیاط اور پرہیز بتایا اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ نماز میں جھکنے سے گریز کریں اور اشاروں میں نماز پڑھ لیں۔ مگر آجانے کے بعد بزرگ نے کھانا پینا کم کر دیا۔ اس کے گھروالوں کو پریشانی ہونے لگی تو انہوں نے ڈاکٹر سے دوبارہ رجوع کیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ہو سکتا ہے روٹی چبانے یا کھانے سے آنکھوں میں درد ہوتا ہو، اس لیے اسے کھانے کو نرم غذا دیں۔ تین دن گھر والے نرم چیزیں دینے کی کوشش کرتے رہے لیکن بزرگ نے وہ بھی نہ کھا کیا۔ کچھ دنوں بعد پریشان ہونے کے بعد گھر والوں نے بزرگ سے پوچھا کہ آپ کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟ ڈاکٹر نے قوسیدہ کرنے سے منع کیا تھا۔ کھانا کھانے سے تو نہیں روکا تھا۔ پھر آپ کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ اس نے کہا کہ جس کا رزق ہے اس کو سجدہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس کا دیا ہوا رزق کھانے سے شرم آتی ہے۔

مرسلہ: منشی محمد عزیز مئے۔ لڈن دہاڑی

عشق کے درجات

حضرت خواجہ بندہ نواز فرماتے ہیں، عشق کے پانچ درجے بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا درجہ شریعت ہے، جمال محبوب کی صفت سننا تا کہ شوق پیدا ہو، دوسرا درجہ طریقت ہے یعنی محبوب کی تڑپ کرنا اور اس کے بتائے ہوئے صراط مستقیم پر چلنا، تیسرا درجہ حقیقت ہے یعنی ہمیشہ محبوب کے خیال میں گم رہنا اور اس کو خیالوں میں پالینا، چوتھا درجہ معرفت ہے جس سے مراد محبوب کی مراد میں ہر وقت گم رہنا ہے اور پانچواں درجہ وحدت ہے اس میں وہ اپنے فانی وجود کو ظاہر اور باطن میں فاکر دیتا ہے اور صرف محبوب ہی کو موجود مطلق سمجھتا ہے۔ یہ پانچ مراتب پورے ہونے کے بعد کا ختم ہو جاتا ہے۔ عاشق اور معشوق کی موج بہر عشق میں غرق ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کسی بزرگ نے فرمایا ہے کہ وجود اور عشق کے درمیان اول بھی عشق ہے اور آخر بھی عشق ہے کیونکہ ہر وجود موجود ہے وہ عشق سے خالی نہیں ہوتا اور نہ عشق کے بغیر قائم یا باقی رہ سکتا ہے۔ بس ظاہر و باطن کو کچھ بھی ہے عشق ہے۔

مرسلہ: منشی محمد عزیز مئے۔ لڈن دہاڑی

عاصمہ بولی۔

”نہیں بھائی جان! آپ بھی جیسے رستم ہیں، میں جانتی ہوں کالیا بھائی کے ہر عمل اور منصوبے کے پیچھے آپ ہی کی جامع حکمت عملی کار فرماں ہوتی ہے۔ وہ ہاتھوں کا استعمال کرتا ہے اور آپ دماغ کا۔“ کہتے ہوئے وہ ہولے سے مسکرائی اور میں بھی ہنس دیا۔

”کھانا لگاؤں؟“

”نہیں بہنا! بھوک نہیں ہے مجھے میں نے ایڈووکیٹ زئیرہ کے ہاں تھوڑا بہت کھالیا تھا۔“

میں اپنے کمرے میں آگیا اور کالیا کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرا ارادہ کالیا کو یا سر سے متعلق آگاہ کر کے انسپکٹر کامران کو اس کے خلاف فوری کارروائی کے لیے تھا۔

میں بستر پر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا کہ اچانک میرا سیل فون گنگنایا۔ میں یہی سمجھا تھا کہ کالیا کا فون ہو گا مگر اسکرین پر ایک اجنبی نمبر دیکھ کر میری پیشانی پر الجھن آمیز سی سلیوشن نمودار ہو گئیں۔

”بیلہ کون؟“

”ہاں! نعمان بات کر رہے ہو۔“ دوسری جانب سے ایک شامسا اور استغفار طلب آواز ابھری۔ یہ استاد بھابھا تھا۔ اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور کالیا سے متعلق میرا دل جانے کیوں تیزی سے دھڑکنے لگا۔

”جی جی۔ میں نعمان ہی بات کر رہا ہوں بھابھا صاحب!“

”کالیا تمہارے ساتھ ہے؟“ بھابھانے پوچھا۔

”نہیں تو۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس کا فون بھی آف تھا، کئی بار میں نے اسے کال کی تھی مگر۔“

”کب سے تمہارے ساتھ نہیں ہے؟“ استاد بھابھا نے پوچھا۔

”کل صبح سے۔“

”وہ مسلسل غائب ہے۔ اس کا نمبر واقعی بند جا رہا ہے، لگتا ہے وہ بے جا رہہ کسی مشکل میں پھنس گیا ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔“ بھابھانے کہا اور فوراً رابطہ منقطع کر دیا۔

اب تو مجھے کالیا کی طرف سے واقعی تنویش ہونے لگی تھی۔ میں نے اسی وقت اس کے دوست جشید عرف جی کو فون کیا، کافی دیر بعد اس نے کال ریسپونڈ کی۔ میں نے اس سے کالیا کے متعلق پوچھا تو وہ خود پریشانی سے بولا۔

”میں تو خود کالیا کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ وہ آج صبح سے ہی

تھے۔ سوزو کی گلی کے چار پانچ مکان چھوڑ کے ایک کے دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ میں نے بڑے دھیان اور چابک دستی کے ساتھ اس کی یہاں بھی تصویر اتار لی جب وہ سوزو کی سے اتر کر گھر کے دروازے کے سامنے کھڑا دستک دے رہا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر میری کار کی طرف دیکھا بھی تھا۔ میں اس سے دور تھا اور کار میں نے بالکل ہی آہستہ کر دی تھی تاکہ یہ اندر چلا جائے۔ قریب سے گزرنے پر وہ میری صورت آشنا ہو سکتا تھا۔

گلی کی زمین ناہموار اور گڑھوں سے اٹی پڑی تھی، میں نے جان بوجھ کر ایک ایسے ہی گڑھے میں کار کا ایک ٹائر پھنسا دیا اور کار کو پنی ریس دینے لگا۔ مقصد تھوڑا وقت نکالنا تھا۔ پھر جب میں نے ونڈ اسکرین سے پار وژیدہ نظروں سے سامنے دیکھا تو وہ اندر جا چکا تھا۔ میں نے کار کو فوراً آگے بڑھا دیا۔ مکان اور سوزو کی کا نمبر میں نے فوراً نوٹ کر لیا تھا۔

گلی کی دوسری سمت سے نکل کر میں دوبارہ مین شاہراہ پر آگیا اور ایک بار پھر کالیا کے نمبر پر اس سے رابطہ کرنا چاہا مگر جواب نہ ملا۔ اس کا سیل مسلسل آف جا رہا تھا، مجھے اس کی طرف سے تنویش ہونے لگی۔ تب ہی میرے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ استاد بھابھا کے اڈے پر جا کے اس سے مل لوں؟ پھر کچھ سوچ کر اپنا ارادہ ملتوی کر لیا اور گھر کی راہ لی۔ مگر میں عاصمہ بہنا بھی اکیلی تھی۔ میں گھر پہنچا تو میری ہی بے چینی سے منتظر تھی۔

”خیریت تو ہے بہنا! تم پریشان کیوں ہو؟“

”بہت دیر ہو گئی تھی آپ کو آتے میں اسی لیے پریشان ہو گئی تھی ذرا۔“ عاصمہ نے جواب دیا اور میں نے مسکرا کر اسے اپنے قریب کرتے ہوئے محبت سے بولا۔

”بہنا! تیری دعائیں میرے ساتھ ہوتی ہیں۔ تم گھبرایا نہ کرو، مجھے آج کل گھر آنے میں دیر ہو جایا کرے گی۔“

”نہیم بھیا کا کچھ پتا چلا۔ بھائی جان؟“ عاصمہ نے پوچھا۔

”ابھی تو نہیں مگر امید ہے جلد اسے بھی ڈھونڈ لیں گے۔“ میں نے اسے دلا سے دیا جبکہ خود ابھی تک مجھے نہیں معلوم تھا کہ فہم کہاں اور میرے کس دشمن کے زہرے میں تھا۔

”بھائی جان! کیا کالیا بھائی بھی اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے؟“

”وہی بے چارہ تو اب تک ہماری مدد کر رہا ہے ورنہ اس کے بغیر میں کیا ہوں۔“ میں نے ایک گہمیری سانس لے کر کہا تو

عاقب ہے اور اس کا فون بھی آف چارہا ہے۔“ اس نے جواب دیا اور بھر کے توقف کے بعد مجھ سے مستفسر ہوا۔
 ”کالیا بھائی تو آپ کے ساتھ ہوتا تھا۔ کیا آپ بھی۔“
 ”مجھ سے بھی آج صبح کے بعد اس سے کوئی رابطہ نہیں ہو سکا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور کسی خیال کے تحت پوچھا۔
 ”سنو! تمہارے پاس جینکو کا نمبر ہے؟“

”ہاں!“
 ”فوراً مجھے سینڈ کرو۔“ میں نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ چند سیکنڈوں بعد ہی جی نے مجھے ایس ایم ایس کے ذریعے جینکو کا نمبر بھیج دیا، میں نے اسی وقت جینکو سے رابطہ کیا مگر دوسری طرف تیل جاتی رہی۔ فون ریسیو نہ ہوا تو میں نے دوبارہ جی سے رابطہ کر کے اس سے کہا۔
 ”کیا تم جینکو سے جا کر اس وقت مل سکتے ہو؟“
 ”نہیں تو سکتا ہوں نوبی بھائی! لیکن لیاری جیسے علاقے میں اس وقت جانا۔“ وہ کھڑے لگا۔
 ”میرے پاس آ جاؤ۔ دونوں چلتے ہیں۔“ میں نے فوراً کہا۔

”ابھی اس علاقے میں جانا مناسب نہ ہوگا لیکن میرا خیال ہے لیاری جانے سے پہلے جینکو سے فون پر رابطہ کرنا ضروری ہوگا۔“ اسی وقت کال کے دوران مجھے ہلکی ہلکی پ کی آواز سنائی دی۔
 ”میرا خیال ہے کسی کا فون آرہا ہے، ایک منٹ ہولڈ کرنا۔“

میں نے اسے ہولڈ کرانے کے بعد کال ریسیو کی یہ جینکو کی کال تھی۔
 ”کون؟“ دوسری جانب سے اس کی گھمبیر آواز ابھری۔
 ”جینکو بھائی! یہ میں ہوں نعمان فوی۔ کالیا کا دوست۔ یاد آیا؟“

”اوہ ہاں! پہچان گیا۔ خیریت تو ہے؟ تمہاری کال آ رہی تھی میں ذرا باہر دروازے پر کسی کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔“
 میں نے اسے کالیا کے پراسرار غریب کے بارے میں بتا دیا۔

”استاد بھابھاسے رابطہ نہیں کیا؟“
 ”کیا تھا۔ وہ خود مجھ سے اس کے بارے میں پوچھ رہا

تھا۔“
 ”تمہارا کیا خیال ہے، مجھے کالیا کے بارے میں کیا علم ہو سکتا ہے؟“ اس نے پوچھا۔
 میں نے اپنے ذہن میں آنے والے پہلے خدشے کو رد کرنے کی غرض سے کہا۔
 ”مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ اسے کہیں جین ڈاڈا کے آدمیوں نے نہ اٹھوایا ہو؟“

”اس شبہ کی کوئی ٹھوس وجہ؟“ جینکو گھاگ لہجے میں مستفسر ہوا۔
 ”جنہوں نے میری بہن کو اغوا کیا تھا، کیا خبر ان لوگوں نے جین ڈاڈا کو حقیقت بتا دی ہو؟“
 ”مگر وہ تم دونوں سے مطمئن ہو گیا تھا۔“ جینکو بولا، تاہم میں نے اس کے لہجے کی لڑکھاہٹ کو صاف محسوس کر لیا تھا۔

”ہاں! وہ مطمئن ہو گیا تھا مگر شاید وہ لوگ مطمئن نہیں ہوئے ہوں گے جنہوں نے میری بہن کو اس کے آدمیوں کے ذریعے اغوا کر دیا۔ مجھ تو ای آدمی کے مکان میں یرغمال بنا رکھا تھا۔“

”میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔“ چند ثانیوں کی مروج خاموشی کے بعد جینکو نے کہا۔ ”اگر ایسی بات ہوئی تو ہم سچی متاثر ہو سکتے ہیں۔ ویسے۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔ میں اس کے آگے بولنے کا منتظر رہا تو اس نے جیسے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا۔

”ٹھیک ہے میں پھر بھی پتا کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر جب وہ رابطہ منقطع کرنے لگا تو میں اندر سے کھٹکا اور بولا۔
 ”جینکو بھائی! تم کچھ کہنا چاہتے تھے؟“

میری بات پر دوسری جانب سے اس کے گہرے سانس لینے کی آواز ابھری اور بولا۔

”میں یہی کہہ رہا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے ہی جین ڈاڈا کا ایک آدمی میرے پاس آیا تھا۔“
 ”پھر؟“ میرا دل اندیشناک دوسو سوتے تیزی سے دھڑکنے لگا۔

”میں جاؤں گا لیکن میرا نہیں خیال کہ وہی بات ہو۔ کوئی اور بات بھی ہو سکتی ہے۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ میں نے کہا اور کسی خیال کے تحت مشورہ طلب انداز میں اس سے دوبارہ بولا۔
 ”جینکو بھائی! ایک بات کی شاید ہم غلطی کر بیٹھے ہیں۔“

”کون سی؟“

”بقول آپ کے جن ڈاڈا آپ کا دوست تھا تو ہمیں خود کاروائی کی بجائے، اس سے ڈائریک مذاکرات کر لیتے تو زیادہ اچھا تھا۔“

”میں نے کب کہا کہ وہ میرا دوست ہے؟“ جینکو بولا۔ ”میں نے اس کے لیے حلیف کا لفظ استعمال کیا تھا اور حلیف تب ہی بنتے ہیں جب ان کے مفادات یکساں ہوں جبکہ دونی بے غرض ہوتی ہے، جیسی میری کالیا کے ساتھ ہے اور کالیا کی تمہارے ساتھ۔ بہر حال تم اس کی فکر نہ کرو اور کالیا کی تلاش جاری رکھو۔“ اس نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

پیشہ میرے ذہن میں اچانک ہی ابھرا تھا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ آخر جن ڈاڈا ان لوگوں کو جواب دہ ہوگا جنہوں نے عاصمہ کو اغوا کیا تھا۔ ان کی طرف سے مجھے اور کالیا کو دھڑکا تو پہلے ہی لگا ہوا تھا کہ اگر اصل اغوا کنندگان نے جن ڈاڈا سے، یا جن ڈاڈا نے خود انہیں بتا دیا ہو کہ یہ ”مہم جوئی“ کن لوگوں کی ہو سکتی تھی اور ہمارے بارے میں یہ بھی وہ ہماری (میری اور کالیا کی) ”جینٹی“ اپنے اڈے پر کروا چکا ہے تو سیٹھ ستار نے اسے ہمارے بارے میں بتا دیا ہوگا لیکن اب بھی بات وہی تھی۔ ناکامی کے بعد میں نہیں سمجھتا تھا کہ سیٹھ ستار نے اس معاملے کو پھیلانے کی کوشش کی ہوگی۔ لاڈلہ سائیں کی مدد سے بھی سیٹھ ستار نے یہ کام کروایا بھی ہوگا تو۔ معاملہ اس نے وہیں ختم کر دیا ہوگا۔ اسے کینگ وار کو ہمارے پیچھے لگانے کی ضرورت نہ تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں جینکو نے مجھے فون کر کے بتا دیا کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی اور وہ معاملہ ختم ہو چکا ہے اگر ایسا ہوتا تو کالیا سے پہلے جن ڈاڈا مجھے (جینکو کو) سے رابطہ کر کے باز پرس کرتا۔

مجھے بھی تسلی ہو گئی۔ میں لیاری گیٹنگ وار سے دور ہی رہنا چاہتا تھا، جس کا مشورہ کالیا نے ہی نہیں بلکہ خود جینکو نے بھی مجھے دیا تھا۔

اب میرے ذہن میں سیٹھ ستار کے سوا اور کسی فرد کا نام نہیں آ رہا تھا۔ یہ تصور کرتے ہی اچانک میرا دل ہولنے لگا تھا کہ اگر کالیا سیٹھ ستار کے قبضے میں ہوا تو وہ مردود کالیا کے ہاتھوں اپنی ایک آنکھ متاع کرنے کا اس سے انتقام نہ لے بیٹھئے؟“

میں بری طرح بے چین ہو گیا۔ نیند آنکھوں سے ہوا گئی۔ کالیا خطرے میں تھا اور میں کالیا کے بغیر خود کا کیلا محسوس

کرتا تھا۔ کالیا سے میرا خون سے بھی بڑھ کر رشتہ تھا۔ اس نے کئی مشکل ترین مراحل میں اپنی جان جو کھم میں ڈال کر میری مدد کی تھی اور کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ میری خاطر اس کی کئی بار اپنے استاد بھابھاسے بھی بدھم کی ہوتی رہی تھی۔ وہ میرے سامنے کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

بڑا ہی عجیب رشتہ تھا میرا اور کالیا کا۔ آج اسی کی وجہ سے ہی میرے بار سونچ اور طاقت ور دشمن، اپنی ہی ذات اور اپنے ہی وجود کو اپنی ناک کا دم بنائے بیٹھے تھے۔ مجھے کالیا کی طرف سے اب سخت قسم کی تشویش دے چینی لاحق ہو گئی۔ میں نے اس کے سارے ساسیوں سے رابطہ کر کے اس کے بارے میں پوچھ لیا تھا، جن جن کے سیل نمبر میرے پاس تھے۔

نہی بے چارہ میری طرح زیادہ پریشان تھا۔ اس کا دوبارہ فون آ گیا اور مجھ سے تازہ حالات جاننے کے بعد پُر جوش سے لہجے میں بولا۔

”نعمان بھائی! میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ کو جہاں بھی شبہ ہو کہ کالیا وہاں مل سکتا ہے، میں آپ کے ساتھ اسی وقت چلنے کے لیے تیار ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے بھی جوش سے دھڑکتے دل کے ساتھ جواب دیا۔ ”میں تمہیں ایک جگہ کا پتا بتا رہا ہوں۔ تم وہاں پہنچو، میں بھی ادھر ہی پہنچتا ہوں۔“ میں نے کہا اور پھر میں نے اسے سیٹھ ستار کی گھٹی کا پتا بتا دیا۔ وہ اسی وقت نکل گیا۔ میں بھی بستر سے اٹھنے لگا اور چاہتا تھا کہ عاصمہ کو مطلع کر کے گھر سے نکلوں کہ فون آ گیا۔

”ہیلو۔“ میں نے سیل فون کی اسکرین پر نمبر پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے کان سے لگا کر کہا۔ یہ کوئی لینڈ لائن نمبر تھا۔

”ہیلو۔ نعمان احمد بات کر رہے ہیں؟“ کسی نے استفسار کیا۔

”جی ہاں! آپ کون؟“ میں نے دھک کھٹ کرتے دل سے جواب دیا۔

”یہ فہیم نا، ایک نوجوان آپ ہی کا بھائی ہے؟“ دوسری جانب سے پوچھا گیا اور میرا تیزی سے دھڑکتا دل جیسے رک گیا۔

”ہاں۔ ہاں۔ فہیم میرا ہی بھائی ہے، وہ خیریت سے تو ہے ناں۔ آپ کون ہو بھائی؟“

”میں سول اسپتال کے امیر جنسی وارڈ سے بات کر رہا ہوں۔ آپ فوراً چلے آئیے۔“ یہ کہتے ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

”کک۔ کیا۔ ٹ۔ ٹانگیں؟“ میرے منہ سے نکلا اور میں نے فوراً اپنا دایاں ہاتھ اس کے چادر سے ڈھکے بدن اور پیٹ سے نیچے پھیرا تو وہاں مجھے ٹانگوں کی جگہ خلا کا احساس ہوا اور میں جیسے سر تا پا لرز گیا، پھر میں نے جنونیوں کے سے انداز میں اس کی چادر ٹانگوں کی طرف سے اٹھادی اور وہ منظر میرے لیے روح فرسا ثابت ہوا۔ مجھے جگر سآ گیا۔ اس کی دونوں ٹانگیں۔ گھٹنوں سے تھوڑی اوپر، رانوں کے قریب سے کٹی ہوئی تھیں۔

”نہیں۔“ میں جسم و جاں بلکہ روح کی پوری طاقت سے چلا اٹھا۔ چھوٹے بھائی کی یہ قابلِ رحم حالت دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ فہیم میرا بھائی ہی نہیں بیٹا اور دوست بھی تھا۔ ماں باپ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد اب میں ہی ان کی ماں بھی تھا اور باپ بھی۔ صدمے کے مارے میرا جگر کٹنے لگا تھا۔ دل جیسے مٹی میں کسی نے لے کر کھینچ ڈالا تھا میرا۔ درود و کرب کی لہر کسی تیز تلواری کی طرح میرے وجود میں اترتی چلی گئی اور دور تک اس نے مجھے جیسے کاٹ ڈالا تھا۔ فہیم میرے سامنے زندہ حالت میں پڑا تھا مگر آدمی لاش کی صورت۔

”محب۔ بھائی جان! یہ مجھے سزا ملی ہے۔ آ۔ آپ سے بدتمیزی کرنے کی۔ آ۔ آپ کے منہ پر میں نے تھپڑ مارا تھا۔“

”میں اسے دشمن کے لیے بڑی سزا بنا دوں گا۔ مجھے بتاؤ۔ کک۔ کس نے تمہارے ساتھ یہ بے رحمانہ سلوک کیا ہے؟“ میں جیسے انجینی سے لہجے میں بولا۔ جوش غیظ ایک کھولتے لاوے کی صورت میرے لب و لہجے سے مترشح تھا اور انتقام کی چمک ریاں آنکھوں سے پھوٹی نمایاں تھیں۔

فہم کی آنکھوں کے گوشے جھپکے ہوئے تھے۔ اس نے اب اپنے سینے اور پیٹ سے بھی تھوڑی سی جاوہر کاوی، وہ ذرا پہلو کے بل ہوا، میں آنکھیں سکیڑے اس کی حرکت دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم پر اسپتال کے لاوارث مریضوں جیسی قمیص تھی۔ سفید رنگ کی۔ جس کے پہلو میں ایک جیب تھی۔ فہم نے اسی کی طرف اشارہ کیا تھا اور میں نے فوراً اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے اس کی جیب میں اپنا ہاتھ ڈال دیا۔ اندر کچھ نہ تھا۔ ماسوائے ایک کاغذ کے ٹکڑے کے۔ وہی میں نے نکال لیا۔ وہ تہہ کیا ہوا تھا، میں نے اسے کھول کر بڑھا۔ چند سطریں تحریر تھیں اس پر۔ جسے میں نے ایک ہی نظر کھما کر بڑھالاکھا

اس اطلاع پر میں دھک سے رہ گیا۔ بے اختیار میرے لبوں سے اپنے چھوٹے بھائی فہیم کے لیے دعائیہ جملے برآمد ہوئے اور میرا ذہن سنسنے لگا۔ مجھے اطلاع دینے والے پر بے حد غصہ آیا کہ اس نے مزید کچھ نہیں بتایا تھا نہ ہی مجھے کچھ پوچھنے دیا تھا کہ کچھ سلی ہوئی۔ میں حاصر کو ابھی نہیں بتانا چاہتا تھا ورنہ وہ بے چاری پریشان ہو جاتی۔ مگر سے نکلنے سے پہلے میں نے جی کو فون کر کے اسے واپس گھر چلے جانے کا کہا اور اپنی مجبور بتائی۔

میں نے عاصمہ سے کوئی اور بھانہ کیا اور کار میں بیٹھ کر
 آندمی طوفان کی طرح اسے دوڑاتا ہوا سول اسپتال کے
 ایمرجنسی ہونٹ میں پہنچا۔ استقبالیہ پر پہنچا، ایک وارڈ ہوائے
 مجھے ایمرجنسی کے جنرل وارڈ میں لے گیا جہاں اور بھی مریض
 لوہے کے پائندوں والے بیڈ پر لیٹے پڑے کراہ رہے تھے، کچھ
 بے ہوش تھے۔ مجھے ایک بیڈ کے قریب چھوڑ کر وارڈ ہوائے
 واپس پلٹ گیا۔ میری چھٹی ہوئی آنکھیں بستر پر دراز، نیم پر جرم
 کر رہی تھیں۔ شکر تھا کہ وہ زندہ تھا۔ شاید نیم بے ہوشی طاری
 تھی اس پر۔ مجھے وہ بہت کمزور اور محیف نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں
 کے کرسواہ حلقے تھے۔

ہسپتال کے عملے سے میں نے پہلے ہی دریافت کر لیا تھا کہ فہیم انہیں کہاں سے ملا تھا۔ انہوں نے یہی بتایا تھا کہ فہیم زخمی حالت میں پولیس کی ایک پیٹرول پارٹی کو ایک ویران اور اندھیری سڑک پر پڑا ملا تھا۔

”فہم! میرے بھائی!“ میں نے کپکپاتی آواز میں سے پکارا اور دھیرے سے اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا تو وہ تھوڑا سا کراہتے ہوئے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھنے لگا۔

”فہیم! میں ہوں۔ تمہارا بھائی جان نعمان۔“

”بھائی جان!“ اس نے کراہتی سی آواز میں مجھے پکارا اور میں نے بے اختیار ہمایوں والے عبت بھرے جذبے سے سرشار ہو کے اس پر جھک کر لیٹے لیٹے سینے سے لگا دیا، اس کا جو دھمی فرط جذبات سے لرزاں تھا۔

”یار! تم اتنے مجھ سے ناراض ہوئے کہ گھر ہی
 نمود کر چلے گئے، باتیں بہت سی ہیں۔ گھر چل کر ہی کریں
 گھر۔“

”بھائی جان! ام۔ مجھے معاف کر دیتا۔“ وہ کھپکھپاتے لہجے میں بولا۔ ”مم۔ میں نے آپ کو کھپڑ مارا تھا۔ کاش! وہ عالم میری انگٹوں کی بجائے یہ ہاتھ کاٹ لیتے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور میں اس کی بات سن کر جیسے

مگر وہ بار بار پڑھنا پڑھا تھا مجھے۔ وہ کاغذ کا محض ایک ٹکڑا نہیں تھا، بلکہ تلی تھوڑی سی پتلی کا کام کر رہا تھا۔
 ”ہاں، مسز نعمان! اور سورے بھائی کا تختہ کیسا لگتے ہیں، بہت تلاش مگی ناں تمہیں اپنے چھوٹے بھائی کی۔ تم یہ دینا میرے احسان مند ہو گے کہ میں نے تمہارے بھائی کی جان نہیں لی۔“

خط پڑھ کر میرا خون کھول اٹھا تھا۔ یہ ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر نہیں تھی۔ ٹاپ شدہ تھی۔ میرا جی چاہا کہ اس کاغذ کی دھجیاں اڑاؤ اور سیل سے بولا۔

”میرے بھائی! میں قسم کھاتا ہوں جس نے تمہیں اس حال تک پہنچایا ہے، میں اس کا عبرت ناک حشر کروں گا۔ فقط مجھے اتنا بتا دو کہ تمہارے ساتھ کن لوگوں نے یہ ظلم ڈھایا ہے؟ اور کیا تم انہیں پہچان لو گے؟“

میری بات اور میری رگھی کیونکہ اسی وقت ایک ڈاکٹر جس نے سفید گاڑن پہن رکھا تھا اور گلے میں اسٹیتھو اسکوپ تھا، وہاں آگیا، اس کے ہمراہ ایک سفید یونیفارم میں نرس بھی تھی جس نے ہاتھوں میں ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ وہ فیم کے واسطے لینے میں مصروف ہوئی۔ میں نے ڈاکٹر کو سلام کیا اور اس سے فیم کی طبیعت کے بارے میں استفسار کیا۔ اس نے ایک نگاہ چلے سکتے چہرے پر ڈالی اور التماساً سوال داغ ڈالا۔

”آپ کا نام؟“

”نعمان۔“

”پیشہ کیا لگتے ہیں آپ کے؟“

”میں اس کا بڑا بھائی ہوں۔“

”ہمیں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے، امید ہے آپ تعاون کرنے سے نہیں ہچکچائیں گے۔“

”جی ہاں، لیکن ڈاکٹر صاحب؟“ میں نے کہا۔

”دراصل ہمارے لیے یہ تمیز کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ یہ ایم ایل سی (میڈیکل کیس) کا کیس ہے یا پھر کچھ اور۔“ کہہ کر وہ استفسار طلب نظروں سے میری جانب منتقل لگا۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”ڈاکٹر صاحب! یہ میڈیکل کیس کا ہی کیس ہے، میرے بھائی کے ساتھ کچھ نامعلوم لوگوں نے ایسا بھیانک ظلم کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ پہلے سچا کر متعلقہ تھانے میں این سی یا ایف آئی آر کٹوا کر لے آئیں، اور اس کی ایک کاپی مجھے دیں تاکہ میں سرٹیفکیٹ جاری کر سکوں جو آپ کو کورٹ میں کام

آ سکتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ فیم کا معائنہ کرنے لگا۔

میں نے اسی وقت متعلقہ تھانے جا کر نامعلوم مظلوموں کے خلاف ایف آئی آر کٹوا دی اور ایک ٹیم، یہ غرض تفتیش کے لیے اسپتال بھی آئی، انہوں نے فیم سے بیان لیا جسے میں بھی غور سے سنتا رہا تھا۔

فیم مجھ سے ناراض ہو کے جب گھر سے نکلا تھا تو وہ اپنے ایک دوست کے ہاں رہنے لگا تھا جو اس کا آفس کولیک تو نہ تھا البتہ اس کا کوئی پرانا دوست تھا۔ اس کا نام اس نے خرم بتایا تھا وہ عظیم پورہ میں رہتا تھا مگر فیم اس کے پاس صرف دو دن ہی ٹھہرا تھا اور پھر اس نے اپنی الگ رہائش کا بندوبست ایک اسٹوڈیو قلیٹ کرائے پر لے کر کر لیا تھا۔ وہیں اسے کچھ نامعلوم لوگوں نے اغوا کر لیا تھا اور اس کی آنکھوں میں پیٹی باندھ کر لے گئے تھے۔ نجانے وہ کون سی جگہ تھی اور کس کی مرضی جہاں مجھے چند روز قید میں رکھا گیا، کھانے پینے کو بھی پوری طرح نہیں دیا کرتے تھے۔

وہاں میں نے چار افراد کو ہی دیکھا تھا۔ وہ مجھ پر وقتے وقتے سے تشدد بھی کیا کرتے تھے۔ ابتداء میں یہی سمجھا تھا میں کہ یہ مجھے کسی خاص مقصد کے لیے ہراساں کرنا چاہ رہے ہیں۔ پھر ایک روز ان میں سے ایک نے جو فون پر اپنے کسی ”چیف باس“ سے رابطے میں رہا کرتا تھا۔ اس نے فون میرے کان سے لگا کر میری اپنے چیف باس سے بات کروائی۔ بہت ہی سنگ دل اور بھیڑیے جیسی آواز تھی وہ۔ مجھ سے یہی کہا گیا کہ تمہارے بھائی نعمان عرف نوی کو ہم نے ہر طرح سے باز رکھنے کی کوشش چاہی مگر اس نے ہماری نہیں سنی۔ اب مجبوراً اسے (مجھے) سبق سکھانے کے لیے ایسا کرنا پڑ رہا ہے۔ نجانے وہ میرے اوپر اب کون سا عذاب توڑنا چاہتے تھے۔ تاہم میں خوش اور مطمئن تو تھا کہ یہ لوگ مجھے آزاد کرنے والے تھے مگر کیا پتا تھا مجھے کہ اس ”آزادی“ کی مجھے کیا قیمت چکانی پڑتی۔

ایک عجیب سی خود کار مشین جس کا وہ عجیب سا ہی نام لے رہے تھے۔ شاید ”گلوٹن“ اس میں میری دونوں ٹانگیں گھنٹنوں سے اوپر راتوں تک پھنسا دیں اور پھر ایک بعد آگرا کر کاٹ دیں، میں درد و اذیت کے مارے بے ہوش ہو گیا اور شاید کئی دن اسی طرح غڑ حال حالت میں رہا، نئی ہوئی جگہ پر ٹانگے لگا دیے گئے تھے اور کوئی دوا وغیرہ بھی پینے کو دیتے رہے تھے، اس کے بعد وہ مجھے رات کے اس پہر کی سڑک پر بھکاریوں کی طرح پیچید کر چلے گئے۔“

فہم نے اپنا دردناک بیان قلم بند کرادیا۔ تفتیشی افسر نے مجھ سے کئی سوالات کیے، میں نے بھی اسے صاف صاف بتا دیا کہ معاملہ کیا تھا۔ تفتیشی افسر جس کا نام انسپکٹر شہزاد تھا، بھلا مانس آدمی تھا۔ اس نے مجھے اپنے ایک مشورے سے بھی نوازا کہ میں ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ سے اس کیس (رفت خانم مرڈر کیس) کو ری اوپن کرنے کے لیے ”سوموٹو ایکشن“ لینے کی درخواست کروں، وغیرہ۔

جب صبح کی سفیدی دھیرے دھیرے پھیلنے لگی تھی تو میں فہم کو اپنی کاریگاری کی سیٹ پر لٹا کر گھر لے آیا۔ میں نے کسی طرح ایک خود کار وہیل چیئر کا بھی بندوبست کر لیا تھا۔ چھوٹے بھائی کی حالیہ زار مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ عاصمہ بے چاری پر کیا بیتے گی جب وہ فہم کو اس حالیہ زار میں دیکھے گی۔

میں گھر پہنچا۔ ڈبل جیئر نیچے اتاری اس کے بعد فہم کو سہارا دے کر اس پر بٹھایا۔ میرا چہرہ آنسوؤں سے لبریز تھا۔ دل تھا کہ جیسے ابھی تک کسی نے کسی میں لے رکھا تھا۔ خود فہم کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔ صبح کا ابھی وقت تھا سی لیے لوگ باگ وہاں کم ہی موجود تھے، جوتے وہ دور قریب میں تھے۔ کسی نے ہماری طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ نہ خیر نہ ریت پوچھنے کو ضرور لپکتے۔ میں نے دروازے کی کال تیل بجا دی۔ عاصمہ نے ہی دروازہ کھولا اور میں اس کے چہرے پر حیرت اور سکتے کی کیفیات کو اُلٹے ہوئے دیکھا، ڈبل جیئر کو دھکیلتا اندر لے آیا۔

”بھائی ی ی۔ یہ کیا ہوا، آپ کو۔“ عاصمہ جیسے جی جان سے چلا آئی۔ فہم کی مغموم سی نظریں عاصمہ پر جمی ہوئی تھیں جبکہ عاصمہ نے جیسے اپنا کلیجہ تھامے رکھا تھا۔

”سمجھ۔ بھائی جان! آپ ہی بتائیے۔ ی ی۔ فہم بھیا کو کیا ہوا ہے آخر؟ یہ یہ ڈبل جیئر پر کیوں ہیں؟“

”حوصلہ رکھو بہنا! خدا کے لیے خود کو سنبھالے رکھو۔“

میں نے کہا اور پلٹ کر عقب میں اپنے دروازہ بند کر دیا۔ عاصمہ نے اپنا سر تھام لیا تھا، شاید ابھی تک اس پر یہ کہ یہ انگیز حقیقت آشکارا نہ ہوئی تھی۔ فہم کو ظالم درندوں نے ہمیشہ کے لیے مانگیں کاٹ کر معذور کر دیا ہے۔

”بھائی جان! بہنا کو سنبھالیے پلیز۔“ اچانک فہم نے مجھے لرزتی آواز میں پکارا۔ میں نے عاصمہ کی طرف دیکھا، وہ ہنوز پٹی پٹی آنکھوں سے کبھی فہم کو اور کبھی سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگتی۔

میں کیا بتاتا ہوں؟ میرا اپنا آپ اندر سے تہہ بالا ہو رہا تھا، تب ہی شاید عاصمہ نے میری پٹی پٹی خاموشی اور لرزے ہونٹوں کا مفہوم اپنے تئیں کچھ یوں لیا کہ بے اختیار وہ آگے بڑھ کر گتھوں کے بل فہم کے ساتھ آن لگی۔ وہ اس کی گود میں اپنا سر رکھ کر رونا چاہتی شاید کہ اچانک ہی وہ چونکی، اس کے دونوں ہاتھ غیر ارادی طور پر فہم کی ٹانگوں والی جگہ کو چھوتے ہوئے اندر کی جانب حلاء میں دھنس گئے اور اگلے ہی لمحے عاصمہ نے ایک جھجکار فہم کی گود میں دھری جا دو گتھ کی اور وہ ادھ کی ”ٹنڈی“ رانیں گوشت کے ٹکڑوں کی طرح جھول رہی تھیں۔ وہ یک دم دہشت زدہ سی ہوئی۔ چہرے پر دکھ اور کرب کے ساتھ ہر اس بھی پھیل گیا۔

”نن۔ نن۔ نہیں، ی ی ی۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ م۔ میرے بھیا کی ٹانگیں۔“ وہ اتنا ہی کہہ پانی تھی کہ مارے صدمے کے غش کھا کر وہیں مچن کے فرش پر لڑھک گئی۔ تب ہی مجھے ہوش آیا اور میں نے عاصمہ کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالا۔ اسے پکارنے لگا۔ ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

”اسے پانی پلاؤ بھائی جان!“ فہم نے دکھ و کرب سے آتش لہجے میں مجھ سے کہا۔ میں عاصمہ کو سنبھالے ہوئے مچن میں ہی ایک چمچی چار پانی کے پاس لے آیا اور لٹا دیا، پھر بھام بھاگ اندر سے پانی کا گلاس بھرا لیا، ٹھنڈے پانی کے چند چھینٹے اس کے چہرے پر مارے، اس کے گال زور زور سے تھپتھپاتے اسے پکارا اس کے بعد گلاس اس کے لرزے لیوں سے لگا دیا۔ کچھ پانی اس کے حلق میں گیا اور کچھ سے زیادہ باہر کو بہہ گیا۔ اس نے بہر حال آنکھیں کھول دیں۔

”حوصلہ کرو۔ عاصمہ! کیا ہو گیا تھا تمہیں؟ کہا تھا میں نے کہ خدا کے لیے خود کو سنبھالنا۔“ میں نے صدمے سے چور لہجے میں اس سے کہا۔ ایک غبار سا تھا جو بار بار میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا۔

”فہم بھیا کو کیا ہو گیا۔ بھائی جان؟“ وہ پٹی پٹی آواز میں یولی اور رو پڑی۔ اس میں دوبارہ ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ۔ پلٹ کر چار پانی سے آٹھ کر دوبارہ فہم کی طرف دیکھتی۔

میں اس کے قریب ہی چار پانی پر بیٹھ گیا۔ دلچہ بعد فہم بھی اپنی ڈبل جیئر دھکیلتا ہوا چار پانی کے قریب آ گیا۔ ہم تینوں بہن بھائی، دکھ سکھ کے ساختی ایک دوسرے کے ساتھ گے روتے چلے گئے۔ ایسی دردناک گھڑیوں میں مجھے وہ

وحشت ناک منظر یاد آگیا تھا جب ابا کو بے گناہ بھائی لگی تھی اور صبح ان کی لاش بھائی ٹھاٹھ سے گھر لائی گئی تھی جبکہ ایک لاش اماں جان کی صورت میں پہلے ہی گھر پر رکھی تھی۔ اس وقت بھی ہم تین نصیبوں جملے بہن بھائی اسی طرح ایک دوسرے سے لپ کر دوئے تھے۔ غم و اندوہ کے منظر کیوں تازہ ہونے لگتے ہیں؟ یہ فتم کیوں نہیں ہو جاتے ہمیشہ کے لیے؟ کیا تقدیر کو ان کا اعادہ کرنا ضروری ہوتا ہے؟ تو پھر۔ تو پھر خوشیوں کا منظر دوبارہ کیوں نہیں لوٹتا؟ اور تب ہی بے اختیار مجھے اپنے اس خیال پر ڈیڑھی لپٹی آگئی۔ بھلا ہم کم نصیبوں کی زندگیوں میں خوشیاں آئی ہی کب تھیں؟

کچھ دیر بعد غم و اندوہ کا غبار چھٹا تو فہم کو ہم اندر کمرے میں لے آئے۔ عاصمہ اور میں نے اسے سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا۔

”بھائی جان! آپ لوگ باتیں کریں۔ میں تب تک ناشتا بنا لیتی ہوں۔“ عاصمہ نے کہا تو میں فوراً بولا۔
”نہیں بہنا! آج تم ناشتا نہیں بناؤ گی۔ آج فہم کی اتنے دنوں بعد وہ ابھی کی خوشی میں باہر سے ناشتا لے آتا ہوں۔ آج حلو پوری کا ناشتا کریں گے۔“

ایسا میں نے شخص غم کی فضا کو کم کرنے کے لیے ہی کہا تھا ورنہ کچھ کھانے پینے کو کسی کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ تقدیر نے ہمیں خوشی دی تھی تو داغدار کر کے۔ چھوٹے بھائی کی یہ قابلِ رحم حالت نہ مجھ سے دیکھی جاتی تھی نہ ہی عاصمہ سے۔

میں نے دیکھا عاصمہ ایک دم سر ہجکائے کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ میں نے بستر پر دراز فہم کی طرف لرزتی مسکراہٹ سے دیکھا اور وہاں سے دوسرے کمرے میں آگیا۔ میرا اندازہ درست تھا، وہاں عاصمہ ایک طرف کونے میں کھڑی دوپٹا چہرے پر کیسے سسک رہی تھی۔ میں اس کے قریب گیا اور بولا۔

”بہنا! میں جانتا ہوں، اس وقت کھانے کی ہر شے ہمیں ذہر لگے گی لیکن۔“

”میں سمجھ گئی ہوں بھائی جان!“ عاصمہ نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”آپ حلو پوری لے آئیں۔ میں تب تک چائے بنا لیتی ہوں۔“

”نہیں، چائے بھی میں باہر سے ہی پارسل کروا کے لے آؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”تم بس فہم کے پاس جا کے بیٹھو، اس سے باتیں کرو، دیکھو، اس کے سامنے اب رونا بالکل مت، جو وہ چکا وہ تو ہو چکا بجھر رہی ہوتاں۔ پیاری بہنا!“

”جی جی بھائی جان! کبھی گئی۔“ اس نے اپنا انک آلودہ چہرہ دوپٹے سے پونچھا اور ہولے سے مسکرائی۔

”شباباش! میں آتا ہوں۔“ میں نے کہا اور گھر سے باہر آگیا۔ میرا دل و دماغ بری طرح سنستا رہا تھا۔ اس ”پردہ نشین“ نے اپنی درندگی کا مظاہرہ کر ڈالا تھا۔ جاتا تھا میں یہ کہ ایسا میرا ”زفت خانہ مرثوئیں“ میں کامیاب پیش رفت سے ہوا ہے اور تب ہی میرے سوچتے ذہن میں۔ اس روز رانا بشر کے ساتھ میری ہونے والی تلخ کلامی اور بد مزگی یاد آنے لگی۔ اس نے مجھے وہ دونوں ڈائریاں دینے سے صاف انکار کر دیا تھا جبکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ ہم اصل قاتل تک پہنچنے والے تھے اصولاً تو اسے خوش ہونا چاہیے تھا اور مجھ پر اور ایڈووکیٹ زنبیرہ پر بھروسہ کرتے ہوئے۔ دونوں ڈائریاں ہمارے خوالے کر دینی چاہیے تھیں لیکن اس کے برعکس وہ ایک دم بھڑک اٹھا تھا۔

میں حلو پوری کی دکان پر پہنچا۔ اس کے بعد پیسے دے کر واپس لوٹا تو گھر کے دروازے پر پہنچ کر کاہی تھا کہ میرے کانوں سے موثر سائیکل کی آواز ٹکرائی جو بہت قریب سے ابھری تھی، میں پٹا اور دیکھا، دو دو بلے پتلے اور سیاہ رنگت کے اشخاص الگ الگ بائیکس پر سوار تھے۔ وہ میری طرف ہی گھور رہے تھے۔ مجھے ایک ایسی کسی خطرے کا احساس ہوا اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ پھر اچانک ہی میں چونکا، میں ان میں سے ایک کو پہچان چکا تھا۔ مجھے فوراً یاد آگیا تھا کہ میں اس لڑکے کو کچھ دن پہلے جین ڈاڈا کے اڈے میں دیکھ چکا تھا۔ دوسرا ابھی میرے لیے اجنبی ہی تھا۔

بائیکس کو سائیڈ اسٹینڈ میں کھڑا کر کے وہ دونوں میری طرف بڑھے اور اسی نے ہی پہلے مجھ سے سر دلچھ میں مخاطب کرتے ہوئے کہا، جسے میں پہچان رہا تھا۔

”تم نعمان احمد ہی ہوتاں۔ اس روز جین ڈاڈا نے تمہیں اور تمہارے ساتھی شیراز کو بلوایا تھا؟“
”ہاں۔ ہاں۔ خیریت؟“ میں نے اپنے دل کی تیز دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”تمہیں جین ڈاڈا نے دوبارہ بلوایا ہے۔“ اس بار دوسرے نے میری جانب گھورنے کے انداز میں کہا۔

”کیوں؟“ میں نے بھی جواب میں اس بار کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔

”یہ دیہن چل رہا تھا میں گے۔“ پہلے والے نے کہا۔
”تمہیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ میں نے

معاملہ فنی سے کہا۔ ”میں اپنے دوست شیراز (کالیا) کے ساتھ کسی وقت آ جاؤں گا۔“

شیراز نے اس وقت جن ڈاڈا کو اپنا یہی نام بتایا تھا۔
”شیراز کو چھوڑو، تمہیں ابھی ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔“
پہلے والے نے کہا تو میں رکھائی سے بولا۔

”ایک منٹ ٹھہرو۔ میں یہ ناشتا اندر دے کر آتا ہوں۔
پھر تم لوگوں سے بات کرتا ہوں۔“ دونوں نے کوئی جواب نہ دیا اور میں اندر داخل ہو گیا۔

جن ڈاڈا کے آدمیوں کی اچانک اس طرح اور وہ بھی میرے گھر آمد نے مجھے ایک غبی پریشانی میں ڈال دیا تھا۔
نجانے کیا بات ہوئی تھی جو اس طرح مجھے دولڑکے بیچ کر جن ڈاڈا نے بلوایا تھا؟ خدشہ تو تھا کہ کہیں ہمارا اس روز کی ہم جوئی والا بھانڈا نہ پھوٹ جائے، جب میں عاصمہ کو بچو کے ٹھکانے سے بازیاں کروا کے لایا تھا۔

”بہنا! تم فہیم کے ساتھ جا کر ناشتا کرو، میرے باہر کچھ دوست آئے ہیں، میں ان سے بات کر کے ابھی آتا ہوں۔“
میں نے عاصمہ کو چیزیں تھمتے ہوئے کہا اور دوبارہ باہر آیا۔
عقب میں گھر کا دروازہ بند کیا اور ان سے سختی لے کر چلے میں بولا۔
”دیکھو۔ میں پہلے بھی اکیلا نہیں آیا تھا۔ شیراز میرا دوست میرے ساتھ تھا، میں اب بھی اس کے ساتھ ہی آؤں گا۔“

میرے مسکت جواب پر وہ دونوں ایک دوسرے کا منہ تکتے لگے۔ پھر پہلے والے نے مجھ سے کہا۔ ”شیراز وہاں موجود ہے۔ اب تم چلو۔“

میں اس کی بات پر بری طرح چونکا۔ کالیا تو تقریباً پچھلے چوبیس گھنٹے سے غائب تھا۔ تو کیا ان لوگوں نے اسے اغوا کیا ہوا تھا؟ اگر ایسا تھا تو پھر۔ یہ مجھے یوں ”شرطانہ“ انداز میں کس طرح لینے کے لیے گھر پر پہنچ گئے تھے؟ یہ بات اچھنبے کی تھی، تاہم میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں کہا۔

”شیراز تمہارے پاس ہے؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ میرے بغیر وہاں کیسے جا پہنچا؟“

”وہ وہاں پہنچا نہیں تھا۔“ دوسرے نے کہا۔ ”اسے وہاں اڈے پر پہنچا دیا گیا ہے اور اب تمہیں بھی اسی طرح وہاں پہنچنا ہوگا۔“ یہ کہتے ہی دونوں نے اپنے نیٹوں میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو میرے پورے وجود میں لاتعداد چبوتیاں سی ریگ نکلیں۔ ان کے ہاتھوں میں سیاہ ریگ کے پتوں

نظر آرہے تھے۔

”اب زیادہ اڑی بازی کی تو ادھر ہی گولی مار دی جائے گی۔ چلو۔“ پہلے والے نے خونخوار غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا اور میری پیشانی پر سلوشیں بکھر گئیں۔ وجود سنسانے لگا۔ جانا بھی مصیبت تھا اور نہ جانا بھی۔

”اب ہم گولی چلا دیں گے اور کوئی ہماری گرد کو بھی نہ پاسکے گا۔ ادھر تمہارے ساتھی کا بھی یہی حشر ہوگا۔ بہتری اسی میں ہے کہ ساتھ چلے چلو ہمارے؟“ پہلے والے نے کہا۔ میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ کالیا ان کے زرنے میں تھا کیوں؟ اس کا جواب آسان بھی تھا اور انکھن آمیز بھی۔ اگر جن ڈاڈا کو ہم پر کسی بات کا شبہ ہوا بھی تھا تو وہ اب تک شبہ ہی ہوگا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہو سکتا تھا۔ مناسب تھا کہ ان کے ساتھ جا کر حالات کو مذاکرات کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی جاتی مگر بات وہی تھی کہ جا میں ہم دونوں کی خطرے میں تھیں۔

میں ایک کے پیچھے بائیک پر بیٹھ گیا۔ دوسرے نے اپنی بائیک ہمارے پیچھے لگا رکھی تھی اور روانگی کے وقت مجھے یہ دھمکی بھی دے دی تھی کہ اگر میں نے راستے میں کوئی چالاکی چلنے کی کوشش کی تو وہ مجھے بے درپیش گولی مار دیں گے۔

آدھے پونے گھنٹے بعد ہم لیاری پہنچ گئے۔ وہاں سے سیدھا ہمیں جن ڈاڈا کے اڈے پر پہنچا دیا گیا۔ سچی بات تھی کہ میں اندر سے بری طرح ڈرا ہوا تھا مگر دل میں تسلی بھی تھی کہ اگر ایسا کچھ ہوتا تو ہمارے ساتھ اسی وقت ہو جاتا جب کالیا بھی میرے ساتھ تھا اور ہم جن ڈاڈا کے روبرو پیش ہوئے تھے لیکن ان کا جارحانہ انداز مجھے تسلی میں مبتلا کر رہا تھا۔

جب میں وہاں پہنچا تو جن ڈاڈا میرا ہی خطرہ تھا مگر میں یہ دیکھ کر چونک گیا کہ وہاں جینکو بھی موجود تھا اور کہیں سے بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ بھی میری طرح زبردستی وہاں لایا گیا ہو۔ تاہم مجھے یاد تھا کہ رات کے کسی پہر جب کالیا کی تلاش کے سلسلے میں میری جینکو سے فون پر بات ہوئی تھی تو اس نے مجھے یہ بتایا تھا کہ جن ڈاڈا نے اسے بلوایا تھا۔

وہ دونوں کرسیوں پر براجمان تھے۔ یاد رہے کہ جینکو وہی آدمی تھا جس نے ہماری عاصمہ کی بازیابی کے سلسلے میں مدد کی تھی۔ اسے وہاں بیٹھا دیکھ کر مجھے تھوڑا حوصلہ ہوا تھا مگر دل اب بھی ایک تشویش آمیز سی بے چینی کا شکار تھا۔ حسب سابق وہاں چند مسلح افراد بھی موجود تھے۔

میں نے مسکراتے ہوئے ان دونوں سے باری باری ہاتھ ملایا۔ مصافحہ کرنے کے دوران میں نے جن ڈاڈا کے

چہرے کے ثبوت بھی بھانپنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بشرے پر گہیرا غاری تھی۔ اس نے مجھے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کا ایک گال پھولا ہوا تھا اور وہ لگتا چہرہ ہاتھ تھا۔

”تم نے ہم سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟“ میرے کرسی پر بیٹھتے ہی جن ڈاڈا نے اسی گہیرے سے لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔ میں اس کی بات پر تھوڑا چوڑا ہونے لگا تھا۔ اس کے سوال پوچھنے کا انداز اور لہجہ کا دبہہ بتاتا تھا کہ اسے بالآخر اپنے پادشوق ذرائع سے خفیت کا علم ہو چکا تھا جبکہ جینکو کی وہاں موجودگی بھی یہی بتاتی تھی۔ پھر بھی میں نے اس کی طرف دیکھ کر تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”کیا جھوٹ سائیں؟ میں سمجھا نہیں؟“

”نعان! مسئلہ یہاں کچھ اور ہو گیا ہے۔“ اس بار جن ڈاڈا کی بجائے جینکو نے میری طرف دیکھ کر تنبیہ کی سے کہا اور میں ابھی ہونٹوں پر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ”نیا مسئلہ کیا ہو سکتا تھا؟“ میرے ڈولیدہ ذہن میں ابجرا۔ وہ آگے بولنے لگا۔

”میں نے جن ڈاڈا کو ساری حقیقت خود ہی بتا دی ہے۔ اس لیے جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہتر ہے جو پوچھا جائے اس کا جواب دیتے جاؤ۔“

”شیراز کدھر ہے؟“ میں نے فوراً پوچھا۔

”پہلے میرے سوالات کا جواب دو نعان!“ جن ڈاڈا نے میری طرف دیکھ کر تیز سے لہجے میں کہا۔

”پوچھو۔“ میں نے بھی اسی کی طرف دیکھا۔

”حقیقت حال اپنے منہ سے بتا دو تاکہ ہمیں اندازہ ہو سکے کہ تم کتنے سچے ہو۔“ جن ڈاڈا میری طرف دیکھ کر بولا۔

”ڈاڈا! سائیں! اگر یہ بات ہے تو پھر سن لو کہ میں ایک شریف اور عزت دار گھرانے کا فرد ہوں، میں نے آپ سے مصلحت جھوٹ بولا تھا کہ ہم عورتوں کے پیلا زہر ہیں۔ درحقیقت میری جوان بہن عاصمہ کو میرے ایک دشمن سیٹھ ستار نے کسی مجنونا کی آدمی کے ذریعے اغوا کر لیا تھا۔ ہمیں پتا چلا کہ وہ دلاری میں ہی جو کہ مکان میں زیرِ غفلت بنا کر رکھی گئی ہے۔ میرے دوست شیراز عرف کالیا نے میری مدد کی اور ہماری جینکو بھائی نے۔“ آخری جملہ میں نے جن ڈاڈا کے قریب بیٹھے جینکو کی طرف دیکھ کر ادا کیا تھا۔ لیکن میں نے دیکھا جینکو کے چہرے پر اب ایک عجیب طرح کا اطمینان عود کر آیا تھا، جیسے میرے سب کچھ بتا دینے پر اس نے بھی کچھ کاساں لیا ہو کر

کیوں؟ میرے اچھے ہوئے ذہن میں سوال ابجرا تھا۔ میری بات پر جن ڈاڈا نے ایک نظر اپنے قریب بیٹھے جینکو پر ڈالی اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

”جہاں تم لوگوں نے کارروائی کی تھی، وہ میرا پاڑہ تھا اور مجو میرا خاص آدمی۔ اس کارروائی میں ہمارا ایک پرویز نامی آدمی تم میں سے کسی ایک کی گولی کا نشانہ بھی بنا تھا۔“ وہ اتنا بتاتا کر ٹھہرا اور مجھے یاد دہاتا کہ وہ میری ہی گولی کا نشانہ بنا تھا جب میں مطلوبہ مکان کے قریب جینکو کے ایک ساتھی کے ساتھ گھات لگائے بیٹھا تھا تو مجھ کے ایک ساتھی نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا اور میں نے اسی کے پستول سے اس پر گولی چلا دی تھی، بعد میں مجو بھی میری چلائی ہوئی گولی سے گھاتل ہوا تھا جو اس کی ٹانگ میں لگی تھی۔

میں خاموشی سے جن ڈاڈا کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ ان سب باتوں کے باوجود مجھے کسی خاص ”گرا کرئی“ کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ جس پر اندر سے میں خود بھی تھیرتا تھا۔ یہ میری خوش فہمی بھی ہو سکتی تھی۔ میں بہر حال جن ڈاڈا کے آگے بولنے کا شہتر رہا۔

”تمہارے اسی آدمی کی چلائی ہوئی گولی سے بعد میں مجو بھی زخمی ہوا تھا، اس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی لیکن جس کے پہلو میں گولی لگی تھی، وہ مرتے مرتے بچا تھا۔ تم لوگوں نے مجھ سے کسی قسم کا مشورہ کیے بغیر میرے پاڑے میں۔ اتنی بڑی کارروائی کس طرح کر ڈالی تھی؟ کیا سمجھتے تھے کہ مجھے حقیقت کا پتا نہیں چلے گا؟“

میں نے دیکھا جن ڈاڈا کا لہجہ لہجہ بہ لہجہ گرم ہوتا جا رہا تھا مگر اب بھی اس میں ابال کی وہ کیفیات نہیں تھیں، جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ معاملہ ہنوز درمیان کا کچھ اور ہی تھا۔ لہذا میں نے بھی ماحول اور حالات کو محسوس کرتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجہ اپنایا اور کہا۔

”ڈاڈا! سائیں! ایک شریف اور غیرت مند بھائی جس کی جوان اور کنواری بہن اغوا کر لی گئی ہو اس کے دماغ میں ایک ہی دھن سوار ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح سے اپنی بیٹی کو اغوا کاروں سے چھڑا کر دیں۔ ہم نے تو اس کا دماغ اور ہاتھ نہیں سوچ سکتا۔ میری اس بات کا احساس وہی کر سکتا ہے جس کی اپنی بھی بہن ہو لیکن جن ڈاڈا۔ آپ کی بات بھی غلط نہیں ہے۔ آپ سے اپنے دل کی بات کہوں گا ڈاڈا! سائیں! ابھی تو تھوڑی دیر پہلے آپ نے یہ کہا کہ ہمیں اس سلسلے میں آپ سے مشورہ کر لینا چاہیے تھا تو اس وقت بھی میرے دل میں یہ بات آئی تھی جب

ہیں یہ بتا چلا تھا کہ مجھ نے یہ حرکت کی ہے اور وہ آپ کا آدمی ہے تو بھینا آپ ایک بہن کے لیے ایک بھائی کے جذبات کا احساس ضرور کرتے۔ کیونکہ مجھے یقین تھا مجھ نے یہ کیا حرکت میرے دشمن کے کہنے پر کی ہوگی آپ کے کہنے پر نہیں۔“

میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اور اپنی معاملہ بندی اور زیرک دماغی کی نفسیاتی چوٹ کا اثر جن ڈاڈا کے چہرے سے مترشح ہوتے دیکھتا رہا۔

درحقیقت درمیان کے حالات اور جینکو کا وہاں دوستانہ انداز میں موجود ہونا اشارہ کر رہا تھا کہ کم از کم جین ڈاڈا کے علم میں لائے بغیر ہی مردود مجھ سے سیٹھ ستار کے کہنے پر میری بہن کو اغوا کرنے کی گری ہوئی حرکت کی تھی۔

جین ڈاڈا کے چہرے کا بڑھتے ہوئے تناؤ کا گراف تیزی سے گرنے لگا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس خارج کر کے اپنے منہ سے گنگا تھوکا اور پھر سامنے رکھی ٹیڈی پاپوں والی جھوٹی میز پر سے پانی کی بوتل اٹھا کر منہ سے لگائی، مٹی کی اس کے بعد اپنے کرتے کی سائیڈ پاکٹ سے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکالا اور ساتھ ہی ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ جھکا اور جین ڈاڈا نے اس کے کان میں کچھ کہا، پھر خود پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر اپنے ہونٹوں میں ڈالی۔

”پتے ہو؟“ اس نے پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ نہیں میں نے شکریہ کے ساتھ انکار میں سر ہلا دیا۔ وہ لائٹر سے سگریٹ سلگانے لگا اور ایک گہرا سانس لے کر کچھ سوچنے لگا۔ میں نے جینکو کی طرف وزدیدہ سی نظروں سے دیکھا تو وہ میری طرف دیکھ کر ہلکے سے مسکرایا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہی آدمی میرے لیے ایک چائے کا ایک بڑا سا گگ اٹھا لایا اور میرے سامنے ٹیڈی ٹانگوں والی میز پر رکھ کے اپنی سابقہ جگہ پر کھڑا ہو گیا۔

”چائے پیو۔“ جین ڈاڈا نے سگریٹ والے ہاتھ سے ٹیک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کی ایک ٹانگ نیچے تھی اور ایک میز کے کونے پر تکی ہوئی تھی۔ میں نے بھی آج اس کا بخود جائزہ لیا تھا جیسا کہ میں پہلے سرسری طور پر اس کے مٹھے کے بارے میں بتا چکا ہوں، جین ڈاڈا میری ہی طرح کا ایک لمبا ترنگا مگر چہرے پر جسم کا ان جوان سالز کا تھارگت گندی تھی۔ ہونٹوں پہ مٹھی موچیں تھیں۔ چہرہ البتہ کچھ لیوٹرا اور آنکھیں بڑی بڑی اور روشن تھیں۔ سر کے بال چھوٹے اور ”سیجرت“ تھے۔

میں گگ اٹھا کے چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔

”مجھے تمہارے بارے میں سب علم ہو چکا ہے۔“ اس نے گولڈ لائف کے سگریٹ کا ایک کش لگاتے ہوئے کہا۔

”تمہارے باپ کو بے گناہ پھانسی پر چڑھا دیا گیا تھا۔ سیٹھ ستار سے تمہاری دشمنی اور بھی بہت کچھ۔ لیکن تم مجھے نہیں جانتے شاید کہ میں ایسے لوگوں کو کسی معاف کرنے کا عادی نہیں ہوں، ہمارے اپنے جھگڑے اپنی جگہ ہیں لیکن باہر کا کوئی آدمی ہمارے علاقے یا پاڑے میں آکر اس طرح کی کارروائی کرے اور وہ بھی ہمارے ہی حلیف کی مدد سے یہ تو بالکل بھی ہم گوارا نہیں کرتے مگر تمہاری جی داری بھی ہمیں پسند آتی کہ جب بھی ہم نے تمہیں بلا یا تم بلا خوف چلے آئے اور آج والی ملاقات میں جیل کو بل کر ہمارا بھی دل جیت لیا۔ اصل میں یہاں معاملہ کچھ اور ہو گیا ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر رکا۔ سگریٹ کا کش لیا۔ میری نظریں بدستور اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ آگے بولا۔

”میرے اپنے بھی علم میں یہ بات نہ تھی کہ ہمارے آدمی مجھ نے اپنے دوستیوں پر یز اور لالی کی مدد سے کسی شریف لڑکی کو اغوا کر کے ہمارے ہی پاڑے میں یرغمال بنا رکھا ہے کیونکہ میں ایسی حرکت کو خود بھی سخت ناپسند کرتا ہوں۔ بات مکمل کی تو مجھے بتا چلا کہ اصل معاملہ کیا تھا۔ افسوس کہ مجھ سے ہمارا رشتہ صرف سامعی کا نہیں ہے ورنہ میں خود اسے اس حرکت پر گولی مار دیتا۔ وہ میرا قریبی رشتہ دار بھی ہے اور ہمارا لاڈلہ بچہ۔“

سیٹھ ستار نے اس سے ہماری معاوضے کے عوض تمہاری بہن کو اغوا کرنے کا کام لیا تھا، جس کی پوری سیٹھ وہ بخو کر چکا تھا۔ جب شکار ہاتھ سے نکل گیا تو جو اس بات کا پابند تھا کہ اب وہ سیٹھ ستار کو اس کی رقم لوٹا دے مگر یہ جو کہ بس کی بات نہیں رہی تھی۔ سیٹھ ستار بھی چھوڑنے والا نہیں تھا۔ ایسا آدمی جو کام سے پہلے پیسے دینا جانتا ہے تو ناکامی کی صورت میں اپنے پورے پیسے واپس لینا بھی جانتا ہے۔ مجھ نے سیٹھ ستار کو اس کی رقم لوٹانے سے صاف انکار کر دیا، جس کے جواب میں سیٹھ ستار نے مجھ کو ایک دھکتی رگ پر پاؤں رکھ دیا، جس کا تعلق ہم سے بھی بننا تھا لیکن مجھ نے ابھی تک مجھ سے یہ سب چھپا رکھا تھا۔ مجھ نے سیٹھ ستار کے سامنے جھک گیا اور یہ بھی کہہ ڈالا کہ وہ روئے تو خرچ کر بیٹھا ہے اگر وہ کوئی اور اس سے کام لینا چاہے تو وہ کر سکتا ہے، سیٹھ ستار جیسوں کو روپوں کی نہیں اپنے کام اور اپنی تسکین کی فکر ہوتی ہے، لہذا مجھ کے جھک جانے سے۔ سیٹھ ستار نے اسے بتایا کہ وہ کالیا کو اغوا کر کے اس کے پاس پہنچا

دے تو حساب برابر ہو جائے گا۔ کیونکہ بیٹھ ستار کو پتا تھا کہ اس کارروائی کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔ جو نے اس کام کی حامی تو بھری لیکن کالیا کو وہ جس طرح تر توالہ سمجھا تھا ویسا وہ نہیں نکلا۔ نتیجے میں مجھ، کالیا کے ہاتھوں مارا گیا۔

جنن ڈاڈا اتنا بتا کر خاموش ہوا اور اس کے آخری اکٹاف پر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ایک بار پھر پریشانی اور تشویش کے سائے مجھ پر حاوی ہونے لگے تھے اور کالیا کی طرف سے فکرو پریشانی سوا ہونے لگی۔ نبانے اب یہ گینگ وار لیڈر اس یاداش میں کالیا کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا تھا کیونکہ مجھے یہاں لانے والوں نے اشارہ دیا تھا کہ کالیا اسی کی گرفت میں تھا۔

”مجھ کو مرنے کے بعد لالی اور پرویز نے مجھے اصل بات سے آگاہ کر ڈالا۔ جو کی موت نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا اور میں خود انتقاماً کالیا سے مجھ کو قتل کا بدلہ لینے کے لیے میدان میں اتر اور اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ کالیا کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ بڑی مشکلوں سے اسے قابو کر کے ہم اڈے پر پہنچے۔ اس سارے معاملے میں چوں کہ مجھے جینکو سے بھی شکایت تھی لہذا اسے یہاں بلایا، کیونکہ کالیا اس کا بھی بار ہے۔ میں پریشان تھا اور انتقام کی آگ میں جل بھی رہا تھا لیکن بعد میں جینکو کے ساتھ بیٹھ کر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ معاملے کی تہ تک پہنچا تو مجھے اس میں سارا تصور اپنے ہی ساتھی جوکا محسوس ہوا کیونکہ پرویز اور لالی نے ڈر کے مارے مجھے اصل معاملے سے ہٹ کر حقیقت بتائی تھی جس سے میں آگ بگولا ہو گیا تھا۔“

”تو کالیا تمہاری قید میں ہے۔ ڈاڈا سائیں؟“ مجھ سے مبر نہ ہو سکا اور فوراً جنن ڈاڈا سے پوچھ لیا۔

”ہاں۔“ اس کی بات پر میں نے اندری ہاندر سکون کی ایک گہری سانس لی تھی۔ پھر پچی مزید تسلی کی خاطر اس سے دوبارہ متسفر ہوا۔ ”وہ ٹھیک تو ہے نا؟“

”بالکل ٹھیک ہے وہ۔“ اس نے جواب دیا۔

جنن ڈاڈا ایک بڑے گینگ وار کالیڈر ہونے کے باوجود مجھے سمجھدار اور سلجھا ہوا آدمی محسوس ہوا تھا ورنہ جیسی شہرت میں نے اس طرح کے لیاری گینگ وار لیڈران کے بارے میں سنی تھی کہ ان کی خطرناکی کے لیے اتنا ہی کہنا کافی تھا کہ عام لوگ باگ ان کے سائے سے بھی دور بھاگتے تھے۔ کوئی ان سے زبردستی مجھڑ بھی جاتا تھا تو دونوں ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھ جاتے تھے لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ یہ لوگ صرف اپنے

دشمنوں کے لیے ہی سنگ دلی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ عام لوگوں سے ان کی کوئی لڑائی یا جھگڑا نہیں ہوتا تھا۔ دو، دو، جنن تین گروہ آپس میں دوست بن کر بھی اپنے مخالف گروہ پر ہلہ بولتے تھے اور اکثر ایک دوسرے کے بھی جانی دشمن بن جاتے تھے جس سے انتقام لینا ہوتا تھا تو اس کا قریب چھپنا چھوڑتے تھے۔ پھر چاہے خود ہی کیوں نہ مر جائیں، پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ یہی ساری حقیقتیں کالیا کو بھی معلوم تھیں۔ غرضیکہ یہ مختلف گروہوں میں بنے ہوئے تھے مگر مجھے جنن ڈاڈا ان میں کچھ مختلف لگا تھا۔

بہر کیف وہ ایک نظر اپنے قریب بیٹھے جینکو کی طرف دیکھتے ہوئے آگے بولا۔

”میں نے کالیا کو ذاتی میں دے دے کر ہلاک کرنا تھا۔ اپنے دشمنوں کا ہم ایسا ہی حشر کرتے ہیں لیکن ساری حقیقت جان لینے اور جینکو سے ملنے کے بعد ہمیں اپنا ارادہ بدلنا پڑا لیکن جو کے لواحقین نے مجھ سے قصاص (خون بہا) کا تقاضا کیا ا میں نے یہی بات جینکو کے سامنے رکھ دی۔ جینکو نے مجھ سے یہی کہا کہ تمہیں ہلا کر بات کی جائے۔“ وہ خاموش ہو گیا اور جینکو کی طرف دوبارہ ایک نظر ڈالی تو جینکو نے اس بار شاید اس کا کوئی اشارہ بھانپ لیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

”دیکھو نعمان! میں تمہیں صرف اپنے یار کالیا کے حوالے سے جانتا تھا۔ میرا براہ راست تم سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ شکر کرو کہ جنن ڈاڈا ایک سمجھدار آدمی ہے۔ حقیقت جان لینے کے بعد یہ اس کی مہربانی اور کم احسان ہے کہ اس نے مجھ سمیت تمہیں اور کالیا کو بھی معاف کر دیا ہے مگر کالیا کے سلسلے میں معاملہ اس کا ہاتھ میں نہیں رہا ہے۔ اب میری بات ذرا غور سے سنو کیونکہ فیصلہ تمہارے ہی ہاتھ میں ہو گا اب۔“

وہ اتنا کہہ کر رکا اور پھر کہنا شروع ہوا۔ میری بہ نگو نظر میں اس کے چہرے پر ہی جی ہوئی تھیں۔

”دیکھو نعمان! قصہ ادھر ہی ختم ہو رہا ہے۔ جو کی حیثیت جنن ڈاڈا کے گروہ میں ایک وفادار ساتھی سے بھی بڑھ کر کچھ اور بھی۔ وہ اس کا قریبی رشتہ دار بھی لگتا تھا۔ اسی خاندان کے چند لوگ دوسرے گروہ سے بھی تعلق رکھتے ہیں جن کا شمار دوستوں میں ہوتا ہے نہ ہی دشمنوں میں۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات؟“

”ہاں ہاں! میں سمجھ رہا ہوں۔ کہتے رہو۔“ میں نے اس کی طرف بدستور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”وہ لوگ بدلے کے طور پر کالیا کو ہلاک کرنے کے

آریوں کی آمد

تاریخ انسانی میں ”آریہ“ سے مراد کاشت کاروں کی وہ قوم ہے جو حضرت عیسیٰ کی ولادت سے ڈھائی ہزار سال پہلے وسط ایشیا کی چراگاہوں سے نکلی اور یورپ، ایشیائے کوچک، ایران اور ہندوستان میں وارد ہوئی۔ ان کی دو بڑی شاخیں تھیں۔ ایک نے یورپ کا رخ کیا اور دوسری ایران کی طرف آئی۔ یورپ کی طرف جانے والے آریہ قبائل کو ہندو یورپی اور ایران کی طرف آنے والوں کو ہند آریہ کہا گیا۔

آریہ کی جو شاخ ایران میں آکر آباد ہوئی، وہ تاریخ میں میڈی کہلاتے ہیں۔ ان کے جانشینوں نے مشہور ہخامنشی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو سارس اعظم کی تحت (559 ق م) سے لے کر اسکندر اعظم (331 ق م) کی لائی ہوئی تباہی تک قائم رہی۔ ان آریوں میں سے کچھ کی اولادیں جو پارسی کہلاتی ہیں، آٹھویں صدی عیسوی میں جنوب مغربی ہندوستان میں آکر آباد ہو گئیں۔ ایران میں اچھی طرح اپنا تسلط جمانے کے بعد ان لوگوں نے افغانستان کی طرف رخ کیا اور تقریباً 2500 ق م میں کابل کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے۔

بعض تاریخی شواہد سے پتا چلتا ہے کہ ارض پاکستان میں داخل ہونے والے آریہ آباد کار حضرت نوح کے طوفان کے بعد یہاں پہنچے تھے۔ تاہم آریہ کوہ ہمالیہ اور کوہ ہندوکش کے دروں کو عبور کر کے پنجاب کی سرزمین میں داخل ہوئے۔ دریائے سندھ کی تیز رفتاری کو دیکھ کر انہوں نے اسے سندھو کا نام دیا۔ یہاں پر پہلے سے آباد درادڑ قوم کو مار بھگا یا اور پانچ دریاؤں کے آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ مفتوحہ علاقوں کو ”آریہ درت“ کہا جانے لگا۔

مرسلہ: قرۃ العین، اقرائی، کراچی

دھپے تھے۔ جن ڈاڈا نے میری دوستی کی خاطر اور کچھ حقائق کا ہاتھ لینے کے بعد مقتول مجھ کو لڑکھن کو بڑی مشکلوں سے قحاص و دیت لینے پر رضامند کر لیا ہے ورنہ تم ہی نہیں کالیا بھی ہاتا ہے کہ یہ لوگ کس قدر خطرناک ہیں۔ اچھے بھلے مجرم بھی ان سے ٹکر لیتے ہوئے گھبراتے ہیں۔“

میں ان دونوں کی باتیں سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ میں تو سمجھا تھا پریشانی ٹٹنے لگی تھی مگر یہاں ایک اور مصیبت گلے کو آ پڑی تھی۔ پتا نہیں کتنا زبردان و دیت دینا پڑتا؟ مجھے بھلا ان چکروں کا کیا پتا تھا؟ اور پھر کون دیتا؟

”کک۔ کتا دیت دینا پڑے گا؟“ بالآخر میں نے گھسی پھسی آواز میں پوچھا۔

”چالیس لاکھ۔“ صلیکو کی بجائے جن ڈاڈا نے جواب دیا۔ چالیس لاکھ کی رقم معمولی نہ تھی۔ اتنی بڑی رقم کا سن کر میرے حلق میں کچھ جھنسنے لگا اور میں نے اسے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”جی۔ چالیس لاکھ! یہ کچھ زیادہ نہیں ہیں؟“

”ایک انسان کی زندگی سے بڑھ کر تو کروڑوں روپے کی کچھ نہیں ہیں۔ یہ تو معاملے کو رفع دفع کرنے کی نیت سے دیت رکھی جاتی ہے تاکہ دونوں طرف کے فریقین اپنے اپنے طور پر مطمئن ہو جائیں۔“ جن ڈاڈا بولا۔ ”اس پر بھی ٹھکر کرو کہ مقتول کے لواحقین نے کسی طرح کالیا کی جان بخشی کر والی۔ وہ پولیس میں بھی تم دونوں کے خلاف رپورٹ کر سکتے تھے۔ دیت تو تمہیں پھر بھی دینا پڑتی مگر پھر پولیس کو بھی دینا دانا لگ پڑتا۔“

”میں کالیا سے مل سکتا ہوں۔ کیونکہ تم کا بند و بست اٹانے ہی کرتا ہے۔“

”نہیں۔“ جن ڈاڈا نے اپنا سر فنی میں ہلایا۔ ”اول تو کالیا کو وہ لوگ اپنے ساتھ لے جا چکے ہیں۔ دوسرے یہ کہ دیت کے پیسے لیے بغیر وہ کالیا کو نہیں چھوڑیں گے۔“

اس کی بات سن کر مجھے مزید پریشانی نے گھیر لیا اور بے اختیار میں اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ کالیا کے بغیر میں لوگوں کو حورا کھتا تھا۔ اس کا دنیا میں میرے سوا اور تھا بھی کون؟ استاد بھابھا بھی اسے بچانے کے لیے اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتا تھا، تاہم ایک اُمید کے سہارے میں اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر ہی چکا تھا۔ رہا جینکو تو اس نے پہلے ہی اپنی طرف سے اس معاملے کو صاف کر دیا تھا، یہی اس کا بڑا احسان فائز دہشتی کا رسلک لیا تھا اس نے۔

مجھے مہلت کے طور پر پندرہ دن دے دیئے گئے تھے۔ کالیا کہاں قید تھا؟ مجھے اس کا علم نہیں تھا، کن کی قید میں تھا، وہ بھی صرف اسی حد تک جانتا تھا کہ جن ڈاڈا کو ہی اس کا علم تھا۔ شکر تھا کہ وہ زندہ تو تھا۔

بہر طور میں جن ڈاڈا اور آخر میں جینکو کا شکر یہ ادا کر کے واپس لوٹنے ہی لگا تھا کہ اچانک دو آدمی احاطے کے پھانک سے دوڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں کے چہرے جوش غیظ سے تھما رہے تھے۔ ان میں تو گھٹے ہوئے جسم اور درمیانے قد و قامت کا آدمی تھا، جس کے چہرے سے خوف ناک کی چمک رہی تھی۔ ہاتھ میں اس کے ٹی بی پسل تھا۔ اس نے ٹائٹ جسم کی بنیان دھاری دھاری شرٹ اور نیلی جینز پہن رکھی تھی جبکہ اس کے دوسرے ساتھی نے شلوار ٹیفس اور وہ ذرا مضبوط جسم کا لباس تنگ آدھی نظر آتا تھا۔ رنگت سیاہی مائل تھی۔

اس کی آنکھوں سے کچھ زیادہ ہی طیش ناک اور چہرے سے خونخواری مترشح ہو رہی تھی۔ وہ بظاہر خالی ہاتھ نظر آتا تھا جن ڈاڈا سے غصے میں وہی مخاطب ہوا تھا، جس سے مجھے اس کی حیثیت کا اندازہ ہوتا تھا کیونکہ جن ڈاڈا جیسے لینگ وار لیڈر کو میں نے اس کے سامنے کچھ دیتے دیکھا تھا جبکہ جینکو کی حالت تو زیادہ ہی پتلی نظر آنے لگی تھی۔ میں کچھ گھبرا گیا کہ نجانے اچانک کیا ہو گیا تھا۔

”ڈاڈا! وہ مردود خونی بھاگ گیا ہے اور ہمارے مزید دو آدمیوں کو بھی ہلاک کر ڈالا ہے اس نے۔ اب تو دیت دیت گئی بھاڑ میں۔ اب اس کے ساتھی کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”ہاں، ڈاڈا سائیں! اب خون کا بدل خون ہوگا بس!“
ٹی شرٹ والے نے بھی اسی طرح کے غصے اور برہمی کا اظہار کیا۔

جن ڈاڈا اور جینکو کو تو خیر اندازہ ہو ہی چکا تھا کہ یہ دونوں کس ”مردود خونی“ کی بات کر رہے تھے لیکن خود مجھے بھی اور اک ہو چلا تھا کہ یہ دونوں کس کی باتیں کر رہے تھے۔ یہی سبب تھا کہ ایسا بکی میری ریڑھ کی ہڈی میں تشویش و خدشات کی سنسنی کسی پرچی کی طرح اترتی چلی گئی۔ کیونکہ ان کا ایک شکار میری صورت میں تو ان کے سامنے ہی موجود تھا، یہ الگ بات تھی کہ ابھی انہیں معلوم نہ تھا۔ جن ڈاڈا کا چاہنا تھا کہ وہ اسی وقت کھڑے کھڑے مجھے ان کے حوالے کر دیتا۔ میں کھڑا رہا مگر اندر سے میرا جو دمقش سا ہور ہا تھا۔

”کیا ہوا ہے میرا داد؟ خیریت تو ہے؟“ جن ڈاڈا نے

بالآخر اس سے پوچھا۔ ہم کھڑے تھے۔ میرا داد بھی قد آدم اور کسرتی بدن والا شخص تھا جو اپنے ساتھی کے مقابلے میں زیادہ بھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”بس، جن ڈاڈا! بہت ہو گیا۔ اب حساب صاف ہوگا۔ کالیا اور اس کے ساتھی نعمان کا ہمیں اسی وقت ہتادے دو۔ ہم جائیں ہمارا کام جانے۔“ اس کے منہ سے اپنا نام بھی سن کر میری رگ دیپے میں پھیری سی دوڑ گئی۔ فکر و تشویش کی ایک سنسناتی ہوئی لہر تھی جو پورے وجود میں برقی کی طرح سرایت کر گئی۔ میں ان کے دوسرے شکار کی صورت میں ان کے سامنے کھڑا تھا اور یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اگر جن ڈاڈا جینکو میری طرف ایک ذرا اشارہ بھی کر دیتے تو میرا دادا تابی پ بھرا ہوا شخص اور اس کا ساتھی اسی وقت مجھے گولیوں سے پھٹلی کر ڈالتے۔

جن ڈاڈا اور جینکو نے میری جانب ایک نظر ڈالی بھی تھی، دکھ اور تاسف کے ساتھ میں نے جن ڈاڈا کے چہرے پر بھی برہمی اور جوش کے تاثرات کی جھلک اٹتے ہوئے دیکھی تھی۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں یہ بھی مجھ کی ہلاکت پر طیش و انتقام تلے انہیں میرے بارے میں بھی بتادے مگر شکر تھا کہ میرے بارے میں بولے کچھ بھی نہیں تھے۔ مجھے حیرت آمیز تشویش اس بات سے ہو رہی تھی کہ بھلا یہ میرے دشمن کیوں کر بن گئے تھے؟ جن ڈاڈا ہوتا تو بات سمجھ میں آتی تھی لیکن پھر فوراً خیال آیا کہ کالیا کے ہاتھ جو کام کا مگر آتا تھا اور کالیا کے ساتھ میں بھی تھا۔ جن ڈاڈا نے جب کالیا کو ان کے حوالے کیا ہوگا تو ساری تفصیل بھی بتائی ہوگی اور اب یہ لوگ مجھ کی ہلاکت اور ابتدائی واقعات سے جوڑ رہے تھے۔

”تم بیٹھو تو بابا! مجھ کے ہلاک ہونے کی اس خبر نے مجھے بھی دہلا کر رکھ دیا ہے۔“ جن ڈاڈا نے ان سے کہا۔ جینکو پریشان سا نظر آ رہا تھا۔ معاملہ اس کے لیے بھی خراب ہوئے لگا تھا۔ میرا تو جی چاہ رہا تھا کہ اسی وقت بھاگ کر احاطے کا پھانک پار کر لوں اور اپنی کار میں جا بیٹھوں، پھر گھر ہی جا کر دوسرا سانس لوں مگر میری ہمت جواب دینے لگی تھی۔ وہ ان دونوں نے مجھ کی موت اور کالیا کے فرار پر وہاں قمر خرولا چلا دیا تھا۔ ابھی شاید انہیں ایک اور حقیقت کا پتا نہیں چلا تھا کہ جن ڈاڈا کے ساتھ موجود جینکو بھی اس میں برابر کا قصور وار تھا۔

”کیا بیٹھ کر کروں میں ڈاڈا!“ میرا داد چراغ پا ہو کر بولا۔ ”اب تو میں سب سے مجھ کی موت کا بدلہ لوں گا، ان لوگوں سے بھی جنہوں نے باہر کے ان دونوں دشمنوں کو یہاں

کی راہ دکھائی تھی۔ تم تو مجھے نہیں بتاؤ گے مگر میں اس کا بھی پتا چلائی لوں گا۔“

اس کی بات پر میں نے کن آنکھوں سے جینگو کی طرف دیکھا تھا، جو میرا داکہ اس خوں ناک دمگی سے پریشان سا نظر آنے لگا تھا۔

”تم جاؤ بعد میں بات ہوگی تم سے۔“ دفعتاً ہی جین ڈاڈا نے مجھ سے کہا اور میں جیسے اسی بات کا ہی منظر تھا۔ ساتھ دل ہی دل میں جین ڈاڈا کا شکر یہ بھی ادا کیا اور پھر واپس جانے کے لیے پلانا تو میرا دانا می اس جلتے سکتے شخص کو اپنی جانب ایک نظر مہررتے بھی پایا۔ میں ابھی بھاگ تک پہنچا ہی تھا کہ آٹھ دس افراد کا مشتعل گروہ ہاتھوں میں اسلحہ تھا، اندر داخل ہونے لگا، میں نے جلدی سے گھبرا کر انہیں اندر آنے کی جلدی۔ یہ بھی میرا داکہ ہی گینگ کے آدمی لگتے تھے۔

ان سب کے بھاگنے سے گزر جانے کے بعد میں جلدی سے آکر کار میں سوار ہو گیا اور اسے اشارت کیا، شاید گھبراہٹ تھی یا بولکھاہٹ کہ گاڑی کو صحیح انیٹن نہیں لگ پارہا تھا۔ یہاں کے حالات خراب ہونے کے واضح امکانات نظر آرہے تھے۔ پورا لیاری ان کی لپیٹ میں آجاتا تھا۔ اس لیے میں جلد سے جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن بنانے کیا ہوا کہ گاڑی اشارت ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ میں نے اس بار صبر و تحمل کے ساتھ دوبارہ سیلف دیا مگر نادر ابھی میں کار سے اتر کر بونٹ اٹھانے ہی لگا تھا کہ جین ڈاڈا کے احاطے کے اندر سے گولیاں چلنے کی سح خراش ترتر اٹھ اُبھری۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ہاں موجود دو تین افراد۔ اندر کو بھاگے، ایک نے مجھ سے غصے میں کہا۔

”اڑے بابا! جاؤ بھاگو ناں ادھر سے۔ ہنگامہ ہو گیا ہے، ابھی تمہاری گاڑی کو آگ لگا دیں گے۔“ وہ یہ کہہ کر اندر بھاگا۔ پریشانی اور خوف سے میرا پورا وجود سنسانے لگا۔ میرے خیال میں کالیا نے جلد بازی کا مظاہرہ کر کے سنبھلنے ہوئے حالات کو پہلے سے زیادہ خطرناک بنا ڈالا تھا جبکہ خود میں بھی مصیبت میں پھنس گیا تھا، خیال تو آیا جی میں کہ گاڑی چھوڑ کر ہی بھاگ جاؤں مگر میرے جیسے متوسط آدمی کے لیے گاڑی جیسی سواری کسی نعمت سے کم نہ تھی اور میں اس کے نقصان کا تحمل بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ دو بارہ خرید سکتا تھا۔ تاہم جان پر ہتی تو اور بات تھی۔ اندر فائرنگ ہو رہی تھی اور شور شرابے کی بھی آوازیں آرہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے دو فریقوں کے درمیان دو بدو یا قاعدہ خطرناک فائرنگ شروع ہو چکی ہو۔

میں نے جلدی سے کار کا بونٹ اٹھا کر دیکھا مگر کوئی خرابی نظر نہ آسکی۔ میں دوبارہ اسٹیرنگ پر آیا اور انیٹن میں لگی چابی گھمائی۔ اللہ سے دعا بھی مانگتے لگا کہ اس بار اشارت ہو جائے اور وہی ہوا شکر تھا کہ وہ اشارت ہو گئی۔ میں نے جلدی سے کینز ڈالا اور کار دوڑائے نکل گیا۔

میں گاڑی کو چیل چوک سے نکال کر میرا ناک چوک پر لے آیا اور سیدھا دوڑا تلے گیا۔ لیاری کے علاقے سے نکلنے کے بعد میں نے سکھ کی سانس تو لی تھی مگر آئندہ کے متوقع حالات کا اندازہ کر کے مجھے تشویش کھائے جارہی تھی۔ جانتا تھا میں کہ آج لیاری کے حالات ہماری ہی وجہ سے خراب ہوئے تھے۔ یہ سوچ سوچ کر ہی میرا دل ہول رہا تھا کہ اب آگے کیا ہونے والا تھا! اور جو ہونے والا تھا وہ۔ کچھ اچھا نہ ہوتا۔ یہ شکر تھا کہ کالیا ان خطرناک لوگوں کی قید سے راو فرار اختیار کر چکا تھا، اس بات سے قطع نظر کہ اس نے ان کی قید سے فرار ہونے کی غلطی کی تھی یا عقل مند کی تھی، تاہم میرا خیال تھا کہ اسے بھی اس حقیقت کا علم ہو چکا ہوگا کہ جیو کی اس کے ہاتھوں ہلاکت پر اس کے وارثین دیت کے طور پر ایک بڑی رقم کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ممکن تھا کالیا کو پہلے ہی سے یہ احساس ہونے لگا ہو کہ اس کی تلاش میں مجھے بھی اسی حقیقت کا علم ہو چکا ہو اور میں اب اس کے لیے اتنی بڑی رقم کے بندوبست کرنے کے امتحان میں نہ پڑ جاؤں اور اس نے میری یہ آزمائش آسان کر ڈالی ہو مگر یہ سب آسان کہاں ہوا تھا؟ وہ ان کے دو ہندے اور بھی مار کے نکل بھاگا تھا ان کی قید سے کوئی بعید نہ تھا کہ میرا دادا اور اس کے ساتھی میرے بچے بھی لگ سکتے تھے۔ مصیبت نئی تو نہیں تھی لیکن اس کا سلسلہ متعلق میرے پیش آمدہ حالات سے ہی تھا۔

اچانک میرے سیل فون کی تیل گنگنائی اور میرا دل اندیشاک مسوسوں تلے آپوں آپ ہی جیڑی سے دھڑکنے لگا۔ جب انسان سنگین تر حالات سے دوچار ہو تو ایسے میں سیل فون کی تیل بھی چوکا دیتی ہے اور دل کسی انجانے خدشات تلے زور زور سے دھڑکنے لگ جاتا۔ جب ہی یہ ایسا پریشان اور ڈولیدہ انسان کلپس کر رہے سوچتا ہے کہ ”کم بخت یہ موبائل فون ایجاد ہی کیوں ہوا۔“

میں نے کال انیڈی کی اور بولو کہا۔
”جگری! تو کہاں ہے۔“ دوسری جانب سے کالیا کی مخصوص لب و لہجہ کی آواز پر میں چونک پڑا۔
”میں راستے میں ہوں اور گھر جا رہا تھا، پتہ بتاؤ کدھر

ہے یا؟“ میں نے پریشان زدہ لہجے میں کہا تو وہ بولا۔
 ”منفورا گوشہ والی جگہ دیکھی ہے ناں۔ وہی جہاں،
 عارف مجتہد سے تیری ملاقات کروائی تھی؟“

مجھے یاد آگیا، ترنت بولا۔ ”ہاں۔ ہاں۔ آگے بول۔“
 ”وہیں آجا، باقی کی تفصیل وہیں آرام سے بیٹھ کر
 کرتے ہیں۔“ کہتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور میں
 نے کار کی رفتار مزید بڑھا دی۔

روڈ پر ٹریفک کارش کم ہونے کی وجہ سے میں آدھے
 گھنٹے میں ہی منفورا گوشہ پہنچ گیا اور کار سیدھی لے جا کر وہیں
 اس کے دروازے کے سامنے روک دی۔ میں نے ایک ہارن
 دے کر انگلیں چوک سے چابی نکالی اور دروازہ کھول کر نیچے
 اترا، جب تک دروازے کے قریب پہنچا، کسی نے میرے
 دستک دینے سے پہلے ہی کھول دیا۔ سامنے بھی کھڑا تھا۔
 ”آجائیں جلدی۔“ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے
 ہوئے مجھ سے کہا۔

میں اندر داخل ہوا اور مختصر سامعین پار کرتا ہوا جی کے
 ساتھ ایک کمرے میں آ گیا۔ کالیا وہاں پہلے ہی سے کھڑا تھا۔
 میں اس سے اور وہ مجھ سے لپٹ گیا۔

آج پہلی بار میں اسے بہت زیادہ پریشان اور تشویش
 زدہ دیکھ رہا تھا۔ وہ نہ تو کہاں وہ مجھے تسلیاں دیا کرتا تھا لیکن آج
 اس کا چہرہ دیکھ کر لگتا تھا جیسے اسے ڈھارسوں اور تسلیوں کی
 ضرورت مگی مگر یہ دیتا کون؟ میں تو خود مضطرب الحال کیفیات
 سے دو چار تھا۔

”یار بھگری! یہ سب برا ہو گیا۔ اتنا پریشان تو میں کبھی
 پولیس کے پیچھے لگنے سے نہیں ہوا ہوں جتنا کہ ان گینگ وار
 دشمنوں سے ہو کے رہ گیا ہوں۔“ وہ مجھ سے الگ ہو کے
 بولا۔ مجھے اس کا چہرہ مترقش اور لہجہ لڑکھاتا ہوا محسوس
 ہو رہا تھا لیکن بعد میں مجھے پتا چلا کہ اس کی تشویش اور پریشانی
 میرے لیے مٹی۔

”جگری! مجھے اس کالیا کی فکر نہیں۔ کیونکہ جب میں
 نے شرافت اور ”شیراز“ کا لبادہ اتار کر کالیا کا لباس اوڑھا تھا
 تو یہ جان لیا تھا کہ یہ جان۔ اب موت کے حوالے ہوئی لیکن
 یار جگری! مجھے تیری فکر ہو گئی ہے کیونکہ تو ابھی کالیا نہیں بنا۔ نہ
 ہی میں تجھے بننے دوں گا۔ ل۔ لیکن۔“ وہ چپ ہو رہا۔

ایسا ہوتا ہے، جب کوئی مرد یا۔ ڈھنسنے لگے تو دوسرے
 کا ہمت و حوصلہ سوا ہونے لگتا ہے، میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔
 کالیا کو اپنے لیے اس قدر محنت اور ڈولیدہ خاطر پا کر میرے

اپنے اندر ایک نئی ہمت اور جوشِ حوصلگی کا جذبہ اچانک ہی
 بیدار ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

”کالیا! میرے پار! آرام سے بیٹھ کر باتیں کرتے
 ہیں۔ فقط اتنا یا رکھا کر۔ ایک سب سے بڑی ہستی ہے جو اب
 آسمان پر بیٹھی ہے اور سب کی جان اسی قادرِ مطلق کے ہاتھ
 میں ہے۔ جب اللہ کا نام دل و دماغ میں جاگزیں ہونے لگا
 ہے تو ساری پریشانیاں اور فکرات ہوا ہونے لگتے ہیں، کیونکہ
 وہی سب کا پالنہارا اور مددگار ہے۔“

کمرے میں ایک ہی بڑا سا پرانا صوفی رکھا ہوا تھا۔ اس
 کے سامنے دو کرسیاں بے ترتیب پڑی تھیں۔ کالیا نے تو کرسی
 سنبھال لی جبکہ میں صوفے پر گر گیا۔ جی اس اثناء میں پانی اور
 چائے لے آیا تھا۔ ہم نے پانی پیا اور چائے کا کپ سنبھال
 لیا۔ جی بھی کالیا اور میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

”پہلے تو اپنی سائے گایا میں سناؤں؟“ میں نے چائے
 کا ایک گھونٹ بھر کے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
 ”اے! بھگری! تیرے پاس بھی کوئی خبر ہے؟ میں تو
 سمجھا تھا کہ میں ہی اپنی سنا رہا ہوں گا۔“

”تجھے سنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے میرے یار!“
 میں نے پھٹکی پھٹکی مسکراہٹ سے کہا۔ باتوں کا سلسلہ چلا تو
 پریشانی اور ڈولیدگی کا نکتہ رکھ کم ہوا۔
 ”مجھے تیرے بارے میں سب معلوم ہے، اسی لیے بہتر
 ہے کہ میں ہی سنا تا ہوں۔“

وہ اب حیرت سے آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھنے
 لگا۔ میں نے اسے اب تک کی ساری حالات و دگرگوں کی
 صراحت سے آگاہ کر دیا اور آخر میں یہ ٹمگنا خبر بھی دی کہ
 فہیم بھائی کے ساتھ اس ”پروہ فہیم“ ظالم درندے نے کیا
 حشر کیا تھا۔

”اف! میرے خدایا!“ کالیا یہ سب سن کر کرب انگیز
 لہجے میں بولا اور چائے کا خالی کپ قریب دھری تپائی پر رکھ
 کے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ گینگ وار گروپ سے
 دشمنی کی پریشانی اپنی جگہ مگر فہیم کے بارے میں سن کر وہ رز اٹھا
 تھا۔

”یار بھگری! مجھے یقین نہیں آ رہا۔ کیا واقعی فہیم بھائی کے
 ساتھ ایسا ظلم ہو چکا ہے؟ بہت برا ہوا یہ۔ بہت برا ہوا یہ۔“ وہ
 دکھ سے خود کلامیہ بڑبڑانے لگا۔

”اے! جوان گہر بھائی کو اس بھری جوانی میں ٹانگوں
 سے محذور دیکھ کر میں ابھی تک اس مدد سے سنبھل ہی نہیں

”یہ بدروحوں کی طرح ہمارے پیچھے پڑ جائیں گے اور کسی کام کا نہ چھوڑیں گے ہمیں۔ اسے معمولی بات سمجھنا، مستقبل قریب میں ہمایک نتائج کا سبب بن سکتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اسی وقت استاد بھابھا کے اڈے پر چلنا چاہیے۔“

کالیا اور میں نے جی کی بات پر صاف کر کے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ دی اور کام میں آکر بیٹھ گئے۔ مکان کو تالا لگا کر جی بھی چھٹی سیٹ پر آن بیٹھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد میری مہران کار ایک بار پھر سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

استاد بھابھا کے اڈے پر پہنچ کر ہم نے لیاری والی گیمپ صورت حال اس کے سامنے رکھ دی، جسے سن کر چند لمحہ استاد بھابھا جیسا آدمی بھی سکتے میں آگیا۔ پھر ہم سے کوئی بات کہنے بغیر اس نے فوراً اپنا سیل فون نکالا اور کسی کا نمبر ڈالنے کے بعد کان سے لگایا۔

”ہاں! جمالی کیا حال ہے؟ اللہ کا شکر ہے میں بھی ٹھیک ہوں، پر یار! تیرے سے ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔ ہاں کچھ ایسا ہی ہے، یار! تھوڑی تکلف کر سکتا ہے؟ میرے پاس ذرا آجا۔ ایک بوئے نازک اور خطرناک مسئلے پر تیرے سے تفصیلی بات کرنی ہے۔“ اتنا کہہ کر استاد بھابھا دوسری طرف سے اس کی منتظر بار پھر نمون بھرے لہجے میں بولا۔

”یار فاضل جمالی! بڑی مہربانی تیری۔ بس! چلا آ، جلدی، سمجھ لے کہ میں تیرا ہی بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔“

اس کے بعد استاد بھابھا نے رابطہ منقطع کر دیا۔ لیاری والے مسئلے کی ساری کھان کو بھابھا نے بڑی پر غور خاموشی سے سنا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ہماری طرح وہ بھی پریشان ہو جائے لیکن اس کی فراغ پیشانی پر اسوائے چند آنچ کی سلوٹوں۔ نمودار ہونے اور ایک گہری پرسوجھ ہمارے کے۔ کچھ بھی! خاص اظہار نہیں ہوا تھا، جس سے پتا چلتا ہو کہ مسئلے کی نزاکت نے اسے بھی ایک بڑی نظر میں جٹا کر دیا ہو۔ اس کے برعکس وہ ایک مگرانی ہوئی نظر بھی اور جھ پر ڈالنے کے بعد کالیا نے مخاطب ہو کر بولا۔

”اوئے کالے! آج پہلی بار تجھے اس قدر پریشان دیکھ رہا ہوں۔ تو تو بذاتی دار آدمی تمامیرے گردہ کا۔ لگتا ہے توئی کے ساتھ رہ کر تو بھی شریف بن گیا ہے۔“

کالیا کے لیے استاد بھابھا کا یہ تبصرہ بلاشبہ عمومی نوعیت نہ تھا جبکہ خود میں بھی کالیا کے متعلق ایسا سوچ چکا تھا اور

”یار! شریفوں کی بھی کیا زدگی ہوتی ہے۔ اپنی ہی بے بسی پر بس آنسو ہی بہا کر رہ جاتے ہیں اور دنیا تماشا دیکھتی ہے قہقہے لگاتی ہے۔ کاش کالیا! کاش تو نے مجھے بھی کالیا بننے دیا ہوتا۔ ایک شریف آدمی جب بد معاش بنتا ہے تو پھر اس سے بڑا بد معاش اور کوئی نہیں ہوتا۔ دیکھ کالیا! میری بات سن۔ اب میں جو کرنے لگا ہوں تو مجھے اس سے نہیں روکے گا۔ تیرے ساتھ رہتے ہوئے مجھے، چاہے دفاع کی حد تک ہی سہی مار کٹائی کرنا آتی تھی۔ اسلحہ بھی چلا لیتا ہوں۔ بلکہ دیکھا جائے تو فی زمانہ جس کے پاس اسلحہ اور طاقت ہے، وہی سب کچھ ہے۔ مجھے بھی ایک عدد لائسنس یافتہ پستول رکھنا چاہیے۔“

میری بات سن کر کالیا اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میرے قریب آکر بولا۔

”اے لے جگری! بڑی بات کر دی۔ تجھے نعمان ہی رہتا ہے اور بس! میں ہوں، یہ کافی ہے۔“

”میرا خیال ہے ہم اصل موضوع پر گفتگو کر لیں جس کے لیے ہم یہاں اکٹھے ہوئے ہیں، تو زیادہ بہتر رہے گا۔“

جی جو ایک طرف کرسی میں اب تک خاموش بیٹھا تھا، ہماری طرف دیکھ کر بولا اور کالیا سر ہلاتا ہوا دوبارہ اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔

”توئی جگری! سب سے پہلا کام تم نے یہ کرنا ہے کہ رانا بشیر والے معاملے کو جلد سے جلد نمٹانے کی کوشش کرو۔“

بالآخر کالیا نے کہنا شروع کیا۔ ”کیونکہ اس معاملے کو جتنا طویل دو گے، پردہ نشین گل کھلاتا رہے گا۔ فہم بھائی کو دونوں ٹانگوں سے محروم کرنے کا بدلہ تو اس پردہ نشین سے ایسا لیں گے کہ اس کی تسلیں تک یاد بھی گئیں۔ باقی رہا مسئلہ لیاری والا تو اس کے لیے ہمیں پہلے استاد بھابھا کے پاس جانا پڑے گا، یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے اور وہی کوئی بہتری کی صورت نکال سکتا ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال تھا لیکن۔“ کہتے ہوئے میں ذرا پرسوجھ انداز میں رکھا پھر بولا۔

”رانا بشیر والا معاملہ پہلے سے زیادہ تیز تر ہو چکا ہے، اسی لیے تو پردہ نشین نے بوکھلا کر اتنی بڑی بزدلی کا مظاہرہ کیا ہے کہ میرے نیچے اور شریف معصوم بھائی کو معذور کر ڈالا مگر یار کالیا! یہ لیاری والا مسئلہ زیادہ حل طلب ہے، اس سنگین مسئلے کی وجہ سے ہم سر چھپاتے رہنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ تو باقی معاملات کیسے دیکھیں گے؟“

”میرا بھی یہی خیال تھا۔“ جی نے پھر مداعت کی۔

چکے تھے۔ وہ ایک موٹی سی موٹر بائیک میں آیا تھا اور اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا تھا شاید۔ بائیک بھی لایا تھا چلا کر۔ وہ پہلے استاد بھابھا سے بڑی گرجن جی کے ساتھ بغل گیر ہوا اس کے بعد ہم سے بھی باری باری دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ ملایا۔ اس کے بعد بھابھا نے اسے اپنے سامنے دیز قالین پر بیٹھنے کا کہا۔ یاد رہے استاد بھابھا کے اڈے پر کرسی اور بیڈ نہیں ہوتے تھے، ماسوائے فرش نشست کے۔ جو ایک موٹے دیز اور قیمتی قالین پر مشتمل تھی۔ محل کے کڑائی والے خوب صورت گاؤں کے بڑے ہوتے تھے، باقی ایسے ہی وغیرہ سمیت ضرورت و آسائش کی ہر شے وہاں موجود ہوتی تھی۔

فیاض جمالی بھی ایک ایسے ہی گاؤں کے سے ٹیک لگائے بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں گولڈ لیف کا پیکٹ اور لائٹر تھا۔ موبائل بھی تھا، کھلے کا ایک پڑا بھی تھا۔ یہ سب چیزیں اس نے اپنے سامنے رکھ دیں۔

”پہلے یہ بتاؤ کیا مٹکواؤں تمہارے لیے؟ پھر آرام سے باتیں کرتے ہیں۔“ استاد بھابھا نے مسکرا کر اس سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ جس کی ضرورت ہے وہ سب میرے سامنے رکھا ہے۔“ فیاض جمالی نے بھی اسی دوستانہ مسکراہٹ سے اپنے سامنے بڑی چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو استاد بھابھا ہنس پڑا۔

”یہ بھی تم نے خوب کبھی جمالی سائیں!“ اس کے بعد اس نے وہاں موجود اپنے ایک ساتھی کو کچائے وغیرہ لانے کے لیے بھیج دیا۔

”یار جمالی! تم سے ایک بڑا ضروری کام پڑ گیا ہے۔“ بھابھا ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

”ہاں! تو بول ناں میرے یار! میں اتنی دور سے یہی جاننے کے لیے تو آیا ہوں تیرے پاس؟“

”تیری مہربانی ہے یار!“

”کوئی مہربانی نہیں۔ یہ دوستی کا فرض ہے کہ اسے تکلیف میں دیکھو تو فوراً پہنچ جاؤ، تو نے بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی کیا بھابھا!“ فیاض جمالی بولا۔ اس کے لہجے سے بھابھا کے لیے مضمونیت کے جذبات نمایاں ہوتے تھے۔

استاد بھابھا نے ایک گہرا سانس لیا پھر کالیا اور میری طرف ایک نظر ڈال کر ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے بولا۔

”یار جمالی! ایک نازک اور سنگین مسئلہ آن کھڑا ہوا ہے،

بات استاد بھابھا نے بھی محسوس کی تھی لیکن کالیا لیاری والے مسئلے سے کس وجہ سے زیادہ پریشان اور متشکر تھا یہ میں ہی جانتا تھا، آفرین تھا کہ کالیا نے مجھے تو اپنی تشویش کی اصل وجہ (جو میں ہی تھا) لیکن وہ استاد بھابھا کے سامنے چپ رہا، مگر بھابھا بھی کالیاں نکلا۔ ہنستے ہوئے بولا۔

”جانتا ہوں تجھے۔ کالیا! تو تو لیاریوں کا یار ہے اور تیری پریشانی کبھی تیری ذات کے لیے آج تک نہیں دیکھی میں نے۔“ بالآخر استاد بھابھا کے اس اعتراف پر کالیا محض اپنا سر جھٹک کر رہ گیا پھر شاید موضوع بدلنے کی غرض سے بھابھا سے بولا۔

”استاد! یہ فیاض جمالی بھی لیاری کا کوئی گینگ لیڈر ہے کیا؟“

”ہاں! مگر کچھ زیادہ بڑا نہیں ہے۔ اس کا گروپ جیسا کہ جین ڈاڈا اور بھورل سندھی کا ہے لیکن وہاں اس کی کسی کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے، نہ ہی وہ کسی کا حلیف ہے۔ اس کا اپنا مٹیاں کا ڈاڈا ہے۔ تاہم اس کی جین ڈاڈا اور بھورل سندھی سے بیٹھک اچھی ہے۔ یہ آٹھ دس گروپ ہیں، قاتل ذکر جین ڈاڈا اور بھورل سندھی کے دونوں گروپ ہیں اور دونوں ماضی میں ایک دوسرے کے جانی اور خونخوار دشمن بھی رہ چکے ہیں پھر بعد میں ایک ایم این اے کی مداخلت سے ان کی خون ریز جنگ صلح کروا کے جنگ بندی کروادی گئی، اب کوئی بھی ایک دوسرے کے معاملے میں دخل نہیں دیتا۔ اب تازہ صورت حال کیا رنگ لاتی ہے یہ تو آگے چل کر ہی بتا سکتے ہیں تاہم اگر بڑے گروپ آپس میں بھڑ جاتے ہیں تو چھوٹے گروپ ایک دوسرے کے حریف بن کر اس جنگ میں کود پڑتے ہیں۔ یہی لیاری گینگ وار کو جنم دیتی ہے۔“

استاد بھابھا نے تفصیل بیان کی اور آگے بولا۔ ”میری بھی ان سے سلام دعا ہے مگر ایک حد تک۔ میں ان کے کام بھی آیا ہوا ہوں۔ فیاض جمالی تو میرے نام کی مالا چتا ہے۔ مجھے امید ہے وہ کوئی بہتری کی صورت نکال لے گا۔“

استاد بھابھا کی باتوں سے کالیا کو ڈھارس ہوئی نہ ہوئی ہو مگر مجھے ضرور پہنچی تھی۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ لوہے کو لوہا اور لہر کو زہر کا کتا ہے۔ استاد بھابھا بھی مجھے ان جفا داری لیڈروں میں سے ایک محسوس ہو رہا تھا۔

فیاض جمالی ایک بہ مشکل کھٹنے کے اندر ہی آ گیا۔ وہ ایک پختہ عمر اور فربہ نامی شخص تھا۔ سر کے آدھے بال اڑ

میرا خیال ہے تو ہی ہماری مدد کر سکتا ہے۔“

”ہاں ہاں! بول میرے یار! کیا مسئلہ ہوا ہے؟“ جمالی بھی ایک نگاہ ہم دونوں پر ڈالتے ہوئے استاد بھابھاسے بولا تو بھابھاسے ساری رام کھانسانے لگا، تقریباً نصف گھنٹے تک ساری بات پوری تفصیل کے ساتھ فیاض جمالی کو بتا دی، جسے سن کر جمالی کا منہ حیرت و تشویش کے طے چلے تاثرات تلے کھل کر رہ گیا اور وہ انہی نظروں کے ساتھ گردن ڈراموڑے کا لیا اور میری جانب کھینکے لگا، پھر بھابھاسے کی طرف دیکھ کر بولا۔

”میں سمجھا تو اسی لیے آج لیاری کے حالات اتنے خراب ہوئے اوہ بڑی عجیب سی بات ہوئی یہ۔“

”اس سے زیادہ سنگین بھی جمالی بھائی! اب مجھے یہ بتاؤ اس کے حل کی کیا صورت حال نظر آتی ہے تمہارے ذہن میں؟“ بھابھاسے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

اتنے میں چائے اور بسکٹ وغیرہ درمیان میں رکھ دیئے گئے۔ بھابھاسے جمالی کو چائے لینے کا کہا۔ جمالی نے چائے کے کپ میں ایک بسکٹ ڈبو کر کھایا اور پھر ایک کو اٹھا کر ایک گھونٹ بھرا، پھر بولا۔

”معاملہ واقعی خطرناک اور الجھا ہوا ہے بھابھاسے! میں تجھے کسی اندھیرے میں رکھنے کی کوشش نہیں کروں گا کیونکہ یہ مسئلہ ہاتھ سے اب نکلا ہوا نظر آتا ہے۔“

”اڈے یار جمالی! تیرے لیے کیا مسئلہ ہے، تو وہ ہیں کا آدی ہے۔ ان کی بولی جانتا ہے، ان کے درمیان اشتباہ بیشتا ہے، چتا ہے مجھے کہ تیری ان سے اچھی دعا سلام بھی ہے۔ مجھے اُمید ہے تو اس مسئلے کو کھانے کی اہلیت رکھتا ہے۔“ بھابھاسے بڑے رساں آمیز لہجے میں اس سے کہا تو فیاض جمالی ایک ہلکی سی مسکراہٹ تلے بولا۔

”یار بھابھاسے! تو مجھے جانتا ہے اور میں تجھے۔ لیاری میں میری حیثیت ایسے ہی گروپ لیڈر کی سی ہے جو کسی سے پنکاہ لینے سے بھی کتراتا ہے۔ ہاں! کام میں سب کے ہی آتا ہوں اور اسی لیے میری تقریباً سبھی سے ہمتی بھی ہے۔“

”یار! اسی لیے تو تجھے چتا ہے کہ تو ایک شخص سے مزاج کا آدی اور درمیانی راہ پر چلنے والا آدی ہے۔“ بھابھاسے کہا۔

”ورنہ! اگر مجھے جنگ کرنا ہوتی تو میں۔ شانو کو جاسے بھی یہ کام لے سکتا تھا، جانے ہونا کھوجا کو۔ اچھے بھلے دنگ گینگ وار لیڈر اس کے آگے پانی بھرے ہیں حالانکہ وہ کیا چیز ہے! منشیات اور غیر قانونی اسلحے کا اسٹور ہے مگر اپنی جیب میں سب کی ”پڑیا“ رکھتا ہے۔“

”اس کے سائے سے بھی دور رہتا ہما بھابھاسے! بھابھاسے نے کان پکڑنے والے انداز میں اس سے کہا۔ ”بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ شانو کھوجا۔ یار مار۔ قسم کا آدی ہے۔ تیرا کوئی کام کرے گا اور اس کا معاوضہ منہ انکا تو لے گا ہی مگر بدلے میں تجھ سے بھی کوئی کام پڑا تو۔ وہ تجھے تیری ہی کسی کمزوری پر ہلکے میل کر کے اپنا کام بغیر پیسوں کے نکلا لے گا۔ یہی بلکہ میلنگ اس کی وہ پڑیا ہے جو وہ سب کی اپنی جیب میں رکھتا ہے۔“ فیاض جمالی نے مختصر مگر جامع لفظوں میں۔ شانو کھوج کی اصلیت، استاد بھابھاسے کے سائے گنوا دی۔“

”کچھ ایسی باتیں تو میں نے بھی اس کے متعلق سن رکھی ہیں مگر تو نے اس کی وضاحت کے ساتھ تصدیق بھی کر ڈالی۔“ بھابھاسے بولا۔ ”اب یہ مجھے بتا کہ تو اس معاملے کے سچ کیا کر سکتا ہے؟“

”کیا نام ہے ان دونوں کا؟“ جمالی نے پھر ذرا گردن گھما کر ہماری طرف دیکھا تھا۔

”کالیا اور نوی۔“ بھابھاسے بتایا۔

”دونوں کو کچھ دنوں کے لیے انڈر گراؤنڈ کر دو۔ بلکہ آج سے اور اسی وقت یہ دونوں زیر زمین چلے جائیں۔“ جمالی نے پہلا مشورہ دیا۔ بھابھاسے خاموشی سے مستفسرانہ انداز میں اس کا چہرہ مکتا رہا تاہم میں اور کالیا اس کی بات پر پریشان سے ہو گئے۔ ہماری بے چینی اور ”کسمپاٹ“ کو بھانپتے ہوئے بھابھاسے بالآخر جمالی سے کہا۔

”یار! کیا یہ ضروری ہے؟“

”ضروری؟“ جمالی اپنی بات پر زور دینے کے انداز میں بولا۔ ”بہت زیادہ ضروری ہے، نہیں جانتا تو اس وقت۔ میرا دادا اور مجھ کے رشتے داروں کا بچہ پیچہ نیفے میں نہیں، بلکہ بغل میں ٹی ٹی دبائے ان دونوں کو تلاش کر رہے ہوں گے۔“

تب ہی پہلی بار میں نے خود فیاض جمالی سے مخاطب ہو کے کہا۔

”جمالی سائیں! ہم دونوں تو انڈر گراؤنڈ چلے جائیں مگر میرا گھر بھی ہے، جہاں میرا ایک معذور بھائی اور جوان بہن رہتی ہے، ان کا واحد قیصل اور دیکھ بھال کرنے والا۔۔۔ صرف میں ہوں۔“

”ان دونوں کو۔ کسی دوسرے شہر رشتے داروں کے ہاں بھیج دو۔ یہ تو کرنا ہی پڑے گا، جب تک ان سے میری بات چیت چلتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی ان دونوں کو گولی ہی نہ ٹھوک دے۔“

جہاں نے مجھ سے کہا اور پھر بھائی کی طرف دیکھنے لگا۔
”تمہیں امید ہے کہ معاملہ خوش اسلوبی سے نہ
لے گا؟ میرا مطلب ہے کہ کتنے دن لگ جائیں گے۔“

”ابھی میں واپس جاؤں گا اور آج ہی حالات کا جائزہ
لگاؤں۔ جن ڈاڈا سے تو ابھی نہیں ملوں گا ہاں بھولر سندھی
ہلنے کے بعد ہی اس کے مشورے سے کچھ کروں گا۔ تم فکر
میں تمہیں آج رات تک کچھ نہ کچھ جواب دے دوں گا۔“
”یار! بڑی مہربانی تیری۔ یہ کام تو نے کر لیا تو سمجھ لے
ہاں کو خرید لیا۔“ استاد بھائی نے یہ کہتے ہوئے اپنے دونوں
اٹل کا بھر پور مصافحہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ دونوں آنے
نے اور قریب ہی بیٹھے تھے۔ جہاں نے بھی اسی گرجوٹی کا
اثر کرتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا اور کہا۔

”خرید تو تم نے نہیں رکھا ہے اپنی بے لوث دوستی سے
ہاں استاد! اب مجھے اجازت دے تاکہ میں اپنا آج ہی سے
م شروع کر دوں۔“ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے
لہ آیا ہوا چھوڑا بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ اس سے بولا۔
”بل بابا! گاڑی اسٹارٹ کر۔ ماں اچان تو۔ (گاڑی)
الک) اسٹارٹ کر دیں آتا ہوں۔“

اس کے جانے کے بعد۔ استاد بھائی نے ہم سے کہا۔
”پہلی فرصت میں۔ اپنے بھائی اور بہن کو وہاں سے
لے کر دوسرے شہر بھجوا دو۔ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں اور
م طرح مشعل بھی، تم دونوں کو نہ پا کر وہ جوش انتقام میں
سے پہلے گھر پر وار کریں گے۔“

”کالیا اسی وجہ سے خاصا پریشان تھا جبکہ مجھے تو اس وقت
ہی فکر لاحق ہوئی تھی جب فیاض جہاں نے مشورہ دیا تھا۔
”مگر میں ان دونوں کو کہاں اور کس شہر بھجوں؟ ہمارا ایسا
اور کا بھی رشتہ دار نہیں رہتا؟“ میں نے کہا۔
”ایڈووکیٹ زبیرہ کے ہاں بھیج دو!“ کالیا نے مجھ سے

”نہیں یار!“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”صرف بہن
کی بات ہوتی تو میں یہی کرتا مگر ایک بھائی اور وہ بھی
نہیں یار! اتنی بڑی ذمہ داری میں زبیرہ کو نہیں دے
سکتا۔“

کالیا سوچ میں پڑ گیا۔ بھائی بولا۔ ”میرے اڈے
م عورت ذات کا جو دو نہیں ہے ورنہ عاصمہ بی کو میں رکھ

”اس کا ایک حل میرے ذہن میں آتا ہے

استاد!“ کالیا اچانک بولا۔

”ایسا کرتے ہیں عاصمہ بہن کو اس وکیلہ صاحبہ کے
پاس چھوڑ آتے ہیں اور فیاض کو اصرار لے آتے ہیں۔“
کالیا کی تجویز مقبول تھی۔ ہم اسی دقت نکلنے لگے تو
بھائی نے روک لیا اور بولا۔

”بھول گئے فیاض جہاں کی بات؟ لیاری کا بچہ بچہ بغل
میں ٹی ٹی دبائے تم دونوں کے خون کی پوسٹھٹا پھر رہا ہو گا۔ اوپر
جاؤ۔ میک اپ کرو اور حلیہ بدل کے باہر نکلو۔ پھر بھی خطا
رہتا۔“ میں اور کالیا یوں ایک دوسرے کا منہ ہنسنے لگے جیسے
پریشانی نے ہماری عقل بھی ماؤف کر ڈالی ہو۔

تھوڑی دیر بعد میں اور کالیا ایک بوڑھے اور بڑھیا کا
حلیہ بنائے استاد بھائی کے اڈے سے نکل رہے تھے۔ کار میں
نے اڈے پر ہی چھوڑ دی تھی۔ ہم دونوں بائیک پر تھے۔
بائیک میں چلا رہا تھا اور کالیا بڑھیا کے روپ میں میرے پیچھے
عورتوں کی طرح دونوں ٹانگیں ایک طرف ڈالے بیٹھا تھا۔
کالیا نے احتیاطاً ایک بھرا ہوا پٹیل رکھ لیا تھا۔ میں بائیک
دوڑاتا ہوا گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

میں مین روڈ پر بائیک دوڑا رہا تھا اور میرا رخ گھر کی
جانب تھا، فیاض جہاں کی باتیں میرے دل و دماغ میں گردش
کر رہی تھیں۔ اپنے گھر کی طرف آتے وقت استاد بھائی کی
کہ ”نوی! بہت خطا ہو کر اپنے گھر کی راہ لینا۔“

یہی وجہ تھی کہ اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے میرا دل
انجانے دوسروں کی زد میں رہا۔ میں اب اپنے گھر کی
خیر خیریت کی دعائیں ہی مانگے جا رہا تھا۔ ان اندیشوں تلے
میرا دل بار بار ڈوب رہا تھا۔ ابھی تو بھائی کے معذروں نے
والے زخم بھی نہیں بھرے تھے کہ یہی مصیبت گلے پڑ گئی تھی۔

محلے میں داخل ہوا تو پریشان دل کو کچھ تسلی ہوئی۔ اگر
خدا خواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو محلے میں کھرام چا
ہوتا۔ دل میں دعائیں پڑھتا ہوا میں اپنے گھر کے قریب پہنچا
تو کالیا کے مشورے کے مطابق میں نے خورے اپنے گھر کا
رخ نہیں کیا تھا بلکہ پہلے ادھر ادھر بائیک کو مختلف چھوٹی بڑی
گلیوں میں گھماتا رہا تھا اس کے بعد جب گھر کے اطراف میں
دوروز دیک کوئی ممکنہ خطرہ یا مشکوک افراد کی نقل و حرکت سے
مطمئن ہوا تو سیدھا جا کر بائیک دروازے کے بالکل سامنے
روک دی اور نیچے اترا آیا۔

میرا حلیہ چوں کہ بدلا ہوا تھا اسی لیے محلے کا کوئی بھی
فرد مجھے پہچاننے سے قاصر تھا۔ کالیا بڑھیا کے ہمیں میں سفید

رنگ کے مثل کاک برقعہ اوڑھے ہوئے تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ نامعلوم کیوں میں اندر سے ایک کھٹک آمیز بے چینی کا بھی شکار ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر گزری۔ اندر سے آواز ابھری۔
”کک۔ کون ہے؟“

میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجادیا۔ وہ آواز عاصمہ ہی کی تھی لیکن۔ اس کا لہجہ مجھے بدلا ہوا لگا۔ یوں جیسے وہ کسی دبے دبے خوف اور سراسیمگی کی زد میں ہو۔ تب ہی ہل کے پل ذہن میں ابھرنے والے ایک فوری اور متوقع خدشے تلے میرے دماغ نے چال چلی۔

”بٹیا! کیا یہ نعمان میاں کا ہی گھر ہے؟“

مکملہ مگر انجانا سا خطرہ بھا پچتے ہی میں نے اپنی اصل آواز کی بجائے بوڑھے ضعیف اور انچھی کی آواز میں کہا۔
”نہج۔ جی ہاں! پر آپ کون؟“ اندر سے عاصمہ نے پوچھا۔ اب اس کا لڑکھڑاتا ہوا لہجہ کچھ سنہیلا ہوا تھا۔
”لہجے کی اسی لڑکھڑاہٹ نے مجھے شے میں ڈالا تھا، جس سے سراسیمگی بھی محسوس ہوتی تھی۔“

میں نے پتلی آواز میں اپنے بالکل ساتھ کھڑے کالیا سے کہا۔
”مجھے اندر گزیر لگتی ہے۔ لگتا ہے دونوں کو اندر کسی نے گن پوائنٹ پر لے رکھا ہے۔“

کالیا کے برقعہ پوش وجود میں ذرا سی بھی کوئی غیر ارادی حرکت نہ ہوئی کہ وہ اس بات سے چونکا ہو۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ وہ بھی میری طرح اندر سے ضرور بدک گیا ہوگا۔

”مکالمہ جاری رکھو۔ ٹھیک جا رہے ہو۔ بروقت عقل مندی دکھائی تم نے جگر! کہ عاصمہ بہن سے اپنے اصلی لہجے میں مخاطب نہیں ہوئے تم۔“

اس نے بھی برقعے کے اندر سے چنپی آواز میں کہا۔
”بٹیا! میں مرزا ٹھیکل ہوں۔ تاتھ تاظم آباد سے آیا ہوں۔ میری گھر والی بھی ساتھ ہے۔ مجھے نعمان میاں سے بات کرنی تھی۔“

”لیکن میں آپ کو نہیں جانتی اور بھائی جان تو اس وقت گھر پر ہیں بھی نہیں۔ آپ پھر کسی وقت آجانا۔“ اندر سے عاصمہ نے کہا۔

”ہمیں بہر صورت اندر داخل ہونا ہے۔ اسی لیے

میں۔ کوشش جاری رکھو۔“ کالیا نے ہولے سے مجھ کی۔

”اچھی بات ہے، پر دیکھو بٹیا! ہم بوڑھے ہیں۔ آئے ہیں، ہمیں نعمان میاں سے بہت ضروری ملاوہ ہمیں پہچانتا ہے۔ ہم اندر بیٹھ کر اس کا انتظار کر سکتے ہیں۔ میرے یہ کہنے کے بعد اندر تھوڑی دیر تک

طاری رہی۔ کسی خیال کے تحت میں تھوڑا اور دروازہ قریب سرک آیا اور اندر کان لگا دیے۔ جبکہ کالیا برقعہ اندر سے۔ اریب قریب نظریں ڈالے ہوئے تھا اور سارے مجھ سے بھی مخاطب رہا۔

اندر کی چند چائے طاری رہنے والی خاموشی سے محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی عاصمہ کو سرگوشیوں اور اشاروں ہدایات دے رہا ہو۔ مجھے اندر اب خطرے کا پوری احساس ہونے لگا تھا۔

”مرزا صاحب! گھر میں میرے علاوہ کوئی نہیں۔ میں بھلا دو انجان افراد کو کس طرح بیٹھا سکتی ہوں۔“

”کہو کہ ہم پھر باہر ہی کھڑے ہو کے انتظار کر رہے ہیں۔“ کالیا نے ہلکی سرگوشی میں کہا۔ پتلی بات تھی کہ اپنے مجھ سے زیادہ کالیا کا دماغ چل رہا تھا۔ جس کا فوراً فائدہ برآمد ہو گیا جب میں نے عاصمہ سے یہی کہا اور واضح سامنے کی خاطر کالیا سے یہ آواز بلند مگر کھلی کھلی آواز میں مخاطب ہو کر بولا۔

”چلو، بانو بیگم! ادھر ہی کھڑے ہو کر نعمان کا انتظار کر لیتے ہیں۔ اب اتنی دور سے آئے ہیں، ہم لے لے کر نہیں سکتے۔“

میں کالیا کی یہ چالاکی سمجھ گیا تھا، اس طرح اندر موجود ”دراغناز“ پریشان ہو سکتے تھے کہ انہیں ہمارا دروازے کے باہر کھڑے ہونا گوارا نہ ہوتا، وہ یقینی طور پر ہی انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس طرح ان کا وہ کھیل بگڑ گیا جس کے لیے وہ نجانے کس طرح اندر نقب لگا کر داخل ہو رہے تھے۔

”مم۔ میں دروازہ کھول رہی ہوں۔ مرزا صاحب آپ۔ اندر ہی آجائیں۔ اور اپنی بیگم کو بھی اندر لے آئیں۔“ دفعتاً ہی اندر سے عاصمہ کی آواز ابھری تھی۔
دراغنازوں کے لیے یہ زیادہ آسان تھا کہ ہم باہر کھڑے ہو کر کے بجائے اندر بلا کر قابو میں رکھتے۔



جینز ڈائجسٹ

ایک ادارہ، چار ماہانہ مطبوعات



جاسوسی ڈائجسٹ سانس ڈائجسٹ ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
مالی اسب سے شہکار کہانیوں، انشائیوں اور مطبوعات کے خزانوں کا انتخاب
جنہیں ہر پڑا نظم کے لاکھوں تارکینِ ادب و عشق سے پڑتے ہیں



جہاں جہاں اردو پڑھی اور نگھی جاتی ہے وہاں یہ رسائل باقاعدگی سے پہنچتے ہیں
C-63 نیز نو ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کو رنگی روڈ کراچی

فون نمبر: 35804200, 35802552 (92-21) فیکس: 35802551 (92-21) ای میل: up@hotmail.com

ہم دونوں غماخ اور سب سے پہلے کالیا آگے بڑھا تھا جب میں نے جواب عاصمہ سے یہ کہا۔
 ”جتنی تر ہو بیٹا! ہم بہت تھکے ہوئے تھے درنہ زحمت نہ دیتے۔“

اسی وقت دروازے کا ایک پٹ کھلا۔ خطرہ کسی بھی وقت دار کرنے والا تھا۔ ہم بھی غماخ تھے۔ مجھے سامنے عاصمہ کا چہرہ نظر آیا جہاں میری بھانپتی ہوئی پہلی ہی نگاہ نے۔ سراپتنگی اور خوف کو تازہ کیا تھا۔

کالیا بوڑھی عورتوں کی طرح سر جھکائے فوراً اندر داخل ہوا تھا اور اس کے پیچھے میں۔ وہی ہوا۔ خطرے کی بوس گھنٹے سو گھنٹے۔ ایک بھیڑیئے جیسی غراہٹ سے مشابہ آواز میرے دائیں جانب سے ابھری تھی۔

”خبردار! آواز نکالی تو گولی باردوں گا۔“ میں نے چونکے اور خوف زدہ ہونے کی بھرپور ایکٹنگ کی تھی جبکہ کالیا نے تو اداکاری کی انتہا کر دی۔ وہ ایک ہاتھ اپنے تھپے پر مار کر شش کھائے گر پڑا۔ درانداز، جن کی تعداد دوسری۔ ان کے ہاتھوں میں ٹی ٹی بی پٹیلیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ دائیں بائیں سے اچانک ہی ابھر کر ہمارے سامنے آ گئے تھے اور ایک نے پھرتی سے دروازہ بند کر دیا تھا۔ میری بھانپتی ہوئی چست نظروں نے مل کے مل ان دونوں کا جائزہ لیا تو ایک نسبتاً پکی عمر والے شخص کو پہچان کر میرے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ میرا داد تھا، وہی میرا داد جسے آج صبح ہی میں نے ڈاڈا کے اڈے پر آگ بگولا حالت میں دیکھا تھا۔ باقی اس کا ساسی اور وہ خود اپنے ”ٹیچیکل“ صلیبے اور شکل و صورت سے لیاری کے ہی معلوم ہوتے تھے۔ انداز و اطوار میں چھٹے ہوئے اور سفاکی میں بھیڑیئے جیسے دکھتے تھے۔

”اڑے او۔ شکرو! تم اس مصیبت کو سنبھالو۔ میں اس بڑھے کو دیکھتا ہوں۔“

میرا دانے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”بڑھا“ میں تھا اور ”مصیبت“ کا اشارہ کالیا کی طرف تھا جو صحن کے فرش پر شل کاک والے برقعے سمیت فرش پر ڈھیر ہو گیا تھا، یہ ظاہر وہ اڑا تر جمہا ہی پڑا تھا مگر میں سمجھتا تھا کہ وہ ان دونوں پر بیک وقت حملے کی پوزیشنیں بنا چکا ہوگا۔

”لگ۔ لگ۔ کیا یہاں۔ ڈڈ۔ ڈیکیتی کی واردات ہو رہی ہے؟

میں نے ایک عام سے آدمی کے روپ میں ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کی پوری ایکٹنگ کی۔

”بکواس بند کرو۔“ بائیں جانب والے نے درشت لہجے میں مجھے جھڑکا جبکہ دائیں جانب والا فوراً ہی آگے بڑھ کر کالیا کو دوپٹے کے لیے لپکا تھا۔ میں نے ساتھ والے کو مزید باتوں میں مشغول رکھنے کے لیے کہا۔

”ارے بھائی! ہم بے قصور ہیں۔ بڑھے ہیں۔ ہمیں جانے دو۔ تم بے شک یہاں۔“ میرا جملہ پورا نہیں ہوا تھا اور مجھے وہ بازو سے پکڑ کر ایک کمرے میں لے آیا، ساتھ ہی اس نے ڈری سبھی کھڑی عاصمہ کو بھی گھورتے ہوئے خونخوار انداز میں اندر کمرے میں چلے آنے کا کہا تھا۔ لہذا ہمارے پیچھے عاصمہ اندر چلی آئی تھی اور کمرے کے ایک طرف کونے میں جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس بے چاری کا چہرہ ڈر و دہشت کے مارے پیلا پڑا جا رہا تھا اور میرا اس نہیں چل رہا تھا کہ بہن کو تسلی دیتا۔

”بھنا! فکر مت کر تیرا بھائی آ گیا ہے۔“ مگر میں ابھی فہم یا اس سے ایسا کچھ نہیں کہہ سکتا تھا ورنہ ہمارا بھانڈا پھوٹ جاتا۔

کمرے میں ان کا ایک اور پستول بدست ساتھی بھی پہلے سے موجود تھا۔ وہ فہم کے بیڈ کے سر ہانے ہی اس کی طرف پستول کیے چوک کھڑا تھا۔ بستر پر دراز فہم بے چارہ۔ خاصا پریشان اور دہشت زدہ نظر آ رہا تھا۔ نقاہت سے پہلے ہی اس کا رنگ پیلا پڑا ہوا تھا خوف نے مزید زرد کر ڈالا تھا۔ تاہم ایک انجینی بوڑھے (مجھے) کو دیکھ کر لکھ بھڑکواس کے چہرے پر انجمن کے آثار نمودار ہوئے تھے۔

”اڑے داول سائیں! کیسے بڑھے کو اندر لے آئے ہو؟ یہ ہمارا شکار تھوڑی ہے۔“ اسی تیسرے ساتھی نے میرا داد سے کہا۔

”شکار تو نہیں ہے پر یہ بڑھا اور بڈھی ہمارا کام بگاڑ سکتے تھے۔“ میرا دانے کہا۔ ”اصل شکار کے آنے تک یہ بھی ادھر ہی بند رہیں گے۔“

”لیکن ہم کب تک اور کتنے لوگوں کو... یہاں جمع کرتے رہیں گے؟“ اس کے دوسرے ساتھی نے میری طرف دیکھتے ہوئے اس سے کہا۔

”مجبوری ہے، یہ دونوں ڈھیٹ تھے، اس چھو کر نے بہانہ بھی کیا تھا مگر یہ باہر۔“

اس کی آواز صحن میں ہی انگ مٹی۔ کیونکہ اسی وقت باہر صحن میں عجیب سی آواز ابھری تھی، جیسے کوئی اٹھان پٹان بچ مٹی ہو۔ مجھ سمیت یہ دونوں بھی چو کئے تھے۔

نمکین غزل

سوئی چھ جائے تو نیزے کی آئی کہتے ہیں
اسے محبوب کی نازک بدنی کہتے ہیں
آنکھ میں ان کی جو کنکر بھی بھی پڑ جائے
اپنے اوپر وہ اسے سنگ زنی کہتے ہیں
کوئی کھسیانی نہیں ہنس کے اگر چہ ہو جائے
ایسی خاموشی کو اب کم سخی کہتے ہیں
کون شوہر ہے جسے خوف نہ ہو بیوی کا؟
سبھی اس شہد کی ممی کو ہنی کہتے ہیں!
ڈال کر لوگ یہاں اونٹ کے منہ میں زیرہ
فخر سے خود کو غنی ابن غنی کہتے ہیں!
اُن پہ تنقید اگر ہو تو نہ جانے کیا ہو
رائے دینے کو جو ہمت کھنی کہتے ہیں
لٹنے والے کو کہا جاتا ہے کم عقل یہاں
لوٹنے والے کو قسمت کا دھنی کہتے ہیں!
چھوڑ کر ملک، سیاست کی زباں میں راہی
عیش کرنے کو غریب الوطنی کہتے ہیں!

عظیم راہی

کے سلسلے میں کسی کشش کا شکار رہے ہوں گے۔ میں درحقیقت
کالیا کی ممکنہ مدد کے لیے ہی باہر مچن کی طرف لپکا تھا۔

کیا دیکھتا ہوں، شکر اور بابن نامی دونوں ”دراغدا“
مچن کے فرش پر ڈھیر پڑے تھے۔ جبکہ میرداد سے کالیا زور
آزمائی میں مصروف تھا۔ پستول ابھی تک میرداد کے ہاتھ میں
تھا جبکہ کالیا نے اس کا وہی ہاتھ مروڑ رکھا تھا۔ دونوں ایک
دوسرے کے ساتھ الجھے ہوئے تھے مگر کالیا کی گرفت مجھے کمزور
پڑتی نظر آ رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے میرداد نے وحشیانہ غراہٹ
کے ساتھ ایک جھکا دی اور کالیا کو دھو بیٹے کے انداز کا داؤ
لگا، کالیا اچھل کر دو قدم پیچھے کھڑکھڑا گیا اور مزید بد قسمتی یہ
ہوئی کہ فرش پر اٹنا نقل پڑے اس کے ساتھیوں کے جسم سے
اس کے پاؤں ٹکرائے تو وہ منہ پھینکنے کی کوشش کے باوصف۔ الٹ
کر پشت کے بل گر پڑا۔

میرداد کے ہاتھ میں ہنوز پستول نظر آ رہا تھا اور یہی وہ
وقت تھا جب وہ مجھ پر یا کالیا پر گولی چلانے کا ارادہ کر رہا تھا
کہ نبجانے میرے اندر کیا ایک اتنا جوش کہاں سے عود آیا تھا یا
پھر ”تیار موت“، ”کوسا منے دیکھ کر بٹا کا جذبہ ایک انوکھی طاقت
بن گیا تھا کہ میں نے اپنی جگہ سے تیزی کے ساتھ حرکت کی اور

”اڑے بابن! کیا معاملہ ہے باہر؟ کہیں شکر و نے اس
بڑھیا سے پنگا تو نہیں لے لیا؟“ میرداد نے سامنے سے کہا اور
وہ بابن نامی اس کا دوسرا سامنے پستول لیے کمرے سے نکلتا چلا
گیا۔ میں جان چکا تھا کہ کالیا نے بڑھیا کے روپ میں کوئی کل
کھلا لیا ہے۔ میرداد نے میرا بازو چھوڑ دیا اور تھکمانہ درشتی سے
بولاً۔

”ادھر بیٹھا رہ چکے۔ ذرا بھی آواز نکالی یا کوئی گڑبڑ
کی تو۔“ ایک بار پھر اس کا جملہ ادھر راہ گیا مگر مجھے حیرت ہوئی
تھی۔ کیونکہ پہلے کی طرح اس بار باہر مچن میں کوئی ایسی ذرا بھی
آواز نہیں ابھری تھی جو اسے چونکانے کا سبب بنتی لیکن۔ یہ
کیوں ایک دم خاموش ہو گیا تھا۔

”اڑے کیا ہو رہا ہے وہاں؟ تم دونوں ایک دم خاموش
کیوں ہو گئے ہو؟“ اب میرا دل جیسے سائیں سائیں کرتی
کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا۔ لگتا تھا کالیا نے دونوں کو ای چالاکی اور
دھوکے سے باری باری گولی چلانے کا ریسک لیے بغیر ہی
”اٹنا نقل“ کر دیا ہے اور اب میرداد کی باری تھی۔

”او۔“ خبردار جو ادھر سے بلے بھی اور تم۔“ وہ مجھے
تہدید کرنے کے بعد بیڈ پر تین دراز فیم کو بھی آخر میں دھمکاتے
ہوئے بولا۔ ”ہوشیار بننے کی کوشش مت کرنا اور تم بھی یہاں
سے مت ہلنا چھو کر!“ اس بد بخت نے آخر میں عاصمہ کو بھی
دھمکایا۔

میرداد کو یقینی طور پر معلوم ہو گیا تھا کہ فیم دونوں ٹانگوں
سے محذور تھا جبکہ میں تو پہلے ہی ”بوڑھا“ تھا اور بوڑھا تو ہوتا
ہی ”کمزور“ ہے، یہی سوچ کر وہ ہمیں محض دھمکانے سے کام
چلا کر باہر کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے کمرے سے
نکلتا چلا گیا تو کمرے سے نکلنے ہی میں نے عاصمہ بہنا اور
ہماری فیم سے اپنی اصل آواز اور سرگوشی میں اڑا پوٹلی کہا۔

”بہنا! بھائی! یہ میں ہوں، نوی، باہر بڑھیا کے روپ
میں میرا سامنے کالیا ہے، گھبرانے کی ضرورت نہیں اٹنا اللہ سب
لنیک ہو جائے گا۔“ میری بات سن کر اور آواز پہچانتے ہی ان
دونوں کے چہروں پہ پہلے حیرت اور پھر خوشی کے آچار ابھرے
تھے، ٹھیک اسی وقت ایک بار پھر میری سنسنی ہوئی سماعتوں
میں۔ کھڑکی بجائے اس بار کسی کی کراہتی آواز ابھری، یہی
وہ وقت تھا جب میں پھرئی سے دروازے کی طرف لپکا تھا۔
ایک بظاہر جھکی ہوئی کمر والے ضعیف بڑھے کو اس طرح کی
پھرئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھ کر یہی فیم پر جبروتوں کے
پہاڑ ٹوٹے ہوں گے، تاہم وہ دونوں شاید ہنوز مجھے پہچاننے

اجل کر اس پر جا پڑا، یوں کہ اس کے پتول والے ہاتھ کی کلائی پر میرا مکہ بڑے زور سے پڑا ڈیل ڈول میں ہم بدامریبی تھے۔ البتہ اس کا جسم میرے مقابلے میں ذرا کسرتی تھا۔ منکے کی ضرب سے پتول تو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا تھا مگر میں اس کے ساتھ لپٹ گیا۔ اس نے غرا کر میرے پیٹ پر لات رسید کر دی جو خامی زور اور ثابت ہوئی۔ میرے حلق سے چیخ سی خارج ہوئی اور میں الٹ کر پیچھے جا کر، وہ پتول اٹھانے کے لیے تیزی سے آگے بڑھا مگر میں نے بھی اپنے ہوش و حواس متل نہیں ہونے دیئے تھے اور اپنی ایک ٹانگ اس کی ٹانگوں کے بیچ لے آیا۔ وہ منہ کے بل گرنے لگا مگر کمال مہارت و پھرتی کے ساتھ خود کو بچا گیا اور دوبارہ پتول اٹھانے کے لیے جھکا۔ اسی وقت کالیا نے اس پر چھلانگ لگا دی تھی اور وہ اسے رکیدتا ہوا فرش پر میرے بالکل قریب ہی گرا تھا۔ اس طرح کہ میرا داکچہ بالکل میرے قریب تھا، میں نے آؤ دیکھنا تاؤ اپنے سر کی ایک زوردار ٹکر اس کی ناک پر رسید کر دی۔ اس کے حلق سے چیخ خارج ہوئی، میں رکنا نہیں اور دوسری ٹکر بھی ماری۔ ایک جوتی جوتی جیسی کیفیات طاری ہونے لگی تھیں مجھ میں۔ میرا دانے اپنی ٹانگ کا ایک ٹھٹھا سیکڑ کر میرے پیٹ میں رسید کرنا چاہا تھا مگر میں پہلے ہی اس کی یہ حرکت بھانپ کر فوراً سے جوتی پیچھے کی جانب لڑھکتی کھا گیا تھا۔ اس کا دار خالی جانے تک کالیا اس پر حاوی ہو چکا تھا کیونکہ وہ میرا دے دوبارہ دودو بھڑنے کی بجائے اس کے پتول پر قبضہ بجا چکا تھا۔

”بس میرا داکھیل ختم۔ شرافت سے اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔“ اس نے شعلہ انگشتی نظروں سے میرا داکھور تے ہوئے پُر غیظ آواز میں کہا اور ساتھ ہی مجھ سے بولا۔

”تو ٹھیک ہے مگر کی؟“

جواب میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم زندہ نہیں بچ سکتے کالیا! اور نہ ہی تمہارا یہ ساتھی۔“

میرا داکھیلے ہوئے خوشوار لہجے میں کالیا سے بولا تو میں نے دیکھا کالیا اس کی دھمکی سے ذرا بھی خائف ہوئے بغیر اسی لہجے میں بولا۔

”کسی ٹھنڈ میں مت رہنا میرا داکھ! تم لوگوں نے خود اس خون ریز جنگ کی ابتدا کی ہے اور ہم نے اب تک جو کیا وہ اپنے دفاع کی حد تک کیا لیکن اب ایسا نہیں ہوگا، اینٹ کا جواب اب پتھر سے دیا جائے گا۔“

”تم بھی کسی بھول میں مت رہنا کالیا!“ میرا داکھرا کر

اس سے بولا۔ ”ہمارے تین آدمیوں کو تم مار چکے ہو، کتنوں مارو گے تم؟ میرے پیچھے ساتھیوں کی پوری فوج ہے۔“ اس کے لہجے میں غرور تھا، وہ گا ہے بیگا ہے میری جانب بھی کھور دیکھ لیتا تھا۔ تب ہی میں نے بھی بلا خوف اس سے مخاطب کے کہا۔

”میرا داکھ! ہماری تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ نہ تو ہم تم لوگوں کو جانتے ہیں لیکن یاد رکھنا، تمہا ہم بھی نہیں مگر ساتھیوں کی فوج پالنے کی بجائے ہم چند ایسے ساتھی ضرور رکھتے ہیں جو دس پر ہماری ہوتے ہیں، رعنی بات تمہارے پہلے ساتھی جو کی ہلاکت کی تو اس نے ایک شرمناک جرم کیا تھا۔ میری بہن کو اغوا کیا تھا اس نے روپوں کے لالچ میں۔ اور ہم نے اس کی گرفت سے بہن کو چھڑا لیا تھا بغیر کسی جان لے لے ہوتا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم اس کا بدلہ مجھ سے لیتے مگر ہم نے بات نہیں ختم کر دی۔ لیکن مجھ پھر بھی باز نہیں آیا اور جس سے اس نے اس کھٹیا کام کے لیے پیسے لیے تھے وہ خود جو کی جان دشمن بن گیا تھا اور اس نے اپنے روپوں کی واپسی کا تقاضا کیا، مجھ پھنس گیا، آخر اس نے اسی آدمی (سیٹھ ستار) کے کہنے میرے ساتھی کالیا کو یہ غمال بنانا چاہا تو وہ مارا گیا۔ اب تم جو بتاؤ کہ تمہیں اس سارے معاملے میں کسی دشمنی کا رنگ نظر ہے یا لالچ۔“

میں نے سنجیدہ اور مستحکم لہجے میں اسے حقائق بتا دیئے اور ذرا توقف کے بعد دوبارہ اس سے بولا۔

”ہم خون خراب نہیں چاہتے۔ اگر پھر بھی تم ہم پر جنگ مسلط کرنا چاہتے ہو تو، تمہاری مرضی۔ چوڑیاں ہم نے بھی نہیں پہنی ہوئی ہیں۔“

”مجھے علم ہو چکا ہے ان ساری باتوں کا۔“ میرا داکھ کہا۔ ”ایسی بات تھی تو تمہیں ہم سے رابطہ کرنا چاہیے تھا۔“ اس کی ڈھٹائی پر مجھے غصہ آ گیا۔ کالیا نے بولنا چاہا تو میں نے اسے خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور اس سے بولا۔

”ہمیں کیا معلوم کہ مجھ کو کون تھا اور اس کے سر پرست کون تھے؟ نہ ہی ہمارا پہلے کسی اس سے ایسا کوئی واسطہ پڑا تھا۔ صاف اور اصولی بات ہے۔ اس نے ایک جرم کیا اور اس کی اسے سزا مل گئی۔ بس۔ بات سمجھ میں آئی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ ہم بھی میدان میں اترے ہوئے ہیں، ہر چوٹ کا سودے ساتھ جواب دیں گے ہم بھی۔“ میرے خم شوٹ کر کہنے والے الفاظ نے میرا داکھ خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے کالیا سے کہا۔

”کالیا! ان لوگوں کو جانے دے لیکن اگر انہوں نے پھر کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو ان کے علاقے میں جا کر ان سے بدلہ چکا نہیں گے۔ جنگ تو جنگ سہی۔ ڈرنے والے ہم بھی نہیں۔“

”اے لے جگری! یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟“ کالیا میری طرف حیرت سے دیکھتا ہوا بولا۔ ”انہیں کیسے زندہ چھوڑ دیں۔ انہوں نے ہمارے گھر میں گھس کر ہم پر قحطانہ حملہ کیا ہے۔ ہر گز نہیں۔ میں ان کو۔۔۔۔۔“

”کالیا!“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس سے پہلے ہماری ان سے آنے والی باتیں نہیں ہوئی تھی مگر آج ہو چکی ہے۔ لیاری میں ہمارے بھی تعلقات ہیں۔ ہم انہی کے ذریعے سے ہی میرا داد اور اس کے دونوں ساتھیوں کو حوالے کریں گے۔ اگر اس کے بعد بھی ہمارے ساتھ کچھ برا ہوا تو یہی آدمی سب سے پہلے ہمارا ٹارگٹ ہوگا۔“ میں نے میرا داد کی طرف اشارہ کیا۔

حالات معمول پر آتے محسوس کر کے عاصمہ بھی ڈرتے ڈرتے کمرے سے باہر نکل آئی تھی مگر میں نے عاصمہ کو اندر جانے کا کہا تو وہ پلٹ گئی۔

کالیا نے سب سے پہلے میرا داد کو رن بسٹ کیا اس کے بعد ہم دونوں نے مل کر اس کے دونوں بے سدھ پڑے ساتھیوں کے بھی ہاتھ پاؤں باندھ دیئے اور پھر تینوں کو کھینچ کر دوسرے کمرے میں لے گئے اور بند کر دیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر کالیا اور میں نے پہلے اپنا ریڑی میڈ میک اپ صاف کیا تو فہیم اور عاصمہ ہمیں پوری طرح پہچاننے کے قابل ہوئے مگر وہ انہیں سلی دی اور کہا کہ انہوں نے ڈرے ہوئے تھے، ہم نے انہیں سلی دی اور کہا کہ انہوں نے ہمارے ساتھ چلنا ہے۔ وہ دونوں بے چارے حریف خوف زدہ ہو گئے مگر کالیا اور میں نے انہیں تسلیاں دیں کہ بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں وغیرہ۔

اس کے بعد ہم نے وہی کیا جس کی ہم پہلے سے حکمت عملی تیار کر کے آئے تھے۔ یعنی عاصمہ اور فہیم بھائی کو کار میں اپنے ساتھ سوار کرا کے سب سے پہلے ایڈووکیٹ زئیرہ کے ہاں پہنچے، وہ تو گھر پر نہیں تھی، البتہ خالہ بچو کے پاس ہم نے عاصمہ کو چھوڑ دیا اور واپسی میں فہیم کو لے کر استاد بھابھا کے اڈے پر پہنچے۔ اس دوران میں نے عاصمہ اور فہیم کو موجودہ صورت حال... کی عکسفی کے بارے میں بتا دیا تھا۔

اڈے پر پہنچتے ہی میں نے ایڈووکیٹ زئیرہ سے فون پر

رابطہ کر کے اسے بھی مختصر صورت حال بتائی اور عاصمہ کے بارے میں بتایا کہ وہ اب کچھ روز اسی کے پاس رہے گی زئیرہ کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا مگر وہ بھی اس بی بی بیٹائی۔ فکر مند ہو گئی تھی۔ باقی کی تفصیل بعد میں بتانے کا کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا اور استاد بھابھا کو ساری بات بتادی۔

”میں ابھی فیاض بھائی سے بات کرتا ہوں۔“ وہ اے کرتے کی جیب سے فون نکالتے ہوئے بولا۔

”نہیں استاد!“ معاہدے کا لیا نے منع کرتے ہوئے بھابھا سے کہا۔ ”فیاض بھائی ابھی تو یہاں سے گیا ہے، اسے ابھی اپنا کام کرنے دیں۔ ہمیں پہلے بھجن ڈاڈا سے بات کر پڑے گی۔ اس سے بھی ہماری اچھی خاصی سوجھ بوجھ ہو چکی ہے لیکن پہلے جینگو سے بات کرنا ہوگی نہیں۔ اس سلسلے میں۔۔۔“

کالیا کارا نے نما مشورہ ہمیں مناسب لگا تو بھابھا کی اجازت سے اس نے اسی وقت جینگو سے رابطہ کیا اور اس سے آج کے تازہ واقعے کے بارے میں بتا ڈالا۔ جینگو نے گویا چھوٹے ہی کالیا کے اس عمل کی تعریف کر دی اور کہا۔

”یہ تم نے بہت اچھا کیا کہ میرا داد وغیرہ کو اس حملے کے باوجود کوئی جسمانی نقصان نہیں پہنچایا۔ صلح کی طرف۔۔۔ یہ بھی تمہارا ایک اچھا اقدام سمجھا جائے گا۔“

”لیکن جینگو! ایسا نہ ہو کہ ہماری صلح کی روش کو وہ لوگ ہماری کوئی کمزوری سمجھ لیں۔“ کالیا نے فوراً کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن۔۔۔ یہ کر کے دیکھ لو مگر آئندہ ایسی کوئی حرکت ہمارے ساتھ دوبارہ کی گئی تو میں کسی کو نہیں بخشوں گا۔“

کالیا کا لہجہ اٹل تھا۔

”تم فکر نہ کرو اور مجھے چند منٹ دو۔“ جینگو نے کہا۔ کالیا نے سہل کا وائیٹ اسپیکر آن کر رکھا تھا تاکہ ہم بھی اس کے اور جینگو کے درمیان میں ہونے والی گفتگو کو سن سکیں۔

”ٹھیک ہے بھجن ڈاڈا اسے ابھی بات کرو۔ وہ اب اس سلسلے میں کیا کہتا ہے، پھر مجھے بتاؤ۔“ یہ کہہ کر کالیا نے رابطہ منقطع کر دیا۔

”میرا خیال ہے کہ اب اس تازہ واقعے کے بارے میں فیاض بھائی کو بھی آگاہ کر دیا جائے۔“ استاد بھابھا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھی کہ اب ہم اس سلسلے میں کیا کرنا چاہتے ہیں۔“

اس کی بات سن کر کالیا نے کچھ سوچ کر اپنے سر کو ہاتھ جینش دی اور بھابھا نے اپنے سہل فون پر بالآخر فیاض بھائی سے رابطہ کر کے آج والے واقعے کے بارے میں اسے بتا دیا۔

تھا ورنہ اگر تم انہیں کوئی جانی نقصان پہنچا دیتے تو دشمنی کی یہ آگ مزید بھڑک سکتی تھی، اب کم از کم اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ اس میں کچھ کی آجائے گی اور لاری میں موجود ہمارے ہی خواہ بھی ہمارا اچھا اور خاطر خواہ دفاع کریں گے، ان پر بھی ہمارا اچھا اثر پڑے گا۔“ استاد بھابھانے جب تو صلی لہجے میں کالیا سے کہا تو وہ معنی خیز انداز میں میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”استاد! یہ میرا کمال نہیں اسنے اس یار دول دار۔ نوی کا کمال ہے ورنہ میں تو ان تینوں سالوں کو ادھر پہنچانے کا کیا ارادہ کر چکا تھا۔ میں دشمنوں کو اسی طرح کا جواب دینے کا قائل ہوں۔ اس طرح کی صلح صفائیوں کو تو میں کمزوری سمجھتا ہوں جس سے دشمن اور اڑتے ہیں۔“

”اوہ۔ اچھا!“ بھابھانے حیرت اور متاثر کن انداز میں اپنی بھونٹیں اچکا کر میری طرف دیکھا تھا۔ ”پھر مجھے یقین ہے کہ یہ معاملہ آگے نہیں بڑھے گا، اسے ادھر ہی بریک لگ جائے گی۔“

”انشا اللہ ایسا ہی ہوگا۔“

☆.....☆

ہم اپنا کام کر چکے تھے، مگر کو خالی چھوڑنا بھی درست نہ تھا۔ میں نے گھر پر ہی رہنے کا ارادہ کیا تھا اور کالیا بھی بعد اصرار میرے ساتھ تھا۔ حالانکہ میں نے اسے منع کیا تھا۔ اس نے یہی کہا تھا کہ جب میں کام پر نکلوں تو وہ بھی اپنے کام سے نکل جایا کرے گا اور پھر میرے لوٹنے پر وہ بھی آ جایا کرے گا۔ میں چپ ہو رہا تھا۔

میری خواہش کے مطابق کالیا نے میرے لیے آرم لائنس بننے کے لیے دے دیا تھا۔ میں خود اس کے ساتھ متعلقہ آفس گیا تھا۔

بہر طور میں اب دوسرے معاملات کی طرف متوجہ ہوا اور اڑے کا رخ کیا۔ وہاں چاچا انور شاہ میری وجہ سے فکر مند ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے ایک چونکا دینے والی اطلاع سنا کی۔ ”بدرخوار نوی! حاجی مہران خان آیا تھا تم سے ملنے کے لیے۔“

لینڈ مافیا کی چیفس کے ایک ”بڑے“ کی اڑے پر آمد اور مجھ سے ملنے کی حالی کی یہ اطلاع میرے لیے چونکا دینے والی تھی اور غیر معمولی بھی ہل کے ہل مجھے ایک اور جنگ کی بو محسوس ہونے لگی تھی۔

(جاری ہے)

حسب توقع اس نے بھی اسے اچھی پیش رفت قرار دیا کہ ہم نے ان کے حملے کے باوجود انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور اس کے برعکس انہیں آزاد کرنے کا بھی ارادہ کیے ہوئے ہیں۔ ہم وہیں بیٹھے اسی مسئلے سے متعلق باتیں کرتے رہے تھے کہ تھوڑی دیر بعد کالیا کو جینکو کی کال موصول ہوئی۔

”جین ڈاڈا سے میں نے بات کر لی ہے۔ وہ اپنے آدمی بھیج رہا ہے تمہارے گھر مجھے پتا بتا دو۔“

”اس نے کہا کیا ہے؟ پہلے یہ تو بتاؤ؟“ کالیا نے فوری طور پر اسے کوئی جواب دینے کے بجائے پوچھا تو جینکو بولا۔

”اس نے بھی وہی بات کی ہے کہ یہ ہمارا ایک اچھا فیصلہ ہے مگر ابھی سے اس کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ میرا دادا کا گروپ ایک دم صلہ پر آباد ہو جائے گا، ہاں البتہ اس طرح صلح کی جانب اچھی پیش رفت کی امید ضرور کی جاسکتی ہے۔“

”وہ ہم سے صلہ کریں یا نہ کریں لیکن ایسا چکی اور آخری بار ہی ہوگا۔ اس کے بعد ہم بھی ایف کا جواب پتھر سے دیں گے۔“ کالیا نے کہا۔

”ہاں! ہاں یار کالیا! میں نے جین ڈاڈا سے ساری بات کہہ ڈالی ہے۔“

”بس تو پھر ٹھیک ہے، جین ڈاڈا سے کہہ دو، اپنے آدمی بھیج دے میں پتا بتاتا ہوں لیکن ذرا ہولٹہ کرو۔“

کالیا نے بھابھا اور مجھ سے مشورہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ میرا دادا اور اس کے دونوں ساتھیوں کو صفورا والے مکان میں لے جاتے ہیں اور وہیں کا پتا بھی بتا دیتے ہیں۔

”نہیں۔“ بھابھانے کالیا کے مشورے کو رد کرتے ہوئے کہا۔ ”تم ان تینوں کو ادھر ادھر لے جانے کا رسک نہ ہی لو تو اچھا ہے۔ یہ معاملہ جلد سے جلد منٹ جائے اتنا ہی بہتر ہے، جینکو کو بخان کے گھر کا ہی پتا بتا دو۔“

اس کے بعد کالیا نے میرے گھر کا پتا اسے بتا دیا اور وقت بھی۔

اور پھر۔ استاد بھابھانے ہی مشورے سے ہمیں جانے کی بجائے۔ اس نے اپنے دو آدمیوں کو میرے گھر روانہ کر دیا تاکہ میرا دادا وغیرہ کو جین ڈاڈا کے آدمیوں کے حوالے کیا جاسکے۔ میں نے بھابھانے ان مذکورہ دو آدمیوں کو اپنے گھر کی چابی دے دی۔ وہ روانہ ہو گئے۔

اگلے چند گھنٹوں کے اندر اندر یہ معاملہ بھی بہ خوبی منشا دیا گیا اور ہم نے قدرے سکون کی سانس لی تھی۔

”کالیا! مان گئے تھے۔ تم نے بروقت یہ اچھا فیصلہ کیا

(نزاہت افشار فتح جنگ کا جواب)

گفتہ یاسین..... کراچی

یہ سب دکھاوے کی ہے ٹیپ ٹاپ در نہ تریف
کرید کر جسے دیکھو گے کھوکھلا ہوگا

احمد علی..... پشاور

یاد محبوب میں آنکھوں سے ٹپکتا ہوا لہو
دل میں ہو سوزش ہیہم تو غزل ہوتی ہے
خوش بخت..... بمبئی

یوں تو جیسی بھی پلا سا کی رہے اتنا خیال
دور سے آئے ہیں سن کے ترے میٹانے کا نام

سید حسان..... خانیوال

یہ تصویر جہاں بے رنگ ہوگی
ہمارا خون اگر شامل نہ ہوگا

(عبدالکیم شمر کراچی کا جواب)

ناہید سلطانہ..... پشاور

یوں ہی کھا گئے ہیں ہم دم کبھی ہم فریب منزل
کبھی ہم نکل گئے ہیں روہ عشق میں سنبھل کر

عطا محمد..... عمان سعودی عرب

یہ بھی ایک کرشمہ ہے ان حسین یادوں کا
دارغ دل چیتے ہیں پھر بھی گھپ اندھیرا ہے

محمد اسلام بھٹو..... لاڑکانہ

یہ ہی تو فلسفہ ہے ارتقاء کا
حقیقت بن گئی رنگین فسانہ

(رفیق احمد ناز ڈی جی خان کا جواب)

راہیل پراچہ..... کراچی

اک ذرا سی بات پہ میں نے سکھ کا درپن توڑ دیا
اب وہ ذرا سی بات نہ پوچھو چھوٹی بات بڑھانے کون

احمد علی..... ساکنہ

آکھ سے گر کر اک آنسو نے
جانے کہاں تک بات بڑھا دی

انجم الدین..... کراچی

اسی کھنڈر میں کہیں کچھ دیے ہیں ٹوٹے ہوئے
انہیں سے کام چلاؤ بڑی اداس ہے رات
اکبر حیات..... لاہور

اف ری مجبوریاں محبت کی
ہونٹ خنداں ہے آکھ پُر نم ہے
(رضا احمد اعوان دریا خان کا جواب)

عبدالستار..... ساہیوال

دشت میں ہر ایک نقشہ الٹا نظر آتا ہے
مجھوں نظر آتی ہے لیلیا نظر آتا ہے
(نیلو فرساہن اسلام آباد کا جواب)

شبیر حسن..... سرگودھا

اٹھ گئے غمگسار باکین سے
رہ گیا صرف چارہ گر تہا

اختر علی اختر..... جہلم

اے جرم ہم غزل ہی کے پردے میں کہہ گئے
ناکام زندگی کی کہانی کبھی کبھی

فیروز احمد..... ڈی آئی خان

آہنوں کا یہ تقاضا ہے کہ جاگیں کچھ اور
سائے ڈھلتے ہیں تو پھر نیند سی آجاتی ہے

(اقرا ماہنو ناگوری کراچی کا جواب)

عندلیپ مظہر..... ملتان

اندھیرا ، قاصطے ، تنہائی ، یادیں
کوئی میری طرح جی کر دکھائے

شہناز فرحت..... لاہور

آنسوؤں کی چھاؤں میں تم جو مسکرا دیے
شبنمی نگاہ میں صبح کچھ کھمر گئی

ارتقاء ملک..... لاہور

اب تو آسمان رشک کرتا ہے
اتنا کافر بنا گیا کوئی

(سید امتیاز حسین بخاری سرگودھا کا جواب)

اے فاروقی..... لیہ

آہ اب یہ بھی مجھ کو یاد نہیں
آنکھ کب میری شبخنی نہ رہی

الیاس حسن..... روپڑی

اس شوق جستجو کی ہمیں داد کون دے
آئے ہیں خود کو ڈھونڈنے تیرے دیار میں
اشتیاق احمد..... کراچی

امرت نہیں دیتا جو ہوئوں سے تو پھر
لا زہر ہی آنکھوں سے پلا دے ساکی
(نامہ تحریر کراچی کا جواب)

نہت پروین..... کراچی

یہ دن بھی مبارک ہے ملو آکے گلے سے
پھر ہم سے کہو ذرا عید مبارک
احمد یار خان..... پشاور

یہ محفل میں تو نے غزل کیسی کہہ دی
کہ دیوار و در کو بھی وجد آیا
انوار حسین..... سرگودھا

یہ کیوں خداں لبی کے ساتھ میں نے پی لیے آنسو
لبوں پر آگئی کیوں کر ہنسی کہتے نہیں بنتی
(احمد علی ساگھڑ کا جواب)

شبیر شاہ..... کشمور

نیند تو درد کے بستر پہ بھی آسکتی ہے
ان کی آغوش میں سر ہو یہ ضروری تو نہیں
(منظر علی لاہور کا جواب)

سعید حسن..... لاہور

جگہ ناز کے الطاف فراواں ٹا
دل کو لیکن جگہ کم تنگی آج بھی ہے
(شبہ ناز فرحت لاہور کا جواب)

عبدالبارودی..... قصور

فقط گزارش سے کام نہیں چلنے والا
دل حسن محبت ہے ذرا دیکھنے تو دو
(الیاس حسن روپڑی کا جواب)

نزابت افشال..... فتح جنگ

چلو اس قدر تو توجہ ہوئی
میرے واسطے زہر لایا گیا

(حکیم سید محمد رضا شاہ میانوالی کا جواب)

اختر شاہ عارب..... جہلم

یوں ہی چپکے چپکے روتا یوں ہی چپکے چپکے باتیں
بڑی نگہ کش کے دن ہیں بڑی الجھنوں کی راتیں
(ہادیہ ایمان ماہ ایمان فورٹ عباس کا جواب)

نوشین عابد..... لاہور

اسی ندی کے کنارے تھا ایک ہار سنگھار
جہاں ہوا تھا مری زندگی کا پہلا پیار
نواز علی..... لاہور

اک ہار اگر پہنچ جائیں جو وہ کسی محفل میں
رنگ اپنا جمائیں گے دزدیدہ نگاہوں سے
انوشنوید..... گجرات

آپ سے اک عنایت کی نظر ہو نہ سکی
میں نے تن من بھی لٹایا تو برا مان گئے
شبیر شاہ..... کشمور

ان کے عارض کی دک کو استعارے بخش کر
پہلے فنِ تنویر تبدیلِ حرم تک لے گئے
عشنا عباس..... جہلم

آپ ذرا دیکھتے تو آکر
کیا کچھ ہے شاداب کے پاس
عارفہ جہانگیر..... پاک پٹن

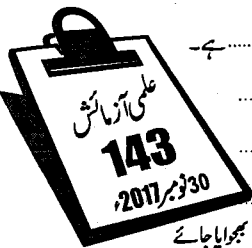
آپ جائیں جو سحر گلشن کو
رنگ اہل چمن کھمرا جائے
رفیق احمد ناز..... ڈی جی خان

الوداع رخصت یار کی گھڑی اب الوداع
پیا ملن کی آس تھی بڑی اب الوداع
(منشی عزیز مئے لڈن کا جواب)

انتظار مہدی..... نوشہرہ

یہ دکھ نہیں کہ اندھروں سے صلح کی ہم نے
ملا ل یہ ہے کہ اب صبح کی طلب بھی نہیں

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ
سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس
اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر ترقی کر دیے
جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔



میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام..... ہے۔

نام:

پتا:

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی □ سپنس □ پاکیزہ □ سرگزشت □ بھجوا یا جائے
کسی ایک پر ☒ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 نومبر 2017ء تک علمی آزمائش 143 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

ماہنامہ سپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ/ماہنامہ سرگزشت

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بیک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایات فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

شمر عباس 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر 35802552- 35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 نمبر III پبلیکیشن ڈسٹری بیوٹرز انٹرنیشنل پرائیویٹ لمیٹڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

نومبر 2017ء

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ”بیت بازی“ شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام:

پتا:

محترم! محترمہ..... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے) **104**

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

علمی آزمائش۔ 143

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کامنٹرہ انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپینس ڈائجسٹ، جامسو موسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ”یک علمی سرگزشت“ کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرح ہر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچئے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوہن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجئے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 نومبر 2017ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1952ء سے لے کر 2004ء تک افسانوں کے 9 مجموعے آئے۔ 1953ء سے لے کر 1995ء تک پانچ ناول شائع ہوئے۔ مختلف اخبارات میں کالم بھی لکھے۔ میرٹھ سے 1946ء میں ایم اے کر کے پاکستان آئے۔ اردو ادب کا ایک بڑا نام۔

علمی آزمائش 141 کا جواب

پروین شاکر 24 نومبر 1952ء میں پیدا ہوئیں۔ اسلامیہ کیمرج اسکول پھر رائیگن سن اسکول سے اکتساب کیا اور رضویہ گرلز اسکول سے میٹرک۔ سرسید کالج سے جامعہ کراچی پہنچیں۔ سرکاری ملازمت حاصل کی۔ شعر و شاعری میں نام پیدا کیا۔

انعام یافتگان

1۔ عماد حسن (سکھر) 2۔ انیس احمد (منظفر گڑھ) 3۔ حسن علی زیدی (شجاع آباد)

4۔ ارباب محمد (پشاور) 5۔ صبیحہ شاہ (لاہور)

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے محمد یونس جمال، وردہ بٹول، اکبر علی رئیسانی، ارشد علی، عنبرین اختر، اسرار احمد، مولابخش، تجویر حسین، ہارون محمد، نواب خان، عطیہ لورین، خادم حسین، نسرت عزیز، تبسم عرفان قریشی، پروین بیگم، نواب سلیم کوکھر، مہوش علی خان، فرحین شیر، فیروز رحمانی، عبدالغفور شمر، ناعیمہ قریم، جلیل احمد جعفری، مہر خورشید، آفتاب احمد نصیر اشرفی، عنبر مظاہر، باسط فاروقی، صوفی تبسم، محمد فیضان، خواجہ خیر محمد، نبیل اختر، الیاس محمد خارج، عنایت کجری، عنایت مسیح، الیاس محمد، طفیل احمد، انعام گل، محمد احمد، منظر

حسن، انیس بھٹو، فہیم بٹ، سعید الدین، امروت، فرحت عباس نقوی، بطنین سید، غلام حسن، نظر حسین، صباحت مرزا، یاسین خان، قیام الدین۔ لاہور سے عباس رضا سید، توصیف باری، یاسین فرحت، فہیم عباس، اقبال اصغر، آل بختین نقوی، مصباح الرحمٰن، علی نواز کارگی، عبدالخالق، اصغر علی اصغر، قاضی حسین رضوی، صابر خان، احمد علی بٹ، نواز کبیر، نوید احسن، سلمان احمد، تاثیر احسن۔ ملتان سے امام بخش، عرفان احمد شاہ، ڈاکٹر عدیب، عبدالغنی شکیل، احمد یار خان، قیام الدین گردیزی، خالق حسن توصیف، نسیم احمد، نصیر شاہ، فوزیہ اختر، فیروز اختر، وردہ فاطمہ، اکبر علی خان۔ حیدر آباد سے ماہ رخ دے زہرہ، موسیٰ مشہدی، دردانہ حسن، کاشف علی کاشف، صباحت مرزا، نعمان صدیقی، اکبر علی رند، نواز علی خان، ابرار مصطفیٰ، نیاز مسکی، آصف علی آصف، بھگر سے محمد عارف قریشی۔ راولپنڈی سے رضوان احمد ہاشمی، ظفر اقبال ظفر، توصیف حسین، مسعود اطہر، افتخار حسن، طارق ظفر، محسن انور، عتیق الرحمن خان، زکی سید، تقی عباس تقی، نوید مرزا، فرحت حسن۔ اسلام آباد سے انور یوسف زکی، نیلو فر شاہین، بشیر احمد بشیر، عصفغر عباس مرزا، محمد ذیشان، خالد عثمانی، ارشاد بانو، ماہ جبین فاطمہ، عزیز الحسن، نسیم اختر۔ واہ کینٹ سے محمد فیض، انیس الرحمن، صفدر شیرازی، نسرین اشرف، کائنات بانو، رانا فتح یاب، زاہد عباسی۔ اسلام آباد سے نیلو فر شاہین، ممتاز احمد، کشر جہاں، توصیف احمد، صدیقی الرحمٰن، نعمت اللہ خان، خضر حیات عباس، نیاز اللہ، شاہین اشفاق، سعید اختر، درویشا، مقدس بخش۔ جہلم سے ارباز خان، ملک سرفراز، مندیہ امتیاز۔ فیصل آباد سے محمد زاہد، ناصر عبدالعزیز (سمندری)۔ جنگ سے عطا مصطفیٰ۔ گوجرانوالہ سے الف اے کھوکھر۔ چکوال سے رمضان دو، ارشاد حسین۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان تنک۔ منڈی بہاؤ الدین سے خرم جہانزیب۔ میانوالی سے عبدالخالق (کالا باغ) ایم فیتھ قدسی (مسلم بازار)۔ کونڈہ سے حبیب احسن، ناصر چنگیزی، نعمان خان، حسن عسکری، زاہد علی، فرحت بابر، خاقان چنگیزی، راؤ رشید، ارباز خان، فیض اللہ خان، قتل سید پوری، تقی چنگیزی، نگار، صابر بشیر، نصرت چنگیزی۔ سرگودھا سے انعام اللہ، انعام، اکبر خان، اشرف ممتاز، زاہد حسن، نادر شاہ، حیات خان، نصیح الزماں، عطی اکی، نوانہ، فلیک الزماں، خضر حیات۔ شجاع آباد سے حسن علی زیدی، فہیم اللہ، نصیر جتوئی۔ خانیوال سے طارق شہزاد، سید ابیہام اشرف مشہدی۔ حیدر آباد سے احمد انصاری، بابر خان، طہ یاسین، بول زہرہ۔ میرپور خاص سے مجاہد علی ایس بنسی۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ پاک پتن سے علی محمد (حسن پورہ)۔ ساہیوال سے سرفراز ملک۔ چنچہ برہ زکی سے ذوالفقار فضل کریم، ملک جاوید محمد خان سرکانی۔ حاصل پور سے نعمان اوریس۔ ڈی جی خان سے موسیٰ خان۔ بہاولپور سے قاضی عدنان احمد، حمیرا کوکب واسطی، آمنہ ملک، ذیشان مرزا، نور محمد، عباس علی، ارشد حسن خان۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ ساکنگر سے عاشق حسین منگل۔ لودھراں سے ڈاکٹر سعادت علی خان۔ پورے والا سے رانا محمد شاہد۔ سیالکوٹ سے موموا اقبال۔ ڈی جی خان سے رفیق احمد نار۔ قصور سے عبدالجبار رروی۔ فتح جنگ سے نظارت افشار۔ بنیر سے فضل واحد (کبوتیل) پاک پتنگ سے علی احسن سیال، عزیز الدین، محمد اقبال چشتی، فیضان احمد، جنید کمال، ابریز مصطفیٰ۔ بہاولپور سے حمیرا کوکب واسطی، نزہت پروین، ثاقب اقبال، فرحان ناز، بے بی ڈول۔ سرگودھا سے سید امتیاز حسین بخاری چکڑ لوٹی، اکبر خان، اشرف ممتاز، زاہد حسن۔ خوشاب سے اعجاز حسین سیٹھار۔ جہلم سے اختر شاہ عارف۔ کشور سے شبیر شاہ۔ شجاع آباد سے نصیر چنبیوی، فہیم اللہ برکانی، زاہد حسین، احمد علی۔ خانیوال سے منور خان، گل محمد سپاہی۔ مظفر آباد سے کے سے ممتاز الدین، اقبال حسن، زاہد توفیق، مصباح الرحمٰن۔ حاصل پور سے ملک احسن۔ ڈی آئی خان سے حیات محمد خان، نوید بشیر۔ چکوال سے ارشاد حسین، نصیر افضل۔ منڈی بہاؤ الدین سے اختر علی افسہانی، بھگریز اختر، نوخیز اختر، شاہد علی سلطانی۔ میانوالی سے عبدالقدوس، زہرہ علی سید، کونین خان، افسین اقبال، فرین اقبال، نورین اقبال۔ کونڈہ سے ناصر چنگیزی، حسن عسکری، اقبال خان، محمد افضل، فتح محمد لاشاری۔ رحیم یار خان سے فہیم الدین، بخش حسین، ملک یاسین، حبیب علی، نادر مرزا، حکیم اللہ، قازم علی، نعمت اللہ۔ ساہیوال سے عبدالستار۔ کوہاٹ سے فدہ حسین طوری، فتح محمد، ارشد کوہاٹی۔ شیخوپورہ سے ثریا فاطمہ عقیل احمد، ناصر حسن، فدا احمد، خان اعظم خان، نصیر الحسن۔ پشاور سے مہنا عرفان، نجم شاہ، یام احمد، صغیر اختر، ظہیر الدین، انجم شاہ، نیاز احسن، اکبر علی، شاہد حسن، کلثوم اقبال، شاہ اورنگ زیب خان۔ بہاول نگر سے احتساب الحسن، زکی امتیاز، نورین گلختر خان۔ مظفر نگر سے نعمان ملک، ساجد علی، فاروق نیازی۔ جیکب آباد سے فہاد شیخ، عرفان الحسن۔ میرپور خاص سے طارق حبیب، سلطان جوگیو، ذوالفقار خان، کائنات یاسین۔

ممالک غیر سے اشتیاق قر، نعمین (پو اے ای)۔ زرغون خان، صاحب جان، اسلم قریشی (دینی)۔ فہیم احمد (نورنٹو)، زیارت فاطمہ (جرنی)، سمیل احمد (مانچسٹر)، علی ناز (بیٹھوڑ)، کاشف اقبال کاشف (ٹوکیو، جاپان)۔

زندگی میں پہلی بار کہانی، وہ بھی خود اپنی لکھی ہے۔ اس سے قبل میں صرف پڑھتی رہی ہوں۔ سرگزشت میں چھپنے والی سچ بیانیہاں مجھے بہت پسند ہیں گزشتہ مہینے کی ایک سچ بیانی نے مجھے اکسایا کہ میں بھی اپنی روداد حیات لکھوں، سولہ لکھ لی اب پتا نہیں کہانی کے انداز میں لکھ سکی ہوں یا نہیں۔ اپنی حالات زندگی صرف اس لیے لکھ رہی ہوں کہ لوگ اس سے سبق حاصل کریں۔ خاص کر وہ لڑکیاں جو کسی بھی لڑکے کی مسکراہٹ کو اپنے لیے اس کی پسند سمجھنے لگتی ہیں اور اپنی آنکھوں میں خواب سجانے لگتی ہیں۔ میں نے بھی یہی غلطی کی تھی جو کچھ مجھ پر بیٹی وہ بیان کر رہی ہوں۔

نعیمہ سلیم

(اکراچی)

گیا۔ اس کے جانے کے بعد ابا کو کام کی تلاش میں مشکل پیش آنے لگی۔ انہوں نے ایک محلے والے سے بات کی جہاں سیمنٹ کے بلاک وغیرہ بنتے تھے۔ اس کے پاس پہلے ہی چار متری تھے، جب وہ چاروں کام میں مصروف ہوتے تو ابا کا نمبر آتا۔ اس طرح ان کی آمدنی خطرناک حد تک کم ہو گئی۔ مجبوراً ماں کو گھر سے باہر قدم نکالنا پڑا۔ ان کے پاس تعلیم بھی دو کوئی ہنر۔ لے دے کے ایک ہی صورت تھی کہ وہ کسی بڑے گھر میں ماسی کا کام شروع کر دیں۔ ہمارے محلے کی کئی عورتیں اس پیشے سے منسلک تھیں۔ اماں نے ان سے ذکر کیا اور قہوڑی سی کوشش کے بعد انہیں ایک گھر میں کام مل گیا۔

اب وہ صبح آٹھ بجے گھر سے نکل جاتیں اور ان کی واپسی بارہ ایک بجے تک ہوتی۔ ان کے ذمہ کئی کام تھے۔ جن میں گھر کی صفائی بھاڑ پونچھ، آنا گوندھنا، برتن اور کپڑے دھونا سب کچھ شامل تھا۔ ان تمام کاموں کے عوض انہیں صرف تین ہزار روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اور بھی بھی مالکین رات کا بچا ہوا کھانا بھی دے دیا کرتی۔ وہ مقدار میں اتنا زیادہ ہوتا کہ ہم اسے دو وقت کھاتے اس طرح ابا کا بوجھ کچھ کم ہو گیا۔

وقت گزرتا رہا ہم چاروں بہن بھائی مسجد اور مدرسہ سے فارغ ہو گئے تھے۔ ابا نے بہت چاہا کہ کم از کم دونوں بھائیوں کو ہائی اسکول میں داخل کروادیں لیکن وہ ان کی فیس کا بندوبست نہ کر سکے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں بھائی سارا

مال باپ نے میرا نام نمبر رکھا لیکن بچپن سے ہی سب لوگ مجھے نمبر کہتے آ رہے ہیں اور اب یہی نام میری پہچان بن گیا ہے۔ میں نے ہوش سنبھالتے ہی گھر میں غربت دیکھی۔ ابا کسی ٹھیکے دار کے پاس داڑی پر راج متری کا کام کرتے تھے۔ یہ ہوائی روزی تھی۔ کام مل گیا تو گھر میں چوہا جل جاتا اور نہ ہی کبھی فائدہ بھی کرنا پڑتا۔ بعض اوقات تو یہ بھی ہوا کہ پندرہ پندرہ دن تک ابا کو کوئی کام نہیں ملا۔ نہ جانے اماں کہاں سے مانگ مانگ کر ہم چھ آدمیوں کے پیٹ کا دوزخ بھرتیں۔ میرے دو بڑے بھائی اور ایک چھوٹی بہن تھی۔ ابا کی بڑی خواہش تھی کہ وہ ہم سب بہن بھائیوں کو تعلیم دلوائیں لیکن ہمارے علاقے میں لڑکے یا لڑکیوں کے لیے کوئی سرکاری اسکول نہیں تھا۔ ابا کی اتنی استطاعت نہیں تھی کہ وہ پرائیویٹ اسکول کی فیس اور دیگر اخراجات برداشت کر سکیں چنانچہ انہوں نے ہم چاروں بہن بھائیوں کو محلے کی مسجد میں قرآن ناظرہ پڑھنے کے لیے بھیجا شروع کر دیا۔ اسی مسجد میں ایک مدرسہ بھی تھا جہاں بچوں کو پانچویں تک مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ صبح کی شفٹ میں لڑکوں اور دوپہر میں لڑکیوں کی کلاس ہوا کرتی تھی۔ اس طرح ہماری پرائمری تعلیم کا بندوبست ہو گیا۔ ابا کا خیال تھا کہ حالات بہتر ہونے پر وہ ہمیں کسی پرائیویٹ اسکول میں داخل کروادیں گے لیکن ان کا یہ خواب بھی پورا نہیں ہوا۔ گھر کے حالات بہتر ہونے کی بجائے بگڑتے چلے گئے۔ ابا جس ٹھیکے دار کے پاس کام کرتے تھے وہ دینی چلا



سارا دن گلیوں میں آوارہ گردی کرتے۔ کیونکہ انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اماں اور ابا دونوں ہی گھر سے باہر ہوتے۔ وہ دونوں دیر تک سوتے رہتے پھر ناشتا کر کے گھر سے باہر نکل جاتے۔ امجد نے محلے کے آوارہ لڑکوں میں اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ گلی ڈنڈا، کچے اور تاش کھیلتا اور اماں کے آنے سے پہلے گھر آ جاتا۔ شام کو پھر وہ کھیلنے کے بہانے گھر سے چلا جاتا اور اس کی واپسی مغرب کے بعد ہی ہوتی۔ اکثر یوں بھی ہوتا کہ رات کے کھانے کے بعد اس کا کوئی دوست بلانے آ جاتا اور پھر وہ دو تین گھنٹے بعد گھر کا راستہ دیکھتا۔

بری صحبت کا نتیجہ بہت جلد سامنے آ گیا۔ امجد کے بارے میں غیبتی باتیں سننے میں آنے لگیں۔ اس نے آوارہ لڑکوں کے ساتھ مل کر ایک گروپ بنا لیا تھا اور چھوٹے موٹے جرائم کرنے لگا تھا۔ پہلے اس نے ٹیلیوں اور دکانوں سے چیزیں چھانا شروع کر دیں پھر لوٹ مار اور ہتہ خوری شروع کر دی۔ وہ سنسان راستوں پر راہ چلتے لوگوں سے نقد رقم اور موپائل چھین لیتا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک پرانی موٹر سائیکل خرید لی تھی۔

ابا کو جب ان حرکتوں کا علم ہوا تو انہوں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ پہلے پیار سے سمجھایا پھر سختی کرنا چاہی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ پہلے تو اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ کسی نے انہیں غلط خبر دی ہے۔ اس نے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا لیکن جب ابا نے اس کے دو تین کارنامے سنوائے تو وہ ڈھٹائی پر اتر آیا اور بولا۔ ”آپ ہی بتائیں پھر میں کیا کروں۔ آخر مجھے بھی تو کڑا کرنا ہے۔“ ”تم کوئی کام دھندا کیوں نہیں کرتے؟“ ابا نے کہا۔ ”کیا کام کروں۔ مجھے آتا ہی کیا ہے۔ اگر میرے پاس تعلیم ہوتی تو کوئی ملازمت ہی کر لیتا۔ جاہل آدمی کو تو کوئی نہیں پوچھتا۔“

”ہم بھی پڑھ لکھے نہیں ہیں لیکن محنت مزدوری کر کے حق حلال کی روزی کما رہے ہیں۔“

”اس محنت مزدوری کے عوض آپ کو کیا ملا۔ میں ایسی زندگی نہیں گزار سکتا۔“

”پھر اپنا ٹھکانہ کہیں اور کر لو۔“ ابا نے غصے سے کہا۔

”میرے گھر میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔“

”ہاں ہاں چلا جاؤں گا۔ میں خود بھی یہاں نہیں رہتا

چاہتا۔ اس گھر میں ہے کیا سوائے غربت اور محرومی کے۔“ اس موقع پر اماں نے مداخلت کی اور ابا سے کہنے لگیں۔ ”کیا ہو گیا ہے تمہیں، جوان اولاد سے اس طرح بات کی جاتی ہے۔“

ابا منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد اماں نے امجد کو آڑے ہاتھوں لیا اور خوب سنائیں۔ وہ ڈھیٹ بنا ستارہ باجب اماں سانس لینے کے لیے رکیں تو بولا۔ ”تم اور ابا کچھ بھی کہو لیکن میں یہ کام نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے اپنا مستقبل عزیز ہے۔ تمہوڑے سے پیسے جمع ہو جائیں تو کوئی چھوٹا موٹا دھندا شروع کر دوں گا۔ پھر تم لوگوں کو کوئی شکایت نہیں رہے گی۔“

اماں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ انہیں اندازہ ہو گیا کہ پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ امجد اتنا آگے جا چکا ہے کہ اب اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہوگا۔ انہوں نے چھوٹے بیٹے ارشد سے ساری امیدیں وابستہ کر لیں لیکن اس نے دوسرا ہی راستہ اختیار کیا۔ بچپن سے ہی اس کا رجحان مذہب کی جانب بہت زیادہ تھا، اس نے مسجد سے اپنا تعلق برقرار رکھا۔ وہ پانچویں وقت کی نماز باقاعدگی سے باجماعت ادا کرتا۔ رمضان میں پورے روزے رکھتا اور شرعی لباس پہنتا۔ اس نے داڑھی بھی رکھ لی تھی اور ہر وقت وہی کتب کا مطالعہ کرتا۔ اس نے تبلیغی اجتماعات میں بھی جانا شروع کر دیا تھا لیکن اسے گھر کی ذمہ داریوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ابا نے بہت چاہا کہ وہ ان کے ساتھ کام پر جایا کرے یا خود اپنے طور پر کوئی کام دھندا شروع کر دے لیکن اسے اپنے کاموں سے ہی فرصت نہ تھی۔ آئے دن وہ سہ روزہ اور چالیس روزہ اجتماعات میں چلا جاتا۔ اب وہ ایک سال کے لیے تبلیغی دورہ پر ملک سے باہر جانے کا پروگرام بنا رہا تھا اس نے اپنا نام لکھوا دیا تھا اور شدت سے انتظار کر رہا تھا کہ اس کا نمبر کب آتا ہے۔

وہ بظاہر بیچ وقت نمازی اور پرہیز گار تھا لیکن دنیاوی معاملات میں انتہائی متعصب اور تنگ نظر واقع ہوا تھا خصوصاً عورتوں کے معاملے میں اس کا رویہ انتہائی سخت تھا۔ اس کی باتیں اور خیالات سن کر ایسا لگتا کہ سارا اسلام عورتوں پر ہی حتم ہو گیا ہے۔ پہلے پہل اس نے بہنوں پر روک ٹوک کی پھر اماں کو بھی بولنے لگا۔ دلچسپ بات یہ کہ وہ گھر میں کسی کو بھی نماز پڑھنے یا اسلامی شعائر اختیار کرنے کی تلقین نہیں کرتا تھا۔ بلکہ اس کی گفتگو کی تان عورتوں پر آکر ٹوٹی۔ مثلاً یہ کہ

عورتوں کو گھر سے باہر نہیں نکلتا چاہیے۔ شرعی پردہ کرنا چاہیے۔ ناخرموں کے سامنے نہیں آنا چاہیے۔ وہ عورتوں کی تعلیم اور ملازمت کے بھی سخت خلاف تھا لیکن حرے کی بات یہ کہ اس نے بھی اماں کے کام کرنے پر اعتراض نہیں کیا اس کے علاوہ اگر وہ کہیں باہر جانے کا نام لیتیں تو چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیتا لیکن اماں اس کی باتوں کو بالکل بھی اہمیت نہیں دیتی تھیں۔ ان پر بس نہ چلتا تو وہ بہنوں کے پیچھے لگ جاتا۔ دوپٹا سر پر رکھو، نظریں نیچی رکھو، کسی مرد سے بات کرنے یا اس کے سامنے آنے کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی ہمارے گھر کون آتا تھا لیکن اگر کبھی بھولے سے کوئی کزن آگیا تو ہمیں اس کے سامنے آنے کی اجازت نہیں تھی۔

زندگی اسی سٹھن زدہ ماحول میں گزر رہی تھی کہ ایک دن سلمیٰ باجی ہمارے گھر آئیں۔ وہ اسی لائن میں دو گھر چھوڑ کر رہتی تھیں اور قریب ہی کسی اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ ویسے تو ہمارا کسی سے ملنا جلتا نہیں تھا لیکن سلمیٰ باجی میں ایک خوبی تھی کہ وہ محلے کے تمام گھروں کی خبر گیری کرتی تھیں گو کہ ان کے مالی حالات بھی بہت اچھے نہیں تھے لیکن وہ اپنی محبت کے مطابق لوگوں کی مدد کرتیں اور ویسے بھی ان کے کام آیا کرتیں۔ کسی کو اسکول میں داخلہ کروانا ہو یا ڈاکٹر کے پاس جانا ہو۔ وہ ہر ایک کے ساتھ چل پڑتیں۔ انہی خوبیوں کی وجہ سے محلے کے سب لوگ ان کی عزت کرتے تھے اور وہ بھی ہر ایک کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتیں۔

سلمیٰ باجی جب ہمارے گھر آئیں تو اماں گھر پر نہیں تھیں۔ میں نے سبزی کاٹ کر رکھ دی تھی تاکہ اماں آئیں تو انہیں کھانا بنانے میں دیر نہ لگے۔ ابھی مجھے ہانڈی پکانا نہیں آئی تھی لیکن اوپر کے چھوٹے موٹے کام کر لیتی تھی۔ مجھے چائے بنانا بھی آگئی تھی۔ اس لیے سلمیٰ باجی کو دیکھتے ہی چائے کا پانی چولہے پر رکھ دیا۔ وہ میری مستعدی اور سلیقہ سے بہت متاثر ہوئیں اور جب میں چائے لے کر آتی تو خوش ہوتے ہوئے بولیں۔ ”ارے تم نے اتنی جلدی چائے بھی بنا لی۔“

”جی۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اس میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔“

انہوں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”بہت اچھی چائے بنائی ہے تم نے۔“ کچھ پڑھی وڑھی بھی ہو یا ابھی

سے گھرداری میں لگ گئیں؟“

”بس ناچیں تک پڑھا ہے۔“ میں نے سر جھکا ہوئے کہا۔ ”یہاں کوئی سرکاری اسکول جو نہیں ہے۔“

”اوہ۔“ انہوں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے جیسے وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئی ہوں پھر وہ بولیں۔ ”تمہیں پڑھنے کا شوق ہے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو انہوں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں تمہیں پڑھاؤں گی۔ تم دونوں بیٹیں شام میرے پاس آ جایا کرو۔“

میں نے کہا۔ ”آپ اماں سے بات کر لیں۔“ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہیں۔ اماں آ گئیں۔ سلمیٰ

باجی نے ان سے بات کی تو وہ بے بسی سے بولیں۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن ان کے باپ اور بھائیوں سے پوچھنا ہوگا۔ اگر انہوں نے اجازت دے دی تو میں کل سے ہی ان دونوں کو تھارے پاس بھیجنا شروع کر دوں گی۔“

میں جانتی تھی کہ اگر اماں نے اجازت دے دی تب بھی ارشد بھائی کبھی نہیں مانیں گے اور وہی ہوا۔ جب اماں نے

ابا سے یہ بات کہی تو وہ خاموش ہو گئے۔ یہ گویا ایک طرر سے نیم رضامندی تھی لیکن ارشد بھائی نے ہنگامہ کھڑا کر دیا اور بولے۔ ”کوئی ضرورت نہیں ہے ان لڑکیوں کو سلمیٰ کے

پاس بھیجنے کی۔ وہ کون ہوتی ہے ہمارے معاملات میں دخل دینے والی۔ خود تو بے پردہ ساری دنیا میں پھرتی ہے اور ہماری بہنوں کو بھی بگاڑ دے گی اور انہیں ضرورت کیا ہے آگے پڑھنے کی؟ کون سا ہم نے ان سے نوکری کروائی ہے۔ ویسے بھی پڑھ لکھ کر لڑکیاں بگڑ جاتی ہیں۔ ہمیں ایسی تعلیم نہیں چاہیے۔ اسے منع کر دیں۔ وہ ہمارے گھر نہ آیا کرے۔“

اس کی تقریر سن کر ابا بھی غصہ آگیا اور وہ بولے۔ ”یہ جو ہزاروں لاکھوں لڑکیاں پڑھ رہی ہیں۔ ڈگریاں حاصل کر رہی ہیں۔ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں تو کیا یہ سب بگڑ چکی ہیں۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو اسے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا۔ اب قدرت نے ایک موقع دیا ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔“

”ابا، سلمیٰ باجی نے کہا ہے کہ وہ ہماری اتنی تیاری کر دیا دین گی کہ میٹرک کا امتحان پرائیویٹ دے سکیں۔“ میں نے ارشد بھائی کو سسلانے کے لیے کہا۔

”میٹرک کر کے تم کون سی انٹر لگ جاؤ گی۔“ ارشد

دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا عالیشان گھر نہیں دیکھا تھا۔ خوب صورت سرسبز شاداب لان جس میں کئی سایہ دار درخت اور رنگ برنگ پھولوں سے لدے ہوئے پودے لہلہا رہے تھے۔ بڑے بڑے کمرے، شاندار وسیع و عریض ڈرائنگ و ڈائننگ روم، جدید طرز کا کچن، قیمتی فرنیچر، قالین اور پردے۔ دنیا کی ہر نعمت اس گھر میں موجود تھی۔

اماں مجھے لے کر گھر میں داخل ہوئی تو مالکن نے مجھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا نام سزن نقوی تھا لیکن اماں ہمیشہ انہیں مالکن ہی کہا کرتی تھیں۔ اس وقت وہ ایک نوجوان شخص سے بیسی باتیں کر رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر میرا دل دھڑکنا بھول گیا وہ اتنا خوب صورت اور اسماٹر بندہ تھا کہ اس پر کسی ناول کے ہیرو کا گمان ہوتا۔ اس نے سفید قمیص، سیاہ جینٹ اور پیروں میں چپل پہن رکھے تھے۔ اس کے گورے رنگ پر گھنٹہ گریالے بال خوب سج رہے تھے۔ اس نے سرسری انداز میں میری طرف دیکھا اور فوراً ہی میرے چہرے پر سے نظریں ہٹا لیں۔

”یہ میری بیٹی ہے نمو۔“ اماں نے کہا۔ ”آج میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔ کام میں میرا ہاتھ بٹانے گی۔“

”اچھا کیا۔“ سزن نقوی خوش ہوتے ہوئے بولیں۔ ”آج کام بھی زیادہ ہے تم واپسی کی فکر مت کرنا۔ اگر دیر ہو گئی تو ذرا تاخیر دوںوں کو گھر چھوڑ آئے گا۔“

اماں مجھے لے کر کچن میں آ گئیں۔ پہلے انہوں نے چائے بنائی پھر ڈبل روٹی پر کھن اور جام لگا کر مجھے دے دے ہوئے بولیں۔ ”تو جلدی سے ناشتا کر پھر کمرہ کی صفائی بھی کر دینی ہے۔ میں جب تک کچن کا کام دیکھ لوں۔“

”مگر اماں میں تو چائے پی کر آئی ہوں۔“

”تو کیا ہوا۔ یہ ناشتا بھی کر کے دیکھ۔ تجھے بھی پتا چل جائے گا کہ اللہ میاں نے دنیا میں کسی کیسی نعمتیں اتاری ہیں۔ کہہ تو آلیٹ بھی یادوں۔“

میں کہنا چاہ رہی تھی کہ یہ نعمتیں ہمارے لیے نہیں ہیں لیکن اماں کے سامنے بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر وہ خوش ہو رہی تھیں تو مجھے اعتراض کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے ان کا دل رکھنے کے لیے ایک تھوس پر کھن لگایا اور چائے کے ساتھ کھا گئی۔ پھر میں نے جمائون اٹھایا اور گھر کی

بھائی ہاتھ نچاتے ہوئے بولے۔ ”آج کل تو ایم اے پاس جوتیاں پچھتاتے پھرتے ہیں۔ تم یہ پڑھائی کا خیال دل سے نکال دو اور گھر کے کاموں پر توجہ دو۔“

ابا نے ارشد بھائی کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ ”جہیں اس معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں۔ ابھی میں زندہ ہوں۔ اس گھر میں وہی ہو گا جو میں چاہوں گا۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ”ٹھیک ہے بیٹی تم دونوں بہنیں کل سے سسلی کے یہاں پڑھنے جاؤ گی۔ اچھا ہے کچھ پڑھ لکھ لو۔ یہی تمہارے کام آئے گا۔“

اس طرح ہم دونوں بہنوں نے سسلی باجی کے یہاں جانا شروع کر دیا۔ مجھ سے چھوٹی نسیم کو پڑھائی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ میری دیکھا دیکھی کتابیں کھول کر بیٹھ جاتی۔ سسلی باجی کا خیال تھا کہ وہ ہمیں ایک سال میں دو جماعتیں پڑھائیں گی تاکہ ہمارا جو وقت ضائع ہو گیا ہے وہ پورا ہو جائے اگر ہمارا تعلیمی سلسلہ بیچ میں نہ ٹوٹتا تو میں آٹھویں اور نسیم چھٹی میں ہوتی۔ سسلی باجی ہر جماعت کا کورس ختم ہونے کے بعد ہمارا امتحان لیتیں اور اگر پاس ہو جاتی تو ہمیں اگلے درجے میں ترقی مل جاتی۔

اس طرح خدا خدا کر کے میں نے میٹرک کا امتحان اچھے نمروں سے پاس کر لیا۔ میں مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن ہمارے گھر میں تو اس کا تذکرہ کرتا ہی بے کار تھا۔ ایک تو اپا کی اتنی استطاعت نہیں تھی کہ وہ میرے کالج کے اخراجات برداشت کرتے۔ دوسرے ارشد بھائی نے کہے گوارا کرتے کہ میں کالج میں پڑھوں۔ سسلی باجی کے گھر جانے اور کالج کی پڑھائی میں بہت فرق تھا چنانچہ میں دل مسوس کر رہ گئی۔ سسلی باجی کی بھی شادی ہو گئی اور وہ رخصت ہو کر دوسرے شہر چلی گئیں۔ جاتے ہوئے انہوں نے سختی سے تاکید کی کہ میں ہر صورت میں نسیم کو میٹرک کی تیاری کرواؤں تاکہ اس کی تعلیم ادھوری نہ رہ جائے۔

ایک دن اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن کام پر جانا بھی ضروری تھا کیونکہ مالکن کے یہاں کوئی دھوٹ بھی اور اس کا سارا انتظام اماں کو ہی کرنا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنی مدد کے لیے ساتھ لیا اور کوئی چلی گئیں جو ہمارے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اماں مجھے اپنے ساتھ کام پر لے کر گئی ہوں۔ اس سے پہلے میں نے صرف کوٹھی کا نام اور وہاں کے قہرے سن رکھے تھے کبھی وہاں جانے یا ان لوگوں سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس کوٹھی کو

ہونے کی ضرورت نہیں۔“
 ”واہ یہ کیا بات ہوئی۔ آپ خود بھی صفائی نہیں کرنے دیتے اور دوسروں کو بھی اس کی اجازت نہیں۔ اس طرح تو آپ خود اپنی چیزوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔“

اس نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا جیسے نگاہوں ہی نگاہوں میں تول رہا ہو۔ اس کے اس طرح دیکھنے پر میں بری طرح شرمائی۔ آج تک کسی مرد نے مجھے اس طرح نہیں دیکھا تھا۔ اول تو میرا واسطہ ہی بہت کم مردوں سے پڑا۔ مگر میں صرف ابا اور بھائی تھے۔ اس کے علاوہ میرا سامنا دودھ والے، بھڑی والے، دھوئی اور محلے کے دکان داروں سے ہوتا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا۔ جسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خواب اٹھائیاں لینے لگیں یا دل میں اربابان محفلے لگیں۔ لے دے کر ایک میرا خالہ زاد بھائی سلیم تھا جو بھی مجھارہم سے ملنے چلا آتا لیکن اس کا آنا بھی سب کو ناگوار گزرتا اور امی کے علاوہ کوئی بھی اس سے سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ خاص طور پر ارشد کو تو اس سے خدا واسطے کا ہیر تھا۔ اگر اس کی موجودگی میں سلیم آجاتا تو ہم دونوں بہنوں کو اس کے سامنے آنے کی اجازت نہیں تھی اگر غلطی سے اسی سلیم کے لیے چائے بنانے کا کہہ دیتیں تو اس کے جانے کے بعد ارشد خوب ہنگامہ کرتا۔ ”جس کو دیکھو منہ اٹھائے چلا آتا ہے۔ جیسے ہم نے کوئی ہوٹل کھول رکھا ہے۔ مگر میں تو کچھ نصیب ہوتا نہیں۔ یہاں آکر گل چہرے اڑائے جاتے ہیں۔“

حالانکہ ایسی بات نہیں تھی۔ سلیم تو محبت میں خالہ سے ملنے چلا آتا۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی نگاہوں کا محور میں تھی۔ ان کے گھر میں کسی چیز کی کی نہیں تھی اور وہ لوگ ہم سے کہیں زیادہ خوش حال زندگی بسر کر رہے تھے۔ خالو کا اپنا کاروبار تھا اور مکان کا کرایہ بھی آتا تھا۔ اس کے باوجود وہ لوگ ہم سے اچھی طرح ملتے تھے، جب کہ ابا کے بہن بھائیوں نے نقر بیاں ان سے تعلق ختم کر لیا تھا۔ صرف بڑے تایا اور دونوں چھوٹیاں عید بقرعید پر ملنے چلی آتیں لیکن ان کی اولادوں کو بھی ہمارے گھر آنے کی توہین نہیں ہوئی۔ شاید وہ سب لوگ ہمیں اپنے سے کم تر سمجھتے تھے یا پھر انہیں یہ ڈر ہوگا کہ ابا کہیں ان سے کچھ مانگ نہ لیں لیکن میرے خیال میں ارشد کا رویہ انہیں ہمارے گھر آنے سے روکتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ہمارے گھر آئے اور ہم دونوں بہنوں کا تو خاص طور پر کہیں جانے کا سوال ہی پیدا

صفائی کرنے چل دی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ کام بھی برائے نام تھا۔ پہلے ہی پورا گھر صاف سقا تھا۔ تمام چیزیں سلیپے سے اپنی جگہ رکھی ہوئی تھیں۔ ہمارے گھر کے برعکس یہاں بالکل بھی بے ترتیبی نہیں تھی۔ اس لیے مجھے بہت زیادہ کام نہیں کرنا پڑا۔ میں نے پہلے تینوں بیڑم صاف کیے پھر ڈرائنگ روم ڈرائنگ روم اور لاونچ میں ہلکا سا ہاتھ مارا۔ اب ایک کمر باتی رہ گیا تھا۔ وہاں گئی تو اس کا دروازہ بند تھا یہ ایک غیر معمولی بات تھی کیونکہ بقیہ سب کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ میں نے اس کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے ہلکی سی دستک مچی۔ اسی اسارت محض نے دروازہ کھولا اور مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”کیا بات ہے؟“

”صاحب جی اس کمرے کی صفائی کرنی ہے۔“
 ”تمہاری ماں نے یہ نہیں بتایا کہ اس کمرے کی صفائی میں خود کرتا ہوں۔ کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔“
 ”واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ میں نے دروازہ کی چوکھٹ پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے ہوتے ہوئے آپ صفائی کریں۔“
 ”تم نہیں سمجھو گی۔“ وہ میرے پیچھے آتے ہوئے بولا۔ ”دراصل اس کمرے میں انتہائی قیمتی اور نادر و نایاب کتابیں ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ کسی بے احتیاطی کی وجہ سے انہیں کوئی نقصان پہنچے۔“

وہ اتنی مشکل زبان بول رہا تھا کہ اس کی آدمی بات میری سمجھ میں آئی اور آدمی نہیں۔ میں نے نظریں گھما کر کمرے کا جائزہ لیا۔ چاروں دیواروں پر الماریاں تھیں جن میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ کمرے کے وسط میں ایک درمیانہ سائز کی میز تھی جس پر کمپیوٹر، ٹیلی فون اور کچھ فائلیں رکھی ہوئی تھیں اور ایک جانب کاؤچ رکھی ہوئی تھی۔ مجھے تو ویسے بھی بچنے کا شوق تھا۔ دل چاہا کہ میز پر رکھے ہوئے رسالوں پر ایک نظر ڈال لوں لیکن وہ تو مجھے کمرے میں ہی نہیں آنے دے رہا تھا۔ بھلا رسالوں کو ہاتھ لگانے کیوں دیتا۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور بے پاکی سے بولی۔ ”اگر یہ کتابیں اتنی ہی قیمتی ہیں تو ان کی حفاظت بھی ضروری ہے لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ ان پر توجہ نہیں دے پارہے۔ اگر یہی حال رہا تو کچھ دنوں بعد ان میں دیک لگنا شروع ہو جائے گی۔“
 ”یہ میرا مسئلہ ہے۔ تمہیں اس بارے میں پریشان

نہیں ہوتا تھا۔

اب میں بچی نہیں تھی کہ ان نگاہوں کا مفہوم نہ سمجھتی۔ اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی اور اگر جسم کو پوری طرح چادر میں لپیٹ کر نہ رکھتی تو لوگوں کی نگاہوں سے بچنا مشکل ہو جاتا۔ مجھ پر ٹوٹ کر جوانی آئی تھی اور آئینہ کو ایسا دیتا تھا کہ بنانے والے نے مجھے بڑی فرصت میں بنایا تھا۔ گورا رنگ، لمبے سیاہ بال، ٹیٹھی آنکھیں، ستواں ناک، ریشمے ہونٹ اور بھرا بھرا جسم۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ مجھے مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ ابھی تک مجھے اس کا نام معلوم نہیں ہوا تھا۔ اس لیے میں اسے صاحب جی ہی کہہ رہی تھی۔ اس وقت مجھے خود بھی اپنا خیال نہیں رہا تھا۔ دوپٹا سر سے ڈھلک کر شانوں پر آگیا۔ میں نے جلدی سے دوپٹا ٹھیک کیا اور اس کی نگاہوں کی تیش سے بچتے ہوئے بولی۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں صاحب جی۔“

”دیکھ رہا ہوں کہ تم کتنی خوب صورت ہو۔“ وہ میرے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے بولے۔ ”قدرت کی صنائی کا لا جواب شاہکار۔“

ان کا یہ جملہ بھی میرے پلے نہیں پڑا۔ یہ تو جان گئی تھی کہ وہ میری خوب صورتی کی تعریف کر رہے تھے اور میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس سے پہلے بھی کسی مرد نے میری تعریف نہیں کی تھی۔ دے دیے بھی اب تک میرا واسطہ صرف سلیم سے ہی پڑا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی میرے حسن کی شان میں قسیدہ پڑھنا چاہ رہا ہو لیکن اسے بہت نہیں ہوتی یا موقع نہیں مل سکا۔

صاحب جی کی زبان سے یہ جملہ سن کر میں گھبرا گئی اور میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے بولے۔ ”اگر آپ اس کمرے کی صفائی نہیں کروانا چاہتے تو میں کوئی دوسرا کام کر لیتی ہوں۔“ ”نہیں اب تم آگئی ہو تو صفائی کر کے ہی جاؤ لیکن خیال رکھنا کہ کوئی چیز ادھر سے ادھر نہ ہو۔“

”آپ بے فکر رہیں، جہاں سے جو چیز اٹھاؤں گی اسے صاف کرنے کے بعد اسی جگہ رکھ دوں گی۔“ ”گڈ ٹرل۔“ انہوں نے کہا اور کمرے سے باہر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے دوپٹا کر کے گرد باندھا اور پوری لگن سے کام میں مصروف ہوئی۔ نہ جانے مجھے کیوں ایسا لگ رہا تھا کہ اپنے گھر کا کام کر رہی ہوں۔

سب سے پہلے میں نے میز کی صفائی کی۔ تمام فائلوں اور کاغذات کو ایک طرف رکھا اور بڑی احتیاط سے پوری میز صاف کر دی۔ کمپیوٹر کے کی بورڈ اور مائیز پر گرد جمع تھی۔ اس پر ہلکا سا پتھر لگا یا تو دونوں چیزیں چمک اٹھیں۔ سب سے زیادہ مشکل الماریوں میں پیش آئیں۔ میں نے ایک ایک کتاب اٹھا کر اسے صاف کرنا شروع کیا تو مجھے اعزاز ہو گیا کہ ایک دن میں یہ کام مکمل نہیں ہو سکتا۔ ابھی میں نے ایک ہی الماری صاف کی تھی کہ وہ بھی آگئے اور گھڑی دیکھتے ہوئے بولے۔ ”تم ابھی تک بیٹیں ہو۔ میں تو سمجھا تھا کہ کام ختم ہو گیا ہوگا۔“

”اتنی جلدی کام کیسے ختم ہو سکتا ہے۔“ میں نے ٹھک کر کہا۔ ”آپ نے تو کمرے کا سٹر نشتر کر رکھا ہے۔“

”اچھا اب کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ تمہاری ماں انتظار کر رہی ہوگی۔ باقی کام حل کر لیتا۔“

کسی کام کو ادھورا چھوڑنا میری عادت کے خلاف تھا لیکن جب وہ خود کمرے سے تھے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں ہاتھ دھو کر کچن میں آگئی۔ اماں نے میرے سامنے کھانا رکھا اور بولی۔ ”کیا بات ہے تو نے صفائی میں اتنی دیر لگا دی۔ ابھی اور بھی بہت سے کام پڑے ہوئے ہیں۔“

”باقی کمروں کی صفائی تو جلدی ہو گئی لیکن چھوٹے صاحب کا کتا بوں والا کمرہ بہت گندا ہے۔ وہاں دیر لگ سکتی۔“

”حیرت ہے۔ وہ تو کسی کو اس کمرے میں قدم نہیں رکھنے دیتے۔ تجھے اجازت کیسے مل گئی؟“

”پہلے تو انہوں نے مجھے بھی منع کر دیا تھا لیکن جب میں نے انہیں سمجھایا کہ صرف اوپر اوپر سے کپڑا مار دینا کافی نہیں جب تک ایک ایک کتاب کو باہر نکال کر اسے چاروں طرف سے صاف نہ کیا جائے تب ان کی سمجھ میں یہ بات آئی۔“

”اچھا! ٹھیک ہے تو جلدی سے کھانا کھالے پھر کام شروع کرتے ہیں۔ ابھی بہت کام باقی ہے۔“

جب اماں کھانے کے برتن سمیٹنے لگیں تو میں نے ان سے پوچھا۔ ”اماں یہ چھوٹے صاحب کوئی کام نہیں کرتے جو اس وقت گھر میں نظر آ رہے ہیں؟“

”ارے بیٹا! ان لوگوں کو کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک ٹیکسٹری ہے۔ جاہلاد سے کرایہ آجاتا ہے۔ بڑے

صاحب فیکٹری سنبھالتے ہیں۔ یہ آرام سے گھر میں بیٹھ کر ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔“

میں دل ہی دل میں ان پر رشک کرنے لگی۔ واہ اللہ میاں کیا قسمت بنائی ہے۔ ایک ہم ہیں کہ صبح سے شام تک کواہو کے نل کی طرح کام میں جے رہتے ہیں اور پھر بھی پیٹ بھر کر دو وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ اس وقت میرے دل میں بڑی شدت سے خیال آیا کہ کاش میری شادی بھی صاحب جی جیسے کسی بندے سے ہو جائے۔ پھر صاحب جی ہی مجھے پسند کر لیں۔ جس طرح وہ مجھے دیکھ رہے تھے۔ اس سے تو یہی لگ رہا تھا کہ میں انہیں بھاگتی ہوں۔ کاش اماں کی طبیعت چند روز مزید خراب رہے اور وہ اسی طرح مجھے اپنے ساتھ کام پر لائی رہیں۔ یوں مجھے صاحب جی سے قریب ہونے کا موقع مل سکتا ہے۔

میری دعا قبول ہوئی اور اماں کی طبیعت گھرانے کے بعد مزید خراب ہو گئی۔ اگلے روز انہیں بہت تیز بخار تھا۔ اس کے باوجود وہ کام پر جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ وہ مجھے اکیلا نہیں بھیجتا چاہ رہی تھیں۔ مالکن نے جو ان کی حالت دیکھی تو کھبرا گئیں۔ فوراً ڈرائیور کے ساتھ انہیں ڈاکٹر کے پاس بھیجا اور آرام کرنے کی ہدایت کی۔ اس دن میں نے اکیلے ہی سارے کام نٹائے۔ صاحب جی سے بھی سامنا ہوا۔ ان کی نگاہوں میں وہی وارفتگی تھی۔ اس روز میں نے پھول دار چست قمیض پہن رکھی تھی جس میں میرا بھرا بدن اور نمایاں ہو گیا تھا۔ انہوں نے ایک بھر پور مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا اور کمرے سے باہر چلے گئے تاکہ میں اپنا کام کر سکوں۔

ان کے جانے کے بعد میں نے دوپٹا اتار کر کرسی پر رکھا اور جھاڑ پونچھ میں مشغول ہو گئی۔ کام کے دوران میرا دھیان صاحب جی کی جانب لگا رہا۔ دل میں ایک خواہش ابھری کہ کاش وہ آجائیں اور مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کریں۔ خدا جانے انہوں نے ایک ہی دن میں مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا کہ میں مسلسل انہی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پھر میرے خیالات کی رو بہک گئی اور میں نے کسی اور اعزاز میں سوچنا شروع کر دیا۔ اگر صاحب جی مجھ سے شادی کر لیں تو کتنا مزہ آئے۔ میں ہمیشہ کے لیے غربت کے ماحول سے نکل آؤں گی۔ میرے پاس بہت سا پیسہ ہو گا۔ خوب عیش کروں گی۔ بڑے صاحب اور مالکن کا کیا ہے۔ وہ دونوں کتنا عرصہ زندہ رہیں گے۔ ان کے بعد تو سب کچھ میرا

ہی ہو گا۔

لیکن صاحب جی مجھ سے کیوں شادی کریں گے انہیں ایک سے ایک امیر اور خوب صورت لڑکی مل سکتی ہے اور کیا پتا ان کی معافی ہو گئی ہو یا کسی کے ساتھ افیسر چل رہا ہے خیر یہ معلوم کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ اگر وہ ابھی تک سنبھلے ہیں تو انہیں اپنی طرف مائل کرنا کچھ مشکل نہیں۔ مجھ میں کیا کمی ہے۔ لاکھوں سے بہتر ہوں اور مجھے یقین تھا کہ صاحب جی پہلی نظر میں گھائل ہو چکے ہیں۔ ورنہ امیر گھروں کے لڑکے نوکرانیوں کو کہاں منگاتے ہیں اور اگر انہوں نے ابھی تک میرا نوٹس نہیں لیا تو انہیں اپنی طرف مائل کرنے کے لیے مجھے کچھ مخصوص حربے استعمال کرنا ہوں گے۔ ایک دو کوششوں میں ہی پتا چل جائے گا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔ سب سے اوپر والے خانے تک میرا ہاتھ نہیں پہنچ رہا تھا۔ چنانچہ میں اسٹول پر کھڑے ہو کر کتابیں صاف کرنے لگی۔ اچانک میرے کانوں میں ٹپ ٹپ کی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو بارش ہو رہی تھی۔ میں نے بے اختیار گنگنا شروع کر دیا۔ آئے موسم رنگیلے سہانے۔ جیا نہیں مانے۔ تو چھٹی لے کے آجایا لاما۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اسٹول پر کھڑے کھڑے رقص کے انداز میں ہاتھ ہلاتا شروع کر دیے حالانکہ میں نے کبھی زندگی میں کوئی فلم نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی مجھے اس گانے کی پچویشن کا پتا تھا لیکن جب دل بے ایمان ہو رہا ہو تو انسان سے ایسی ہی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک بے خودی کے عالم میں اسٹول پر کھڑے ہو کر رقص کرتی رہی پھر اچانک ہی میرا توازن جڑ گیا اور اس سے پہلے کہ میں نیچے گر گئی۔ دو مضبوط بازوؤں نے آگے بڑھ کر مجھے تھام لیا۔

وہ صاحب جی تھے جو نہ جانے کب سے میرے پیچھے کھڑے ہوئے یہ شوق دیکھ رہے تھے۔ اس وقت میری بہت ہی عجیب پوزیشن تھی۔ میں دوپٹے کے بغیر ایک اجنبی کی بانہوں میں اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ مجھ پر جھکے ہوئے تھے اور ہمارے درمیان صرف چند انچ کا فاصلہ تھا۔ میں اس پچویشن سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی کہ اچانک ہی وہ سنبھل گئے اور انہوں نے مجھے اپنے بازوؤں کی قید سے آزاد کر دیا۔ مجھے یوں لگا کہ کسی فلم کے رومانی سین پر سنسنے قہقہی چلا دی ہو۔

”کیا کر رہی ہیں تم؟“ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولے۔ ”کچھ نہیں۔“ میں نے کرسی پر سے دوپٹا اٹھایا اور

گلے میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ”اچانک ہی بارش ہو گئی تو میں نے بے اختیار ہو کر گنگنا شروع کر دیا۔ بس اتنی سی بات تھی۔“

”بہ اتنی سی بات نہیں ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ ”اگر تم اسٹول سے گر جائیں تو کولہے کی ہڈی میں فریچر ہو سکتا تھا۔ امید ہے کہ آئندہ تم احتیاط کرو گی۔“

”جی بالکل۔“ میں نے ان کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے لیے چائے بناؤں۔“

”رہنے دو۔ میں خانساں سے کہہ دوں گا۔“

”خانساں آج چھٹی پر ہے۔ چائے بنانے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ میں ابھی لے کر آئی۔“

بادرہجی خانے میں آکر میں نے چائے کا پانی چولہے پر رکھا اور اس کے ساتھ ہی پکڑیوں کے لیے بین کھولنے لگی بیٹھ گئی۔ میں بہت تیزی سے کام کرتی تھی۔ پندرہ منٹ کے اندر ہی میں نے پکڑیاں حل کر ڈالے میں رہیں۔ ساتھ ہی کچپ کی بوتل لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہو گئی۔ وہ گرم گرم پکڑے دیکھ کر خوش ہو گئے اور بولے۔ ”واہ تم نے تو برسات کا مزہ دے دیا۔“

میں دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ”آپ نے سنا نہیں کہ دل تک پہنچنے کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔“

”واہ۔“ وہ ایک پکڑی منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔

”باتیں تو تم پڑھے لکھوں جیسی کرتی ہو۔ کتنی تعلیم ہے تمہاری؟“

”مشکل سے دسویں پاس کر سکی ہوں۔“ میں آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے بولی۔ ”ہمارے یہاں آگے پڑھنے کا رواج نہیں ہے۔“

”کیوں؟ تعلیم تو ہر شخص کا بنیادی حق ہے اور مجھے لگتا ہے کہ تمہیں پڑھنے کا شوق بھی ہے۔“

”شوق سے کیا ہوتا ہے جی۔“ میں نے روئی صورت بتاتے ہوئے کہا۔ ”میرے والدین کہتے ہیں کہ لڑکیوں نے پڑھ لکھ کر کیا کرتا ہے انہیں تو ساری عمر ہانڈی روئی ہی کرنا ہوتی ہے۔“

”بہت ہی دقیانوسی سوچ ہے۔“ وہ تھوڑا سا ناراض ہوتے ہوئے بولے۔ ”خیر اگر تم آگے پڑھنا چاہتی ہو تو میں تمہیں پڑھاؤں گا۔“

”آپ مجھے پڑھائیں گے؟“ میں خوش ہوتے

ہوئے بولی۔

”ہاں اس میں مجھے کون سا ہتھی بیل جوتا ہے۔ اگر تم ایک گھنٹا بھی باقاعدگی سے میرے پاس بیٹھ کر پڑھ لو تو آسانی سے پرائیویٹ امتحان دے سکتی ہو۔“

میں نے فوراً ہائی بھر لی۔ صاحب جی سے قریب ہونے کا اس سے اچھا موقع اور کیا چھٹکا تھا۔ بلکہ مجھے یوں لگا کہ شاید وہ بھی میری قربت کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ ورنہ کون کسی نوکرانی کے لیے اپنا وقت ضائع کرتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں خوشی سے سرشار ہو گئی اور شرماتے ہوئے بولی۔ ”ٹھیک ہے آپ اماں سے بات کر لیں۔ اگر وہ اجازت دیتی ہیں تو میں کل سے ہی پڑھائی شروع کر دوں گی۔“

اس دن میں شام کو کام سے واپس آئی تو سلیم کو اپنا منظر پایا۔ ارشد بھائی سر روزہ اجتماع میں گئے ہوئے تھے۔ اس لیے اس نے موقع غنیمت جانا اور ہمارے گھر چلا آیا۔ اماں کا تو ایک بہانہ تھا۔ دراصل وہ میرے دیدار کی آس لے کر آیا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں اسے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھتی لیکن اس روز نہ جانے کیوں مجھے اس کا آنا اچھا نہیں لگا۔ میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ اسے دیکھ کر میں اپنے کمرے میں چلی گئی کیونکہ ہمارے گھر میں دو ہی کمرے تھے۔ ایک میں ابا دونوں بھائیوں کے ساتھ سوتے اور دوسرا کمر اماں اور ہم دونوں بہنوں کے لیے وقف تھا۔ لہذا میں اسی کمرے میں اماں کی پاکی سے لگ کر بیٹھ گئی۔ مجھ خاموش دیکھ کر اماں نے خود ہی موضوع چھیڑ دیا۔

”سلیم کی نوکری لگ گئی ہے۔ مٹھائی لے کر آیا ہے۔ میری طبیعت ٹھیک ہو جائے تو جاؤں گی آپ کو مبارک دینے۔“

مجھے معلوم تھا کہ سلیم نے چند ماہ قبل ہی انجینئرنگ میں ڈپلوما کیا تھا اور بڑی شدت سے جاب کی تلاش میں تھا۔ میں نے بے رخی سے کہا۔ ”مبارک ہو، بخواہوشی ملے گی؟“

اسے شاید اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ وہ تو سمجھ رہا ہو گا کہ میں اس کی جاب کی خبرن کر خوشی سے اچھل پڑوں گی اور فوراً اس کے لیے جانے کے ساتھ دیگر لوازمات کا اہتمام کروں گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ تب وہ سنہلے ہوئے بولا۔

”فی الحال پندرہ ہزار ملیں گے لیکن انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ چھ ماہ بعد میری تنخواہ میں اضافہ کر دیں گے۔“

”اونہ! کس نے دیکھے ہیں چھ مہینے۔ شروع میں

سب ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ بعد میں کسی کو یاد بھی نہیں رہتا۔ بہت ہوا تو سالانہ انگریز سنٹ کے نام پر ہزار پانچ سو کا اضافہ ہو جائے گا۔ میری ماں تو سال دو سال بعد باہر چلے جاؤ۔ یہاں تو تم یونہی گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھتے رہو گے۔“

”جب وقت آئے گا تو اس بارے میں ضرور سوچوں گا۔ فی الحال تو مجھے یہیں رہ کر کچھ تجربہ حاصل کرنا ہے۔“ وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اب تم جلدی سے اچھی سی چائے پلو اور پھر میں چلا ہوں۔“

”ارے تم اتنی دیر سے آئے بیٹھے ہو اور تمہیں کسی نے چائے کو بھی نہیں پوچھا۔“

”خالہ تو کہہ رہی تھیں لیکن میں نے ہی منع کر دیا۔ سو چاکر تم آ جاؤ پھر چائے پیئیں گے۔ میں مٹھائی کے ساتھ سمو سے اور جلیبیاں بھی لایا ہوں۔“

میں چائے بنانے لگی تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آ گیا اور بڑے رومانٹک انداز میں بولا۔ ”لگتا ہے کہ تمہیں جاب ملنے کی خبر سن کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔“

”اگر تم مطمئن ہو تو۔“ میرے خوش ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے رکھاٹی سے جواب دیا۔

”تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ پہلے تو تم نے بھی ایسا رویہ اختیار نہیں کیا۔“ وہ مایوس ہوتے ہوئے بولا۔

”پہلے نہ سمجھی۔ اب آہستہ آہستہ بہت سی باتوں کی سمجھ آ رہی ہے۔“ میں نے تنک کر کہا۔ ”تم اماں کے پاس بیٹھو۔ میں چائے لے کر آتی ہوں۔“

میری بے رخی سے اس کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے جیب سے چوڑیوں کا پیکٹ نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ میں تمہارے لیے لایا تھا۔“

”تمہیں معلوم ہے کہ میں چوڑیاں نہیں پہنتی لیکن خیر تمہارا دل رکھنے کے لیے پہن لوں گی۔“

”شکریہ۔“ وہ خوش ہوتا ہوا گلایا اور مجھے اس کی حماقت پر ہنسی آنے لگی۔ بے چارہ ڈل کھایا۔ میرے لیے کاغذ کی چوڑیاں ہی لاسکتا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ کچھ عرصہ بعد میں سونے کی پہاڑ پر بیٹھنے والی ہوں۔

اس کے جانے کے بعد اماں نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ”مجھے تو لگتا ہے کہ تیری خالہ بہت جلد سلیم کے لیے حیرانہ شے مانگنے والی ہیں۔ وہ پہلے بھی مجھ سے اشارتا یہ بات کہہ چکی ہیں لیکن آج سلیم کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ

بھی تجھ میں دلچسپی لے رہا ہے۔“

”اماں! تالی دونوں ہاتھوں سے بھتی ہے۔ یہ یک طرفہ ٹریفک مجھے قبول نہیں۔ اگر وہ مجھ میں دلچسپی لے رہا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں بھی اس رشتے کے لیے تیار ہو جاؤں۔“

”کیا مطلب ہے حیرا؟“ یہ آج تو کیسی ہلکی ہلکی باتیں کر رہی ہے؟

”ٹھیک کہہ رہی ہوں اماں۔ میں اس جنجال پورہ میں جا کر اپنی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتی۔ گھر دیکھا ہے ان کا۔ دو کمروں کا کابک ہے جس میں چھ افراد پہلے ہی رہ رہے ہیں۔ ساتویں کی جگہ کہاں سے نکالیں گے۔“

”پھر کیا حیرے لیے کوہ قاف سے کوئی شہزادہ آئے گا؟“

”کیا پتا آ ہی جائے۔ آدمی کو ہمیشہ اچھی امید رکھنی چاہیے۔ ویسے کوہ قاف جانے کی ضرورت نہیں۔ اس شہر میں بھی بہت سے شہزادے ہیں۔ بس دیکھنے والی نظر ہونی چاہیے۔“

اماں ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولیں۔ ”چار جماعتیں پڑھ کر تیرا دماغ بالکل ہی خراب ہو گیا ہے۔ ارشد اسی لیے عورتوں کی تعلیم کے خلاف ہے۔“

”وہ تو پاگل ہے اور چاہتا ہے کہ ساری دنیا اس کی طرح پاگل ہو جائے۔“

انکے دن کام پر گئی تو صاحب جی میرے لیے فرسٹ ایئر کی کتاویں کا کورس لے آئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے انٹروکٹ فارم بھی بھرایا اور بولے۔ ”بس اب تم سنجیدگی سے پڑھائی شروع کر دو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے اندر کوئی کمی رہ جائے۔“

ان کی یہ بات سن کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کا مطلب ہے کہ انہیں میری غربت کی نہیں بلکہ تعلیم کی فکر تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ان کے شانہ بشانہ چل سکوں۔ میں نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ ان کی خواہش ضرور پوری کروں گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے دنیا بھر کی مخالفت مول لینا پڑے۔ سب سے زیادہ خطرہ مجھے ارشد کی طرف سے تھا۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ میں فرسٹ

ایئر کے امتحان کی تیاری کر رہی ہوں تو وہ میرا جینا حرام کر دیتا لیکن صاحب جی کی وجہ سے مجھ میں اتنی ہمت آگئی تھی کہ میں نے اس کا مقابلہ کرنے کا بھی فیصلہ کر لیا۔

نومبر 2017ء

وقت مسجد اور تبلیغی جماعت کے ساتھ گزارتا۔ حالانکہ وہ سب نیک اور بڑھے لکھے لوگ تھے اور دین کے ساتھ دنیا کے کام بھی کرتے تھے جب کہ ارشد کو لوگوں کی عیب جوئی اور تنقید کرنے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ اسے کسی کی نیکی نظر نہیں آئی تھی البتہ ان کی برائیوں پر اس کی نظر خود آ جاتی۔ عورتوں کا تو وہ سخت دشمن تھا۔ اس کے خیال میں ساری برائیوں کی جڑ عورت ہی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ لڑکیوں کی پیدائش پر ہی پابندی لگا دیتا لیکن اسے ماں اور بہن کی کمائی کھاتے

صاحب جی نے نہ جانے اپنی ماں کو کیا بیٹی پڑھائی کہ انہوں نے بھی میری پڑھائی پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ بخوشی اجازت دے دی۔ البتہ اماں اس کے حق میں نہیں تھیں۔ پہلے تو انہوں نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ لڑکی ذات کو بڑھ لکھ کر کیا کرتا ہے۔ اب تو اسے گھر داری کے کاموں میں دھچکی لینا چاہیے تاکہ یہی چیز آگے چل کر اس کے کام آئے لیکن صاحب جی نے انہیں بھی کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا۔ البتہ اماں نے سختی سے مجھے تاکید کر دی کہ گھر میں کسی کو اس بات کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔ خاص طور پر ارشد کو تو بالکل نہیں، ورنہ وہ میرا گھر سے نکلتا بند کر دے گا۔

اس طرح پڑھائی کے بھانے مجھے صاحب جی سے قریب ہونے کا موقع ملا گیا۔ اماں کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی اور انہوں نے کام پر جانا تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ اس طرح مالکن کے گھر کی پوری ذمہ داری مجھ پر آ گئی۔ اب مجھے اکیلے کام پر جاتے ہوئے ڈرنیں لگتا تھا۔ البتہ شام کو اگر دیر ہو جاتی تو تنگ صابہ اپنے ڈرائیور کے ساتھ مجھے گھر بھجوا دیتیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میرے دونوں بھائیوں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ اپنی دنیا میں مگن تھے۔ بڑے بھائی اچھدے اب ایک نیا دھندا شروع کیا تھا۔ اس نے چوری چکاری اور بھتہ خوری چھوڑ دی تھی اور کرائے کا سیاسی کارکن بن گیا تھا۔ اس کی وفاداریاں کسی ایک سیاسی جماعت کے ساتھ نہیں تھیں بلکہ وہ معاوضہ لے کر سبھی سیاسی پارٹیوں کے لیے کام کیا کرتا۔ جلے جلوسوں کے لیے پچاس ساٹھ آدمی اکٹھے کرنا، تحریے لگانا اور مخالف پارٹی کے جلے خراب کرنا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ اس کی وجہ سے اس کی مقامی سطح کے عہدیداروں اور پولیس میں اچھی خاصی جان پہچان ہو گئی تھی اور وہ ان تعلقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کروا دیتا۔ مثلاً کسی کا مکان یا دکان خالی کروانی ہے، کسی کے بچے کولاج میں داخلہ کروانا ہے، کسی کا بجلی کا بل زیادہ آگیا ہے تو اس کی قسطیں کروانی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس کے عوض اسے مٹھائی کے نام پر اچھی خاصی رقم مل جاتی۔ اس کی جیب ہمیشہ نوٹوں سے بھری رہتی لیکن ابا کے نزدیک اس کی یہ کمائی بھی ناجائز تھی۔ اس لیے وہ اس سے کچھ نہیں لیتے تھے اور نہ ہی اسے گھر میں کچھ خرچ کرنے کی اجازت تھی۔

چھوٹے بھائی ارشد کی وہی بے ڈھنگی چال تھی۔ اس نے شاید کوئی کام نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ وہ اپنا بیشتر

قارئین متوجہ ہوں

پرچا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

- ☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چادستیاب نہ ہو۔
- ☆ شہر اور علاقے کا نام۔
- ☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطہ اور مزید معلومات کے لیے

شمر عباس 0301-2454188

جاسوس دانجسٹ پبلی کیشنز

سپینس جاسوسی پاکیزہ، سرگزشت

63-C لاہور سیشن ہائوس پانک انٹرنیشنل کی روایت میں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgrp@hotmai.com

ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آتی تھی۔

ہونا چاہیے تھا۔“

جی میں آیا کہہ دوں کہ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ آپ مجھے بڑے گھر کی بھونٹا لیں پھر میری ذہانت اور سلیقہ مندی دیکھیں لیکن میں اپنے منہ سے یہ بات نہیں کہہ سکتی تھی۔ بس انتظار کرتی رہی کہ وہ کب پہل کرتے ہیں لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ چائے ختم کرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔ ”چلو بھئی بہت دیر ہوگئی۔ مجھے ابھی بہت سا کام کرنا ہے۔“

مجھے ان کی سرد مہری پر بڑا غصہ آیا۔ اتنا اچھا موقع ملا تھا اظہارِ محبت کا جسے انہوں نے گنوا دیا خیر میں بھی دیکھتی ہوں کہ کب تک بچتے ہیں۔ انہیں اپنی محبت کے جال میں پھانس کر ہی دم لوں گی۔ اس دن کے بعد میں ان سے مزید قریب ہونے کے بہانے ڈھونڈنے لگی۔ پڑھائی کے لیے تو دو گھنٹے مخصوص تھے ہی اس کے علاوہ دن میں دس چکر ان کے کمرے کے لگائی۔ بھی چائے کبھی پانی کبھی شربت کے بہانے۔ بعض اوقات وہ کھانا بھی اپنے کمرے میں منگوا لیتے۔ اس دوران میں مستقل ان کے پاس بیٹھی رہتی۔ بڑی جگمگ صاحبہ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی تھیں۔ اس لیے انہیں پتہ ہی نہیں چلا کہ میں کیا کل کھلا رہی ہوں۔

صاحب جی کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی تھیں۔ میرا دل چاہتا کہ بس ہر وقت ان کے پاس بیٹھی رہوں اور وہ بھی مجھ سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے۔ انہوں نے گھر میں انٹرکام لگوا لیا تھا۔ جب میں مگن میں ہوتی تو وہ اس کے ذریعے مجھے بلا لیتے۔ انہیں سینکڑوں اشعار یاد تھے۔ بات بات پر شعر پڑھتے۔ ان میں شقیۃ اشعار زیادہ ہوتے۔ بات بات پر میرے حسن کی تعریف کرتے جسے سن کر میں مجموعہ اشقیۃ میں نے بھی انہیں لبھانے اور جھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ فنک والی قمیص پہننا شروع کر دیں۔ جن سے میرا انگ انگ نمایاں ہو جاتا۔ اکثر بغیر دوپٹے کے ہی ان کے سامنے چلی جاتی اور ان کی پُرشوق نگاہیں برے کی طرح میرے جسم کے آر پار ہوتی رہتیں۔ اب مجھے صرف اس دن کا انتظار تھا جب وہ اپنی زبان سے اقرار محبت کر لیں۔

ایک دن سلیم، ارشد بھائی کی غیر موجودگی میں ہمارے گھر آیا اور اس نے یہ خبر سنائی کہ مالکوں نے حسب وعدہ اس کی تنخواہ میں پانچ ہزار کا اضافہ کر دیا ہے۔ مجھے یہ

ایک دن مالکین کی طبیعت خراب تھی لیکن انہیں مینے کا سودا خریدنے کے لیے سپر اسٹور جانا تھا کیونکہ گھر میں سب چیزیں ختم ہوگئی تھیں۔ انہوں نے صاحب جی کو سامان کی فہرست پکڑائی اور کہا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں کیونکہ میں ہی کچن کا سارا کام کرتی تھی اور مجھے چیزوں کی پہچان تھی۔ اس لیے میں دیکھ بھال کر خریداری کر سکوں گی۔ میں خوشی خوشی صاحب جی کے ساتھ چلی تھی۔ اس سپر اسٹور کو دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہاں دنیا بھر کی چیزیں تھیں۔ میرے بس میں ہوتا تو سب خرید لیتی۔ خیر میری فہرست بھی خاصی طویل تھی۔ ان چیزوں کی خریداری میں دو تین گھنٹے لگ گئے۔ جب ہم وہاں سے چلنے لگے تو صاحب جی نے چاکلیٹ کے کئی پیکٹ خریدے اور مجھے پکڑاتے ہوئے بولے۔ ”یہ تمہارے لیے ہیں۔“

وہ بہت قیمتی چاکلیٹ تھے اور میں انہیں لیتے ہوئے ہچکچا رہی تھی کہ اگر ان کی عادی ہوگئی تو دوبارہ کہاں سے خریدوں گی۔ صاحب جی نے شاید میرے چہرے پر کھسی تحریر پڑھ لی اور بولے۔ ”فکرت کرو ختم ہو گئے تو اور لا دوں گا۔“

واپسی میں صاحب جی نے ایک ریسٹوران کے سامنے گاڑی روکی اور بولے۔ ”بہت محنت ہوگئی ہے کچھ دیر بیٹھ کر سٹالیں۔“

ریسٹوران کا ماحول بہت رومان پرور اور خوباناک تھا۔ زیادہ تر میزیں خالی پڑی ہوئی تھیں۔ البتہ کہیں کہیں کچھ جوڑے پیٹھے راز و نیاز میں مصروف تھے۔ انہوں نے ایک الگ تھلگ گوشے میں میز منتخب کی اور دیگر کو اشارہ کرنے سے پہلے بولے۔ ”کیا لوگی؟“

میں ہنسی باراتے ہوئے ریسٹوران میں آئی تھی۔ اس لیے میرے حواس قابو میں نہ تھے۔ حیرت سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔ بمشکل اتنا ہی کہہ سکی۔ ”آپ جو چاہیں منگوا لیں۔“

انہوں نے چائے اور سیٹلڈ وچز کا آرڈر دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”تم خوب صورت اور حسین ہونے کے ساتھ سلیقہ مند بھی ہو۔ آج تم نے جس مہارت اور ہوشیاری سے شاپنگ کی ہے۔ اسے دیکھ کر میں بھی تمہاری ذہانت کا قائل ہو گیا۔ تمہیں تو کسی بڑے گھر میں پیدا

ہنس کر ہنسی آگئی۔ اتنے پیسوں کی شاچنگ تو صاحب جی ہدفہ میں کر لیتے تھے۔ پھر بھی میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے مبارکباد دی اور کہا کہ وہ اس ملازمت پر قناعت نہ رہے اور باہر جانے کے لیے کوشش کرتا رہے۔ آج کل ہی ہزار میں کیا ہوتا ہے۔ اس نے میری بات سنی ان سنی لڑی اور بڑے رومانٹک انداز میں بولا۔ ”اماں کو کب بھوں؟“

”وہ کس لیے؟“ میں نے جان بوجھ کر انجان بننے لگے کہا۔

”اپنے اور تمہارے رشتے کی بات کہی کرنے کے لیے۔“

”لیکن میرا تو ابھی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ حیران ہوئے

”ٹھیک کہہ رہی ہوں سلیم۔“ میں نے سنجیدہ ہوتے

کہا۔ ”تم ہمارے گھر کے حالات سے اچھی طرح

خبردار ہو۔ زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے مجھے دوسروں کے

کامروں میں کام کرنا پڑ رہا ہے۔ میری کوشش ہے کہ

ریجویشن کر لوں تاکہ مجھے کوئی اچھی ملازمت مل جائے۔“

”لیکن تم نے تو میٹرک کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔

ریجویشن کیسے کرو گی؟“

اب میرے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ اسے بھی اس

الامیں شریک کر لوں۔ میں نے اسے اعتماد میں لیتے ہوئے

کہا۔ ”جس گھر میں کام کرتی ہوں وہ لوگ مجھے پڑھا رہے

ہیں۔ دو مہینے بعد انٹر کا امتحان دوں گی۔ اس کے بعد اللہ نے

اپنا تو کر بھجوشن بھی ہو جائے گا لیکن یہ بات صرف اماں کو

علوم ہے اگر ارشد بھائی کو پتا چل گیا تو وہ میرا گھر سے نکلنا

مکروں گے۔“

”لیکن تم تک یہ بوجھ اٹھاؤ گی۔ یہ ذمہ داری

تمہارے بھائیوں کی ہے۔“

”اگر وہ اس قابل ہوتے تو رونا کس بات کا تھا۔

میرا حال تم میرا خیال دل سے نکال دو۔ میں اپنے ماں باپ

رہوئی ہیں کوئی منہ حار میں چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

”تم کیلی نہیں ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہم مل

رہے بوجھ بانٹ لیں گے۔“

”جذبانی باتیں مت کرو۔ چار بیٹیں ہیں تمہاری۔

ان کی شادیاں کرتے کرتے ہی بوڑھے ہو جاؤ گے میرا بوجھ

کس طرح بانٹ سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گا۔ تم نہیں تو کوئی بھی

نہیں۔ جب اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہو جاؤ تو بتا دینا،

میں برأت لے لے کر آ جاؤں گا۔“

میں جانتی تھی کہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ خالہ

زیادہ دیر انتظار نہیں کریں گی اور جلد یا بدیر اس کا رشتہ نہیں ہو

جائے گا۔ خیر مجھے کیا۔ میں نے تو اپنے خیالوں میں صاحب

جی کو بھرا رکھا تھا اور شدت سے اس دن کا انتظار کر رہی تھی

جب وہ مجھ سے اپنے دل کی بات کہیں۔ اشاروں اشاروں

میں تو وہ بہت کچھ کہہ چکے تھے لیکن ان کی زبان ابھی تک

خاموش تھی۔ ممکن ہے کہ وہ میری پڑھائی ختم ہونے کا انتظار

کر رہے ہوں۔

ایک دن ڈرائیور چھٹی پر تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ نے

صاحب جی سے کہا کہ وہ مجھے گھر چھوڑ آئیں۔ میں یہ سنتے

ہی خوشی سے جموم اٹھی۔ مجھے ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے کا

بہت ارمان تھا لیکن اس کا موقع ایک آدھ دفعہ ہی ملا۔ اس

کے علاوہ یہ بھی اُمید تھی کہ ہو سکتا ہے۔ صاحب جی تنہائی کا

فائدہ اٹھاتے ہوئے دل کی بات زبان پر لے آئیں۔ کچھ

دور جانے کے بعد انہوں نے گاڑی ایک آکس کریم پارلر

کے سامنے روک لی اور بولے۔ ”آکس کریم کھاؤ گی؟“

میں تو ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہ

رہی تھی۔ اس لیے فوراً ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ انہوں نے

آکس کریم منگوائی اور بولے۔ ”انٹر کا امتحان دینے کے بعد

کیا ارادہ ہے۔“

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور مجھے یقین ہونے لگا

کہ جس لمحے کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ وہ بس آپا ہی

چاہتا۔ میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”میں تو گریجویشن

کرنا چاہتی ہوں لیکن پتا نہیں آگے چل کر کیا حالات

ہوں۔“

”تمہاری کہیں بات تو طے نہیں ہوئی؟“ وہ میری

آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے تو میرا چہرہ شرم سے سرخ

ہو گیا اور میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ

یہی کہیں گے اگر میں نہیں پر پوز کروں۔

اس کے بجائے انہوں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے اگر تم آگے

پڑھنا ہی چاہتی ہو تو میں تمہاری پوری مدد کروں گا۔ مجھے ایسی

لڑکیاں اچھی لگتی ہیں جن میں آگے بڑھنے کی لگن ہو۔“

مجھے ان پر شدید غصہ آیا۔ ایک بار پھر انہوں نے اپنی بات کہنے کا سوچ گنوا دیا تھا۔ نہ جانے انہیں یہ اعزازہ کیوں نہیں تھا کہ میں ان کی زبان سے کیا سننا چاہتی ہوں۔ وہ کون سی مصلحت تھی جس نے انہیں روک رکھا تھا۔ شاید انہیں جلدی نہیں تھی۔ وہ ہنستا کر کے کھانے کے عادی تھے لیکن مجھ سے انتظار نہیں ہو رہا تھا اور میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر انہوں نے منہ نہ کھولا تو میں ہی بے شرم بن کر حرف مدعا زبان پر لے آؤں گی۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کچھ دنوں بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ میرے سارے خواب اور ارمان بکھر کر رہ گئے۔ ہوا یوں کہ بڑی بیگم کی بھانجی سعدیہ امریکا سے چھٹیاں گزارنے پاکستان آئی تو اس نے یہیں قیام کیا۔ چند روز بعد اس کے والدین بھی آنے والے تھے لیکن بیٹی کو انہوں نے پہلے ہی بھیج دیا تا کہ اس کی چھٹیاں ضائع نہ ہوں اور وہ اچھی طرح محکوم پھر لے۔ بیگم صاحبہ نے مجھے خاص طور پر اس کا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی لیکن وہ مجھے بالکل بھی پسند نہیں آئی۔ دیکھنے میں ہی انتہائی مغرور، تک چڑھی اور بد مزاج معلوم ہوتی تھی۔ وہ مجھ سے بھی انتہائی تحسنا نہ اعزاز میں بات کرتی تھی لیکن میں یہ سوچ کر برداشت کرتی رہی کہ چلو دوسرے کی تو بات ہے۔ اس کے بعد یہ واپس چلی جائے گی تو میرا ہی اس مہر راج ہوگا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں ایسا خواب دیکھ رہی ہوں جس کی کوئی تعبیر نہیں۔

اس کے آنے کے بعد صاحبہ جی نے مجھے منہ لگانا چھوڑ دیا تھا۔ اب نہ تو وہ مجھ سے کسی کام کے لیے کہتے اور نہ ہی مجھے پڑھاتے۔ ان کا سارا وقت سعدیہ کے ساتھ ہی گزرتا۔ وہ دونوں دن بھر گھومتے اور رات گئے ان کی واپسی ہوتی۔ یہ صورت حال میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ میں سعدیہ کو اپنا رقیب سمجھنے لگی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ جلد از جلد واپس چلی جائے لیکن اس وقت تو اس کے والدین بھی نہیں آئے تھے۔ ان کے آنے کے بعد ہی اس کی واپسی کا پروگرام بنتا۔

ان دنوں بیگم صاحبہ بہت معروف رہنے لگیں۔ وہ

اکثر شاپنگ کے لیے چلی جاتیں اور پھر ان کی واپسی دیر سے ہوتی۔ ایک دن وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئیں اور

بولیں۔ ”تم بھی اپنے لیے دو جوڑے بنالو۔ ورنہ شاہ میں کیا پہنو گی۔“

”کس کی شادی ہو رہی ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”سعدیہ اور راشد کی۔ تمہیں نہیں معلوم۔ میں تو سمجھتی تھی کہ راشد نے تمہیں بتا دیا ہوگا۔ بس سعدیہ کے ماں باپ آجائیں تو تاریخ طے کر کے ان کا نکاح پڑھوا دیتی ہوں۔ اس کے آگے مجھ سے کچھ نہیں سنا گیا۔ میرے کا سائیں سائیں کر رہے تھے۔ لگتا تھا کہ میں سننے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی ہوں۔ جیسے تیسے کر کے شاپنگ کی اور طبعیت کی خرابی کا بھانہ کر کے گھر چلی آئی۔ جی چاہ رہا تھا کہ غور دہائیں مار مار کر روؤں لیکن اس گھر میں ٹوروں کے بھی جگہ نہیں تھی۔ رات بھر بستر پر لیٹی اپنی قسمت کا ماتم کر رہی۔ مجھے رہ رہ کر راشد پر غصہ آرہا تھا وہ بھی عام مردوں طرح ہر جہاں نکلا لیکن اس کا بھی کیا تصور تھا۔ اس نے تو اس سے بھی کوئی وعدہ نہیں کیا۔ ساتھ مرنے اور جینے کی قسمیں نہیں کھائیں۔ کبھی اقرار محبت نہیں کیا، پھر میں اسے کیا کوس رہی تھی۔ اس کا تصور صرف یہ تھا کہ اس نے میرا خیال رکھا۔ میری محرومیاں دور کرنے کی کوشش کی۔ میری پڑھا میں مدد کی۔ میری شخصیت کو نکھارنا چاہتا تھا۔ اس نے تو مجھ تنہائی میں مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میں ہی تھی جو پہلی نظر میں اس پر رنجھ گئی۔ اسے اپنا ہاتھ کے لیے خود کو نمایاں کیا۔ اسے اپنی اداؤں سے رجمانے کی کوشش کرتی رہی۔ میں بڑے گھر کی بہو بننے کا خواب دیکھ رہی تھی جس کی تعبیر اتنی ہموار نکلی۔

ساری صورت حال کا تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ اس میں راشد کا کوئی تصور نہیں تھا بلکہ یہ سہ میرا اپنا کیا دھرا تھا۔ میں نے اپنی محرومیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے اونچی چلا جگہ لگانے کی کوشش کی۔ منہ کے بل آن گری۔ اب مجھے احساس ہو گیا کہ زمین ریٹکنے والے کیڑے کبھی آسمان تک نہیں پہنچ سکتے۔ انڈر زمین ہی پناہ دیتی ہے اور میری پناہ گاہ بھی سلیم کا گھر تھا۔ چنانچہ میں نے صبح اٹھتے ہی اماں سے کہہ دیا کہ وہ خالہ رشتے طے کرنے کے لیے بلا لیں کیونکہ صاحبہ جی نے میری اوقات یاد دلادی تھی۔



بہنیں

مدیر اعلیٰ سرگزشت

السلام علیکم

کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جو ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔
رفعت اور نزہت کی زندگی بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ جب سے
سنا ہے اسے قلمبند کرنے کو دل مچل رہا ہے۔ مختصر انداز
میں ان کے واقعات کو سچ بیانی کے انداز میں لکھ دیا ہے۔
یقیناً آپ کو بھی پسند آئے گی۔

مزمل سلیم

(تاندلیانوالہ فیصل آباد)

ہمارا جو تمہارے ساتھ رہے گا۔“ آخری بات کرتے ہوئے
نزہت افسردہ ہو گئی۔

”اچھا بھائی یہ کیا ہے؟“

”پرلیپ ٹاپ ہے۔“

”ہائیں وہ کیا ہوتا ہے؟“ رفعت نے عادت کے

مطابق ”ہائیں“ کو لہا کیا۔

”کمپیوٹر کا ہٹا ہے نا؟“

”ہاں وہ چاچے غمور کے بیٹے کے پاس تھا وہاں ہم

گائے سنتے تھے۔“

”اتنا بڑا گھر؟“ رفعت کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”آؤ اندر آ جاؤ رفعت۔“ نزہت نے اس کا ہاتھ پکڑ

لیا۔

”یہ دیکھو یہ تمہارا کمرہ ہے۔“ نزہت اسے ایک خوب
صورت کمرے میں لے آئی۔

”ہائیں اتنا بڑا کمرہ؟ باقی اس میں اور کون کون رہے
گا؟“

رفعت کا معصوم سوال سن کر نزہت مسکرا دی۔ ”میری
جان صرف تمہیں رہنا ہے، یہ صرف تمہارا کمرہ ہے اور کون ہے

بز نس بھی سنبھالتی تھی۔ وہ پوری بز نس میں دلچسپی لیتی بھی اس لیے کہ اس کے چاچو چاچے تھے کہ اب وہ شادی کر لے مگر وہ یہ کہہ کر ٹال دیتی کہ ابھی نہیں۔ ذرا حالات سنبھال جائیں تب سوچوں گی۔ اب جب حالات معمول پر آگئے تھے تو وہ شادی کی بجائے بہن کو گاؤں سے لے آئی۔

رفعت گاؤں سے آتے ہی ہر چیز کے بارے میں سوال کر رہی تھی اور نہ بہت اس کی حرکتوں اور باتوں پر کبھی ہنس پڑتی۔ کبھی سنبھانے کی کوشش کرتی۔ اس نے آفس سے چھٹی لے رکھی تھی۔ آج وہ رفعت کے ساتھ شاپنگ مال میں آئی تھی۔ رفعت نے اتنی بڑی عمارت دیکھ کر ”ہائیں“ کی صدا بلند کی۔

نہ بہت بار بار اس کا دوپٹا منہ سے ہٹاتی مگر وہ جیسے ہی کسی لڑکے کو دیکھتی تو دوپٹا منہ پر ڈال لیتی۔ نہ بہت نے ایک مہنگا اور خوب صورت ڈریس اس کے لیے پسند کیا۔ رفعت نے پراس ٹیک پر جب قیمت دیکھی تو فوراً بولی۔ ”باجی نہیں لیتا یہ، اتنا مہنگا۔ اتنی قیمت میں تو میرے تین چار اچھے سوٹ آجائے ہیں۔“

”مگر یہ بہت خوب صورت ہے تم پر بہت سچے گا۔“

”ہاں مگر یہ جو دکھتا ہے اس کی شکل ماموں کے مرنے جیسی ہے، وہ میری مرنیوں کو مارنا تھا مجھے نہیں لیتا اس سے۔“

نہ بہت اس کی بات پر ہنس پڑی اس نے قیمت ادا کر کے ڈریس خرید لیا۔

”باجی اتنی فضول خرچی نہ کریں مجھ پر۔“

”ان پیسوں پر تمہارا بھی حق ہے آئندہ ایسی بات کی تو میں تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔“

”اچھا باجی اب نہیں کہوں گی مگر ناراض نہ ہونا، لوکان پکڑ لے۔“ رفعت نے جلدی سے کان پکڑے۔

نہ بہت کو اس پر بے تحاشا پیار آیا۔ اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور آنکھوں میں آنی سی صاف کی۔ شاپنگ کے بعد وہ ہوٹل میں آئیں۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ بار بار رفعت کو سنبھاتی رہی۔ وہ اپنی پرکار میں بیٹھے ہوئے رفعت نے اچانک کہا۔ ”باجی پانچ سو روپے دینا۔“

نہ بہت نے حیران ہو کر اسے دیکھا اور جلدی سے نوٹ نکال کر دے دیے۔ رفعت نے سو سو کے پانچ نوٹ پکڑے اور گاڑی سے اتر کر تھوڑی دور بیٹھے ایک فقیر کو وہ پیسے دیے جب وہ پیسے دے رہی تھی تو اس نے نہ بہت کی طرف اشارہ کر کے فقیر کو کچھ کہا بھی تھا۔

”ابھی تو مجھے فضول خرچی سے روک رہی تھی اور خود فقیر کو اتنے پیسے دے دیئے؟“ نہ بہت نے پوچھا۔

”بس یہ کمپیوٹر کی جدید قسم ہے۔“ نہ بہت نے اسے سنبھانے کی کوشش کی۔

”اچھا تو کیا اس پر بھی میں گانے سنوں گی۔“

”ہاں سننا گانے مگر پہلے اسے استعمال کرنا سیکھ لیتا۔“

”کون سکھائے گا؟“

”میں سکھاؤں گا جی، غلام حاضر ہے۔“ مبشر کی اتنی ٹھیک وقت پر ہوئی تھی۔ رفعت نے اسے دیکھتے ہی جلدی سے دوپٹا ڈال کر دوسری طرف منہ کر لیا۔

”تمہیں کیا ہوا۔ شرمایا کیوں رہی ہو؟“ نہ بہت نے حیرانگی سے پوچھا۔

”مائی بہتی ہیں غیر مردوں سے پردہ کرتے ہیں۔“

”مبشر غیر نہیں ہیں۔“ نہ بہت نے کہا۔ ”یہ مبشر رضا ہیں ہمارے جو چارو لندن میں رہتے ہیں ان کے اکلوتے سپوٹ یعنی ہمارے کزن محترم۔“

”اچھا تو پہلے بتانا تھا نا۔“ رفعت نے جلدی سے دوپٹا ہٹا کر سلام کیا۔

مبشر نے مسکرا کر سلام کا جواب دیا اور غور سے اس خوب صورت لڑکی کو دیکھا۔ سفید رنگ، گہری سیاہ آنکھیں اور سب سے بڑھ کر چہرے کی جذبییت وہ معصومیت مگر حسن کی تصویر تھی۔

☆.....☆

نہ بہت اور رفعت احسان احمد کی بیٹیاں تھیں۔ نہ بہت آٹھ سال کی تھی جب رفعت پیدا ہوئی۔ رفعت کی پیدائش کے تیسرے دن ہی رضیہ کا انتقال ہو گیا۔ احسان کے لیے یہ غم بہت بڑا تھا۔ رفعت نو مہینوں بعد سنبھالنے کے لیے کسی عورت کی ضرورت تھی اس لیے اسے ماموں ممانی اپنے ساتھ گاؤں لے کر چلے گئے مگر نہ بہت شہر میں باپ ہی کے پاس رہی۔ احسان احمد کو بز نس سے کبھی مینوں بعد تادم ملتا تو رفعت کو دیکھنے چلے جاتے۔ نہ بہت چھوٹی بہن کو بہت پیار کرتی تھی مگر ماموں ممانی نے ضد کر کے اسے اپنے پاس رکھا۔ نہ بہت اٹھائیس سال کی تھی اور ایم بی اے کر کے باپ کا بز نس سنبھال رہی تھی۔ جب احسان صاحب کو ہارٹ ایکٹ ہوا اور وہ چل بے تو نہ بہت نے کمال حاصل سے یہ غم جھلا اور باپ کی ہدایت کے مطابق رفعت کو گاؤں سے شہر لے آئی۔ رفعت نے پرائیویٹ میٹرک کیا تھا۔ وہ ساری عمر گاؤں میں رہی تھی اس لیے اسے شہر کی زندگی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ بے حد سادہ طبیعت کی معصوم لڑکی تھی۔ جب کہ نہ بہت شہر کی پردہ وہی نہیں بلکہ اپنا

”مگر نزہت تمہاری عراب اٹھائیس سال ہے میری بھی اتنی ہی ہے تو کیا ہم بوڑھے ہو کے شادی کریں گے۔“
 مبشر برسوں سے اُمید لگائے بیٹھا تھا۔
 نزہت جانتی تھی بچپن میں احسان صاحب اور اس کے چاچو نے ان کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ اسی دورانِ رفعت چائے لے کر آگئی۔

”بائی یہ کزن مجھے کپیوٹر چلانا سکھائے گا؟“
 ”آج سے ہی شروع کرتا ہوں مگر فیس کے طور پر چائے پلائی پڑے گی۔“ مبشر نے ہنس کر کہا۔
 ”توبہ کہتے مطلبی انسان ہیں، اپنی اس معصوم کزن سے بھی چائے بخوڑ گے۔“
 ”نزہت دیکھ لوباب یہ زبان پکڑ رہی ہے۔“ مبشر نے مصنوعی غصے سے کہا۔

رفعت جلدی سے بولی۔ ”میں زیادہ نہیں بولتی آپ کی طرح کوئی تین چار گز لمبی زبان نہیں میری۔ پتا نہیں منہ میں پوری کیسے آگئی۔“

”اللہ نزہت کیا جاو کیا ہے ایک ہفتے میں اتنا اعتماد۔“
 مبشر حیران ہوا۔ نزہت ان دونوں کی باتوں سے محظوظ ہو رہی تھی۔ وہ دونوں ہنسنے بولنے کی لپٹ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گئے۔
 نزہت غور سے ان دونوں کو دیکھنے لگی۔ اس کے ذہن میں ایک خیال جڑ پکڑنے لگا۔ وہ کچھ سوچ کر مسکرا دی۔
 ”میں قربانی دوں گی اپنی بہن کی خاطر۔“ اس کے ذہن میں یہ خیال پختہ ہو گیا۔

☆.....☆
 ”نزہت تم باگل ہو یہ کیسے ممکن ہے۔“ مبشر اس کی بات سن کر ہنسنے سے اکڑ گیا۔

”کیوں..... کیوں ممکن نہیں۔“ نزہت نے پوچھا۔
 ”میری اور تمہاری بات بچپن سے کی ہو چکی ہے پھر رفعت اور میری عمر اور طبیعت میں بہت فرق ہے۔ میں اسے چھوٹی بہن سمجھتا ہوں یہ ممکن ہی نہیں۔“

”ابج کا کوئی مسئلہ نہیں پھر تم میچور ہو اس کے ساتھ ایڈجسٹ کر سکتے ہو، میں جانتی ہوں تم اسے سنبھال سکتے ہو۔“
 ”مگر نزہت میں تم سے پیار کرتا ہوں تمہارے علاوہ کبھی کسی اور کے بارے میں نہیں سوچا۔“ مبشر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”لوہ بھر کے لیے نزہت کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ وہ جانتی تھی مبشر اس سے پیار کرتا ہے مگر اس طرح اس نے بھی

”میں نے اسے پیسے دے کر کہا دعا کرو میری باجی ہمیشہ خوش رہے۔“ رفعت نے خوش ہو کر اسے بتایا۔
 نزہت حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ مگر واپس آکر اس نے رفعت کو اپنے پاس صوفے پر بٹھایا اور پوچھا۔ ”تم ساری زندگی مجھ سے دور رہی ہو پھر بھی اتنا پیار کیوں ہے؟“

”پتا ہے باجی جب آپ گاؤں آتی تھیں اور میں چھوٹی سی تھی آپ میرے لیے ڈھیروں چیزیں لاتی تھیں۔ گاؤں کی دوست پوچھتی تھی، کون لایا ہے تو میں فخر سے بتاتی میری باجی۔ آپ بچپن سے میرا مان ہیں، وہاں ساری بہنیں ایک دوسرے سے لڑتی ہیں پر آپ مجھے بہت پیار کرتی ہیں اس لیے اتنے سالوں کے فاصلے کے باوجود میری محبت آپ سے کم نہیں ہوئی مجھے پتا ہے آپ نے ابوکا بہت ساتھ دیا ہے اور ابو ای کی موت کا صدمہ مجھ سے زیادہ برداشت کیا ہے۔“ بات کرتے ہوئے رفعت کے آنسو بہنے لگے اور وہ نزہت سے لپٹ گئی۔ نزہت خود بھی رونے لگی تھی۔

”ادو یہاں تو بڑا جذباتی سین چل رہا ہے۔“ مبشر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ وہ مائیسٹر میں رہتا تھا اور سال میں ایک بار پاکستان آتا تھا۔
 ”کزن آگئے میں ان کے لیے چائے لاتی ہوں۔“
 رفعت جلدی سے ہنسی۔

”کزن کچن ادھر ہے جہاں آپ جہاں جا رہی ہیں وہاں واش روم ہے۔“ مبشر نے کہا تو نزہت ہنس پڑی اور رفعت غصے سے مبشر کی طرف دیکھنے لگی۔

”اب مجھے میرے گھر کا راستہ سمجھائیں گے۔ اللہ کرے مالی بابا کا کتنا آپ کو کاٹ لے جس نے مجھے کاٹا تھا اور چوہہ انجکشن لگے تھے۔“ رفعت کو برانا دکھ یاد آ گیا۔
 ”اجما چائے پلاؤ پھر بات کرتے ہیں مالی بابا کے کتے سے۔“ مبشر مسکرا کر بولا۔

”بہت معصوم ہے یہ۔ پتا نہیں کیسے ایڈجسٹ ہوگی یہ اس ماحول میں۔“ نزہت نے اس کے جانے کے بعد کہا۔
 ”ریلیکس وقت لگے گا مگر ہو جائے گی۔ ابھی تو اس کی بہن صاحبہ کا مسئلہ ہے جو ہمارے ساتھ ایڈجسٹ نہیں ہو پا رہی ہیں اگر ہو جائیں تو کیا بات ہے۔“ مبشر نے شرارتی نظروں سے دیکھا۔

”سوچنا بھی مت۔ جب تک رفعت کا مستقبل محفوظ نہیں ہو جاتا میں شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔“

اقرار نہیں کیا تھا مگر یہ لمحے گزر گئے نہت کی جگہ ایک بڑی بہن کھڑی ہوئی۔

”اگر تم مجھ سے پیار کرتے ہو تو تمہیں رفعت کو اپنانا ہوگا ورنہ میں سمجھوں گی تمہارا پیار خود غرض تھا۔“ نہت میسر کو امتحان میں ڈال کر اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ وہ دونوں اس بات سے بے خبر تھے کہ کوئی ان کی ساری باتیں سن رہا تھا۔

☆.....☆

آج کافی دنوں بعد میسر ان کے گھر آیا تھا۔

”تو جناب کزن صاحب اس کمپیوٹر کو صرف آن کرنا ہی سکھاتا تھا آگے کے سبق کون دے گا؟“ رفعت نے اس کا استقبال کیا۔

”مصرف تھا رفعت۔“ وہ ہچکی سی مسکراہٹ کے

ساتھ بولا۔

”باجی دیکھیں ان کے کام۔“

”رفعت تم چائے لاؤ۔“ میسر نے مسجد کی سے کہا۔

”کیا سوچا تم نے؟“ اس کے جاتے ہی نہت نے پوچھا۔

”جو تم نے کہا مجھے منظور ہے۔ میرا پیار خود غرض نہیں اگر تم اس طرح خوش ہو تو ٹھیک۔ ڈیڑی اور ماکوں میں منا لوں گا۔“ وہ روکے لہجے میں بولا۔

”ٹھیک یو سوچ میسر تم نے میرے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹا دیا۔“ نہت کی آواز میں خوشی تھی۔ میسر اٹھ کر باہر کی طرف چل دیا۔

”عجیب بندہ ہے یہی۔ میری جائے کیا اتنی خراب ہے جو آرڈر کر کے نہیں لی۔“ چائے لے کر آئی رفعت نے اسے باہر جاتا دیکھ کر تمبرہ کیا لیکن میسر کا نہیں۔

☆.....☆

”کیا بات ہے رفعت تم نے مجھے اور میسر کو کیوں بلایا ہے۔“ نہت حیران تھی کہ آخر اسے کیا کام ہے جو میسر اور اسے ایمر جنسی میں بلایا ہے۔ وہ دفتر سے بھاگ آئی تھی۔

”مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“

”کیا؟“ دونوں ایک ساتھ بولے۔

”آپ دونوں شادی کب کر رہے ہیں؟“

”کیا مطلب؟“ نہت گڑبڑا کے بولی۔

”لو باجی اب میری تو ہوئی نہیں ورنہ شادی کا مطلب

بتاتی۔“ وہ مصعوبیت سے بولی۔

میسر کے لیوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”پاکل میں شادی کیسے کروں گی جب تک تمہاری نہیں

ہوگی۔“ نہت ڈانٹتے ہوئے بولی۔

”ہو جائے گی باجی ابھی میری کون سی عمر ہے ابھی تو آگے پڑھنا ہے اور یہ کہاں لکھا ہے کہ پہلے چھوٹی کی شادی ہوگی پھر بڑی کی، آپ کر لیں کہیں اچھا رشتہ ہاتھ سے نہ نکل جائے۔“ رفعت نے مسکرا کر میسر کی طرف دیکھا۔

”تم پاگل ہو۔“ نہت یہ کہہ کر رے کی طرف چل دی۔

”تو اس دن جناب نے ہماری ساری باتیں سن لی تھیں۔“ میسر اس کا کان پکڑتے ہوئے بولا۔

”میرا کان چھوڑیں ذرا باجی کو منا کر آئی مجھے ان کی کمزوری کا پتا ہے۔“ وہ کان چمڑا کر نہت کے کمرے کی طرف بھاگی۔ نہت بیڈ پر چپ چاپ بیٹھی تھی۔

”باجی!“ رفعت نے پکارا۔

”کیا مسئلہ ہے رفعت یہ تمہارے سوچنے کی باتیں نہیں۔“

”پر باجی میسر آپ کو پسند کرتے ہیں اور میں بھی یہ چاہتی ہوں۔“

”مگر رفعت.....!“

”اگر مگر کچھ نہیں آپ کہاں کرنی ہوگی۔ میں نے کبھی آپ سے کچھ نہیں مانگا۔ آپ نے جو محبتیں دی ہیں خود دی ہیں پہلی اور آخری بار کچھ مانگا ہے، میسر کو ان کی محبت لوٹا دیں۔“

نہت چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ ”تنی بڑی کب سے ہو گئیں تم؟“

”جسب سے آپ کے پاس آئی ہوں۔“ رفعت اس کے ساتھ لپٹ گئی۔

”ٹھیک ہے رفعت اگر تم ایسے خوش ہو تو مجھے منظور ہے۔“

”یا ہوا!“ رفعت نے جلدی سے نہت کے ہاتھ کو چوما۔

”آپ بہت اچھی ہیں باجی۔ میں ذرا کزن کو بلالوں۔“ وہ باہر سے میسر کو بلالاتی۔

نہت کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ تھی۔ اب وہ نہت احسان سے نہت میسر ہو چکی تھی۔

”میں چائے لاتی ہوں۔“

”ادھر دواش روم ہے، آلو!“ میسر نے اسے پکارا۔

”مجھے بے وقوف مت بنائیں۔“ رفعت نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ کیسے دیکھتی بھی کبھی آنسو چھا کر مسکراتا پڑتا ہے۔ کتنی عمر کا روگ تھا۔ وقت کے ساتھ یہ زخم بھرے گا۔ ”ہمیشہ نہت باجی ہی کیوں قربانی دیں ان کا بھی حق ہے خوشیوں پر۔“ اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے سوچا۔

لوگ مجھ پر ہنستے ہیں، میرا مذاق اڑاتے ہیں، پھبتیاں کتے ہیں۔ میرے جانے والوں نے میرا عجیب عجیب نام بھی رکھ چھوڑا ہے، کوئی مجھے آوارہ بڑھا کہتا ہے تو کوئی رنگیلے شاہ کیونکہ میرا ایک ہی شوق ہے۔ ہر ایک دو سال بعد ایک نئی دلہن گھرانے آتا۔ اس وجہ سے کچھ لوگ میرے راستے میں آنے کی کوشش بھی کرتے ہیں، عین وقت پر جا کر پھڑا بھی ڈال دیتے ہیں مگر مجھے کسی کی پروا نہیں۔ میں ہر دو سال بعد ایک شادی ضرور کرتا ہوں۔ اب آپ یہ نہ سمجھیں

خوش بخت

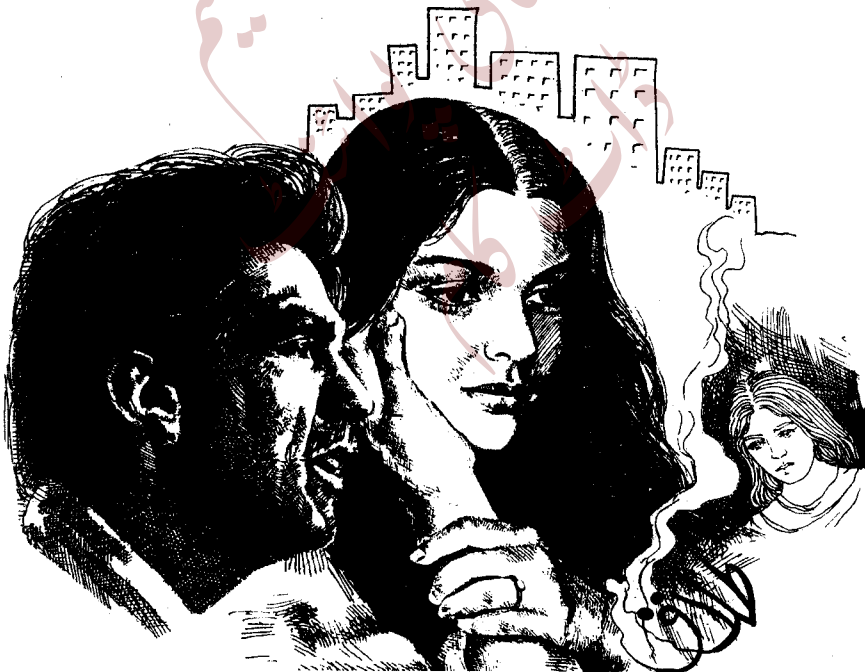
محترم مدیر

السلام علیکم

لوگ کچھ بھی کہیں مگر میں باز آنے والا نہیں۔ کیوں کہ ہر ایک دو سال بعد ایک نئی لڑکی سے شادی کرنا میری مجبوری ہے۔ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں یہ آپ کو میری آپ بیٹی بتا دے گی اور آپ بھی میری مجبوری جان کر مجھ سے ہمدردی کریں گے۔

ابرار احمد

(کراچی)



کہیں بہت امیر کبیر شخص ہوں۔ میرے دو چار تیل کے کوئیں ہیں۔ میں نوٹوں پر سوتا ہوں۔ اجی جناب میں تو بہت غریب اور مفلوک الحال شخص ہوں۔ اتنا غریب ہوں کہ لہسن کا جھڑا بنوانے کے لیے مجھے ادھر ادھر سے مانگنا پڑتا ہے۔ قرض کی مدد سے کام چلانا پڑتا ہے۔ قرض دینے والے بھی بغیر بتائے جان جاتے ہیں کہ میں شادی کرنے والا ہوں اور وہ فراق اڑانا شروع کر دیتے ہیں۔ طرح، طرح کے جیلے کئے گئے ہیں، کبھی، کبھی کوئی سرکشی میں پوچھ بھی لیتا ہے۔" امیر صاحب آپ کون سا کشتہ استعمال کرتے ہیں۔ کس حکیم سے بنواتے ہیں؟ اب میں انہیں کیسے بتاؤں کہ وہ دن ہوا ہوئے جب ظیل خان فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ اب تو ظیل خاں کے ہاتھ بھی خالی ہو چکے ہیں اور وہ آسمان کی طرف حسرت سے دیکھتے ہیں اور چیخ بھائی فاختہ بھی ایسی اڑاتی گزر جاتی ہیں۔ خبر میں بتا رہا تھا کہ میں شادی کرنے کے شوق میں جتا ہوں۔ اور یہ شادی کا بندھن جو درود خوں، دو جسون کو جوڑنے کا سبب ہے، ہمیشہ ڈھیلا ثابت ہوتا ہے۔ اتنا ڈھیلا کہ کبھی ماہ دو ماہ تو کبھی چھ سات ماہ میں مل جاتا ہے۔ کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے ہیں کہ آنے والی مجھے لات مار کر جانے والیوں کی فہرست میں نام لکھوا لیتی ہے۔ تو سن لیں کہ یہ قلعہ اطلاع ہے۔ انہیں میں خود چلا کر دیتا ہوں۔ مگر کیوں یہ آج سن لیں۔ اس قلعے کا آغاز آج سے تقریباً دس سال پہلے ہوا تھا۔ ان دنوں میں پلاسٹک پنٹ بنانے والی فیکٹری میں ملازم تھا۔ تنخواہ معقول تھی۔ گزارہ اچھے انداز میں ہو جاتا تھا۔ مگر میں صرف دو افراد تھے ایک ماں اور ایک میں۔ بھائی، بہن کوئی تھا نہیں۔ والد کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب میں صرف بارہ سال کا تھا۔ ماں نے ہی میری پرورش کی تھی۔ وہ بڑی نکستی تو تھی نہیں۔ اس لیے مزدوری کرتی رہی اور مجھے پڑھانی رہی۔ ماں کی پریشاندگی کو میں نے محسوس کر لیا تھا اس لیے دل لگا کر پڑھانی کرتا تھا۔ لیکن میٹرک سے آگے پڑھ نہیں سکا اور نوکری کی تلاش میں نکل پڑا۔ اتفاق سے ایک فیکٹری میں جاب خالی تھی۔ مجھے رکھ لیا گیا۔ تنخواہ معقول تھی اس لیے بعد میں ماں کو گھر بٹھالیا۔ اب ماں کا ایک ہی کام تھا۔ آس پڑوس میں کپڑے لگانا اور ایک، ایک سے تقاضا کرنا کہ وہ کسی چاندی لڑکی کو ڈھونڈیں۔ انہوں نے کئی نام پیش بھی کیے۔ میرا محلہ انتہائی غریب لوگوں کا تھا۔ وہاں صرف پیسے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک دوسرے کی جو میں دیکھنے والیاں ہی

نظر آتی تھیں اور ایسی لڑکیاں مجھے کب پسند آئیں۔ میں ایک قلم موقوف رکھتا رہا۔ پھر پتا نہیں کیسے اماں کو رضیہ نظر آگئی۔ ساٹھ گز کے چمکی نما کوارٹر میں رہتے ہوئے انہوں نے اسی گز والے گھر کی لڑکی تلاش کی تھی۔ گو کہ صورت شکل بس واجبی سی تھی مگر سینے اوڑھنے کا اسے سلیقہ آتا تھا۔ اور سلیقہ مشین بھی چلا لیتی تھی۔ اچھے، اچھے کپڑے بھی سی لیتی تھی۔ یہی خوبی اماں کو سب سے زیادہ پسند آئی تھی اور اماں نے ضد باندھ لی تھی کہ بختی جلد ممکن ہو سہرا باندھو، اسلم کو چران کے گھوڑے پر بیٹھو اور اسے پیادہ گھر لے آؤ۔ دن رات کی ایک ہی نگرار سے عاجز آ کر میں نے سپر ڈال دی اور رضیہ کو دلہن بنا کر گھر لے آیا۔ اس نے آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ گھر کا راج پاٹ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور اماں کو ریٹائر کر کے نماز کی چوکی پر بٹھادیا۔ یہ کام اس نے حسن سلوک کے ہتھیار سے کیا تھا۔ اس لیے اماں نے بھی خوشی، خوشی اکلوتے ٹوٹے ٹرک کی چابی بھی اسے دے دی تھی اور خود سبکدوشی لے لی۔ ریٹائر آدی زیادہ نہیں چلا۔ مشین کے فاضل پرزے زیادہ نہیں ملتے۔ وقت سے پہلے رنگ خوردگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اماں بھی ایک دن نماز پڑھتے، پڑھتے چوکی سے لڑھک گئیں۔ بچے کریں تو آواز بھی ہوتی ہوگی مگر رضیہ نے تکلیف کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اپنے کاموں میں لگی رہی۔ جب روٹی سینک کر ڈربے نما کچن سے باہر آئی تو اسے ماں فرش پر بخواب نظر آئیں۔ اس نے کہا۔ "اماں ابھی تک آپ اٹھی نہیں، چلیے اٹھ کر ہاتھ منہ دھولیں۔ گرما گرم روٹی لاتی ہوں۔"

دو تین بار آواز دینے پر بھی جب وہ نہیں اٹھی تو مجبوراً رضیہ کو اٹھانے کی زحمت کرنا پڑی۔ اس نے جیسے ہی ہاتھ لگایا ان کا جسم لڑھک گیا۔ اس نے چھو کر دیکھا تو ان کا جسم خشکا پڑا تھا۔ بس اس نے اتنی زور کی جھج ماری کہ کئی گھر بعد کی عورتیں بھی دوڑ پڑیں۔ اور پھر عین کرنے کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ کسی نے میری فیکٹری میں فون کر دیا اور میں بھی بھاگتا ہوا پہنچ گیا۔ پھر محلے والوں کی دینداری سے اشتراک کیا اور کفن و دفن کا انتظام ہو گیا، ورنہ میری حالت ان دنوں ایسی نہیں تھی کہ میں قبرستان کی میس، جنازہ گاڑی کا کرایہ، کفن کی قیمت دے سکتا۔

گھر کا نظام پہلے بھی رضیہ کے پاس تھا اماں کے بعد بھی اسی کے پاس رہا۔ سرموقوف فرق محسوس نہیں ہوا۔ اور وقت گزرتا چلا گیا کہ ایک دن وہ مل گئی۔

یہ بات اماں کے انتقال کے پورے ایک سال بعد کی ہے۔ اس روز قیصری میں کچھ زیادہ کام تھا اس لیے میں کچھ دیر سے نکلا تھا۔ سڑک دہراں نظر آ رہی تھی انڈسٹریل زون کی سڑکیں تو صرف ڈیوٹی آدر میں ہی تھوڑی دیر کے لیے آباد ہوتی ہیں۔ گھنٹا دو گھنٹا کی چہل پہل ہوتی ہے۔ یعنی جب لوگ ڈیوٹی دینے آ رہے ہوں یا جا رہے ہوں۔ باقی وقت تو یہاں کی سڑکیں کسی کی عاشق کے دل کی طرح خالی رہتی ہیں۔ ابھی میں بس اسٹاپ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ایک ذیلی سڑک سے بھاگتی ہوئی لڑکی نکلی اور مجھ سے ٹکرائی۔

بیکر شدید قسم کی تھی۔ میں لڑکھڑا گیا۔ وہ ایسے بھاگتے ہوئے آئی تھی جیسے اس کے پیچھے کتے لگ گئے ہوں۔ میں نے اسے عملی نظروں سے دیکھا تھا مگر اس کے چہرے پر پھیلی گھبراہٹ اور محسوسیت نے میرے غصے کی آگ کو خنڈا کر دیا اور میں ہمدردی کے جذبات سے بھر اٹھا۔ میں نے پوچھا۔ ”بی بی کیا بات ہے تم اس طرح بھاگ کیوں رہی ہو؟ کیا کتے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔“

دوڑنے کی وجہ سے اس کی سانس پھول رہی تھی جو سنبھلنے کے زبردوم سے ہویدا تھی۔ لگا ہیں ٹپکنے لگی تھیں اور میں ٹھہرا ایک شریف انٹنس شخص اس لیے نظر چرانے لگا تھا۔ ادھر ادھر دیکھنے کی ادا کاری کرنے لگا تھا۔ وہ خوفزدہ رہنے کی طرح بار بار مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کا یوں مڑ، مڑ کر دیکھنا خطرے کا الارم تھا۔ ان دنوں جرائم اتنے عام نہیں تھے۔ اور نہ ہمارے غیرے کے پاس بی بی ہوا کرتی تھی۔ مگر فٹنڈے بد معاش ہر دردمیں پائے جاتے ہیں۔ ان کے پاس چاقو بھی ہوا کرتا تھا۔ جو بڑی آسانی سے مقابل کے پیٹ میں اتر جاتا تھا۔ اس کے اعزاز سے میں نے سمجھ لیا کہ وہ کسی فٹنڈے کے چگل سے نکل کر بھاگی ہے۔ تبھی کافی دور دو آدمی دوڑتے نظر آئے۔ میں سمجھ گیا کہ اسی کو پکڑنے آ رہے ہیں۔ وقت ضائع کرنا عقلمندی نہیں تھی۔ بس میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ بے تکلفی اضطرابی طور پر سرزد ہوئی تھی مگر ضروری تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑا اور سامنے کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ میرا ساتھ دینے کے لیے قدم سے قدم ملا کر دوڑ رہی تھی۔ ہم دوڑتے دوڑتے سامنے والی گلی میں آ گئے۔

یہ بات اماں کے انتقال کے پورے ایک سال بعد کی ہے۔ اس روز قیصری میں کچھ زیادہ کام تھا اس لیے میں کچھ دیر سے نکلا تھا۔ سڑک دہراں نظر آ رہی تھی انڈسٹریل زون کی سڑکیں تو صرف ڈیوٹی آدر میں ہی تھوڑی دیر کے لیے آباد ہوتی ہیں۔ گھنٹا دو گھنٹا کی چہل پہل ہوتی ہے۔ یعنی جب لوگ ڈیوٹی دینے آ رہے ہوں یا جا رہے ہوں۔ باقی وقت تو یہاں کی سڑکیں کسی کی عاشق کے دل کی طرح خالی رہتی ہیں۔ ابھی میں بس اسٹاپ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ایک ذیلی سڑک سے بھاگتی ہوئی لڑکی نکلی اور مجھ سے ٹکرائی۔

بیکر شدید قسم کی تھی۔ میں لڑکھڑا گیا۔ وہ ایسے بھاگتے ہوئے آئی تھی جیسے اس کے پیچھے کتے لگ گئے ہوں۔ میں نے اسے عملی نظروں سے دیکھا تھا مگر اس کے چہرے پر پھیلی گھبراہٹ اور محسوسیت نے میرے غصے کی آگ کو خنڈا کر دیا اور میں ہمدردی کے جذبات سے بھر اٹھا۔ میں نے پوچھا۔ ”بی بی کیا بات ہے تم اس طرح بھاگ کیوں رہی ہو؟ کیا کتے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔“

دوڑنے کی وجہ سے اس کی سانس پھول رہی تھی جو سنبھلنے کے زبردوم سے ہویدا تھی۔ لگا ہیں ٹپکنے لگی تھیں اور میں ٹھہرا ایک شریف انٹنس شخص اس لیے نظر چرانے لگا تھا۔ ادھر ادھر دیکھنے کی ادا کاری کرنے لگا تھا۔ وہ خوفزدہ رہنے کی طرح بار بار مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کا یوں مڑ، مڑ کر دیکھنا خطرے کا الارم تھا۔ ان دنوں جرائم اتنے عام نہیں تھے۔ اور نہ ہمارے غیرے کے پاس بی بی ہوا کرتی تھی۔ مگر فٹنڈے بد معاش ہر دردمیں پائے جاتے ہیں۔ ان کے پاس چاقو بھی ہوا کرتا تھا۔ جو بڑی آسانی سے مقابل کے پیٹ میں اتر جاتا تھا۔ اس کے اعزاز سے میں نے سمجھ لیا کہ وہ کسی فٹنڈے کے چگل سے نکل کر بھاگی ہے۔ تبھی کافی دور دو آدمی دوڑتے نظر آئے۔ میں سمجھ گیا کہ اسی کو پکڑنے آ رہے ہیں۔ وقت ضائع کرنا عقلمندی نہیں تھی۔ بس میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ بے تکلفی اضطرابی طور پر سرزد ہوئی تھی مگر ضروری تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑا اور سامنے کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ میرا ساتھ دینے کے لیے قدم سے قدم ملا کر دوڑ رہی تھی۔ ہم دوڑتے دوڑتے سامنے والی گلی میں آ گئے۔

وہ ایک ذیلی سڑک تھی۔ اس سڑک پر قطار میں کئی بچکے بنے ہوئے تھے۔ ہم دونوں پوری قوت سے..... بھاگ رہے تھے۔ تبھی مجھے خیال آیا کہ وہ مرد ہیں دیکھنے میں

”میرا خیال ہے کسی بچکے میں گھس گئی ہے۔“

”ایک، ایک بچکے میں گھس کر دیکھنا تو نامکن ہی بات لگتی ہے۔“

”ایسا کرتے ہیں جس بچکے کا گیٹ کھلا ہوا نظر آئے اس میں دیکھ لیتے ہیں۔ وہ اندر ڈرائیونگ روم میں تو جانے سے رہی۔ باہر ہی چھپی کھڑی ہوگی۔“

انتہا سن کر ہی میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ لوگ کسی بھی وقت یہاں جھانک سکتے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور برآمدے کے برابر میں بنی گلی کی طرف بڑھ گیا۔ چھپنے کے لیے وہ گلی بہت مناسب تھی اس گلی میں ابھی پہنچا ہی تھا کہ باہر سے کسی کی آواز سنائی دی۔

”اے کون ہو کہاں گھسے چلے آ رہے ہو؟“

ہم نے پلٹ کر دیکھا مگر کوئی نظر نہیں آیا۔ آواز گیٹ کی طرف سے آ رہی تھی۔ ہم ساکت کھڑے ہو گئے تھے کہ دوبارہ آواز آئی۔ یہ آواز کسی دوسرے کی تھی۔ ”ادھر ایک لڑکی اور ایک لڑکا تو نہیں آیا۔ ہم ان دونوں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”ادھر کوئی نہیں آیا۔ بھاگ دو رن کنا کھولنا ہوں۔“

کتے کا نام سن کر میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی کیونکہ کتا تو ہماری یوفوراسوگتھ لیتا اور شور مچانے لگتا۔ یہ بات

بھی سمجھ میں آچکی تھی کہ لڑکی کا پیچھا کرنے والے دونوں غنڈے اندر آنا چاہ رہے تھے جسے بچنے والے نے روک دیا ہے۔

”فورا بھاگو ورنہ پولیس بلا لوں گا۔“ اس دھمکی پر شاید وہ لوگ واپس ہو گئے تھے۔ کیونکہ خاموشی کی چادر تن گئی تھی۔ ہم بھی مطمئن ہو گئے تھے اور باہر نکلنے پر غور کر رہے تھے کہ آواز آئی۔ ”اب باہر آ جاؤ۔“

میں نے مڑ کر دیکھا، ایک کچم کچم باندھ ہاتھ میں ڈنڈا لیے کھڑا تھا۔ اس کی لمبی لمبی مونچھیں تھیں۔ وہ جلد سے مالک تو لگ نہیں رہا تھا یقیناً چوکیدار ہو گا۔ اسے دیکھ کر لڑکی کے چہرے پر زردی پھیل گئی۔ رنگ بالکل فق ہو گیا تھا۔ مجھے بھی اپنے دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”ہمارے پیچھے کچھ غنڈے لگ گئے تھے۔“

”یہ سب بعد میں بتانا۔ جلدی ادھر آؤ۔“

”ہم لوگ صرف پناہ کے لیے آئے ہیں، ہماری نیت بری نہیں ہے۔“ میں نے حفظاً مقدم کے تحت کہا۔

”مجھے پتا ہے، میں نے تم دونوں کو سڑک پر ہی دیکھ لیا تھا۔ جب تم اندر آ رہے تھے اس وقت بھی میں کھڑکی پر کھڑا تھا۔“ اس کا انداز دوستانہ تھا۔ اس لیے ہم دونوں آگے بڑھ آئے۔ لڑکی کی نظر اس کے ڈنڈے پر جمی ہوئی تھی۔ شاید اس کے اندر اب بھی خوف بیٹھا ہوا تھا۔ وہ میری آڑ لے کر آگے بڑھ رہی تھی۔

”قرب پہنچنے پر اس نے پوچھا۔“ تم لوگ رہتے کہاں ہو؟“ میں نے اپنے علاقے کا نام بتایا۔

”اچھا چلو گاڑی میں بیٹھو۔“ اس نے روش پر کھڑی سوزو کی کیری کی طرف اشارہ کیا۔ جس پر کافی سارا سامان لدا ہوا تھا۔

”مگر کیوں؟“ میں نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

”تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”وہ لوگ آس پاس ہی ہوں گے۔ اکیلے نکلے تو اس لڑکی کے حق میں بہت برا ہو گا۔“

میں دواہوں دوسوں میں گھرا ہوا تھا مگر بات اس کی صحیح تھی اس لیے میں اس کے ساتھ پیئجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میرے برابر میں وہ لڑکی بیٹھ گئی۔ سوزو کی چل پڑی۔ اس سے تیز دماغ دوڑ رہا تھا سوچوں کا ایک گرداب تھا، فکر و پریشانی کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا اور میں تھا۔ سوزو کی میں خاموشی تھی۔ لڑکی خوف سے خاموش تھی اور میں فکر کی وجہ سے۔ ڈرائیور

بھی خاموش تھا۔ تبھی میری نظر بیک ویو مرر پر پڑی۔ دو بانیک پیچھے، پیچھے چل رہی تھیں، انڈسٹریل ایریا سے نکل کر ہم مرکزی سڑک پر پہنچ گئے تھے مگر وہ بانیک ساتھ، ساتھ تھیں۔ مجھے ڈر لگا کہ یہ بانیک والے وہی دونوں غنڈے ہیں۔ یہاں روٹن مردج پر بھی۔ ٹریفک زیادہ تھی۔ ڈرائیور نے سوزو کی سائیڈ میں کر کے روک لی پھر بولا۔ ”چلو اتر جاؤ اور یاد رکھنا، کبھی ویران علاقے میں لڑکی کے ساتھ نہ جانا۔ عزت اور جان دونوں کا خطرہ ہے۔ اسی لیے تمہیں ساتھ لے آیا کہ وہ لوگ تمہیں نقصان نہ پہنچا دیں۔“

میں نے بانیک والوں کی طرف دیکھا۔ وہ لوگ بھی ہماری طرف ہی دیکھ رہے تھے، مجھے خوف محسوس ہوا کہ اب یہ لوگ پھر روکنے کی کوشش کریں گے۔

”اب یہاں سے اپنے علاقے کی بس پکڑو اور نو دو گیارہ ہو جاؤ۔“

ہم فوراً اتر گئے۔ اس نے پھر کہا۔ ”ادھر آؤ۔“

میں پکڑ لگا کر دوسری کھڑکی پر پہنچا مگر میری نظر بانیک والوں پر جمی۔ اطمینان تھا کہ یہاں روٹن ہے وہ لوگ کچھ نہیں کریں گے کیونکہ جب ایک آدمی سے ڈر گئے تو اتنے لوگوں کے سامنے ان کی ہمت نہیں ہوگی۔

”ادھر نہیں ادھر دیکھو۔“ اس نے کہا تو میں ڈرائیور کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”کسی کو بتانا نہیں کہ تم کس بچنے میں چپے تھے۔ اب اس بچنے کو ذہن سے کھرچ دو ورنہ کسی بڑی مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔“

”جی اچھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”وجہ بھی سن لو۔“ کہہ کر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور باہر نکالا تو اس کی منجھی میں بہت سے مڑے مڑے نوٹ تھے۔ انداز ایسا تھا جیسے گئے بغیر جیب میں بھر لیا گیا ہو۔ وہ کافی سارے تھے مگر بے ترتیب تھے۔ انہیں اس نے میرے اوپر والی جیب میں ٹھونٹے ہوئے کہا۔ ”رکھ لو بعد میں کام آئے گا اور یہ منجھی سن لو، ہم چور ہیں۔ یہ جو سامان لدا ہوا ہے یہ چوری کا ہے۔ بنگلہ خالی کر کے آرہے ہیں۔ لڑکی ساتھ ہو تو پولیس والے چینگ کے لیے روکتے نہیں ہیں اسی لیے تم دونوں کو بیٹھا لیا تھا۔“ اپنی بات ختم کر کے اس نے ایکسپریس دیا دیا۔

ایسا زبردست انکشاف اور اتنے سارے نوٹ میں تو کتنے میں رہ گیا تھا۔ تبھی مجھے بانیک والوں کا خیال آیا، میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں سوزو کی کے پیچھے، پیچھے

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ



موسم کی بدلتی گرماہٹ

نومبر کے شمارے

کی یادگار زماہٹ

اولین صفحات

ظلم و زیادتی کی ایک حد ہوتی ہے مگر وہ ایک ایسا کردار تھا جس نے زندگی و سفاکیت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ **ایچ اقبال** کے قلم کی نشر و نثر زنی

انگاریے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب، کے مالک چیمپین کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی نصف میں آگے بڑھتا **ظاہر جاوید مغل** کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلیاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے برسرِ پیکار نوجوان کی سرگزشت..... **عبدالرب بھٹی** کی سلسلے دار کہانی

سرورق کے رنگ

نفرت..... محبت..... سادگی و وارفتگی کے رنگوں سے مزین سرورق کے رنگ

ان کے علاوہ

مظہر امام، تنویر، ریاض، سلیمان، امرشد بیگ، جمال دستی، تمکین مرزا اور عکس فاطمہ کی طبع کی زاو ترجمہ کہانیاں

چنی تکتہ چنی

آپ کے تمبرے... مشورے... محبتیں... دکھائیں... اور نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

جار ہے تھے۔ یقیناً وہ بھی اس کے ساتھی ہوں گے۔
ادھر سے نظریں ہٹا کر میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔
اس کے چہرے پر اب خوف کا سایہ نہیں تھا، اطمینان سا نظر آ رہا تھا۔ اسے پرسکون دیکھ کر میں نے پوچھا۔ ”اب یہ بتاؤ تمہیں جانا کہاں ہے؟“
اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔
”تمہارا گھر کہاں ہے؟ اکیلی چلی جاؤ گی ناں۔“
میں نے پھر سوال کیا۔

اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا پھر سر جھکا لیا۔ جیسے جواب دینے سے گریزاں ہو۔ اسے یوں خاموش دیکھ کر میرا پارہ چڑھنے لگا تھا۔ ”بی بی! میں نے پوچھا ہے کہ آپ کو جانا کہاں ہے؟ گھر کہاں ہے؟“ مرا ابھرتے ہو گیا تھا۔ پھر بھی اس نے جواب نہیں دیا۔ جواب دینے کی بجائے اس نے میرے بازو کو تختی سے پکڑ لیا تھا جیسے وہ میرا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتی۔ اس طرح بازو پکڑنے کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ میرے ساتھ جانا چاہتی ہے۔
”کیا تمہارا کوئی گھر نہیں ہے۔“ اس بار میں نے جھنجھلا کر کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
”ارے بابا منہ سے یوں۔ ڈھائی من کا سر ہلانے سے بہتر ہے کہ ایک چھٹانک کی زبان ہلا دو۔“ میری آواز تیز ہو گئی تھی۔
اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھ کر اپنا منہ کھول دیا۔ کھلے ہوئے منہ کو دیکھتے ہی میں اندر تک کانپ گیا۔ اس کی آدمی زبان کئی ہوئی تھی جیسے کسی حادثہ میں کٹ گئی ہو۔ وہ سن سکتی تھی۔ اکثر گوشت قوت سماعت سے محروم ہوتے ہیں، یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ یہ لڑکی کسی حادثہ میں زبان کھو بیٹھی ہے۔

میں نے ہاتھ اٹھا کر ایک رکشے والے کو اشارہ کیا اور اسے اپنے محلے کا نام بتا کر اندر بیٹھ گیا۔ لڑکی بھی ساتھ بیٹھ گئی۔

گھر پہنچا تو بیوی نے مشکوک نظروں سے خیر مقدم کیا۔ جیسے پوچھنا چاہتی ہو کہ کیا میری سوتن لے کر آئے ہو؟ میں نے اس کی نظروں کی تپش کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”تھکا ہارا آیا ہوں، کم سے کم ایک کپ چائے ہی ہلا دو۔“

”یہ ہے کون؟“ اس نے نیچی آواز میں پوچھا۔
 ”تتا ہوں پہلے چمڑی کے نیچے دم تو لینے دو۔“
 ”چائے پلائے مہری جوتی، پہلے بتاؤ یہ ہے کون جو
 اس طرح اپنے باپ کا گھر سمجھ کر آرام سے بیٹھی ہے۔“
 ”تتا ہوں ناں، پہلے چائے تو لے آؤ۔“

”چائے کے لیے چینی پتی کا ہونا ضروری ہے۔ مگر
 میں ایک چٹلی چائے کی پتی نہیں ہے۔ دکان دار نے بھی
 ادھار دینے سے منع کر دیا ہے۔“ وہ تقریباً سرگوشی میں بولی۔
 ”یہ لو اور جا کر اس کے منہ پر مارو۔“ کہہ کر میں نے
 جیب سے نوٹ نکالے، نوٹ دیکھ کر بیوی کی آنکھیں حلقوں
 سے اٹنے لگیں اور مہری سانس ڈوبنے لگیں کیونکہ میں نے
 یہی سمجھا تھا کہ سوزوکی والے نے سودو سو دیے ہیں مگر اب جو
 دیکھا تو وہ ہزار، ہزار کے نوٹ تھے۔ بیوی غصہ بھول کر نوٹ
 کی طرف اس طرح جھنجھٹی جیسے چیل گوشت پر جھنجھٹی ہے۔
 سب بیویاں ایک جیسی ہوتی ہیں، بیویوں کی دیوانی، نوٹوں
 میں بیوی کی دلچسپی لڑکی سے جھپی نہ رہ سکی، پتا نہیں اس نے
 کیا خیال کیا، وہ جو بیوی کے تیز رو کیہ کر گھر اٹھی تھی، اس نے
 جلدی سے اپنی کمر سے ایک جھوٹی سی پوٹلی کھولی اور اس میں
 سے کچھ زیورات نکالے اور اسے بھی بیوی کی طرف
 پڑھا دیے۔ رضیہ پر تو شادی مرگ جیسی کیفیت طاری ہو گئی
 تھی۔ اتنے سارے نوٹ اور زیورات، وہ تہنیت الکیم کی
 دولت ملنے جیسی کیفیت میں آ گئی تھی۔ وہ تمام چیزیں الماری
 میں رکھ کر باہر نکل گئی۔ واپس آئی تو سامان سے لدی پھندی
 تھی۔

اتنے دنوں بعد گھر میں چکن بھی لگا تھا۔ ہم تینوں نے
 ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ بیوی کا غصہ، شک، شبہ سب ہوا ہو گیا
 تھا۔ جب کمرے میں پہنچا تو لڑکی کے بارے میں ایک فرضی
 کہانی سوچ چکا تھا وہی اسے سادی کہ اس گوشتی کے ماں،
 باپ مر چکے ہیں، پچا پرورش کر رہا تھا کہ اس کا بھی انتقال
 ہو گیا اور چچی نے گھر سے نکال دیا ہے۔ اب یہ کہاں جاتی،
 کسی بھی غلط ہاتھ میں پڑ سکتی ہے اسی لیے لے آیا کہ کسی
 دارالالمان میں داخل کرادوں گا۔

کچھ بھی ہو بیویاں ہر جھوٹی سچی بات پر آسانی سے
 یقین کر لیتی ہیں اس نے بھی امانہ صداقت یقین کر لیا۔

اگلے روز جب میں کارخانے پہنچا تو منیجر صاحب کو
 پریشانی میں پایا۔ میں نے پوچھا۔ ”خیریت تو ہے؟“
 ”ارے کہاں بھائی کہاں خیریت، صبح سے دوبار

بڑے صاحب کا فون آچکا ہے، گودام میں باہر سے کیپیکل
 آرہا ہے جب کہ گودام کی پوزیشن یہ ہے کہ ایک انچ جگہ
 خالی نہیں ہے۔“ دراصل پیکنگ کے وقت یا بعد میں ڈبے
 پچک جاتے ہیں کہیں لیک نہ ہو جائے اس ڈبے سے ان ڈبوں کو
 مسٹر دکر دیا جاتا ہے۔ کباڑی اسے کوائرٹریٹ سے بھی کم
 میں خرید کر لے جاتے ہیں وہ اسے چھوٹے دکانداروں کو بیچ
 دیتے ہیں۔

”ایک بندہ آتا تو ہے؟“ میں نے کہا۔

”جو بندہ رہنچیکڈ مال لے جاتا ہے وہ آ نہیں رہا۔
 تین ماہ سے زیادہ ہو گیا۔ پتا نہیں وہ کہاں غائب ہے۔
 گودام اٹ گیا ہے۔“

”ہاں میں نے دیکھا تو ہے گودام بھر گیا ہے۔“

”تو میاں جا کر تلاش کرو، جو بندہ ملے اسے لے کر
 آؤ بڑے صاحب بہت ناراض ہو رہے ہیں۔ گودام خالی
 کرنا ضروری ہے، اگر کوئی نیا بندہ ملتا ہے تو اسی کو لے آؤ۔“
 ”اس میں قطع کاربٹ کیا ہے؟“

”مت پوچھو جو مال یہ لوگ دس روپے میں اٹھاتے
 ہیں وہ دکانوں پر سوکا بیچتے ہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ وہ ایک لگا
 کر سوکتا ہے۔“

”تنتے کا مال اشاک میں پڑا ہے؟“

”تقریباً ایک لاکھ کا ہوگا۔“

ان کے جواب نے مجھے ایک نئی راہ بھادی۔ لڑکی
 نے جو زیورات دیے ہیں اگر اسے فروخت کیا جائے تو اتنے
 ہی پیسے ملیں گے۔ کیوں نہ ایک رسک لیا جائے۔ اس خیال
 کے آتے ہی میں نے کہا۔ ”سر آپ اگر ساتھ دیں تو میں خود
 اس لائن میں آ جاؤں۔“

”ارے میاں اگر اتنی رقم لگا سکتے ہو تو دیر نہ کرو، یہ
 بہت اچھا کام ہے۔ اس میں منافع ہی منافع ہے۔“ انہوں
 نے خوش ہو کر کہا۔

”کل میں رقم کا انتظام کرتا ہوں۔“ کہہ کر میں گھر
 آ گیا۔ لڑکی کے زیورات کو بیچنے کے بعد مجھے تقریباً ایک
 لاکھ تیس ہزار ملے۔ میں رقم لے کر ان کے پاس پہنچ گیا۔

وہاں سے مال اٹھایا اور کئی دن دکانوں تک پہنچا دیا۔ سارا مال
 اتنی آسانی سے نکل گیا کہ پتا ہی نہیں چلا۔ تقریباً چار لاکھ
 روپے ہاتھ آئے، اتنا منافع دیکھ کر میں تو پاگل ہوا تھا، اتنی
 بڑی رقم یہی پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اتنی بڑی رقم خواب میں بھی نہیں
 دیکھی تھی۔ مگر حقیقت بہار دکھا رہی تھی۔ میں نے بیوی کو

دلچسپ و دلگداز تحریروں سے سجا اکتوبر 2017ء کا دل فریب شمارہ



پاکینہ

شیریں حیدر اور رفعت سراج کے قسط وار ناول

سیمما رضا ادا کا مٹی ناول ہم کو عبث بدنام کیا اختتامی مراحل میں

اسما قادری کی ایک نہایت شاندار تحریر..... بد صورت

ہما بیگ، نیلام احمد بشیر اور صبیحہ شاہ کی خصوصی تحریریں

نگہت سیمما کا خوب صورت اندازِ بیاں..... پُر لطف ناولٹ صید ضیافت کی صورت

دینی معلومات پر مبنی پر عقیدت مضامین

ماضی کی ادا کارہ دیبا کی

ہونہار فنکارہ صاحبزادی مدیحہ رضوی

سے دل پزیر ملاقات

سحر ساجد کی اچھوتی تحریر..... عنان گیر مکمل ناول کی صورت

رنگین علامہ

عقیلہ حق، ثمر کاظمی، سحرش فاطمہ، طیبہ عنصر مغل،

ہاجرہ ریحان و دیگر ماہر افسانہ نگاروں کی خوب صورت کاوشیں

اس کے ساتھ ساتھ محرک شاعری، جوش ذائقہ تراکیب متاثر کن تراشے اور بہت کچھ صرف آپ جیسے پُر ذوق پڑھنے والوں کے لیے

بتایا تو وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔ اس نے پہلا مطالبہ یہ کیا کہ اس گندے علاقے سے نکل کر کسی اچھے علاقے میں گھر لے لیں۔

میں نے وعدہ کیا کہ بہت جلد تمہارا یہ خواب بھی پورا کر دوں گا مگر اس نے تو چشم قدی کر دی۔ ایک اسٹیٹ ایجنٹ کے پاس پہنچ گئی کہ کسی اچھے علاقے میں مکان چاہیے۔ اچھے علاقے میں اس وقت پندرہ بیس لاکھ سے کم میں گھر نہیں آتا تھا۔ اتنی رقم میرے پاس تھی نہیں، صرف امیدیں تھیں۔ بیوی کا حوصلہ تھا، اس کا کہنا تھا کہ انہی پیسوں سے کام آگے بڑھاتے رہو۔ اب میں اسے کیسے سمجھاتا کہ ریجنیکلڈ مال ہر روز نہیں ملتا۔ اس کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ سال کے سال مال نکلتا ہے۔ جب یہ بات اسے معلوم ہوئی اس نے کہا۔ ”اس شہر میں اور بھی تو کارخانے ہیں وہاں جا کر معلوم کرو۔“

یہ مشورہ مقول تھا، میں نے فیئر صاحب سے ذکر کیا تو انہوں نے بھی اس خیال کو سنا بلکہ ایک احسان بھی کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہر روز تم ایک ٹکٹا پہلے آ جاؤ اور دو ٹکٹا پہلے نکل جاؤ۔ اس وقت کے کاغذ اور دوسرے کارخانوں میں جا کر پتا کرو۔ جہاں سے جو ملے اسے خرید لو۔

اب تک میں بسوں میں سفر کرتا تھا۔ وقت کی بچت کے لیے میں نے بائیک لے لی اور جی جان سے کام میں لگ گیا۔ قسمت کی دیوی مہربان تھی، ایک کے بعد دوسرا کنٹریکٹ ملنے لگا۔ کہیں سے رنگ کے ڈبے اٹھاتا اور کہیں سے ریجنیکلڈ کپڑوں کے تھان، کسی سے سینڈلوں کا اشاک لیتا تو کسی سے کاسمیک، جہاں سے جواٹھا تا وہ کوڑیوں کے مول اٹھاتا مگر بکتا تو سونے کے بھاؤ بکتا گویا دولت کی بارش ہو رہی تھی۔ ایسی بارش کہ سنبالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ صرف ایک سال میں حالات اتنے بدل گئے کہ اب لوگ مجھے فقر و کی بجائے فخر الدین صاحب کہنے لگے۔ میں نے رہائش بدلی، بیگم نے حلیہ بدلا۔ اب وہ زیادہ وقت بناؤ سنگھار میں، زہرات کی خریداری میں، لمبوسات کے انتخاب میں صرف کرتی۔ اس کا کہنا تھا کہ اب اسے دوسروں کو خاموش نگاہوں سے بتانا ضروری ہے کہ وہ بیٹھ فخر الدین کی بیوی ہے۔ واقعی اس میں بہت تبدیلی آ گئی تھی۔ مگر میں خود کو تبدیلی نہیں کر پایا تھا۔ میں اب بھی شلوار سوٹ اور پٹا داری چپل میں نظر آتا تھا۔ تبدیلی اس گولی لڑکی میں بھی نہیں آئی تھی جسے میں خوش بخت کے نام سے پکارتا تھا، اس

کے ماضی سے اب تک لاعلم تھا۔ وہ بول نہیں سکتی تھی اس لیے اس نے اپنا نام بتایا نہیں تھا۔ اپنے بارے میں بتا بھی تو نہیں سکتی تھی کہ وہ کون ہے کہاں سے آئی ہے۔ والدین کہاں ہیں کیا کرتے ہیں، اسے پکارنے کے لیے ایک نام کی اشد ضرورت تھی۔ اسی لیے میں نے خود ہی یہ نام رکھ دیا تھا۔ نام انسان کی پہچان ہے۔ اور وہ واقعی ہی اسم بہ اسمی تھی۔ میرے لیے تو خوش قسمتی کی دیوی ثابت ہوئی تھی۔ میرے حالات اس کے آنے کے بعد ہی تو بد لے گئے۔ اس لیے مجھے تجسس بھی نہیں تھا کہ میں معلوم کروں۔ میں چاہتا بھی نہیں تھا کہ وہ یہاں سے، میرے گھر سے جائے، مگر میری بیوی کو چہین نہیں تھا۔ خوش بخت اکیلی نوکرانیوں کا کام نمٹاتی تھی۔ اسی وجہ سے بیگم کوافر مقدار میں خود پر صرف کرنے کو وقت مل رہا تھا پھر بھی اسے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ہر دو چار روز میں وہ گردان ضرور کرتی کہ اس لڑکی کو بھگاؤ۔ دراصل اسے اس کی خوب صورتی سے ڈر لگا رہتا تھا۔ وہ ہمہ وقت ٹوہ میں رہتی کہ میں اس سے کتنی بار ملتا ہوں۔ کیسی اور کیا باتیں کرتا ہوں۔ کئی بار اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں کہا بھی کہ میں اس سے عشق کرنے لگا ہوں۔ اسے میں نے کئی بار سمجھا بھی کہ اللہ کی بندی، کچھ تو خوف خدا کر۔ وہ ایک بے زبان لڑکی ہے۔ ایسی مخلوق سے پگانہ لینا پھر بھی وہ دنگا کرنے پر تیار رہتی تھی۔ کیونکہ جیسے جیسے خوش حالی آ رہی تھی دیے، ویسے اس کے دل میں ڈر بیٹھا جا رہا تھا کہ کہیں میں اسے چلتا نہ کر دوں۔ خوش بخت کو بیوی بنا لوں۔

ایک دن میں وقت سے پہلے گھر آ گیا۔ نوکری تو کب کا چھوڑ چکا تھا۔ اس لیے وقت اپنا تھا۔ جب چاہتا گھر سے نکلتا اور جب دل کرتا گھر لوٹ آتا۔ اس دن بھی وقت سے پہلے آ گیا تھا اسی لیے وہ منظر دیکھ لیا۔ اس منظر نے مجھے اندر تک ہلا دیا تھا۔ میں نے دروازے سے چچ کر کہا۔ ”اری بد بخت یہ تو کیا کر رہی ہے۔ کیوں خوش بخت کو پیٹ رہی ہے۔“

”یہ میرے سینے پر مونگ دلنے آئی ہے۔ میں اسے اپنے گھر میں ایک لمحے کو برداشت نہیں کر سکتی۔“

”ایسا کیا کر دیا اس بھاری نے۔“
”مسز صدیقی تیار ہی نہیں کہ ان کے بھائی نے بھی ایک لڑکی کو سہارا دیا تھا اور اب وہ لڑکی ان کی بھالی بن کر راج کر رہی ہے۔ میں اس گھر میں ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گی۔“ اس نے چیخ کر کہا۔

”ایسی بے وقوفی تمہاری سہیلیاں ہی کر سکتی ہیں جو بے بات کی بات پیدا کر رہی ہیں۔ کان کھول کر سن لو، تمہیں اس لڑکی کو برداشت کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ یہ واقعی خوش بخت ہے۔ خوش قسمتی کی جیتی جاگتی دیوی ہے۔ اس کے آنے سے ہی ہمارے گھر میں خوش حالی آئی ہے۔ ورنہ کیا تھا یہاں، مہینے کے آخری دنوں میں قرض پر گزارہ ہوتا تھا۔ خود تمہارے پاس ایک دو ہی اچھے جوڑے تھے۔ ایک پتلی سی چین تک نہیں مٹی عمر آج..... آج دیکھو اپنے وارڈ رو ب کو، کپڑوں سے بھرا ہوا ہے۔ سیف میں زیورات اٹے ہوئے ہیں۔ یہ سب اسی کے قدموں کی برکت ہے۔“ میں نے بھی چیخ کر جواب دیا۔

”ہائی فٹ۔“ آج کل وہ محفلوں میں آنے جانے کے لیے انگلش سکھ رہی تھی اور رعب ڈالنے کے لیے وقت بے وقت انگلش کے جملے بولتی تھی۔

”ہائی فٹ نہیں گرین فٹ..... ہبز بیری ہے تو..... کیوں اپنی اوقات دکھا رہی ہے۔ تیرے آنے سے مجھے صرف پریشانیاں ملی ہیں۔ جب کہ اس مصوم کے آنے سے خوشیاں ہی خوشیاں ملیں۔“

”ہاں ہاں میں خوب سمجھتی ہوں۔ محنت خود کرتے ہیں اور کرپٹس اٹ اس کو دیتے ہیں۔“

”ایسا میں کیوں کرنے لگا۔ کیا میں تم سے ڈرتا ہوں جو جھوٹ بولوں گا۔ تم خود دیکھیں کہ حالات کس تیزی سے بد لے ہیں۔“

”تم مردوں کی چال خوب سمجھتی ہوں۔ اس کی صورت شکل اچھی دیکھ لی تو ایک پلان کے تحت کام کرنا شروع کر دیا مگر میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔“

یہ جنگ ابھی اور طوالت پکڑتی کہ ڈوریل بج اٹھی۔ میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور بیوی سے کہا۔ ”تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“

وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی مگر دروازے پر پہنچ کر رگ گئی۔ پھر بولی۔ ”جا کر دروازہ کھولیں۔“

میں نے دروازے پر پہنچ کر لاک کھولا تو سامنے امجد کھڑا تھا۔ وہ رضیہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ موصوف پان کا کابین چلاتے تھے مگر اب اپنی باجی کی مہربانی سے ایک جزل اسٹور کے مالک بن چکے تھے۔ میں سب کچھ سمجھتا تھا مگر بولتا نہیں تھا۔ کیونکہ دسترخوان کا بچا ہوا اگر کسی کے کام آجائے تو برا کیا

تھا۔ پھر وہ میری شریک حیات کا بھائی تھا اگر وہ بہن کی مدد سے اپنی زندگی سنوار رہا تھا تو اس میں برائی کیا تھی۔

موصوف اندر آتے ہی مجھ پر آنکھیں تریرنے لگے۔ انداز خطاب کی گرمی نے میر مزاج گرم کر دیا۔ پہلے بہن دماغ کی دہی بنا چکی تھی۔ اب یہ آگئے تھے۔ میں نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر کہا۔ ”ہاں ذرا پھر کہنا کیا کہہ رہے تھے۔“

موصوف نے شاید میرے جملے کی کاٹ کو سمجھا نہیں فوراً بولے۔ ”میں کہہ دیتا ہوں، میری باجی کو اکیلا مت چھوٹے گا۔ ہم چار بھائی ہیں۔ اسے ذہن میں رکھ کر فیصلہ کیجئے گا۔“

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں جواب گھونٹنے سے دیتا۔ ایک ہی گھونٹنے سے اس کے دانت اور اس کی باجی کا سر پھوڑ دیتا۔ مگر یہ بے وقوفی ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھ پر تقریرات پاکستان کی دفعہ 307 لگتی اور میں حوالات میں پھنسی جاتا۔ دانا کہتے ہیں کھانا ٹھنڈا کر کے کھانے میں مزہ ہے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ موصوف شیر ہو گئے۔ گلے فرمانے۔ ”اس کو گولی کو اسی دقت نکال باہر کریں ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو رکھا اور اس سے کہا۔ ”ایک کام کرتے ہیں تمہارے ابا کے پاس چلتے ہیں۔ وہیں بیٹھ کر باجی باتیں کر لیتے ہیں۔“

”ہاں، ہاں یہی اچھا ہوگا۔ وہاں چل کر فیصلہ کر لیتے ہیں۔“ وہ اپنے زعم میں آستین اوپر کرتے ہوئے کہتا چلا گیا اور میں غصے میں بھرتا چلا گیا۔

”ابھی چلتے ہیں۔ ذرا ایک دوست کو فون کرلوں۔“ کہہ کر میں فون کی طرف بڑھا اور اپنے ایک دوست کا نمبر ملائے لگا۔ نمبر ملتے ہی اس سے بولا کہ تم ذرا رضیہ کے گھر آ جانا ایک ضروری بات کرنی ہے۔ رضیہ کے علم میں یہ بات تھی کہ میں نے جسے فون کیا ہے وہ ڈانور کا نامی گراہی شخص ہے۔ کہنے کو اس کی ایک بڑی سی دکان تھی اور وہ کپڑوں کا کاروبار کرتا تھا۔ مجھ سے رجسٹرڈ تھا خریدتا تھا۔ کل بھی وہ اسی سلسلے میں آچکا تھا مگر یہ سب دکھاوا تھا۔ وہ بہت خور تھا۔ بد معاشی کے بیویوں پر اس کا گزارہ تھا۔ فون رکھ کر میں نے الماری سے کچھ کاغذات نکالے اور باہر نکل آیا۔ وہ دونوں بھائی، بہن بھی باہر آ گئے۔ میں نے نیکی لی اور ڈانور کی طرف چل پڑا کہ وہ ہیں رضیہ کا گھر تھا۔

وہ دونوں خوش تھے کہ اپنے گھر میں مجھے خوب بے عزت کریں گے۔ اپنی شرائط منوائیں گے۔ مگر ان کے گھر پہنچتے ہی

میں نے ہانسہ ہی پلٹ دیا۔ میں نے اس کے پاس سے کہا۔ ”آپ سے ایک ضروری بات کہنی تھی اسی لیے آیا ہوں۔“
 ”ہاں ہاں کہو۔“ وہ آج کل کچھ زیادہ ہی مہربان تھے ورنہ وہ بھی مجھ سے بھاگتے تھے کہ میں ان سے کوئی سوال نہ کر دوں۔ کچھ مایک دلوں لیکن جب سے میرے حالات بدلے تھے جس کا اثر ان کے گھر پر بھی پڑا تھا اب وہ میرے لیے مہربان بن گئے تھے۔ مشورہ بھی کرنے لگے تھے۔ گھر کے مسائل بھی ڈسکس کرتے تھے۔

میں نے رضیہ اور اس کے بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ”ابھی نوشاد آتا ہی ہوگا۔ اس کے آنے سے پہلے ہی میں اپنی بات ختم کر لینا چاہتا ہوں آپ کو تو معلوم ہی ہے نوشاد کس قماش کا آدمی ہے۔ باقی کی باتیں وہی کرے گا۔ فی الحال تو میں ایک پرانی بات بتا دوں۔ آپ کو بھی یاد ہوگا جس دن میری منگنی ہوئی اسی دن میرا شادی کا کارڈ اور پانچ سو روپے کر گئے۔ پھر جب شادی ہوئی تو میری نوکری جاتی رہی مگر میں نے حوصلہ نہیں ہارا اور تنگ دو دو میں لگا رہا۔ پھر ایک دن ایک لڑکی ملی میں اسے انسانیت اور خدا ترسی کے تحت گھر لے آیا۔ اس کے آتے ہی قسمت کے دروازے کھل گئے اور مجھے ماننا پڑا کہ دولت عورت کی قسمت سے آتی ہے۔ وہ عورت واقعی خوش قسمتی کی دیوی عابت ہوئی مگر آپ کی بیٹی اسے گھر سے نکالنے کی ضد کر رہی ہے۔“

”ہاں، ہاں اسے میں ایک لمحے کے لیے بھی گھر میں برداشت نہیں کر سکتی۔“ رضیہ نے چیخ کر کہا۔
 ”صحیح کہا۔ بد قسمتی، خوش قسمتی کو بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے یہی کہنا ہے کہ میں خوش قسمتی کے آگے بد قسمتی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے.....“

”ہاں، ہاں تم نے تو یہ سارا گھڑاک ہی اسی لیے پھیلایا ہے۔ کان بھول کر سن لو کہ اب میں اس گھر میں تب تک نہیں جاؤں گی جب تک وہ کہیں رہے گی۔“
 ”ہاں، ہاں میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اب تم یہیں رہو اور اس کے لیے میں تمہیں طلاق دیتا ہوں طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔“

میرے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ نے سب پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔ میں نے آگے کہا۔ ”باقی کی باتیں نوشاد آکر کرے گا۔ اگر کسی نے چون بھی کیا تو وہ اس کے ساتھ خودنٹ لے گا۔“ اتنا کہا ہی تھا کہ دروازے پر نوشاد کی پکار آئی۔

میں نے کہا۔ ”نوشاد بھی آگیا۔ وہ تمہیں حق مہر کی رقم دینے نہیں دے گا پھر بھی میں شرافت کے ساتھ حق مہر کی رقم دے رہا ہوں..... یہ رہے پچاس ہزار روپے.....“ اتنا کہہ کر میں باہر نکل آیا۔

مجھے پتا تھا کہ اس وقت تو سب نوشاد کے خوف سے خاموش رہ گئے مگر میرے نکلنے ہی جگ عظیم سوم شروع ہو گئی۔ بہن سارا الزام بھائی پر اور بھائی، بہن پر دے رہا ہوگا۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جو میں کرنا نہیں چاہتا تھا وہ کر آیا تھا۔ صرف احمد کی آنکھیں دکھانے کی وجہ سے۔ اگر وہ مجھے لٹکانے کی جرات نہ کرتا تو میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاتا۔

نوشاد کے ساتھ دو تین دکانوں کا چکر لگایا اور گھر واپس گھر آگیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ جو ہونا تھا ہو گیا۔ خوش بخت کو گئی ہے تو کیا ہوا یک سب سے تو بڑی نہیں ہے۔ اچھا ہی ہے کہ کوئی ہے۔ کبھی کچھ بولے کی نہیں۔ اس لیے اس کے ساتھ ابھی نکاح پڑھوا لوں گا اور آج ہی ہنی سون ٹریپ پر سوات چل دوں گا۔

دل ہی دل میں پروگرام بناتا ہوا گھر میں داخل ہوا مگر یہ کیا؟ گھر خالی پڑا تھا۔ اکلوتی نوکرانی جو صرف ایک کھنٹے کے لیے برتن دھونے آتی تھی وہ بیٹھی تھی۔ اس نے بتایا کہ خوش بخت اشاروں میں اسے سمجھا گئی ہے کہ وہ میرا گھر ٹوٹے ہوئے نہیں دیکھ سکتی اس لیے جاری ہے، کہاں یہ خود اسے بھی معلوم نہیں۔

اتنا سنتے ہی میں گھر سے بھاگا اور آس پاس کا تمام علاقہ دیکھ آیا مگر وہ کہیں نہیں ملی۔ کافی عرصہ تک میں اسے ڈھونڈتا رہا مگر وہ نہ ملی۔

وہ کیا گئی میری خوش قسمتی بھی ساتھ لے گئی۔ یہ درپہ نقصان ہونا شروع ہو گئے۔ رنگ کے کنٹر خریدے تو سب کے سب لیک والے نکلے جس میں رنگ پوری طرح جم کر خراب ہو چکا تھا۔ کپڑوں کے تھان خریدے تو اینڈ والے رنگ کی چھپائی والا نکلا۔ جس کی وجہ سے کپڑے گلے ہوئے تھے۔ اسی طرح کئی ایک سو دے میں بھاری نقصان ہوا اور میں دیکھتے ہی دیکھتے تلاش ہو گیا۔ گویا بوے، بوڑھے صحیح کہتے ہیں کہ دولت عورت کی قسمت سے آتی ہے اسی لیے میں ایک کے بعد ایک شادی کرتا چلا جا رہا ہوں کہ کوئی تو خوش قسمت نکلے گی۔





محبت گزیدہ

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم

امید قوی ہے کہ مہری آپ بیتی آپ کو بھی پسند آئے گی۔
گوکہ اس سچ بیانی کی مرکزی کردار فیلم ہے مگر میرا رول
بھی بہت اہم رہا ہے۔ پڑھنے والے خود بھی یہی کہیں گے کہ
مرکزی کردار کے ساتھ میرا کردار بھی اہم ہے۔

مونا

(لاہور)

مجھے بچپن سے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ میں نے ڈاکٹر
بننے کی سرٹوڈکوش کی لیکن انسان کی ہر خواہش کب پوری
ہوتی ہے۔ صرف چند نمبروں کی کمی سے میڈیکل میں میرا
ایڈمیشن نہیں ہو سکا۔ میں نے دلبرداشتہ ہو کر بی ایس سی میں
☆.....☆

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ناصر سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن وہ میری ایک بہت اچھی اور پیاری دوست نیلم کا مگھیر ہے۔“

”اچھا اچھا، آپ کی وہ دوست جو یہاں ایڈمنسٹریشن میں ہوتی ہیں۔“

”ہاں وہی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس معصوم اور مخلص لڑکی کا دل تو ریزہ ریزہ ہو جائے گا نورین۔ میں کس طرح اسے بتاؤں کہ.....؟“

”تو کیا نیلم! اپنے مگھیر کو خود یہاں لائی تھی؟“ نورین نے پوچھا۔

”ناصر کو تو وہ ڈاکٹر ابراہم کے پاس لائی تھی۔ اسے کئی دن سے بخار آرہا تھا۔ پہلے تو وہ اپنے محلے ہی کے ایک ڈاکٹر سے علاج کرتا رہا جب اتفاقاً نہ ہوا تو نیلم اسے ڈاکٹر ابراہم کے پاس لے آئی۔“

ڈاکٹر ابراہم نے اس کے کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیئے تھے۔ نیلم کے کہنے پر میں نے وہ ٹیسٹ یہاں کر دیئے لیکن اس کی بلڈ ریڈنگ نے تو مجھے شدید تشویش میں مبتلا کر دیا ہے نورین۔ اللہ کرے وہ کچھ نہ ہو جس میں سمجھ رہی ہوں۔“

نورین خاموشی سے میری بات سنتی رہی۔

”نورین پلےز تم ذرا پانی کامنڈا دو۔ مجھے تو اس رپورٹس نے لرزاکر رکھ دیا ہے۔ اب مجھ سے کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہیں ہوگا۔“

میں نورین کو ہدایات دے کر دوسرے روم میں جا کر بیٹھ گئی تاکہ کچھ آرام کر سکوں۔

میں کوئی کمزور دل لڑکی نہیں تھی کہ یہ ریڈنگ دیکھ کر پریشان ہو جاتی۔ مجھے اسپتال میں موجود اس لیبارٹری سے منسلک ہوئے پانچ سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ میرا نے اس دوران میں بے شمار ترچے سکتے مریض دیکھے تھے۔ بہت سے جلعے مریضوں کا انتہائی بری حالت میں خون ٹیسٹ کیا تھا۔ میں اس کام میں اتنی ماہر اور ایکوتھی کہ ڈاکٹر زبیرت تمام عملہ میری عزت کرتا اور مجھے اپنے کام میں قابل تصور کرتا تھا۔ جیسی اتنی بڑی پتھالوجیکل لیب کا انچارج بنایا ہوا تھا مگر اس وقت میں تنہا کمرے میں بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ اندیشے میں گھری سوچوں کی وادی میں گم تھی۔

نیلم سے میری دوستی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ہم کالج کے زمانے سے ایک دوسرے کے دوست، غم خوار اور رازدار تھے، ہم نے ساتھ انٹر کیا، پھر اس نے میری

میں نے بلڈ سیمپل سات کا بلڈ چیکنگ مشین میں بند کیا اور ریڈنگ کے لیے ٹین دیا دیا۔ دوسرے ہی لمحے ریڈنگ اسکرین پر ابھرنے والے بلڈ کمپوزیشن ریڈنگ نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے ٹیسٹ دوبارہ، پھر تیسری مرتبہ کیا۔ ہر مرتبہ ریڈنگ وہی تھی۔ میرا سر بری طرح پکڑانے لگا۔ میں بہ مشکل اپنی کرسی تک پہنچی اور اس پر ڈھکی گئی۔

میری اسسٹنٹ نورین اپنا کام چھوڑ کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے تشویش سے پوچھا۔ ”خیریت تو ہے میڈم!“

”پلےز مجھے ایک گلاس پانی پلا دو۔“ میں نے اپنے لرزے جسم پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

نورین نے مجھے پانی دیا۔ میں نے ایک سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا۔ پھر نورین سے کہا۔ ”نورین! تم ذرا بلڈ سیمپل کی ایک مرتبہ پھر ریڈنگ کرو۔“

نورین میری بات پر چونکی۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ میں خود ٹیسٹ کرنے کے بعد نورین سے دوبارہ ٹیسٹ کرنے کو کہوں۔

اس نے اچھے ہوئے انداز میں مجھے دیکھا اور ریڈنگ لینے چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے وہی رپورٹ میرے سامنے رکھ دی جو میں پہلے خود چیک کر چکی تھی۔

”اوٹو!“ میں نے بڑبڑا کر کہا۔ ”یہ ریڈنگ تو خاصی ایب نارمل کنڈیشن ظاہر کر رہی ہے۔“ میں نے تشویش سے کہا۔ ”نورین! یہ ناصر ہی کا بلڈ سیمپل ہے نا؟“ میں نے پوچھا۔

”جی میڈم!“ اس نے جواب دیا۔ ”آپ نے خود ہی تو یہ سیمپل لیا تھا۔“ نورین نے کہا۔

”شاید..... شاید کہیں کوئی غلطی ہو رہی ہے۔ تم پلےز، اس بلڈ سیمپل کو ایک مرتبہ پھر چیک کرلو۔“

نورین نے مجھے یوں دیکھا جیسے اسے میرے ذہنی توازن پر شبہ ہو۔

مجھے کچھ کہے بغیر وہ دوبارہ ریڈنگ مشین کی طرف بڑھ گئی اور دوبارہ رزلٹ لے کر آئی تو ریڈنگ وہی تھی۔

میں نے سر جھٹک لیا اور کہا۔ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ایکسیکوز می میڈم!“ نورین نے کہا۔ ”آپ اتنی پریشان کیوں ہیں۔ یہ ناصر صاحب آپ کے کوئی رشتے دار یا عزیز ہیں؟“

طرح بی ایس سی کی بجائے بی اے کو ترجیح دی لیکن ایک ہی کالج میں رہے۔ ہمارے گھر بھی قریب قریب تھے۔

ہماری اتنی اچھی دوستی کا مطلب یہ نہ تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ہم مزاج تھے، ہمارے مزاجوں میں بہت فرق تھا۔ نیلم بہت نرم دل، حساس، خوابوں خیالوں میں رہنے والی، حسن پرست، دھنک، خوشبو، برسات کی دلدادہ اور دل میں لوگوں کے لیے محبت ہمدردی رکھنے والی بہت سادہ مزاج لڑکی وہ لوگوں پر جلد اعتبار کر لیتی تھی۔ اس سے کبھی مجھے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا لیکن اس کی بے ضرر طبیعت سادگی اور محبت نے مجھے مائل کر رکھا تھا۔

وہ مجھ سے دل کی ہر بات کہہ دیتی تھی۔ میں حیران ہوتی، اسے سمجھاتی کہ دیکھو! میری طرح سب دوسروں کے معمولات چھپانے والے نہیں ہوتے۔ اس لیے آئندہ ایسی باتیں کسی سے نہ کرنا اور جاہو تو مجھ سے بھی چھپانا۔ میرا یہی محبت بھرا انداز اس کے دل میں میرے لیے اور اعتماد بڑھا دیتا۔

میں نے بی ایس سی کے بعد اس اسپتال کی لیب جوائن کر لی اور دو سال ہی میں میری مہارت اور قابلیت دیکھتے ہوئے انتظامیہ نے مجھے اس لیب کا انچارج مقرر کر دیا۔ میرا مزاج پریکٹیکل تھا۔ نیلم کے مزاج میں آئیڈیل پسندی اور رو باس تھا۔ تذبذب تھا، ابھی ابھی بیزار اور افسردہ کی لگتی تو کبھی اس کی خوشی اور شہرت میں بچپن رنگ نظر آتے۔ جانے کیوں مجھے کبھی کبھی اس پر بڑا ترس آتا۔ میرا دل چاہتا اس معصوم بے ضرر، محبت کرنے والی لڑکی کو اپنی باتوں میں چھپالوں، نہیں اسے زمانے کی عاریوں اور خود غرضیوں کی ہوانہ لگ جائے۔ کہیں اس کا شے سانا زک دل لوگوں کی فریب کاریوں سے ٹوٹ نہ جائے لیکن جب بھی وہ مجھ سے کسی پریشانی کا اظہار کرتی کسی شخص کی اچھائیوں کے بارے میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتی۔ میں اس کا تجزیہ کرتی جاتی اس کی ایک ایک بات سنی اور اسے زمانے کے سرد و گرم سمجھانے اور لوگوں سے ہوشیار رہنے کی تلقین کرتی۔ وہ میری ساری باتیں سن تو لیتی مگر دامن جھڑک کر اٹھتی اور پھر وہی کرتی جو اس کا پاگل دل کہتا۔ جب وہ کسی شخص سے فریب کھاتی تو پھر میرے ہی پاس آ کر ان کا روٹا روٹی اور کبھی، ہاں تم نے صحیح کہا تھا مگر میں کیوں کسی کو بلاؤ۔ غلط سمجھوں، کیوں شاکی رہوں؟ اور کچھ دن بعد وہ پھر ویسی ہو جاتی۔

نیلم کے گھریلو حالات بھی میری نظر میں تھے۔ وہ لوگ مالی طور پر بھی کمزور تھے۔ اس کے بڑے بھائی اور والد ان کے گھر کا بوجھ اٹھا رہے تھے۔ پھر نیلم سمیت تین بہنیں اور ان کے گھر میں وہی متوسط طبقے والے معاشی اور شادی کے مسئلے تھے۔ نیلم سے بڑی بہن بھی گریجویشن کے بعد گھر بیٹھ گئی تھی۔ کچھ معمولی شکل اور سانولے رنگ کی وجہ سے اور کچھ ان کی اپنی اونچی پسند کی وجہ سے رشتہ نہ ہو پاتا تھا اور ان کی عمر چونتیس۔۔۔ سے اوپر پہنچ چکی تھی۔

نیلم کا رنگ تو صاف تھا مگر نہ اس میں امورِ خانہ داری سکھنے کا شوق تھا اور نہ پڑھنے کی لگن۔ انٹر سائنس کر کے بڑی مشکل سے میرے سمجھانے پر اس نے بی اے کیا تھا۔

اسپتال کی لیب جوائن کرتے ہی میں نے نیلم کو بھی اکیلے کرنے کی کوششیں کیں کہ کہیں جاب کرے تاکہ ذہن بے کار نہ رہے اور پھر میں نے کچھ عرصے بعد اسے بھی اپنے اسپتال کے ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ میں اسٹنٹ لگوادیا۔

کالج کے زمانے میں جب میری نیلم سے دوستی ہوئی تو اس وقت وہ اپنے کزن کی محبت میں جھلائی۔ وہ لڑکا ارشد نیلم سے بڑا تھا مگر تین سال میں انٹر مکمل نہ کر پایا اور کسی ٹیکنیکل کورس میں لگ گیا۔ نیلم اس کے اہمیت دینے جانے پر دل و جان سے فدا تھی۔ اس کے محبت بھرے خطوط مجھے لا کر دکھاتی۔ اس سے ملاقات میں اس کی طرف سے اشاروں کنایوں میں کیے جانے والے عہد و بیان بتاتی۔

مجھے وہ لڑکا کبھی بھی نیلم سے تعلق محسوس نہ ہوا، اس لیے میں نیلم کو سمجھاتی کہ شادی اور محبت میں ایسے غیر ذمے دار لوگ کہاں تعلق ہو سکتے ہیں۔ یہ سب خواب شادی کے بعد عقل پر چتر بن کر برستے ہیں لیکن ان معاملات میں کسی کو بھی سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے اور یہ تو پھر نیلم بھی جن خوابوں کی اہمیت اور محبت کی پیاسی۔

نیلم کو ہوش آیا تو اس وقت جب ارشد اپنے کورس کی بنیاد پر سعودی عرب کی ایک مہینہ میں ٹیکنیشن کی جاب حاصل کر کے اسے نظر انداز کر کے کچھ کہے بغیر سعودی عرب چلا گیا۔ نیلم کا نازک شے سادل تو چھ کر رہ گیا۔

نیلم میرے سینے سے لگ کر خوب روئی۔ وہ روتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔ ”ہاں مونا! تم صحیح کہتی تھیں۔ وہ تو بہت خراب نکلا چلا جاتا وہ، میں کب روئی اسے مگر مجھے بتاتا تو۔ وہ تو مجھ سے شادی کے لیے یہ ضد تھا۔ میرے بغیر اس کا ایک لمحہ نہ گزرتا تھا، لیکن اب..... اب وہاں کیسے رہے

”وہ جو میرے ساتھ کام کرتے ہیں وہ کسی سے تذکرہ کر رہے تھے۔“

”اچھا اسی لیے وہ تین دن سے نظر نہیں آیا۔“
 ”اس کی تین بیٹیاں ہیں اور سنا ہے کہ اس کی کسی بہن کی معافی ٹوٹ گئی ہے۔“

”اچھا، کیوں؟“
 ”جیسی اس لڑکے کی عادتیں اچھی نہیں تھیں اور وہ نشے کا عادی بھی تھا۔ فیروز کے والد کو معلوم ہوا تو انہوں نے اپنی بیٹی کی معافی توڑ دی۔“

”اوہ، بہت افسوس ہوا، ابھی آج کل تو کسی پر اعتماد کرنا بھی کتنا مشکل ہے۔ میرے خیال میں اسی لیے فیروز کی والدہ کی طبیعت خراب ہوئی ہوگی، آخر ماں ہے ناں، بیٹیوں کے دکھ تو پیدائش کے ساتھ ہی محسوس کر لیتی ہے۔“ مجھے اس واقعے پر محورت کی مظلومیت کے سارے دکھ یاد آ گئے۔
 ”لڑکیوں کی زندگی اتنی مشکل کیوں ہوتی ہے موتا۔“

نیلیم نے معصومانہ انداز سے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔
 ”ہونہ، پتا نہیں۔“ میں نے اسے ٹالنا چاہا۔
 ”فیروز کتنا افسردہ ہوگا۔“ نیلیم نے خود کلامی کی۔

جس دن فیروز آفس آیا، نیلیم اسے لے کر میرے پاس آگئی۔ میں نے فیروز سے اس کی والدہ کی خیریت پوچھی تو اس نے بتایا کہ انہیں ہارٹ ایک ہوا تھا۔ اب طبیعت بہتر ہے۔

فیروز بہت پریشان اور غمزدہ سا لگ رہا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ لڑکوں کے ساتھ بھی کم مشکلات نہیں ہیں۔ روزگار کی تلاش میں بھٹکتے پھرتے ہیں، بڑی مشکل سے کسی جگہ مل جائے تو آفس میں مزدوری سے زیادہ محنت سیاست اور سازشوں میں وقت گزارنا، اپنا مقام بنانا اور گھر لوٹیں تو گھر کی الجھنیں، بیٹیوں، بہنوں کی شادی کے مسائل الگ۔ شاید زندگی انہی آزمائشوں کو سہنے کا نام ہے۔

کچھ دن پونہ گزر گئے۔ فیروز کے حالات سن کر مجھے بھی اس سے ہمدردی ہو گئی تھی اور نیلیم تو تھی ہی اس کی گھائل۔

ایک دفعہ میں بیمار ہو گئی۔ مجھے تین دن لیب سے چھٹی کرنی پڑی۔ چھٹی کے تیسرے دن شام کو نیلیم میرے گھر آگئی۔ میں بھی میری طبیعت پوچھنے آئی ہے لیکن خیریت پوچھنے کے بعد جو کہانی سناری تھی اسے میں پچھلی پچھلی آنکھوں سے سن رہی تھی۔

گا..... جھوٹا دغا باز! میں اس کے لیے یہ اہمیت رکھتی تھی، یہ محبت تھی اسے مجھ سے؟“

میں نیلیم کو تسلیاں دیتی رہی۔ جب وہ رو کر اپنا غبار نکال چکی تو میں نے کہا۔ ”چھوڑ نیلیم تم اس کے لیے کیوں اپنا جی جلاتی ہو۔ تم اس سے زیادہ تعلیم یافتہ ہو، بس اب یہ جذباتیت چھوڑو۔ میں نے تمہارے لیے اسپتال میں اسٹنٹ کی جاب کا بندوبست کر دیا ہے۔ اپنے آپ کو قابل اور اہم بناؤ۔ وہ تمہارے قابل نہ تھا اسے بھول جاؤ اور مستقبل کی طرف دیکھو۔“

یوں نیلیم میرے ساتھ ہی جاب کرنے لگی صرف ہمارے ڈیپارٹمنٹ مختلف تھے۔

مجھے جاب کرتے ہوئے دو سال اور نیلیم کو ایک سال ہو چکا تھا۔ وہ ارشد کو بھول چکی تھی۔ ایک دن اس نے بتایا کہ اس کے ڈیپارٹمنٹ کا لڑکا فیروز اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔

میں نے خاموشی سے سنا اور ٹال دیا۔ اب موقع بہ موقع ملاقاتوں میں نیلیم کے پاس بات کرنے کا موضوع صرف فیروز ہوتا تھا۔ وہ لوگ بھی کبھار کھانے کے وقفے میں یا کام کر کے میرے پاس لیب میں آجاتے۔ یوں فیروز سے میری بھی اچھی شناسائی ہو گئی۔

کئی چوڑی جسامت، فرنج کٹ داڑھی اور اس پر چشمہ لگے فیروز واقعی پروکار اور سنجیدہ شخصیت محسوس ہوتا۔

فیروز ہمارے اسپتال میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ اس کے علاوہ اچھی کتب کے مطالعے اور حالات حاضرہ سے دلچسپی نے اس کی معلومات اور انداز گفتگو کو بڑا مہذب اور عالمانہ بنا دیا تھا۔ نیلیم سے اس کا متاثر ہو جانا، میرے لیے کوئی اچھبے کی بات نہ تھی لیکن مجھے اس بات سے کوئی خوشی اس لیے نہ ہوئی کہ میں نے فیروز میں بھی نیلیم کے لیے دلچسپی محسوس نہیں کی۔

فیروز سے جب بھی میری ملاقات ہوتی تو گفتگو آفس کے معاملات یا حالات حاضرہ پر بھی ہوتی لیکن نیلیم کے ذریعے مجھے اس کی کچھ نجی زندگی کے متعلق بھی پتا چل چکا تھا۔ اس کی وجہ کچھ تو نیلیم کی ہمدرد طبیعت تھی اور کچھ فیروز میں دلچسپی لینے سے جس کا جذبہ ایک دن وہ بڑے زور و شور سے مجھے بتا رہی تھی۔ ”یار موتا! پتا ہے فیروز بے چارے کی والدہ سخت بیمار ہیں۔“

”اچھا تمہیں کس نے بتایا؟“

”موننا! میں..... میں اب فیروز کے بغیر نہیں رہ سکتی
یار! مجھے وہ بہت اچھا لگتا ہے۔“

”تو تم کب اس کے بغیر رہتی ہو، سارا دن تو ساتھ
ہوتی ہو آفس میں اور جھا لگنا بھی پرانی اطلاع ہے۔“ میں
کھینچے ہوئے بھی اس کی بات نہ سمجھ کر شوخی سے اس کی طرف
دیکھ رہی تھی۔ ”اور تمہیں اتنا پاگل ہونے کی کیا ضرورت
ہے۔ کیا اس طرح الجھا پریشان حلیہ بنا کر تم اسے شادی پر
راہی کر لو گی۔“ میں نے اس کے بے ترتیب بالوں اور
سادے کپڑوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”شادی کا تو پتا نہیں، لیکن..... لیکن موننا! اس نے
مجھ سے کل محبت کا اقرار کر لیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا میں اسے
بہت اچھی لگتی ہوں۔ میں شام کو آفس آف ہونے کے بعد
باہر اسٹاپ پر آئی تو پیچھے وہ بھی آگیا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا
چلو اگلے اسٹاپ سے بیٹھیں گے۔ میں اس کی بات مان گئی۔
اس کی رفاقت تو میری بھی خواہش تھی۔ چلتے چلتے اس نے
مجھ سے پوچھا کہ مجھے اس کے ساتھ چلنا کیسا لگ رہا ہے۔
میں کیا جواب دیتی اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں
محبت کے دیپ جمل رہے تھے۔ میں نے شرمناک گردن جھکا
لی اور خاموشی سے چلتی رہی۔ پھر اس نے مجھ سے قریبی
ہوٹل میں چائے پینے کے لیے کہا۔ میں حیرت زدہ تو تھی ہی اس
کے اصرار پر بخ نہ کر سکی۔ میں پہلی مرتبہ کسی غیر مرد کے ساتھ
یوں ریسٹوران میں گئی تھی۔ ہماری ٹیبل کا رخ دیوار کی
طرف تھا۔ میں نشست پر بیٹھی تھی فیروز بھی ادھر میرے
قریب بیٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے کھانے پینے کی خواہش کا
پوچھا اور پھر میرے منہ سے منع کرنے پر صرف چائے کا آرڈر دے
دیا۔“

پھر اس نے ہوٹل کی تصویر کشی شروع کر دی۔

”کیسا لگ رہا ہے میرا قریب؟“ اس نے مجھے

دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”آپ..... آپ ادھر بیٹھ جائیں۔“ مجھے اپنا دل بے

قابو ہوتا ہوا محسوس ہوا کہ اس کے جسم کا کس میرے وجود میں
نشر بن کر اتر رہا تھا۔

پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تمام لیا،
مضبوطی سے پکڑ لیا پھر اچانک اپنے ہونٹ میری ٹیبل پر رکھ
دیئے۔ وہ میرے اتنے قریب بیٹھا تھا کہ مجھے یقین نہ آیا۔
اس نے اپنا ہاتھ میرے چہرے کی طرف بڑھایا اور سرگوشی
میں میرے چہرے کے قریب آتے ہوئے ہونٹ سکڑے

جین مت

چھٹی صدی قبل مسیح کو تاریخ انسانیت میں
خاص اہمیت حاصل ہے۔ شاید پوری دنیا میں
انسانوں پر ویسے ہی نفسیاتی و جسمانی مظالم
ڈھائے جا رہے تھے جو ہندی آریاؤں نے
اقتصادی ترقی و خوشحالی اور تہذیبی جم جماد حاصل
کرنے کے باوجود ذات پات کی تفریق، فلسفہ
تنازع اور انسانی و حیوانی قربانیوں کی صورت میں
روا رکھے۔ شاید انہی مظالم کا رد عمل تھا کہ اس
زمانے میں چین اور ہندوستان سے لے کر
ایران اور یونان تک مختلف ملکوں میں بڑے
بڑے معلم، فلسفی اور مذاہب کے بانی پیدا
ہوئے۔ اس صدی میں ہندوستان میں گوتم بدھ
اور مہاویر پیدا ہوئے، چین میں کنفیوشس اور
لاؤ زے، ایران میں زرتشت اور یونان میں فیثا
غورث۔ آج تک مورخین یہ معلوم کرنے سے
قاصر ہیں کہ چین مت کی بنیاد کس طرح، کہاں
اور کب رکھی گئی مگر جینی لوگوں کا کہنا ہے کہ چین
مت ابدی اور غیر قاتی ہے۔ یہ اس وقت سے
ہے جب کائنات کا ظہور ہوا اور جب تک
کائنات قائم ہے، چین مت بھی قائم رہے گا۔
ان کے خیال کے مطابق جینی پیامبر وقتاً فوقتاً
نوع انسان کی اصلاح کے لیے ظاہر ہوتے
رہے۔ ان کے نزدیک آخری جینی پیامبر
مہاویر (560-468 ق م) ہیں۔ ان کا اصل
نام ورودھ مان ہے اور مہاویر لقب ہے یعنی
بہادر اعظم۔ وہ صوبہ بہار کے ایک کھتری حکمران
خاندان کے راج کمار تھے۔ پنڈے کے قریب
ویسالی میں پیدا ہوئے۔ گوتم بدھ کے ہم عصر
تھے۔ تیس برس کے تھے کہ ان کے والدین کا
انتقال ہو گیا اور انہوں نے دنیا اور اس کی
آساکشوں سے تنگ ہو کر تاج و تخت کو خیر باد کہا
اور سچائی کی تلاش میں جنگل کی راہ لی اور تہا سخت
ریاضت کی۔ بارہ برس کی ریاضت کے بعد آخر
عرفان حاصل ہوا اور وہ مہاویر کہلانے لگے۔

مرسلہ: نوید عثمانی، ملتان

لیکن میں نے فوراً اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر زور سے پیچھے کر دیا۔

”ایک بار تھوڑا سا۔“ وہ گڑگڑایا لیکن میں نے اسے سختی سے منع کیا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جاتے جاتے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ہماری ملاقات کے اس پہلو کا کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے لیکن تم..... تم موت! میری دوست میری راز دار ہونا، تم سے کیا پردہ۔“

میں جراتی سے نیلم کے چہرے پر پھیلی عشق کی انتہا دیکھ رہی تھی۔ نیلم کو سمجھانا تو میرے لیے ہمیشہ ہی مشکل رہا تھا، اب تو مشکل ترین ہو گیا تھا کہ اب اس محبت میں لسانیاتی حدت بھی شامل ہو گئی تھی۔

نیلم کی محبت اور سادگی سے مجھے ہمیشہ یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ کوئی غلطی نہ کر بیٹھے۔ فیروز کی سنجیدہ شخصیت سے مجھے کسی بڑی غلط بات کی امید تو نہیں تھی مگر جو کہانی نیلم نے مجھے سنائی تھی اس میں غلط بیانی نہیں ہو سکتی تھی۔ نیلم اپنے باطن سے ظاہر تک مجھ پر اپنی ہر خلوت میں عیاں تھی مگر فیروز کے انداز میں یہ تبدیلی مجھے چونکا گئی۔ میرا ذہن مختلف پہلوؤں پر تیزی سے غور کر رہا تھا۔ میں خاموشی سے اسے سختی رہی۔ میں نے سوچا کہ اگر فیروز واقعی نیلم سے شادی میں انٹرسٹڈ ہے تو بہت اچھی بات ہے لیکن اگر نہیں تو مجھے فیروز کو نیلم کی سادگی اور محبت سے فائدہ نہیں اٹھانے دینا چاہیے تھا۔ نیلم اتنی جذباتی ہو رہی تھی کہ اس نے دو دن کی چٹنی کر لی یوں مجھے فیروز سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔

آفس میں کھانے کے وقفے میں فیروز میرے پاس آگیا۔ کھانے کے دوران میں نے اس سے باتوں باتوں میں کہا۔ ”بھئی فیروز! آپ یہ بتائیں کہ شادی کب کر رہے ہیں۔“

”جب تم کہو۔“ اس نے شوخی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نئے انداز اور ”تم“ سے مخاطب کرنے پر میں چونکی لیکن میں نے یہ بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”تو کیا جب میں کہوں جس سے کہوں، آپ اس سے راضی ہو جائیں گے۔“

”بھئی تمہاری آدمی بات صحیح ہے لیکن جس سے کہوں سے کیا مطلب۔“

”بھئی نیلم سے اور کوئی ہوگی اتنی اچھی، اتنی معصوم اور اتنی محبت کرنے والی۔“ میں نے بات چھیڑی۔

”بہت خوب، اچھا لطیفہ ہے بھئی! اچھی، معصوم اور محبت کرنے والی، ہونہر، میرا خیال ہے مس مونا آپ بہت زیادہ ہی کہہ رہی ہیں، مجھے تو آپ جیسی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔“

فیروز نے اس تیزی کے ساتھ تیر پیچہ کا تھا کہ میں لرز کر رہ گئی۔ یعنی فیروز نے نیلم کو بے وقوف بنایا اور اب شاید میری طرف، میں خاموش نیچے نگاہ کیے رہی وہ شاید سمجھ رہا ہو کہ میں اس کے اس طرح اظہار پسندیدگی پر شرم سے سر نیچے کیے بیٹھی ہوں لیکن میں سوچ رہی تھی کہ میں نیلم کو کس طرح فیروز کی نیت کا پتا دوں، کیا وہ محبت میں اندھی میری بات پر یقین کرے گی۔

چند دنوں بعد نیلم نے مجھے بڑی پریشانی اور نظر سے بتایا کہ اس کے لیے رشتہ آیا ہے۔ گھر والے اسے قبول کرنے کے لیے بڑی سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں لیکن میں اب فیروز کے علاوہ کسی سے شادی کے لیے راضی نہیں ہوں۔

میرے لیے ایک نئی مشکل پیدا ہو گئی کیونکہ میں جانتی تھی کہ شادی کیا فیروز تو اس کی عزت بھی نہیں کرتا پھر یہ کیسے ممکن ہے۔ میرے لیے نیلم کو سمجھانا آسان نہ تھا اگر میں فیروز کی برائی کرتی، فیروز سے دور رہنے، محبت چھوڑنے کا کہتی تو اس کے مجھ سے بدگمان ہونے کا خطرہ تھا۔ وہ یہ بھی سمجھ سکتی تھی کہ شاید میں فیروز میں انٹرسٹڈ ہوں اور اسے شادی کے لیے راضی کر کے فیروز سے اپنی لائن کلیئر کرنا چاہتی ہوں۔ یہ وہ نازک معاملہ تھا جو دوستی کو شک کے ذریعے کھا سکتا تھا اور اگر خاموش رہتی کہ نیلم کی ہاں میں ہاں ملائی تو کہیں نیلم کا یوں گھر آئے ہوئے رشتے سے انکار بہت برا ہوتا۔ میں نیلم کے معاملے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔“

”نیلم کا رشتہ آیا ہے۔“ میں نے فیروز کو اطلاع دی۔ ”بہت اچھی بات ہے، اس کی تو جلد از جلد شادی ہو جانی چاہیے۔“

”اور؟ آپ کو بھی تو جلد شادی کر لینی چاہیے۔“ میں نے اسے جملہ لوٹایا۔

”ہم تو یہی چاہتے ہیں، بس آپ کے تیار ہونے کی دیر ہے۔“ فیروز کی آنکھوں میں خواہشوں کے دہپ جل اٹھے۔

”فیروز! آپ ایک بات مانیں گے۔“ میرے ذہن

میں ایک خیال تیزی سے آیا۔

”ہاں ہاں کو، جان دول سے مانیں گے۔“

”وہ..... دراصل نیلم اپنے گھر آئے ہوئے رشتے پر آپ میں اثر سٹھ ہونے کی وجہ سے راضی نہیں ہو رہی۔ آپ تو راضی نہیں لیکن میں یہ بتا کر اسے رنجیدہ نہیں کرنا چاہتی میں کسی طرح اسے رشتے پر راضی کرنا چاہتی ہوں۔“

”ہاں تو میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”میں آپ کی فرضی معافی کا اسے بتا دیتی ہوں، آپ اس کی تصدیق کر کے اپنی مجبوریوں کا بہانہ بنا دیجیے گا۔“

میری بات سن کر فیروز کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا لیکن شاید نیلم سے پچھا چڑانے اور مجھ میں اثر سٹ کی وجہ سے راضی ہو گیا۔

”نیلم! تمہارے سلسلے میں میری فیروز سے بات ہوئی ہے۔“

”اچھا! کیا کہا؟“

”تم اسے اچھی تو لگتی ہو مگر وہ تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ دراصل اس کی نسبت اپنی کزن سے ملے ہوئے اور اس کے گھروالے تمہارے لیے راضی نہیں ہو سکتے۔ اس نے تم سے درخواست کی ہے کہ تمہیں شادی کر لینی چاہیے۔“

میرے اندیشے کے مطابق نیلم متوجش اور بے یقینی کے عالم میں تھی جیسے میری بات اسے سمجھ نہ آ رہی ہو۔ وہ مزید کچھ نہ بولی۔ میں اسے بدگمانی، دکھ اور بے یقینی میں چھوڑ کر گھر آ گئی۔ میں اس کے علاوہ کیا کر سکتی تھی۔ تھوڑا بہت تو دکھ اٹھانا ہی تھا اس لیے اگر اصل بات پتا چل جاتی تو شاید وہ شرم سے مر ہی جاتی۔

دوسرے دن وہ آئس نہ آئی۔ فیروز کی زبانی معلوم ہوا کہ نیلم نے اسے فون کیا تھا۔ فیروز کو معافی کی مبارک باد دی گئی۔ میری ہدایت کے مطابق فیروز نے اس کا دل دکھانے پر معذرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس کی معافی اگلے بدلے میں ہوئی ہے لہذا وہ معافی توڑ کر اپنی بہن کے گھر کو تباہ نہیں کر سکتا اس لیے بہت مجبور ہے اور اس نے نیلم سے التماس کیا، اسے سمجھایا کہ ابھی رشتے بار بار نہیں آتے، لہذا شادی کے لیے راضی ہو جائے۔

یوں نیلم فیروز کی خواہش پر بادل نخواستہ شادی پر راضی ہو گئی۔ یوں میری ترکیب سے نیلم بڑے غم سے ٹوٹے بغیر نکل آئی لیکن اس حادثے نے اسے بدل کر رکھ دیا، اس نے ناصر کے ساتھ شادی کے لیے راضی ہونے کے ساتھ

جواب سے استغنی دے دیا۔

ناصر بینک آفیسر تھا۔ کچھ دنوں بعد نیلم کی بڑی دھوم دھام سے معافی ہو گئی۔ ایسا لگتا تھا نیلم نے فیروز کی محبت کو اپنے اندر کی گوشے میں چھپا کر مبرا کر لیا ہے۔

مجھے ناصر، نیلم کے ساتھ بہت اچھا لگا۔ ناصر سے میرا تعارف ہوا، میں نے اسے مبارکباد دی۔

معافی کے بعد ایک دن نیلم ناصر کے ساتھ میرے پاس لیب آئی۔ پرنیڈ کاشن کے سوٹ پر بڑا سا گرین دوپٹا سر پر اوڑھتے ہوئے بڑی برق دار اور گھری ٹھری لگ رہی تھی۔

ناصر سے گفتگو کر کے مجھے احساس ہوا کہ وہ کافی حد تک لڑکیوں کی پسند اور آزادی کا قائل ہے اور نیلم کو آزادی ہے کہ وہ اپنی پسند سے زندگی گزارے۔ نیلم بڑی سنجیدگی اور خاموشی سے ہماری باتیں سنتی رہی۔ ابھی ہم لوگ گفتگو کر رہے تھے کہ فیروز آ گیا۔ نیلم کو دیکھ کر وہ ٹھک گیا۔ نیلم نے بھی اسے دیکھ کر ایک دم چہرہ نیچے کر لیا۔ میں نے فیروز اور ناصر کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔ فیروز نے نیلم اور ناصر کو مبارکباد دی۔ نیلم اور ناصر کے جانے کے بعد فیروز بڑی حیرانی سے مجھ سے کہہ رہا تھا۔

”واہ بھئی، نیلم کے تو انداز ہی بدل گئے ہیں، اتنی اچھی کیسے ہو گئی۔“

”اچھی تو وہ پہلے بھی تھی فیروز صاحب، بس آپ کو شک کرنے اور ظاہر سا اندازہ لگانے کی عادت ہے۔“ میں نے اس کی بات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

نیلم کی شادی کی تاریخ تین مہینے بعد کی ٹھہری تھی۔ ایک مہینے بعد ناصر میرے پاس آیا۔ وہ کچھ بیمار پتا تھا تھا سا لگ رہا تھا۔ اس نے خیر خیریت کے بعد میری طرف ڈاکٹر کی سلیپ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کچھ دنوں سے طبیعت صحیح نہیں ہے۔ بخار ہو جاتا ہے اور بہت کمزوری محسوس ہو رہی ہے میں نے ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے چیک اپ کے بعد ٹیسٹ لکھ کر دیئے ہیں۔ میں نے سوچا آپ کی لیب سے کرائوں۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ آپ کوئی غیر تھوڑی ہیں۔“

پھر میں نے خود ناصر کا بلڈ لیا، اسے سرخ سے ٹیوب میں ڈالا اور لیب نمبر ڈال کر ریک میں ٹیسٹ کرنے کے لیے رکھ دیا۔

☆.....☆

ناصر کی ٹیسٹ رپورٹس نے مجھے لرزہ کر رکھ دیا تھا۔

تھی۔

میں نے گہرا کر پوچھا۔ ”کیوں کیا ہوا نیلم کو، خیریت تو ہے ناں۔“

”صبح ہم نے دیکھا کہ وہ دیر تک سو رہی ہیں۔ بھرہٹا چلا کہ بے ہوش ہیں۔ کئی کوششوں کے بعد جب وہ ہوش میں نہ آئیں تو ہم فوراً کلینک لے گئے۔ ڈاکٹر کی تین گھنٹے کی کوششوں سے ان کی زندگی بچی ہے شاید کوئی غلط چیز پیٹ میں چلی گئی تھی۔ امی نے ابھی آپ کو فون کا کہا۔ آپ آ رہی ہے ناں۔“

”ہاں ہاں ابھی چھٹی لے کر آتی ہوں۔“ میں اپنے اسپتال سے کلینک چلی گئی۔

میں وہاں پہنچی تو نیلم کے سارے مگر والے موجود تھے۔ انہوں نے بھی وہی تفصیل بتائی۔ نیلم اپنے بڈ پر سو رہی تھی۔ نیلم کے ڈاکٹر سے ملی تو اس نے بتایا۔ ”نیلم نے آخر شب نیند کے کپسول کھا کر خودکشی کی کوشش کی تھی اس بے ہوشی میں اسے اسپتال پہنچایا گیا اگر ذرا اور دیر ہو جاتی تو نیلم نہ بچ پاتی۔ ان کے والد نے درخواست کی ہے کہ یہ بات کسی کو نہ بتائی جائے آپ کیونکہ اس فیملی کی ہیں۔ دوست ہیں تو نیلم کی امی نے آپ کو بتانے کی اجازت دے دی ہے تاکہ آپ نیلم کو سمجھائیں۔“

میں نیلم کے اس انتہائی اقدام پر حیران رہ گئی۔ ”کیوں آئی؟ ایسی کیا بات ہوئی تھی جو نیلم نے یہ کیا۔“ نیلم کی امی کی حالت انفرادی اور تھابت سے قائل رحم ہو رہی تھی۔

”بس بٹا کیا بتائیں زعدگی کی آزمائشیں ختم ہی ہونے نہیں پاتیں۔ نیلم کی مگنی سے جو تھوڑی خوشی ملی تھی ناصر کی بیماری کا سن کر خاک ہو گئی دوسرے وہ نئے کا بھی عادی ہے بتاؤ بھلا ایسے کیسے ہم اپنی بیٹی کو جانتے ہو جیسے جنم میں جھوک دیں۔ کل شام ہی نیلم کے والد کو یہ بتا چلا وہ تو صاف لڑکے والوں کو انکار کر آئے جب نیلم کو پتا چلا تو وہ خوب روئی اور ہڈیانی انداز میں جھپٹی رہی کہ مجھے اب بس میری قسمت پر چھوڑ دیں۔ اسی سے کر دیں میری شادی، آپ مگنی کر کے ناصر سے میری شادی کا وعدہ کر چکے ہیں۔ رات گئے تک مگر میں یہی افراتفری رہی۔ نیلم غالباً ساری رات جاگتی رہی اور صبح کے وقت کپسول کھا کر خودکشی کی کوشش کی۔ بٹا! تم تو اس کی اچھی دوست ہونا میری بیٹی کو سمجھاؤ اسے بھگتے سے بچالو۔ میں تمہاری ہمیشہ احسان مند رہوں گی۔“ نیلم کی امی

اسے محض بخار اور کمزوری نہیں تھی اس کی ٹیسٹ رپورٹس دیکھ کر میرے ذہن میں کئی اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔ میرا تجربہ جو کچھ کہہ رہا تھا اسے نظر انداز کرنا آسان نہ تھا کہ میں نے سیکڑوں لوگوں کے بلڈ ٹیسٹ کیے تھے اور بیمار یوں اور ان کی علامات کے متعلق میرے اندازے کافی حد تک صحیح ہوتے تھے لیکن میں اس وقت سر جھکائے پریشان اندازوں کے غلط ہونے کی دعا کر رہی تھی۔ ہمارے لیب کے پچھا لوجسٹ صاحب کے سامنے رپورٹس رکھتے ہوئے اس کے بارے میں پوچھا۔

”ان کے سفید ملاز کی تعداد TLC اور لیور فنکشن (جگر کا افعال) بہت ڈسٹرب ہے۔“

پھر ڈاکٹر صاحب نے بڑے انہماک سے ناصر کی بلڈ سائیز دیکھیں۔ ”ناصر کے بلڈ ملاز پلس کروٹ کنڈیشن ظاہر کر رہے ہیں میرا خیال ہے ان میں کینسر کی ابتدا ہو گئی ہے۔“

”اوہو!“ میرا وجود لرز گیا، جب کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو کنٹرول کیا۔ پچھا لوجسٹ کے جانے کے بعد بھی میں خاموش بیٹھی رہی۔

مجھے نیلم اور ناصر کی مگنی کا دن یاد آ رہا تھا۔ کیسے نیلم کو سجا کر ناصر کے پہلو میں بٹھایا گیا تھا۔ لڑکیاں ڈھونک کی تھاپ پر گیت گارہی تھیں۔ لوگ مبارک باد دے رہے تھے اور چند ماہ بعد ان کی شادی تھی۔ مگنی کے ایک مہینے بعد ناصر کو یہ تکلف شروع ہو گئی۔ لیور فنکشن کی خرابی کینسر کی ابتدا کا باعث ہو گئی تھی اس کا مطلب تھا کہ ناصر کو نشہ آور چیزیں استعمال کرنے کی بہت زیادہ عادت ہے۔

میں اپنے آپ میں استہانت نہ پاتی تھی کہ نیلم کے مگر والوں کو ناصر کی اس بیماری یا اس کی نشے کی عادت ہونے کی خبر پہنچاؤں ابھی چند دن پہلے تو میں جب نیلم کے مگر گئی تھی تو ان کے مگر میں نیلم کی شادی کی زور و شور سے تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ شاپنگ ہو رہی تھیں دوپٹوں پر بیٹلیں لگائی جا رہی تھیں۔ اب میں انہیں یہ بتاؤں۔

میں کب تک یہ خبر چھپاتی۔ مجبوراً بتانا پڑا۔ میں نے فون کی مگنی پر ریسور اٹھایا تو دوسری طرف نیلم کی چھوٹی بہن بول رہی تھی۔

”موننا باجی! نیلم باجی کی طبیعت بہت خراب ہے، وہ ہمارے قریبی کلینک میں داخل ہیں۔“ اس کی آواز روہانسی

میرے ہاتھ تھے گڑگڑا رہی تھیں۔ ان کے آنسو میرے ہاتھ اور دامن پر گر رہے تھے۔

میں نے انہیں تسلی دی پھر انہیں آرام کے لیے گھر چھوڑ آئی۔ میں نے اپنے لیب سے نیلم کی تیار داری کے لیے چھٹی کر لی۔ نیلم کا گھر قریب ہی تھا۔ شام کو نیلم کی طبیعت کچھ بہتری میں رات گزارنے اپنے گھر چلی گئی اور نیلم کے پاس رات بھر ان کی والدہ رہیں۔

دوسرے دن نیلم کے ہوش و حواس کچھ بحال ہوئے لیکن اتنے بڑے حادثے کے بعد وہ گم سم تلاؤں میں دیکھ رہی تھی کسی سے بات کرنے کے قابل نہ تھی۔ اس کو ہلکی غذا میں دی جا رہی تھیں۔

لیکن وہ کمزری بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ تیسرے دن میں آفس مینی تو نیلم کی وجہ سے پریشان اور خاموش تھی اپنا کام نشا کرا لگ روم میں آ بیٹھی۔ دوپہر کے لچ بڑیک میں میرا دل کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ نورین کھانا کھا کر دوبارہ کام میں لگ گئی۔ میں سر جھکا کر بیٹھی۔ میرے ہاتھ میں کیا تھا جو نیلم کی مدد کرتی۔ نیلم کے گھر والے اس صورت میں ناصر کے ساتھ بھلا کیسے نیلم کی شادی کے لیے تیار ہو جاتے۔ میں اپنے اندر قناعت محسوس کر رہی تھی، اپنی ہمت کو جمع کر رہی تھی کہ کسی کے قدموں کی چاپ ابھری۔ میں نے سر اٹھایا۔

”فیروز؟“ اسے دیکھتے ہی میرے دل میں نفرت بھر گئی۔

”خیریت تو ہے، کہاں غائب تھیں بھئی۔“ اس نے بے تکلفی سے بیٹھتے ہوئے اپنائیت سے پوچھا۔

”کیوں، آپ کو کیا فکر، میں مروں یا جیوں۔“ میرا لہجہ تپتی اور زہر سے بھرا تھا۔

”..... یہ کیا کہہ رہی ہو، میں نے تو دو دفعہ تمہارے گھر بھی فون کیا مگر پتا چلا کہ تمہاری کسی دوست کی طبیعت صحیح نہیں ہے تم اسپتال گئی ہو اور اب تم میرے غلوں اور محبت پر شک کر رہی ہو۔“

”ہونہ! غلوں محبت.....! لڑکیوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر انہیں بے وقوف بنا کر ان کا اعتماد حاصل کرنا پھر انہیں خواہشوں کے جنگل میں اکیلا چھوڑ دینا۔ کتنوں سے غلط کریں گے آپ؟ اور وہ..... وہ بے چاری نیلم! اس کے تو نصیب لڑکی ہونے کی وجہ سے خراب تھے ہی، سادہ دلی اور گداز دل فطرت کے ہاتھوں مار کھا گئی اور اب جب کچھ

اس کے اچھے مستقبل کی آس ہوئی تو شادی سے پہلے اس کے منگیت کو مہنگا پیاری نے آیا اور نیلم کو دیکھوا سی لڑکے سے ہمدردی میں گھر والوں سے ناصر کے ساتھ ہی شادی کا اصرار کر رہی ہے اور تمہیں پتا ہے اس احمق لڑکی نے غلوں سے ٹوٹ کر خود کشی کی کوشش کی تھی۔“ یہ کہتے کہتے میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی، کچھ دیر بعد پھر بولی۔ ”تم نے فیروز..... تم نے..... اس کا دل دکھایا ہے اس کی تذلیل کی ہے۔ وہ تو مجھ سے کہیں زیادہ اچھی تھی۔ میں تو اسے سمجھاتے سمجھاتے تھک چکی ہوں فیروز! لیکن وہ اپنے اندر کی ہمدردیوں، محبتوں اور اعلیٰ طرف بننے کے شوق کو کبھی دل سے نہ نکال سکی۔“

فیروز ہکا بکا متوحش سا میری باتیں سن رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ نیلم اس حد تک مجھے حرف بہ حرف اپنے اور اس کے متعلق! اتنی بتا دے گی۔

فیروز نے شرم سے سر نیچے کر لیا۔ ”مونا! پلیز مجھے معاف کر دو، میں نے تمہاری دوست نیلم کو بہت غلط سمجھا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ تم دونوں اتنی اچھی دوست ہو اور اتنا اعتماد کرنی ہو ایک دوسرے پر، میں نے یہ سب کچھ تمہاری توجہ حاصل کرنے کے لیے کیا تھا۔“

”چھوڑیں فیروز صاحب! اجائیں اور اب مجھ سے نہ ملیں تو اچھا ہے، جو میری دوست کی تذلیل کر سکتا ہے، اسے میں بھی محبت اور اعتبار کے قابل نہیں سمجھ سکتی۔“ میں نے فیروز کو نظر انداز کرتے ہوئے دو ٹوک الفاظ میں اس سے منہ تعلق ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ میں نے رومال سے منہ صاف کیا، پرس اٹھایا اور تیزی سے باہر نکل آئی۔ آج میں نے فیروز کو یہ کہہ کر کہ وہ محبت اور اعتبار کے قابل نہیں، نیلم کو دینے جانے والے دکھ کا بدلا لے لیا تھا۔

نیلم کی طبیعت اب کچھ بہتری آئی تھی لیکن وہ اب تک ذہنی شاک کے اثر سے نہیں نکلی تھی۔ ڈاکٹر نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ نیلم کے پاس دو فرد سے زیادہ لوگ نہ ہوں اور اس سے کسی بات کی پوچھ گچھ نہ کی جائے اس کا ہر لمحہ خیال رکھا جائے۔

میں نیلم کی وجہ سے اتنی پریشان اور افسردہ تھی کہ اپنی لیب کے کام کو بھی توجہ سے نہیں کر پا رہی تھی۔ میں بیک وقت صبح اپنے اسپتال جاتی پھر سہ پہر کو نیلم کی تیار داری کرنے اس کے فلیکٹ جاتی۔ میں نے بڑی مشکل سے اگلے پچھلے چار دن کی چھٹی لے لی۔ نیلم کی طبیعت تو بہتر ہو گئی تھی لیکن وہ

بڑی مشکل سے کسی بات کا جواب دیتی۔ بس خالی ذہن بند پر لپٹی چھت کو کھینچ رہی تھی۔ اس وقت نیلم کو نفسیاتی تمارداری کی بھی ضرورت تھی لہذا میرا اس کے پاس ہونا بہت ضروری تھا۔

میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد نیلم سے گفتگو کی کوشش کرتی لیکن وہ کم مہم مجھے سختی رہتی۔

”کچھ تو بولو چند! تم مجھ سے تو کبھی کوئی بات نہ چھپاتی تھیں دیکھو میں نے پچھلی لے لی ہے تاکہ میں خوب تم سے باتیں کروں۔ کتنے دن سے ہم نے باتیں نہیں کیں، ہیں ناں؟“ میں نے نیلم کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پیار سے سہلائی رہی۔

”مونا.....! مونا!“ اس نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے مجھے پکارا۔

”ہاں ہاں میں مونا ہوں! تمہاری دوست غم خوار لیکن تم نے مجھے اب کے کچھ نہ بتا کے بڑی زیادتی کی ہے۔ میں نے تم سے بہادر بننے اور برداشت کرنے کے لیے اس لیے تھوڑی کہا تھا کہ تم مجھے بھی کچھ نہ بتاؤ۔ کیا میں اس قابل نہیں۔ تم تو مجھ سے مل کر ساری محبتوں کو بھول جاتی تھیں۔ کیا تمہارا اعتماد مجھ پر سے اٹھ گیا تھا۔ کیا اب تمہیں مجھ سے کوئی محبت نہیں، بتاؤ مونا میں نے ایسی کون سی غلطی کی ہے؟ کون سا نہیں دکھ دیا ہے کہ تم نے مجھے بتائے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھایا اتنا غلط فیصلہ، کس نے حق دیا تھا تمہیں کہ تم اپنے گھر والوں سے اور مجھ سے اپنے وجود کو چھین لو، کیا صرف کسی مرد کی محبت ملنا ہی زندگی ہے اور نہ ملے تو بے کار ہے، موت ہے۔“ میں نے اسے غصے اور غم کی ملی جلی کیفیات میں بھنچوڑ ڈالا اور وہ جیسے ہوش کی طرف لوٹنے لگی۔ میری آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو اپنی دوستی، محبت کے احساس اور یوں شکایت کرنے پر وہ میرے کانڈھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”پتا نہیں کیوں میں اتنی بد نصیب ہوں، بتاؤ مونا! مجھے زندگی صرف ٹھوکر کھانے، قریب کھانے کے لیے ملی ہے، کیا میرے نصیب میں کوئی خوشی نہیں؟ مجھے اپنا وجود بہت ارزاں غیر اہم محسوس ہونے لگا تھا۔ میں کیا کرتی۔ اور..... اور اب تو میں گھر والوں کے لیے بھی بھاری ہو گئی۔ میں کسی کو تکلیف دینا نہیں چاہتی۔ اس لیے مونا..... میں نے..... میں نے اپنی زندگی ختم کرنے کا سوچا۔“ نیلم بول اٹھی تھی۔ وہ روتی جاتی اور اپنے دکھ کبھی جاتی۔ نیلم جیسے لوگ

دل کی بات کہے بغیر چھین نہیں پاسکتے۔ میں نے اس کی فطرت بدلنے کی کوشش میں اس کو بہادر بننے اور برداشت کرنے کا کہہ کر اس میں نادانستہ طور سے شاید یہ بات بٹھا دی تھی کہ دنیا میں کسی کو تمہارے دکھ سننے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرے زیادہ نہ ملنے کو وہ میرا نظر انداز کرنا بھی۔ اب اس حادثے کے بعد میں اس کی دل جوئی کر رہی تھی۔ اس میں زندگی کی امنگ پیدا کرنے کے لیے اس کو محبت اور اہمیت کا احساس دلانا ہی تھی۔

”نیلم تم تو سراپا محبت ہو، میرے لیے تمہارا یہ خلوص یہ اعتماد بہت بڑی دولت ہے۔ باگل! زندگی اتنی ارزاں نہیں کہ ایک نارسائی کے پیچھے ختم کر دی جائے۔ میں ہوں ناں تمہارے پاس محبت کے لیے۔“

”اور میں بھی تو ہوں محبت کے لیے، اعتماد کے لیے جیسا بھی ہوں۔“ ہم دونوں اپنا رونا دھونا بھول کر سامنے کھڑے فیروز کو پچھنی پچھنی آنکھوں سے دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

”آپ..... آپ کیسے آئے؟“ بالآخر میں بولی۔
”کیوں! نیلم سے میری بھی تو دوستی تھی، میں بھی تو اس کی عبادت کو آسکتا ہوں۔“
”مگر اب میں کسی کے نیلم کو قریب آنے سے قریب دینے کی اجازت نہیں دے سکتی۔“ میں تلخ لہجہ میں فیروز سے مخاطب تھی۔

وہ بڑے اطمینان سے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔
مجھے نظر انداز کر کے نیلم سے مخاطب ہوا۔
”کیسی ہو نیلی! تمہیں میرا آنا برا تو نہیں لگا؟“
نیلم حیران بھی میری اور بھی فیروز کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ہاں نیلی کہو ناں!“ فیروز نے پھر کہا۔
”ٹھیک ہوں۔“ نیلم نے بڑی مشکل سے کہا۔

”میں بہت برا ہوں ہے ناں؟“
”نہیں..... نہیں تو۔“ نیلم نے اس کے پوچھنے پر کہا۔
”اس کا مطلب ہے، اچھا لگتا ہوں، چلو پھر ٹھیک ہے۔“ فیروز نے شغفی سے گردن ہلائی۔

فیروز کے اس انداز اور مکالموں پر میں غصہ بھول کر اسے حیرانگی سے دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں نیلم کی امی کسی خاتون کے ساتھ اندر داخل ہوئیں۔ فیروز اٹھ کھڑا ہوا اور ان نئی خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

سرسرگزشت
ماہنامہ کراچی

مرگِ ناگہاں نمبر

اس خاص شمارے میں وہ سب کچھ ہے جو
آپ پڑھنا چاہتے ہیں، آپ کو پڑھنا چاہیے۔

ان مشہور و مقبول شخصیات کی روداد جو بے وقت موت کا
شکار ہوئے جنہیں عہدِ شباب میں موت اپنے ساتھ لے گئی

جنوری 2018ء کے اس شمارے
کو آپ مجلد کرا کر رکھنے پر مجبور ہوں گے

سال کا پہلا شمارہ سب سے اہم شمارہ

آج ہی اپنے نزدیک بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرائیں

”ای! یہ نیلم ہیں اور مونا۔ جو میری کولیگ بھی ہیں۔“

نیلم اور میں نے فیروز کی امی کو سلام کیا۔ فیروز کی امی نے آگے بڑھ کر نیلم کو پار کیا اس کی خیریت پوچھی۔

”بھئی، ہمیں آپ کی بیٹی بہت اچھی لگی اور آپ کی بی نہیں یہ اب ہماری بیٹی تھی تو ہے۔ کیوں نیلم! تمہیں بیٹی کہہ سکتے ہیں نا ہم۔“ فیروز کی امی نے نیلم کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی، کیوں نہیں محبت ہے آپ کی۔“ نیلم بالکل نارل انداز میں بات کر رہی تھی۔

نیلم کی امی بھی خوش نظر آ رہی تھیں۔ نیلم کی امی مجھے ساتھ لے کر باہر نکل آئیں اور کہا۔

”فیروز کیسا ہے مونا؟ ان کے گھر سے نیلم کے لیے رشتہ آیا ہے۔“

”اچھا، واقعی۔“ خوشی میں میری جیج نکل گئی۔ فیروز بالآخر نیلم کے پاس واپس آ ہی گیا۔

لبے چوڑے قد و قامت، صاف رنگت، فریج کٹ داڑھی میں فیروز کی شخصیت واقعی متاثر کن تھی۔ آنکھوں پر لگے گلاسز کی وجہ سے وہ سنجیدہ اور پروقار سا بھی لگتا تھا۔ اس کا مطالعہ اس کی گفتگو کا انداز بہت اچھا تھا۔ شریف فیملی سے تعلق تھا۔ اچھی جاب تھی، بس نیلم کو سمجھنے میں اس نے ایک عام مردوں والا جابلانہ انداز اپنایا تھا۔ پھر نیلم کے اس طرح آسانی سے حاصل ہو جانے پر غلط مطلب نکال بیٹھا تھا اور اب جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تو میں کیوں اس کی راہ میں آتی۔ میں نے نیلم کی امی سے فیروز کی بڑی تعریف کی۔ ان کی امی نے بتایا کہ فیروز کے گھر والے اور فیروز انہیں بھی اچھے لگے ہیں۔

دو دن بعد نیلم کو گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ ایک ہفتے بعد میں لب میں اپنے معمول کے کام میں مصروف تھی کہ فیروز آ گیا۔

”ہیلو دوست! کیسی ہو؟“ اس نے مجھے خوشی سے مخاطب کیا۔

”ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟“ میں نے اس کے لیے اپنا لہجہ نرم کر لیا تھا۔ ”آپ اندر کمرے میں تشریف رکھیے، میں ابھی آتی ہوں۔“

میں نے نہایت مہذب انداز میں اسے کہا تو وہ خاموشی سے مڑ کر کمرے کی طرف چلا گیا۔ میں کام مکمل کر

کے اس سے ملنے اندر کمرے میں چلی گئی اور خاموشی سے بیٹھ کر اس سے بات کرنے کا سوچنے لگی۔

”اب بھی ناراض ہو گیا۔“ اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”نہیں..... نہیں تو۔“ پھر کچھ توقف کے بعد نرم انداز میں کہا۔

”بہت شکریہ فیروز، دیری سوری، میں نے تمہیں بہت برا بھلا کہا۔“

”ارے نہیں یار، شکریہ تو مجھے تمہارا ادا کرنا چاہیے کہ تم نے مجھے صحیح راستہ دکھایا۔ پھر مجھ سے ناراضگی کے باوجود میرے بارے میں نیلم یا ان کے گھر والوں سے برائی نہ کی۔

میں بہت خوش ہوں مونا! کہ مجھے تم جیسی با اعتماد اچھی لڑکی کی ہمدردی حاصل ہوئی اور تمہاری دوستی کا تحفہ نیلم ہے جسے میں ہمیشہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا۔“

”بہت شکریہ فیروز! اگر تم نے نیلم کو اپنی محبت اور اعتماد یا تو ہمیشہ میں تمہاری عزت کرتی رہوں گی۔“ وہ بہت محبت کرنے والی لڑکی ہے تمہیں بھی اس کی طرف سے دکھ نہیں پہنچے گا، انشاء اللہ۔“ میں نے طمانیت سے کہا۔

”اچھا تو پھر اس خوشی میں کچھ ہونہ جائے۔“ فیروز ماحول بدلنے کو ذرا چکا۔

”یعنی!.....!“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”یعنی میری طرف سے کل سن شامین ریسٹوران میں کھانے کی دعوت ہے، نیلم اور میری بات پکی ہونے کی خوشی میں، پلیز مونا! اسے کل میرے ساتھ کھانے کی اس دعوت پر راضی کر لو ناں! دیکھو میرا بڑا دل چاہ رہا ہے اس سے ملنے، باتیں کرنے، اسے دیکھنے کا، پلیز۔“ فیروز بڑے ملتجیانہ لہجے میں مجھ سے التماس کر رہا تھا۔

”اچھا، واہ بھی کیا کہنے آپ کی بے تابی اور محبت کے اور دعوت کے لیے میں اسے راضی تو کر لوں..... مگر.....

ریسٹوران لے جا کر..... کیا ارادے ہیں جناب کے، کہیں.....“ میں نے ذرا ٹھہر ٹھہر کر شرارتی انداز میں کہا۔

فیروز ایک دم چونکا پھر ذرا شرمندہ کھسیانی ہنسی کے بعد بولا۔ ”ارادے کیا خاک ہوں گے، کھانے کی دعوت میں آپ بھی تو ہوں گی اور آپ سے دشمنی لے کر مجھے مرنا ہے کیا۔“

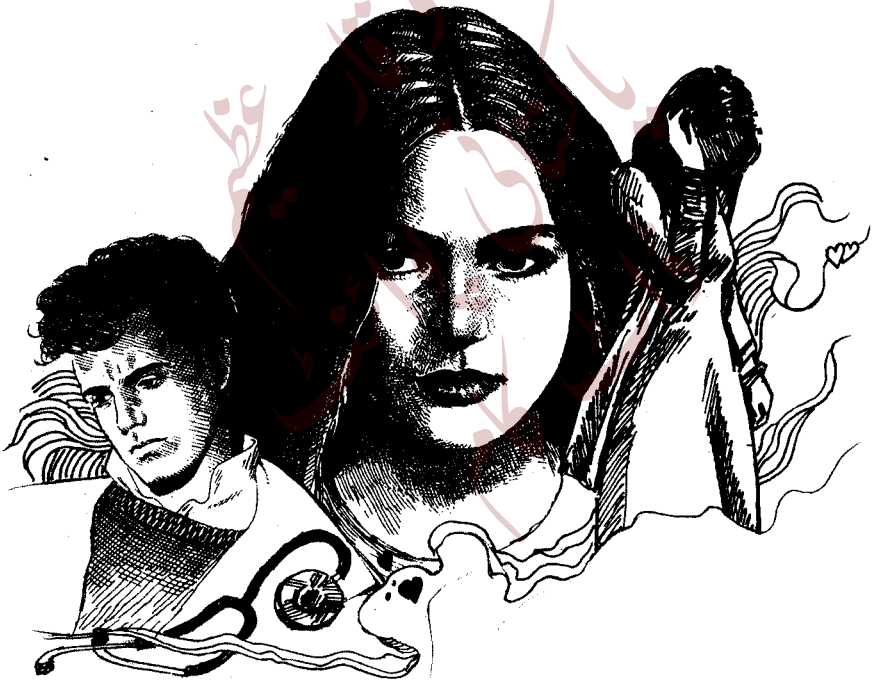
اور پھر ہم دونوں زور سے ہنس پڑے۔

کالی گوری

محترم مدیر
السلام علیکم

آپ تو جانتے ہیں میرے لکھنے کا ایک مخصوص انداز ہے۔ اپنے
اسی مخصوص انداز میں اس بار تہمینہ اور متین کی سچ
بیانی لکھی ہے۔ عورت کس قدر قربانی دیتی ہے اس کا ادراک
آپ کو یہ سچ بیانی پڑھ کر بخوبی ہو جائے گا۔ اُمید ہے یہ سچ
بیانی قارئین کو بھی پسند آئے گی۔

سلمیٰ اعوان
(لاہور)



کوان کی خوشیوں اور غموں میں ہمیشہ شامل رکھا ہے۔ کسی نے
میرے پاس آکر آنسو بہائے تو میں نے اس کی اشک شوئی کی
دلا سدا، ہا، حوصلہ بڑھایا اور اگر کوئی خوشی کی خبر سنانے آیا تو میں
نے بھی مسکرائیں، بکھیریں۔ پیچرز کے آپس کے جھگڑوں کو

سچی بات ہے Divide and rule کبھی میری
پالیسی نہیں رہی۔ ایک بڑے تعلیمی ادارے میں گزشتہ چند
سال سے بطور پرنسپل کام کر رہی ہوں۔ کوئی سو کے قریب
اساتذہ میری زیر نگرانی کام کرتے ہیں۔ میں نے اپنے آپ

پیار اور محبت بھری ڈانٹ سے نمٹنا۔ یقیناً یہ میرا طرز عمل ہے کہ میری ٹیچر مجھ سے اپنے ذکھ سکھ کہنے میں کوئی عار نہیں سمجھتیں۔

یہ بڑی گرم دوپہر تھی۔ لُو کے تھیرڈن نے میرا چہرہ حُلسا دیا تھا۔ میں آخری رازِ دُست سے فارغ ہو کر ابھی آفس میں آ کر بیٹھی تھی اور سوچ رہی تھی کہ ذرا اس فائل کو کھولوں جس میں انتظامیہ کے ساتھ ہونے والی میٹنگ کی رپورٹ تھی کی گئی تھی۔ ابھی میں نے رپورٹ پر ضمنی شروع کی ہی تھی جب بس تہینہ دفتر میں داخل ہوئی۔

تہینہ کے بارے میں مختصر عرض کیے دینا چاہتی ہوں۔ مخلص، ہمدرد، عام سے نقش و نگار والی لڑکی ہے۔ ایم اے لی ایڈ تک تعلیم ہے۔ خاندانی پس منظر اچھا ہے۔ چھوٹی سی فیملی جس میں دو بہنیں ایک بھائی ماں اور باپ شامل ہیں۔ باپ نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنا گھر خریدا تھا۔ معاشی حالات بس نارمل سے ہیں۔ زنگی سکون سے گزر رہی ہے۔ بس اگر پریشانی ہے تو تہینہ کے لیے موزوں رشتے کی۔ تہینہ کی عمر تیس کے قریب قریب ہے مگر تک سب سے آراستہ رہنے اور اپنا خیال رکھنے کی وجہ سے اتنی دکھتی نہیں۔

وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ آج صبح سے میں نے اُسے نہیں دیکھا تھا اب بغور دیکھا تو کچھ پریشان ہی نظر آئی۔ ”کوئی بات؟ پریشان لگتی ہو۔“ میں نے زری سے پوچھا۔

”میڈم مجھے کچھ بیسیوں کی ضرورت ہے۔“

”کتنے چاہئیں؟“

”بہنی کوئی پچاس ہزار۔ بس دو تین ماہ میں لوٹا دوں گی۔“

پچاس ہزار معقول رقم تھی۔ میں نے ذرا گہرائی میں اترتا مناسب خیال کیا۔

”کہاں ضرورت ہے؟“

اور اس کے تفصیلی جائزے سے مجھے محسوس ہوا کہ وہ کچھ کو گولی کیفیت، میں ڈوبی ہوئی ہے۔

”محل کر بات کرو میں تمہاری پاس ہی نہیں بہن بھی ہوں۔ ٹھیک مشورہ دوں گی۔“ اور اس نے بتانا شروع کیا۔

”ہمارے دائیں ہاتھ جو لوگ رستے ہیں وہ شیخ ہیں۔ شیخ اقبال احمد کے دوست ہیں تو صیغ اور نجمہ۔ تو صیغ میڈیکل کے تیسرے سال میں اور نجمہ فائن آرٹس میں ایم اے کر رہی ہے۔ بہت کھلنے کھلنے والے اور مخلص لوگ نہیں

ہیں۔ بس کبھی کبھار ہی آنا جانا ہوتا ہے یا آتے جاتے ٹکراؤ ہو جائے تو بیلوہائے ہو جاتی ہے۔ کوئی تین دن پہلے اماں ہمارے ماموں کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ بھائی ٹیوشن پڑھنے چلا گیا اور میں گھر میں اکیلے تھی۔ کبھی کبھی اکیلا اپن بھی کبھی اُداسی پیدا کر دیتا ہے؟ اُدی ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے۔ میں نے کچھ وقت لان میں پودوں کی کانٹ چھانٹ پر ضائع کیا۔ کچھ وقت گھر میں ہی ادھر ادھر گھومنے پھرنے میں کاٹا اور بالآخر میں نے نجمہ کے گھر کی طرف قدم اٹھا دیے۔ میں اپنی بوریت کو کچھ کم کرنا چاہ رہی تھی۔

”پلو ٹھیک سے بات وات نہ کریں گے تو بھی خیر۔ تھوڑا سادقت تو کہنے گا۔“

میں اپنے گھر سے نکل کر ان کے گیٹ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ گیٹ بند تھا اور میرا ہاتھ اطلاقی کھٹی پر جانے ہی والا تھا جب ایک سائیکل سوار لڑکے نے میرے پاس آ کر پوچھا۔ ”تو صیغ احمد شیخ کا گھر یہی ہے۔“

میں نے کھٹی بجانے کے بجائے رخ پھیر کر اسے دیکھا 22، 21 برس کا کمزور سا لڑکا میرے سامنے کھڑا تھا۔ سائیکل کو اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ زرد چہرہ، کال چمکے ہوئے، آنکھیں موٹی موٹی مگر اُداسی میں ڈوبی ہوئیں۔ بے ترتیب سے بال۔ لباس بھی عام سا تھا۔

”یہی گھر ہے۔ تمہیں تو صیغ سے ملنا ہے کیا؟“

اور میں نے اُس کے جواب کا انتظار کیے بغیر کھٹی پر انگلی رکھ دی۔ ساز بجا اور گیٹ کھل گیا۔ دروازے پر ملازمہ تھی۔ میں نے نجمہ اور تو صیغ کے بارے میں پوچھا۔ دونوں گھر پر تھے۔ میں نے اندر جاتے ہوئے ملازمہ سے کہا۔ ”تو صیغ کو بتا دو کہ اُس سے کوئی ملے آیا ہے؟“

نجمہ اپنے کمرے میں تھی میں کچھ سوچ کر وہیں چلی گئی۔ وہ غالباً جائے پینے لگی تھی۔ ڈرائی سامنے رکھی تھی۔ کرا ٹھنڈا تھا اور ماحول بہت خوشگوار سا۔ میں نے ڈھیت بن کر کہا۔ ”میرا خیال ہے میں ٹھیک وقت پر آئی ہوں۔“

”آئیے آئیے۔“ نجمہ نے خاصی خوش دلی سے کہا۔

”مجھے گھر میں پور ہو رہی تھی تھوڑے سے وقت کو خوش گوار بنانے کے لیے آئی ہوں اُمید ہے محسوس نہیں کرو گی۔“

اور نجمہ نے جواباً خاصی فراخ دلی سے کہا۔ ”ارے نہیں کیسی بات کرتی ہیں آپ۔ اسکھ چائے پیتے ہیں اور تھوڑی سی گپ شپ بھی لگاتے ہیں۔“

چائے پی اور گپ شپ لگی۔ نجمہ نے یونیورسٹی کے لپیلے

سالہ بیابانی بیوہ ماں کا اکھوتا بیٹا ہوں۔ پڑھنے میں بہت لائق ہوں۔ ہمیشہ وظیفہ لیا۔ میڈیکل کرنا میری بہت بڑی تمنا ہے۔ ٹیوشنوں اور وظیفوں کے بل پر ڈاکٹری کی لائن میں تو آگیا مگر اس کے بیشمار اخراجات کو برداشت کرنا اب میرے لیے بہت مشکل ہو رہا ہے۔ بیس ہزار کی وادف کار سے پڑا تھا کتا بولوں کی ضرورت تھی۔ کچھ دوسرے سال میں نے ٹیوشن نہیں کیے۔ پہلے سال وقت بہت ضائع ہو گیا اور اپنی پوزیشن قائم نہیں رکھ سکا۔ ان بیسوں سے ضروریات پوری کرتا رہا۔ اب اس نے ناک میں دم کر دیا ہے کہ میرے پیسے واپس کرو۔ میں تو صیف کے پاس آیا تھا مگر اس نے معذرت کر دی ہے۔“

تہینہ نے کہا۔ ”یہ روپے مجھے تین کو دینے ہیں۔ ایک ہفتہ کا وعدہ کیا تھا میں نے۔ میرے خیال میں تین جیسے ہونہار نوجوان کی مالی اعانت کرنا ٹھیک ہی نہیں اس ملک کی بھی خدمت ہے۔“

مجھے تہینہ کے نظریے سے بالکل اتفاق تھا مگر میں اسے دیکھنا چاہتی تھی اور اپنی اس خواہش کا اظہار میں نے اس سے بھی کر دیا جس پر وہ بولی۔ ”میں کہہ دوں گی وہ آپ سے مل لے۔“

اگلے دن میں نے رقم بینک سے نکھو کر اُسے دے دی۔

تہینہ اور تین کے درمیان طے پا گیا تھا کہ وہ اسے پیسے دینے کہاں آئے گی؟ یہ مقام اسپتال کا تھا جو میڈیکل کالج کے ساتھ ملحق تھا۔

گیارہ بجے وہ اسکول سے چھٹی لے کر چلی گئی۔ تین اس جگہ اس کا منتظر تھا وہ اسے دیکھتے ہی محل اٹھا۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے خاموش کھڑے تھے۔ تہینہ نے پرس سے پیسوں کا لفافہ نکالا اس کی طرف بڑھایا اور آہستگی سے کہا۔ ”اسے قرض مت سمجھنا۔ یہ مدد ہے ایک انسان کی دوسرے انسان کو آئندہ بھی جاکر تمہیں ہوسکا میں تمہارے لیے کچھ کرتی رہوں گی۔ ٹیوشن کے پکڑوں کچھ چھوڑ دو اور اپنی تعلیم کی طرف توجہ دو۔“

معلوم نہیں یہ جذبہ مہینیت کی انتہائی یا دھورت حال سے اس درجہ متاثر تھا کہ اس سے ایک لفظ بھی نہ بولا گیا۔ تہینہ کو اس کی آنکھوں میں نمی محسوس ہوئی۔ اس کے ہونٹ بھی پھڑپھڑانے لگے تھے۔ وہ ایک ٹک تہینہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے گہرا کر اسے دیکھا اور بولی۔ ”کیا بات ہے

سنائے اور میں نے بھی اسے اسکول کی باتیں بتائیں اور تھوڑی سی بات چیت فلم دہی پر ہوئی اور گھٹنا گزر گیا۔ میں نے وقت دیکھا اور کھڑی ہو گئی۔ مجھ نے بیٹنے کے لیے کہا مگر میں نے معذرت کرتے ہوئے بتایا۔ ”گھر میں کوئی نہیں۔ نوکر بھی نہیں ایسے ہی کھلا چھوڑ آئی ہوں، اماں آگئیں تو بولیں گی۔“

جب میں گیٹ سے نکلی اور اپنے گھر کی طرف بڑھی تو وہی لڑکا میرے سامنے آگیا۔ میں نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس وقت سورج ڈوب چکا تھا اور ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ہماری لین میں سرکری ٹیوشن نہ ہونے کی وجہ سے اندھیرا وقت سے پہلے ہی چھانے لگا ہے۔

”میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھ سے۔“ میں نے حیرانی بھری آواز میں کہا۔

”جی میں تو صیف کا کلاس فیلو ہوں۔“

گویا وہ میڈیکل کالج اسٹوڈنٹ تھا اور میڈیکل کے اسٹوڈنٹ سے بات کرنے میں قطعی حرج نہ تھا۔ میں نے سوچا۔

”بات لمبی ہے تو گھر آ جاؤ۔“

میں نے گھر کی طرف اپنے قدم بڑھا دیے۔ وہ سائیکل کو گیٹ کے پاس کھڑا کرنے لگا تو میں نے کہا۔

”اسے اندر لے آؤ کوئی اٹھا سکتا ہے۔“ سیاہ گیٹ کا ایک پٹ میں نے کھول دیا۔ اس نے سائیکل دیوار کے ساتھ ٹکا لی۔ جب تک وہ فارغ نہ ہوا میں اس کے پاس کھڑی رہی۔

اس کا حلیہ اُسے کسی بہت غریب گھر سے تعلق کا چاندیتا تھا۔ ڈرائینگ روم میں صوفے پر بیٹھ کر میں نے بغور اُسے دیکھا اور پوچھا۔ ”کہو کیا بات ہے؟“

”مجھے میٹرک یا ایف ایس سی کی کوئی ٹیوشن دلانے میں آپ کچھ مدد کر سکتی ہیں۔“

”تو صیف کے پاس تم اسی کام کے لیے آئے تھے۔“ میں نے پوچھا۔

”جی نہیں ان کے پاس میں کسی اور کام کے لیے آیا تھا۔“

”کیا کام تھا وہ۔“ میں اس کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی تھی۔

لیکن مجھے احساس ہو چکا تھا کہ وہ تذبذب میں ہے کہ کہے یا نہ کہے۔ میں خاموش بیٹھی اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد وہ بولا۔

”غریبی بھی خدا کا بہت بڑا عذاب ہے۔ میں اپنی دو

”متین؟“

”مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔“ اس نے بے بسی سے کہا۔
”یقین نہ آنے والی کون سی بات ہے؟“ آخر انسان ہی
ایک دوسرے کا دکھ بانٹتے ہیں۔ جانور تو اگر احوال بدی
کرنے سے رہے۔

وہ اسے کھین میں لے گیا جہاں اس نے تہینہ کو چائے
پلائی اور یہ پوچھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ اسے کہاں مل سکتی
ہے۔ تہینہ نے اسے اسکول کا پتا بتایا اور مجھ سے ملنے کو بھی کہا۔
یہ اکتوبر کے خوشگوار دن تھے۔ آفس کے سامنے
چھوٹے سے گلاب کے باغیچے میں پھولی مسکرا رہے
تھے۔ میری نظریں بہت دیر سے ان پر جمی ہوئی تھیں۔ ہوا کے
ہلکے ہلکے جموں کوں سے وہ دائیں بائیں لہراتے خوبصورت لگ
رہے تھے۔ میری محویت ”میں اندر آسکتا ہوں۔“ اس جیلے
سے ٹوٹ گئی۔ ایک نوجوان میرے سر کو اثبات میں ہلٹے دیکھ کر
اندرا گیا۔ آتے ہی اس نے سر کو قدرے جھکایا اور بولا۔ ”میں
متین احمد ہوں مں تہینہ نے شاید میرا ذکر آپ سے کیا
ہو۔“ میں نے یکدم خوش ہو کر کہا۔

”اچھا اچھا تو آپ متین ہیں بیٹھیے۔“

وہ کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے گہری
تعمیدی نگاہ اس پر ڈالی۔ اس کی آنکھیں موٹی موٹی سی تھیں مگر
معلوم نہیں مجھے وہ کچھ عجیب سی لگیں۔ اس کا چہرہ معصومیت بھرا
نہیں تھا۔ میں کچھ پریشان ہی ہو گئی۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان کے بارے میں اتنی جلدی فیصلے
نہیں ہوتے۔ اس کی اتنی تھیں ہیں کہ بعض اوقات سالوں
ساتھ رہ کر بھی پتا نہیں چلا مگر پھر بھی میں جو عمر کی درمیانی
منزل میں ہوں۔ چہرے مہروں سے تھوڑا بہت جاننے کا دعویٰ
ضرور رکھتی ہوں۔

اس کے چہرے نے مجھے متاثر نہیں کیا تھا۔ یہ اور بات
ہے کہ اس کی باتیں بڑی حقیقت پسندانہ تھیں۔ ان میں غم کی
جھلک تھی اور حوادث سے نمٹنے کا عزم بھی۔ میں نے چہرہ
سے تہینہ کو بلایا۔ میرا خیال اسے چائے پلانے کا تھا مگر تہینہ کی
موجودگی میں۔

میں نے دیکھا تہینہ جوں ہی کمرے میں داخل ہوئی۔
متین کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں اور رخساروں پر جیسے گلاب
سے کھل اٹھے اور جس انداز میں اس نے متین کو دیکھا تھا وہ
مجھے یہ سمجھانے اور بتانے کو کافی تھا کہ وہ مہروں سے آگے
بڑھ چکی ہے۔ میں نے متین کے چہرے پر جو کچھ بکھرا دیکھا تھا

اُس سے صرف یہی جان سکی کہ وہاں مسکراہٹ ضرور تھی مگر
سنجیدہ ہی۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے رخصت چاہی۔ تہینہ اس کے
ساتھ ہی باہر نکل گئی۔ میں نے کڑکی کے شفاف شیشے میں سے
دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ خاموش
سایہ انداز دید ان کی محبت کی چٹائی کھاتا تھا۔ مجھے قدرے
حیرت بھی تھی کہ تہینہ اچھی بھلی سمجھ دار لڑکی کیسے بیوقوف بن گئی
ہے؟ اسے اپنی اور اس کی عمروں کے درمیان فرق کا احساس
نہیں۔ زمانہ کون سا جا رہا ہے۔ یہ اسے مالی لحاظ سے سپورٹ
کرتی رہے گی اور وہ اسے بیوقوف بناتا رہے گا۔ ڈاکٹر بن کر
کسی اچھی خوبصورت لڑکی سے بیاہ رہا چلے گا اور یہ بیٹھی قسمت
کو روئے گی۔

اسے رخصت کرنے کے بعد جب تہینہ واپس آئی تو
میرے پاس ہی آگئی۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ ”سزمن کینا
لگا آپ کو متین؟“

”اچھا ہے۔“ میں نے قدرے توقف سے کہا۔

”تہینہ دیکھو میں ایک بات تم سے کہنا چاہتی
ہوں۔ انسانی فطرت مطلب برآری کے لیے گدھے کو باپ
بنانے سے نہیں چوکتی۔ ایسا نہ ہو کہ تم مہروں کی پلیٹ میں اپنا
آپ لٹائی رہا اور وہ ایک دن احسان فراموشی کی داستان بن
کر تمہارے سامنے آجائے۔ اس وقت تم دکھ اور کرب کی جس
منزل سے گزر دو گی اس کا اندازہ مجھے ابھی سے ہو رہا ہے۔“

اس نے میرے ان خدشات کے جواب میں کچھ نہ کہا
بس سر جھکائے جب چاب میری باتیں سنتی رہی۔ بڑیک کی
گھنٹی بجی اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔

بہت عرصے تک مجھے کچھ پتا نہ چل سکا مگر ایک بات
میں نے ضرور محسوس کی تھی کہ تہینہ کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اس
کے چہرے کا رنگ پیلا پڑا ہوا تھا۔ ایک دو بار میں نے اس
سے پوچھا بھی مگر وہ ٹال مٹلی۔ ایک دن اتفاق سے جب میں
لیجرز کے پاس بیٹھی ہوئی تھی تہینہ زیر بحث آگئی۔ سزمن رحمان
نے تنگ کر میرے اس اندیشے کی تردید کی جو مجھے اس کی صحت
کے بارے میں تھا۔

”تمن ٹیوٹھو تو وہ اسکول ختم ہو جانے کے بعد پڑھائی
ہے اور تنم چارے کے گھروں میں جاتی ہے۔“

اور جیسے میرے دل پر گھونسا پڑا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ
اس مشقت کی چکی میں کس لیے پس رہی ہے؟ میں خاموش تھی
اور سزمن رحمان غالباً منتظر تھی کہ وہ میرے کسی بھی حیرت کے

اکٹھار کے بعد حقیقت سے پردہ اٹھائے اور میں اپنی ہی سوچ میں تم کی وجہ اس نے کہا۔
 ”کسی ڈاکٹر کے پیچھے لگی ہوئی ہے اُسے پڑھا رہی ہے۔“ اور ساتھ ہی طویہ سا قہقہہ فضا میں اچھال دیا۔ ”حق! جب وہ ڈانچ دے جائے گا تو بیٹھی قسمت کو روئے گی۔“

میں خاموش رہی تب میرے کرنا مجھے قطعی پسند نہیں۔
 ایک دن میں نے مسکراتے ہوئے ٹوہ لینے کی خاطر کہا۔
 ”میرا خیال ہے تم محبت کر بیٹھی ہو۔“ میں نے موضوع کی گچی کو مسکراہٹ کی آڑ دی۔ اور اس نے شرمانے یا سر جھکانے کے بجائے سکون سے کہا۔

”شاید اسی کا نام محبت ہے مجھے تین اچھا لگنے لگا ہے۔“
 ”مکروہ تم سے شادی کر لگا۔“
 ”مسز حسن شادی بیاہ تو مقدروں کی بات ہے۔ میں نے اگر اسے مالی اعانت دی ہے یا دے رہی ہوں تو یہ عوض نہیں مجھے اس کی مدد کر کے خوش ہوتی ہے۔ اس بار اس نے ٹاپ کیا ہے۔“
 ”کسی لڑکی ہے۔ کتنا بڑا دل رکھتی ہے خدا کرے خوش رہے۔“

تین کے ساتھ اس کی دوستی اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ سب لوگ جان گئے تھے۔ بیشتر کا نظریہ میرے جیسا تھا۔

اور جس دن تین ڈاکٹر بنا اس دن اس نے بہت شاندار پارٹی دی۔ سب لوگوں کا اصرار تھا کہ وہ تین کو بھی بلا لے۔ تین بھی آیا۔ اس نے پنجاب کے میڈیکل کالجوں میں نمایاں پوزیشن حاصل کی تھی۔

میں نے کافی مدت بعد اُسے دیکھا تھا۔ وہ خاصا صحت مند اور اچھا لگ رہا تھا۔

مسز رحمان نے پوچھا ”شادی کب کرو گے؟“
 ”ابھی تو کوئی پروگرام نہیں تھی۔ ہاؤس جاب کرنا ہے پھر باہر جانے کے لیے وظیفہ متوقع ہے۔“

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ تہینہ نہایت سکون سے کہوں میں چائے ڈالنے اور سب لوگوں کو پیش کرنے میں مصروف تھی۔ اس کے اندر کوئی طوفان برپا تھا یا وہ پرسکون تھی یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

تین کے جانے کے بعد ایک دو نے کہا بھی۔ ”تہینہ ریت سے گھر بنانے کی کوشش کر رہی ہو۔“

پانی

پانی زندگی کی بنیادی شرط ہے۔ لہذا زمین کے علاوہ اگر کسی مقام پر زندگی ہو سکتی ہے تو وہاں پانی کا ہونا لازم سمجھا جاتا ہے۔ 2011ء میں نظام کسی کے باہر ایک سیارہ دریافت ہوا تھا جس کا نام HATP 16B رکھا گیا۔ اس کی فضا میں پائے جانے والے پانی کے ذرات پر سائنسدان تحقیق کر رہے ہیں۔ یہ سیارہ زمین سے 430 نوری سال کے فاصلے پر ہے اور دو بڑی خلائی دوربینوں جمل اور سپر کی مدد سے اس کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ اس کی فضا ہائیڈروجن اور ہیلیم سے بنی ہے۔ یہ اپنے ایک سورج کے گرد گردش کرتا ہے جو ہمارے سورج سے دو گنا زیادہ بڑھا ہے۔ یہ نظام کسی کے سیارے نیپچون کے حجم جتنا ہے لیکن یہ اس سے زیادہ گرم ہے کیونکہ اپنے سورج سے زیادہ قریب ہے۔ خلائی تحقیقاتی ادارے ناسا کے مطابق اس میں پانی کی موجودگی کے بعض شواہد ملے ہیں تاہم یہ پانی زیادہ نہیں HATP 16B جس نظام کا حصہ ہے وہ نظام کسی سے ملتا جلتا ہے۔

مرسلہ: منشی عزیز علی۔ لندن ضلع وہاڑی

☆☆

ابن صفی نے اپنے ایک ناول میں سچا لطیفہ لکھا ہے جو کچھ یوں ہے: ”ایک مدیر صاحب کے پاس شہرہ آفاق مصور پکاسو پر اردو میں لکھا ہوا مقالہ آیا۔ مدیر محترم نے فوراً اگلے شمارے میں اشاعت کے لیے برائے کتابت کا تب صاحب کے حوالے کر دیا۔“ مضمون کا عنوان تھا ”پکاسو“ اردو ادب کے ماہر کا تب صاحب جو مشہور مصور پکاسو کے متعلق کچھ نہ جانتے تھے انہوں نے مضمون کا بغور جائزہ لیا پھر مسکرائے اور زیر لب بولے۔ ”اچھا رکھنا بھول گئے۔“ اب اللہ دے اور بندھے، جہاں جہاں پکاسو کا لفظ آیا کا تب صاحب کا اضافہ کرتے چلے گئے۔ یوں ہو گیا ایک زبردست مقالہ ”پکاسو“ پر تیار۔“

مرسلہ: محبی رحمان۔ یو ایس اے

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”میں نے تو گھربانے کا سوچا نہیں تھا بلکہ جو سوچیں پیدا کر رہی ہو۔ گھر اوپر والا بناتا ہے۔ چاہے گا تو جو بنادیں گے رکھی ہے اس پر بن جائے گا اور اگر نہیں تو میں بجری، سینٹ، چپس لے کر بھی نہیں بنا پاؤں گی۔“

”متین ان دنوں ہاؤس چاہ کر رہا تھا۔

پھر بہار کی ایک راتوں سے بھری صبح کو وہ بہار کی طرح کلائی اور بازوؤں تک مہندی کے پھول پتوں سے سجی قیمتی رتزار جوڑا پہنے اور پھولوں کے زیورات سے لدی پھندی اسکول میں آئی اور متین سے اپنے نکاح کی دھماکا خیز خبر سنائی۔ ہم سب کے شکوہ پر اس کا معذرت بھرا اظہار تھا کہ بس سادگی سے نکاح ہوا ہے۔ باہر سے تو کوئی مدعو ہی نہیں تھا۔

چلو خوشی کی بات تھی۔ اس کی بے کیف سی زندگی میں خوشیوں کے رنگ تو کھلے۔
سال بعد بچہ آگیا۔ وہ واقعی بہت خوش تھی۔ سرور و مطمئن اور سرشاری۔

متین پڑھنے کے لیے انگلینڈ چلا گیا۔ پانچ سال بعد واپس آکر اس نے گلبرگ میں ایک شاندار اسپتال اور گھر بنایا۔ تہینہ نے نوکری چھوڑ دی اور اسپتال کی منتظم علی کی ڈیوٹی سنبھال لی۔

انسانوں کو برکے، پڑھنے اور ان کو جانچنے کے میرے سارے دعوے غلط نکلے تھے۔
ہم سب کا خیال تھا کہ تہینہ بخدا ہے۔ قسمت کی دہنی ہے۔ مقدر نے اس کا بہت ساتھ دیا ہے۔

یہ جانی سردیوں کے دن تھے۔ میرے بچے چائیز کھانے کے لیے ضد کر رہے تھے میں انہیں لے کر ایک چینی ریستوران میں چلی گئی۔ بڑا خوبصورت سا ماحول تھا۔ بہت زیادہ لوگ نہیں تھے۔ میں میزوں کے گرد بیٹھے لوگوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ جب ذرا فاصلے پر گونے میں ایک نوجوان چہرے نے مجھے فی الفور اپنی طرف متوجہ کیا۔ لڑکی کا حسن نیم اندھیرے میں لٹک رہا تھا۔ بار بار میری نظر اس کی طرف اٹھتی تھیں۔ مجھے جس سا تھا کہ ساتھ بیٹھا مرد کیسا ہے؟ دونوں جب اٹھے تو میں ششدر رہ گئی۔ وہ متین تھا۔ بہت دیکھ بھگ رہا تھا۔ بلا پتا جسم اب بھر گیا تھا۔ باہر کی تعلیم و تربیت نے زبردست گرومنگ کر دی تھی۔ دونوں اپنی ترنگ میں میرے قریب سے گزر کر چلے گئے۔

تو میرے خدشات درست تھے۔ انسانوں کے بارے میں میری ریڈنگ بھی غلط نہ تھی۔ ایسے ہی ہوتا ہے۔
اگلے دن میں نے تہینہ کو فون کیا۔ ایک ڈکھ بھری جھجک آمیز تشویش میرے لب و لہجے سے ہو رہی تھی۔ میں حیران رہ گئی۔

”سر مجھ! اس کی آواز میں طمانیت سے بھر ا ہوا محبت بھرا چاؤ تھا۔ وہ ٹمرہ بھی۔ متین کے بچپن کے انتہائی بُرے دنوں کی ساقی۔ اس کی محبت، اس کی پوری۔“
میں تو سنانے کی ہی کیفیت میں تھی وہ چند لمحوں کے لیے رکی تھی پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی۔
”ٹمرہ کے بارے میں تو اس نے پہلی چند ملاقاتوں کے بعد ہی بتا دیا تھا۔“

سر مجھ! جب تین سال کی ایک سمجھ دار، پختہ عمر کی، اپنے مستقبل سے مایوس لڑکی خود سے نو سال چھوٹی عمر کے لڑکے سے اس کی مجبور یوں اور اپنی تشنہ خواہشوں کے تانے بانوں سے ایک رشتہ بننے لگتی ہے تو سمجھوتے کی پلک کو بھی ساتھ رکھتی ہے۔ متین کی بیوہ ماں ٹمرہ کے گھر کی ملازم تھی۔ ان کی جھوٹ سے اپنا اور بچے کا پیٹ بھرتی تھی۔ ٹمرہ کا گھر اس کی ماں کی وہ پناہ گاہ تھی کہ جہاں اس نے اپنا وقت عزت و آبرو سے کاٹا۔

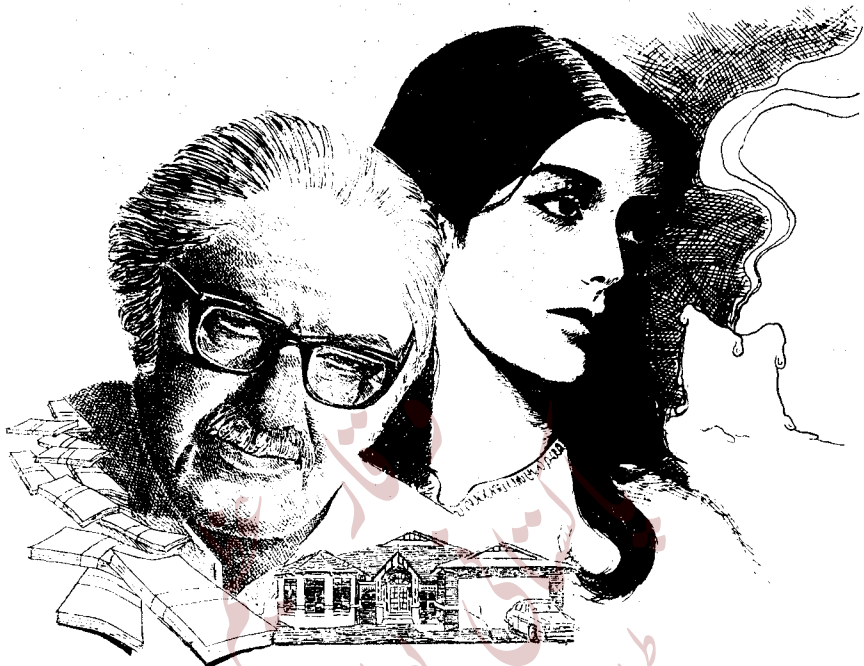
دونوں میں کوئی تین چار سال کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ دونوں میں بے پناہ محبت تھی۔ متین میرے غلوں اور قربانیوں سے بھی متاثر تھا۔ میری زندگی میں خوشیاں بکھیرنے کا آرزو مند تھا۔ ٹمرہ کی محبت کی ڈوریوں میں بندھا ہوا تھا۔ میں سوچتی رہی اور بالآخر ایک نتیجے پر پہنچی گئی۔

”متین دوستیوں میں بھر کر رکھ بیٹھا تھا۔ میری دانش مندی نے اُسے ڈولنے نہیں دیا۔ اُس کے انگلیڈ جانے سے قبل نکاح اس کی تعلیم اور گرومنگ سب میری نگرانی میں ہوئی۔ پانچ سال وہ میرے ساتھ میرے زیر سایہ رہی۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

میں ہونٹوں کی طرح منہ کھولے آنکھیں بھاڑے یہ سب سنتی تھی جانے کیوں یہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔ ”تہیں کچھ محسوس نہیں ہوتا۔“

وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ”ارے سر مجھ! میں تو اس کے سارے نظام کی گاؤں مدر ہوں۔ میرے خمار کیلئے تو یہی کافی ہے۔“





تعبیر خواب

محترم مدیر
السلام علیکم

یہ روداد ہے دو سیپیلیوں کی۔ ان دونوں میں کتنی محبت کیسی چاہت تھی اس کا اندازہ آپ کو روداد پڑھ کر ہی ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ سرگزشت کے قارئین کو بھی یہ روداد پسند آئے گی۔

حبیب الرحمن
(کراچی)

والے تھے اور سال ہا سال سے ایک ساتھ رہ رہے تھے اس لیے یوں لگتا تھا جیسے سب ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔ سن شور سے پہلے کا بھی ایک زمانہ ہوتا ہے جس میں کوئی نہ بڑا اکھلاتا ہے نہ ٹھامتا۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب سارے بچے بہت سارے بچوں اور بڑوں کے درمیان رہ کر اچھی بری ہر قسم کی باتیں سن بھی رہے ہوتے ہیں اور کچھ بھی رہے ہوتے ہیں۔

میں اس کو اپنے بچپن سے جانتی تھی کیونکہ وہ میری ہم عمر ہی تھی۔ ایک ہی گلی، ایک ہی محلہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دیوار سے دیوار جڑی ہوئی۔ یہ بستی نہ تو بہت غریبوں کی تھی اور نہ ہی بہت خوشحال لوگوں کی۔ ایک خوبی نمایاں تھی کہ اس میں رہنے والے سارے لوگ ہی پڑھے لکھے اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں کام آنے

جوں جوں عمر کن شعور کی جانب بڑھ رہی ہوتی ہے، ہم اچھی اور بری باتوں کا تجزیہ بھی کرنے کے قائل ہوتے جا رہے ہوتے ہیں لیکن اس مقام پر ہمارے ارد گرد کا ماحول، بڑوں کے رویے اور سلوک، ماں باپ اور بہن بھائیوں کا کردار، حلقہٴ احباب کا طرز سلوک اور سب سے بڑھ کر اساتذہ کا معیار تعلیم و تربیت ہماری کردار سازی میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوتا ہے۔

اس ابتدائی دور سے گزر کر جب میں اور وہ کن شعور کو چھو کر کچھ اور آگے بڑھتے تو ہمیں یہ سمجھ کر خوشی ہوئی کہ ہمارے ارد گرد کے ماحول کے جتنے بھی مراحل تھے وہ سارے کے سارے بہت ہی اچھے تھے اس لیے ہم پورے یقین سے یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم میں کسی بھی قسم کا کوئی بگاڑ جو خود ہمارے لیے یا پھر ہمارے کسی بھی بڑے کے لیے وجہ شرمندگی ہو، نہیں آسکا تھا۔

زندگی میں بعض اوقات ایسے مراحل بھی آتے ہیں جب ایک لمحہ بھی صدیوں کے برابر لگتا ہے اور وقت کا نئے نہیں لگتا اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ پر لگا کر اڑنے لگتا ہے۔ کچھ ایسا ہی میرے اور اس کے ساتھ بھی ہوا۔

اسکول میں داخلہ لیا ہی تھا کہ ابتدائی اسکول سے فارغ ہونے کا پانی نہ چلا اور اب تو میں اور وہ دسویں جماعت میں تھے۔

مجھ میں اور میری سہیلی میں اگر کوئی بہت بڑا فرق تھا تو وہ یہ تھا کہ ذہن ہونے کے باوجود بھی وہ پڑھائی کے معاملے میں سستی اور کاہلی کا شکار تھی۔ حسن اتفاق یہ بھی رہا کہ میں اور وہ دسویں جماعت تک جس جس اسکول میں بھی رہے نہ صرف اسکول فیو رسے بلکہ ہم جماعت بھی رہے۔ میں اپنے پورے یقین کے ساتھ یہ بات کہہ سکتی ہوں کہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ لائق فائق تھی، ہر چیز اس کو طے کی طرح ازبر ہو جایا کرتی تھی اور ہر سوال کا جواب اس کے پاس موجود ہوتا تھا لیکن نہ معلوم کیا بات تھی کہ وہ موم و رک ہو گیا کسی قسم کے درمیان بدلت یا سالانہ امتحانات، وہ اس میں مجھ سے پیچھے ہی رہ جایا کرتی تھی اور اس کی بنیادی وجہ وہ یہی بتاتی تھی کہ نہ جانے ان مواقعوں پر اس میں سستی اور کاہلی کیوں بڑھ جایا کرتی ہے جس کی وجہ سے وہ سب کچھ جانے ہوئے بھی امتحانی سوالات کے جوابات کا حلقہ نہیں دے پاتی تھی۔

کسی حد تک میں بھی گھریلو کاموں میں بہت ساری کوتاہیوں کا شکار رہتی تھی، جھاڑ پونچھ کا کام تو مجھے عذاب ہی لگا کرتا تھا لیکن دیگر گھریلو امور خاص طور سے کھانا پکانا اور

مہمانداری میں میرے والدین اور بہن بھائیوں کو کبھی کوئی۔۔۔ شکایت نہیں ہوئی لیکن میری سہیلی شاید بہت سارے معاملات میں بہت اچھی رہی ہو مگر سالن چولہے پر چڑھانے کے بعد اکثر بھول جانے کی عادی رہی تھی اسی لیے پڑوس سے اس کی والدہ کی چیخنے کی آواز سنایا کرتی تھیں کہ ارے نیک بخت دیکھ سالن جلنے کی بو آ رہی ہے۔

ڈیٹ شیٹ آچکی تھی اور ٹھیک بیسویں دن ہمارا پہلا پرچہ تھا اور درمیان درمیان مناسب وقفوں کی وجہ سے اس کا اختتام بائیس دن بعد ہونا تھا۔ امتحان کی بھی قسم کا ہو یہ انسان کو اندر سے ہلا کر رکھ دیتا ہے، یہی حال میرا بھی تھا اور سارے کاموں سے منہ موڑ کے میں نے اپنا رخ کتابوں کی جانب پھیر لیا تھا لیکن جب جب بھی میں اپنی سہیلی کے گھر گئی اس کی کتابیں تو کھلی اور کھری پائیں لیکن اس کا دھیان نہیں اور یہ پایا، پوچھنے پر یہی جواب ملا کہ میرے ساتھ نامعلوم کیوں ایسا۔۔۔ ہوتا ہے۔

پرچے ختم ہوئے، لگا ایک پہاڑ سا بوجھ سر پر دھرنا تھا وہ اتر گیا۔ ہمارے ملک کا یہ ایسا ہے کہ امتحانات کے نتائج بہت ہی تاخیر سے آیا کرتے ہیں اس طرح زندگی کے کئی قیمتی مہینے امتحان کے نتائج کے انتظار میں ہی گزر جاتے ہیں سو یہ بھی ایک امتحان تھا جو گزر ہی گیا لیکن مجھے اس بات کا گہرا صدمہ تھا کہ میری بہت ہی اچھی اور پیاری سہیلی کو ایک پرچے میں حزیست اٹھانا پڑی اور باقی پرچوں میں بھی بہت حوصلہ افزا خبریں آسکتے تھے۔

کہتے ہیں کہ وقت بڑا امر ہم ہوتا ہے، اس لیے ماحول کی کدورت بھی قصہ ماضی بننا شروع ہو گئی اور اس نے بھی مجھی امتحان میں بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔

کچھ فیصلے وہ دہوتے ہیں جو ہم کر رہے ہوتے ہیں اور کچھ فیصلے وہ دہوتے ہیں جو کا تب تقدیر لکھ رہا ہوتا ہے۔ اس نے مجھی امتحان میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔۔۔ تھا اور درخواست داخل ہووڑ کی ہی تھی کہ کوئی اس کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آن کھڑا ہوا۔ لوگ اچھے تھے، لڑکا مناسب تھا اور ان ہی کے مطابق حالات اور ماحول والا تھا اس لیے والدین نے رشتہ طے کرنے میں دیر لگانا مناسب نہیں سمجھا اور اس کو اللہ کا حکم اور رب کی رضا سمجھتے ہوئے نہ صرف قبول کر لیا بلکہ چند مہینوں میں اس کو رخصت بھی کر دیا۔ جس جس نے بھی لڑکے اور لڑکے والوں کو دیکھا، ملاقات کی، سب نے یہی کہا کہ اچھے لوگ ہیں اور دعائیں دیں کہ اللہ تعالیٰ سکھی رکھے۔ اس طرح میری بہن جیسی سہیلی مجھ سے میلوں دور پیار کے اور میری بچوں پر ستارے سجائے

پیدا پس جلی گئی۔

میں ابھی اس وقوعہ پر حیران و پریشان ہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ میری پہلی کی ابھی عمر ہی کیا تھی جو ان کے والدین نے اس کے نرم و نازک کانحوں پر اتنی بھاری ذمہ داری ڈال دی کہ میرے گھر بھی کوئی آندھی طوفان کی طرح آن پڑا اور میں نہیں نہیں ہی کرتی رہ گئی۔

اس طوفان کو سر سے گزرے بھی پانچ برس بیت چکے ہیں۔ اس پانچ برسوں میں کئی اور حقیقی طوفان بھی گزرے، میری والدہ دنیا سے رخصت ہوئیں، میری سہیلی کے تو دونوں سائے ہی سر سے اٹھ گئے، میرے والد کا سایہ ابھی تک میرے سر پر ہے لیکن میں والد سے کوسوں دور دارالحکومت میں ہوں اور والد اپنے آبائی شہر میں، اپنی پہلی کی بس اتنی ہی خبر ہے کہ وہ شادی ہو کر حیدرآباد چلی گئی تھی اور کیونکہ میری شادی بھی بہت غلط میں ہوئی تھی اس لیے کسی کو اتنی مہلت ہی نہ مل سکی کہ دو دروازے کے لوگوں کو مدعو کیا جاسکے۔

آج کل کے ماحول کے اعتبار سے شاید یہ بات بہت عجیب سی لگے کہ اتنی چھوٹی عمر میں ہماری شادیاں کیوں کر دی گئیں لیکن میرے زمانے میں یہ عمریں بہت بڑی کہلاتی تھیں اس لیے ایسا ہو جانا اس زمانے کے لحاظ سے درست ہی تھا اور جو کچھ میں نے اپنے محسوسات بیان کیے وہ میرے اپنے اندر کی لڑکی کے تھے کیونکہ مجھے ایسا ہی لگا تھا کہ اتنی کم عمر میں اتنی بھاری بھاری ذمہ داریاں کسی بچی پر ڈال دینا میری اپنی سوچ کے مطابق مناسب نہیں تھا۔

جب تک میری والدہ حیات تھیں اور ان سے بذریعہ خط و کتابت رابطہ رہتا تھا یا وہ بھی یا میں بھی آتی..... یا..... جایا کرتے تھے، اپنی سہیلی کے متعلق یہی خبر ملی کہ وہ بحیثیت مجموعی خوش ہی ہے البتہ فطری سستی اور کالہ کی وجہ سے اسے اکثر شدید پریشانی کا سامنا رہتا ہے لیکن والدہ کی وفات کے بعد ہر قسم کا رابطہ منقطع ہو کر رہ گیا تھا۔

مکروں پر سے پاک اللہ کی ذات ہے، مجھے بھی اس بات کا اندازہ ہے کہ میری اکثر غلامیوں، مکروں پر اور کوتاہیوں کی وجہ سے کافی مشکلات کا سامنا رہتا تھا، کچھ پر تو میں قابو پایا کرتی تھی لیکن جس طرح ایک گھروالی کو گھر کو چھین بٹا کر رکھنا چاہیے، اس کمزوری پر میں اب تک قابو نہیں پاسکتی تھی۔ یہ بات میری ساس کے لیے بیدہ دلی کا سبب بن جایا کرتی تھی لیکن ان کی اچھی بات یہ تھی کہ وہ بات کو طول دینے کی بجائے ختم کر دیا کرتی تھیں اور یوں بات آتی ہی ہو جایا کرتی تھی۔

آج مجھے اپنی سہیلی نہ جانے کیوں بہت یاد آ رہی تھی۔ پیدا نش سے لے کر جوانی تک اور پھر شادی تک جو بہنوں کی طرح ساتھ رہی ہو اس کو بھول جانا کیسے ممکن ہے لیکن پریشانی کی بات یہ تھی کہ میرا اس سے اور اس کا مجھ سے رابطہ نہیں تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دو تین ہی ذرائع ہوا کرتے تھے، خط، تار یا پھر لینڈ لائن ٹیلیفون..... ٹیلیفون تو کسی کی کہ پاس ہوا کرتا تھا۔ میرے پاس یہ سہولت ضرور تھی لیکن کروڑوں اس نعمت سے محروم ہی ہوا کرتے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی یہ نہیں سنا تھا کہ میری سہیلی کے گھر یا محلے میں ایسی کوئی سہولت میرے رہی بات خط اور تار کی تو اس کے لیے اولین شرط گھر کے پتے کی ہوتی ہے جو میرے پاس تھا ہی نہیں کیونکہ جو بھی خیر خیریت مجھے معلوم ہوتی رہی وہ میری سہیلی کے والدین سے ہی ہوتی رہی اور اب تو وہ لوگ بھی اس دنیا میں نہیں رہے تھے اور میرا رابطہ بھی بہت عرصہ ہوا اس کے گھر والوں سے منقطع ہی تھا۔ اس کا خیال آتے ہی دل کی گھرائیوں سے کوئی آس و اُمید کی آہ بلند ہوتی تو یہی ہوتی کہ اللہ اس سے ملاقات کی کوئی تسلی ضرور نکالے اور زندگی میں وہ اور میں ایک بار ضرور مل سکیں۔

میری ساس اس زمانے کی روایتی ساس بالکل بھی نہیں تھیں، چھوٹی موٹی گھریلو باتوں کے علاوہ کبھی کوئی بات نہیں ہوئی اور جو ہوئی بھی اس میں میری عمر ہی کسی نادانی یا کوتاہی کا دخل رہا۔

میرے شوہر کی ملازمت بہت مناسب تھی اور ہم ایک اچھی زندگی گزار رہے تھے۔ میرے سر بھی اچھے سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ شوہر حسب معمول صبح دفتر جاتے اور چار پانچ بجے کے دوران لوٹ آتے تھے۔ سرہوں یا میرے شوہر، سرکاری ملازمت کے باوجود پابندی اوقات کے بہت ہی پابند تھے اس لیے ہم سب کے سونے اور جاگنے کے اوقات معمول کے مطابق ہی تھے۔

ایک دن جب میرے شوہر گھر لوٹے تو کچھ مضمحل مضمحل نظر آئے، میں نے یہ تبدیلی محسوس... تو فوری طور پر کر لی لیکن جب وہ نہاد ہو کر فارغ ہوئے تو میں نے جانے پوچھ کر پوچھ کر پوچھ کر اس تبدیلی کے محسوس کئے جانے پر حیرت اور خوشی کی ٹلی جلی کیفیت کا اظہار کیا اور پھر کہا کہ میرا جلد تین سال کے لیے حیدرآباد کر دیا گیا ہے۔

یا اللہ، میرے دل میں بے اختیار یہ صدا گونجی، آج ہی تو میرے دل میں اپنی بچپن کی سہیلی سے ملنے کی تڑپ پیدا ہوئی تھی

جوبیادہ کے حیدر آبادی گئی تھی اور آج ہی میرے شوہر مجھے اپنے
جائے لے کا سنا رہے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے یوں لگا جیسے میں
شوہر کے سامنے نہیں ہوں بلکہ سبیلی کی تلاش میں حیدر آباد کی
گلیوں میں گھومتی پھر رہی ہوں۔

”کہاں تم ہو گئیں“ میرے کانوں میں شوہر کی آواز
گونجی اور مجھے یوں لگا جیسے بہت دور سے کسی نے آواز دی ہو۔
میں نے گہرا کہہ کہا۔ ”کہاں تم ہو سکتی ہوں آپ کے
باس ہی تو ہوں۔“ لیکن یہ جملہ ادا کرتے ہوئے میرا لہجہ
آنکھیں اور اعتماد کچھ اور ہی چٹکی کھا رہا تھا۔ میرے شوہر نے
سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی چشم پوشی سے کام لیا۔

اکثر میں اپنے گھر آئے کسی مہمان یا گھر میں ساس یا
سسر سے کوئی بات کر رہی ہوتی تھی اور میرے شوہر دور بیٹھے کسی
کام میں مصروف اس بات کو نوٹ بھی کر رہے ہوتے تھے پھر بھی
آج تک انھوں نے خود سے یہ جاننے کی کوشش یا خواہش نہیں
کی کہ میں کیا باتیں کر رہی تھی۔ میں نے اکثر اپنے شوہر کو ٹوکا
کہ آپ، کی جانے والی باتوں کو دریافت کیوں نہیں کرتے تو وہ
بہت متانت سے صرف اتنا کہا کرتے تھے کہ ظاہر ہے تم کوئی سا
میرے خلاف کسی سے کچھ کہہ رہی ہوگی، اگر کوئی بات مجھے
بتانے کی ہوگی تو مجھ سے کیوں چھپاؤ گی اور میں ان کی اس سوچ
پر ششدر رہ جایا کرتی تھی۔

یہی اس وقت بھی ہوا اور وہ مجھے آج بھی حیران کر رہے۔
والدین کے سامنے اپنے مسئلے کو رکھتے ہوئے انھوں نے
کہا کہ میں نے سوچا ہے کہ میں آپ کی بیٹی کو ساتھ لے جانے
کی بجائے تمہارا چلا جاؤں اور چھٹیوں کے دوران آؤں جاؤں
تا کہ آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

میں نے یہ جملہ بہت مبر ضبط کے ساتھ سنے۔ گھر کی
فضا میں چند لمحوں کے لیے سکوت سا چھا گیا۔ میری نگاہیں بے
ساختہ اپنے ساس سسر کی جانب اٹھ گئیں اور میں منتظر رہی کہ
دیکھیں کیا جواب آتا ہے۔

”نہیں بیٹے، یہ بات ہمیں کبھی گوارہ نہیں ہوگی۔ تین
سال کا عرصہ کوئی ٹھوڑا عرصہ تو نہیں ہوتا اور کیا ہمیں معلوم نہیں
کہ لو کر یہ پیشہ افراد کو کتنی چھٹیاں ملتی ہیں۔ تم جاؤ تو ہماری بیٹی کو
ہمارے لے کر جانا۔“

ان کی باتیں سنی تو میری چٹکیں شبنم آلود ہو گئیں کہ ہم کتنی
جلد کسی کی جانب سے کوئی رائے قائم کر لیا کرتے ہیں۔

”ٹھیک ہے۔“ میرے شوہر نے جواب دیا۔ ”میں دو
دن بعد روانہ ہو رہا ہوں، جو آٹنگ دوں گا، کسی اچھی جگہ مکان

تلاش کروں گا اور پھر انہوں نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
”اور پھر آپ کی بیٹی کو بھی لے جاؤں گا۔“
ایسا ہی ہوا، ایک ماہ کے اندر اندر میں اپنے شوہر کے
ساتھ حیدر آباد شفٹ ہو گئی۔

حیدر آباد کا لطیف آباد اس وقت کے حیدر آباد (اور آج
کے بھی) کی ایک اچھی رہائشی اسکیم تھی اور کیونکہ اس کی تعمیر
شروع ہوئے بہت عرصہ نہیں ہوا تھا اس لیے ہر جگہ بہت کھلی کھلی
اور صاف ستھری نظر آتی تھی، گوکہ مجھے یہاں کی رہائش اسلام
آباد سے اچھی بھی نہیں لگتی لیکن جہاں شوہر ہودہ بیشک جنگل بھی
ہو تو ساں منگل سے کم نہیں ہوا کرتا۔

لطیف آباد میں رہتے ہوئے اب دو سال کا عرصہ گزر چکا
تھا۔ گلیوں میں گھومتے، بازاروں میں خرید و فروخت کے
دوران، تفریح گاہوں میں سیر کرتے میں ایک ایک خاتون، خواہ
وہ نقاب میں ہو یا بے نقاب، غور سے دیکھا کرتی کہ شاید مجھے
میری سبیلی نظر آجائے لیکن اب تک ایسا ممکن نہ ہوسکا تھا۔ اکثر
یہ بھی ہوتا کہ میرے شوہر میری اس بات کو محسوس کر لیتے لیکن
سوائے مسکرانے کے کبھی انہوں نے اور کچھ نہیں کیا جس پر اکثر
میں جھنجھلاہٹ کا شکار ہو کر پوچھ پٹھتی کہ آخر آپ میری اس
کیفیت پر کوئی تبصرہ کیوں نہیں کرتے، یہ بات سن کر ان کی
مسکراہٹ میں اور بھی گہرائی آجایا کرتی تھی مگر تبصرہ پھر بھی نہیں
کرتے تھے۔

آج بھی کچھ ایسا ہی ہوا، میں ان کے ساتھ بازار میں
کچھ خرید و فروخت کر رہی تھی ایک نقاب پوش خاتون کو کچھ زیادہ
غور سے دیکھنے لگی لیکن بہت جلد مجھے یہ احساس ہوا کہ جو کچھ
میں تلاش کرنا چاہ رہی ہوں وہ اس میں ہے ہی نہیں۔ میں نے
بے ساختہ مڑ کر شوہر کی جانب دیکھا تو ان کے ہونٹوں پر گہری
مسکراہٹ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔

گھر پہنچ کر میں ان پر الٹ ہی پڑی۔ ”آخر آپ میری
اس کیفیت پر صرف مسکراتے کیوں ہیں پوچھتے کیوں نہیں کہ
میں ایسا کیوں کرتی ہوں۔“

آج پہلی مرتبہ مجھے ان کی جانب سے لفظوں میں جواب
ملا تو میں حیران رہ گئی۔

کہنے لگے۔ ”جس چیز کا معلوم ہو اس کے متعلق پوچھنے کا
کیا فائدہ اور جس کا نہ معلوم ہو تو اس کی محو کج رید کیوں؟“

میں ان کے جواب پر چونک پڑی، آپ کو کیا معلوم کہ
میں ایسا کیوں کرتی ہوں؟“

کہنے لگے۔ ”تمہیں اپنی سبیلی کی تلاش ہے۔“

یقین اور اعتماد والی بات کہ اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتا چاہیے۔

کچھ دنوں سے میری طبیعت مجھے اپنی ہی چٹلی کھاتی محسوس ہو رہی تھی، مگر میں بزرگ خواتین کا ہونا بھی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے اس کا احساس تو مجھے حیدر آباد آتی ہی ہو گیا تھا لیکن اب کچھ دنوں سے تو اس کی احساس اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اس زمانے کی تربیت ہی ایسی ہو کر تھی کہ اس قسم کی باتیں شوہر سے بھی براہ راست نہیں کی جاتی تھیں لیکن اب تو کرنا ہی تھی۔ دل و دماغ کو سمجھایا، دل کی دھڑکنوں کو سنبھالا اور آخر کار ان کے سامنے بات رکھ دی۔

یہ وہ وقت تھا جب میرے شوہر دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلے ہی والے تھے۔ میری یہ بات سن کر وہی گہری مسکراہٹ ان کے لبوں پر قید ہوئی جس کو دیکھ کر میرے دل و دماغ میں عجیب سے کھلبلی مچ جایا کرتی تھی۔ اسی کے ساتھ وہ کوئی جواب دینے بغیر مجھے حیران و پریشان چھوڑ کر دفتر روانہ ہو گئے۔

حسب معمول شام کو گھر لوٹے تو بس اتنا کہا کہ بس تم تیار ہو جاؤ، لیکن پہلے چائے، آج کہیں چلتے ہیں۔ میں نے سوچا شاید میرے سلسلے میں ہی جارہے ہوں۔

چائے تیار کی، وہ مسکرا کر کہنے لگے تو میں اٹھی اور تیار ہونے چلی گئی۔ واپسی پر وہ بھی تیار ہی لے اور ہم نامعلوم منزل کی جانب چل دیے۔ حیدر آباد میرا دیکھا ہوا تو نہیں تھا اس لیے میرے لیے منزل نہ معلوم ہی رہی ہوگی لیکن جہاں میرے شوہر مجھے لے جاتا چارہ رہے ہوں گے وہ تو یقیناً ان کے لیے ”معلوم“ ہی ہوگی۔

ہماری کار کو جہاں بریک لگا اس جگہ کو دیکھ کر ایک جھٹکا میرے دماغ کو بھی لگا، نہ تو یہاں اسپتال تھا اور نہ ہی تفریح گاہ، یہی دونوں جگہیں میرے تصور میں گردش کر رہی تھیں یا اللہ ریلوے اسٹیشن؟ یہ بھی کوئی جگہ ہوئی۔

کسی گاڑی کے آنے کا وقت قریب تھا، تانگے اور سائیکل رکشایں ہوتا شروع ہو گئے تھے۔ اکاؤنٹ موٹر کاریں بھی نظر آرہی تھیں، یہ وہ زمانہ تھا جب بعد مشکل کسی محلے میں کوئی کار والا ہوتا تھا۔

میں نے اپنے شوہر سے اپنی حیرت کا اظہار کیا تو بس اتنا جواب ملا۔ ”چند منٹ ٹھہر جاؤ سب معلوم ہو جائے گا۔“ اور چند منٹ بعد ہی ریل گاڑی اسٹیشن سے آگئی اور اس کے مزید چند لمحے بعد ایک ڈبے سے میرے ساس سر

”کیا مطلب؟“ میں جیسی چیخ سی پڑی۔ یہ بات آپ اتنے یقین سے کیوں کہہ رہے ہیں۔

”بات یہ ہے کہ تم جس چھوٹے سے شہر میں رہتی تھیں وہاں تقریباً سارے ہی لوگ ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے۔ جب میرے والدین میرے رشتے کی تلاش میں وہاں گئے تو آپ بات کا تذکرہ بھی آیا کہ تمہاری ایک سہیلی کی شادی چند ماہ قبل ہو چکی ہے اور وہ رخصت ہو کر حیدر آباد گئی ہے۔ تم اور تمہاری سہیلی کا جو دوستانہ تھا وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں تھا اس لیے میری والدہ سے اس کے تذکرے بالکل اس طرح گئے تھے جیسے کوئی بچی کہتا ہے۔“

میں۔۔۔ دل ہی دل میں انھیں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن صرف ”ہوں“ کہہ کر رک گئی۔

جب ہی میں کہوں یہ ہر دم مجھے اس طرح دیکھ کر مسکرایا کیوں کرتے ہیں۔ یہ بات بھی میں نے اپنے دل ہی دل میں کہی۔

میں نے اپنے جذبات کو قابو رکھتے ہوئے کہا۔ ”پھر آپ کے علم میں بھی ہوگا کہ وہ لطیف آباد میں کہاں ہے۔“ ”جہیں علم ہے؟“ انہوں نے مجھ سے سوال کر لیا۔ ”جہیں۔“ میرے منہ سے بیباختہ نکلا۔

”پھر مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے جبکہ مجھے اس کا یا اس کے شوہر کا نام تک نہیں معلوم۔ جہاں تک اس کے نام کا تعلق ہے وہ ظاہر ہے میں کیسے بھول سکتی تھی لیکن جہاں تک اس کے شوہر کے نام کا تعلق ہے وہ تو میں نے کبھی کسی سے پوچھا تک نہیں تھا اور نہ میرے زمانے میں ایسا کوئی رواج تھا البتہ اگر اس کی شادی ہماری بستی ہی میں کسی سے ہوئی ہوئی تو بہت ممکن تھا کہ اس کے شوہر کا نام کسی نہ کسی سے سننے میں آئی جاتا۔ بات آگئی ہوگی اور کچھ ہفتے ایسے ہی گزر گئے۔

شادی ہوئے تقریباً سات برس بیت چکے تھے لیکن ہم ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ اولاد کی نعمت بھی کیا نعمت ہوتی ہے۔ ہماری تو تنہا جتنی بھی ہو کم ہے، بزرگوں کی تنہاؤں کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ اولاد کی محرومی ایک خاتون خانہ پر جمی ہوئی تلواری کی مانند ہوتی ہے۔ یہ سوچ کے جب جب میں نے اپنے شوہر کی جانب دیکھا ان کو مطمئن ہی پایا اور تذکرہ کرنے پر ایک ہی جواب ملا کہ ہم سب اللہ کے بندے ہیں اور اللہ کی رحمت سے مایوسی نافر ہے۔

میرے شوہر نظارہ کوئی مولوی یا مذہبی قسم کے نہیں تھے لیکن ان میں کچھ صفات توجہ خیز ضرور تھیں، جیسے یہی۔ اتنے

برآمد ہوئے جن کو دیکھ کر میری حیرت اور خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔

ایک حیرت اس حیرت سے بڑھ کر یہ تھی کہ آخر اپنی بات شوہر کے سامنے رکھتے ہی سب کچھ کیسے ہو گیا جبکہ اگر ایسا تھا بھی تو تین چار دن تو لگ جانے چاہیں تھے۔

انٹینشن سے لے کر گھر تک اس خیال کے علاوہ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کچھ اور سوچا ہو۔

گھر آ کر جو نبی میرے ساس سر نہانے دھونے میں مصروف ہوئے تو میں شوہر سے ابھٹی جس کا جواب انھوں نے لفظوں میں دینے کی بجائے دیوار سے لٹکے ہوئے کلینڈر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے دیا اور بے ساختہ میری نگاہیں اور گردن جیسے جھکی کی جھکی رہ گئیں۔

ابو (سر) ریٹائرڈ ہونے ہی والے تھے اور امی (ساس) اس خبر کے بعد کسی طور نہیں رک سکتی تھیں اس لیے ابو نے وہ چٹھیاں جو جمع ہو چکی تھیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد ان کا حساب بے باق ہو جانا تھا، ان کو ”حساب“ میں لانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور ان کو تصرف میں لانے کا اس سے اچھا موقع کون سا ہو سکتا تھا۔

میری مشکل دیکھ کر میری امی (ساس) نے میرے شوہر سے کہا کہ کراچی چلو، یہاں جدید ہسپتالوں کا قاعدہ ہے اور اللہ نے ہمیں اتنا کچھ دیا ہوا ہے تو کیوں نہ کسی اچھے نجی اسپتال میں چیک اپ کرالیں، میرے شوہر کو اس بات پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا جبکہ میرے سر کے بہت سارے رشتے دار کراچی ہی میں ہوا کرتے تھے۔ کراچی پہلے دارالحکومت ہوا کرتا تھا، جب اسلام آباد کو دارالحکومت بنایا گیا تو میرے ابو (سر) کا بھی اسلام آباد ٹرانسفر ہو گیا تھا۔ یہ بات مجھے اپنی شادی کے بعد ہی معلوم ہوئی تھی۔

کراچی میں ہمارا قیام ابو (سر) کے چھوٹے بھائی کے گھر ہی ہوا۔ ابو اور امی تو اکثر کراچی جاتے آتے رہے تھے لیکن میں پہلی بار ہی کراچی گئی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ پاکستان کے ہر شہری کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ کراچی دیکھے۔ بیشک اس وقت کا کراچی ہو یا اس وقت کا، ایک بہت ہی بڑا اور پرسوں شہر ہے لیکن لوگوں کے پاس اتنے وسائل ہی نہیں ہوتے تھے کہ وہ کہیں دور دراز کا سفر کر سکیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اب اپنے ملک میں گھومنا تو گھومنا، باہر جانا بھی کوئی بہت انہونی بات نہیں رہی۔

سب لوگ بہت اچھے لگے اور سب سے ہی پیار ملا۔

اگلے دن ہم ایک بہت اچھے اسپتال گئے۔ معائنے کے دوران معلوم ہوا کہ اس اسپتال سے اپنا ہاؤس چاب مکمل کر کے ڈاکٹر قرۃ العین حیدر آباد چاکی ہیں اور یہاں انھوں نے بہت اچھی شہرت پائی ہے۔ کیونکہ گزشتہ سات آٹھ برس سے حیدر آباد میں ہی مقیم ہیں اس لیے وہاں کے ایک نجی اسپتال نے ان کی لائق مندی اور اچھی شہرت کی وجہ سے ہاؤس چاب کے دوران ہی اچھی آفر دی ہوئی تھی جس کو انھوں نے اپنی خوش بختی سمجھتے ہوئے قبول کر لیا تھا۔ اسپتال کی انتظامیہ کو جب یہ علم ہوا تو انھوں نے مشورہ دیا کہ اگر آپ چاہیں تو ان کے پاس اپنی رجسٹریشن کر سکتی ہیں۔

الحمد للہ، میری رپورٹیں سب ہی اچھی آئی تھیں اور کسی بھی قسم کی کوئی تشویش کی بات نہیں بتائی گئی تھی، علاوہ کھانے پینے کی احتیاط کے، اس لیے سب نے یہی کہا کہ مشورہ مناسب ہے اور فیصلہ ہوا کہ اب بانی علاج اور دیکھ بھال حیدر آباد میں ہی ہو تو بہتر ہے۔

قرۃ العین، میں نے رات بھر اس نام پر بہت غور کیا۔ یہی نام تو تھا میری سہیلی کا۔ لیکن ڈاکٹر؟ میٹرک میں سپلیمنٹ، پڑھنے میں کامل اور سست۔ سو جانے والی لاہالی..... ادھہ کیا دنیا میں ایک ہی قرۃ العین ہے مگر حیدر آباد۔ سات آٹھ برسوں سے مقیم بس ساری رات کیا۔ جتنے دن کراچی میں گزارے اور کراچی سے آنے کے بعد اپنے گھر میں گزارے یہی کہانی دماغ میں گھومتی رہی۔ اس دوران مجھے یہ تک احساس نہیں ہو سکا کہ میرے شوہر میری اس کیفیت کو بھانپتے بھی رہے ہیں یا نہیں، آج ڈاکٹر کے پاس جانا ٹھہرا تھا، شوہر میرے ہمراہ تھے، اسپتال حیدر آباد شہر سے تھوڑا سا ہی باہر تھا۔ اسپتال میں ایسا رش بھی نہیں تھا اور میں آخری مریدی تھی۔ جب میں ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوئی تو یوں لگا جیسے میرا سارا وجود پتھر کا ہو گیا ہو، پاؤں سن من بھر کے ہو کر رہ گئے تھے۔ میں تو اب تک نقاب میں ہی تھی لیکن جو چہرہ میرے سامنے تھا وہ نقاب سے آزاد تھا اور.....

”کیا ہوا..... کیا ہوا۔“ ڈاکٹر اور اس کی انٹینڈنٹ گھبرا کے میری جانب بڑھیں۔

”کچھ نہیں ہوا ہے مجھے۔“ میں نے عجیب سی آواز کے ساتھ کہا اور اپنا نقاب کھینچ لیا۔

”ہائیں ل.....“ ڈاکٹر کے منہ سے بھی بیساختہ نکلا۔ اس کے بعد جو ہم دونوں نے آنسو بہائے ہیں وہ اللہ ہی جانتا ہے۔ میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ شادی مرگ سے بچ گئی۔ جب

کیفیت معمول پر آئی تو میرا آنسوؤں کے سیلاب میں میرا پہلا جملہ ”تم..... ڈاکٹر قرۃ العین..... تم۔“

آخری جملہ کہنے کے لیے مجھے کوئی تمہید نہیں باندھنا پڑی ظاہر ہے کہ مجھ سے زیادہ اس کو کون جانتا تھا۔

”خواب۔ ایک خواب کی تعبیر۔“

”کیا مطلب۔“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ہوایہ کہ میٹرک میں ایک پرپے میں فیل ہونے کے بعد اس رات میں بہت روئی۔ روئے تو نہ جانے کب مجھے نیند آگئی تو میں نے دیکھا کہ لڑکیوں کی ایک بہت لمبی قطار لگی ہوئی ہے۔ میں خواب میں بھی سوتے سے ہی بیدار ہوئی تھی۔ خمار آلود آنکھوں اور نیند میں ڈوبی آواز میں نے ایک لڑکی سے پوچھا کہ یہ کیسی قطار ہے، جواب ملا جنت کے ٹکٹ تقسیم ہو رہے ہیں۔ اندازہ لگایا کہ یہ اتنی لمبی قطار ہے کہ اس میں کئی گھنٹے لگ جائیں گے۔ میں نے سوچا کہ قطار میں کھڑے ہو کر اپنی ٹانگیں تھکانے سے بہتر ہے کہ سو جاؤ۔ آرام سے آخر میں قطار میں لگ کر ٹکٹ لے لوں گی۔

جب میری آنکھ کھلی تو اس قطار میں دو تین لڑکیاں ہی دکھائی دیں لیکن جس کھڑکی سے جنت کے ٹکٹ تقسیم ہو رہے تھے وہ مجھ سے بہت ہی فاصلے پر تھی۔ میں گھبراہٹ میں اٹھ کر تقریباً دوڑتی ہوئی کھڑکی کی جانب بڑھی۔ اسی دوران آخری لڑکی بھی فارغ ہو چکی تھی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ فاصلہ قربت میں بدل جائے لیکن جو بھی میں اس کھڑکی کے قریب پہنچی وہ کھڑکی بند ہو چکی تھی۔ میں یہ جان کراتی زور سے چیخی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ میری آواز پر سب گھروالے پریشان تو ہوئے لیکن اس کو میرے ٹپل ہو جانے کے صدمے کا سبب سمجھ کر اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے۔

میں نے سوچا جو لڑکی جنت کے ٹکٹ کے لیے بھی نہ جاگ سکے وہ دنیا میں کیا کر سکتی ہے۔

خواب کے بعد میں نے عہد کر لیا کہ اب میں کبھی سستی اور کاہلی کا مظاہرہ نہیں کروں گی۔

اسی دوران میری شادی ہو گئی لیکن میں کچھ اور ہی ٹھان چکی تھی۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ میرے سر سبیل حیدر آباد میں سرکاری ڈاکٹر تھے۔ میں نے بلا تکلف ان سے پڑھنے اور ڈاکٹر بننے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ میں سوچ رہی تھی کہ شاید یہ اجازت ملے لیکن وہ یہ سن کر بہت ہی خوش ہوئے اور میں نے کالج میں داخلہ لے کر پڑھائی کا آغاز کر دیا۔ گھر میں ساری سہولتیں تھیں، نوکر چاکر تھے اس لیے کام کاج کا کوئی بوجھ ہی نہ تھا۔ اور.....

اور..... دیکھ لو میں تمہارے سامنے ایک لیڈی گامینا کا لو جسٹ ڈاکٹر قرۃ العین موجود ہوں۔“

باہر نکلی تو میرے شوہر نے بہت غور سے مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھا لیکن حسب عادت کوئی لفظ بھی ادا نہیں کیا۔ میں نے بھی اپنی کیفیت کو چھپائے ہی رکھا اور یہی خیال کیا کہ وہ مجھ سے میرے متعلق کوئی سوال کریں گے۔

وہ مجھے گھر پر اتار کر یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے کہ میں ابھی آیا اس مرتبہ میں نے بھی عہد کیا ہوا تھا کہ جب تک وہ خود سے نہیں پوچھیں گے میں بھی ان کو لپٹنی سیکلی کے ٹل جانے کا نہیں بتاؤں گی۔ بڑا ادغوی کرتے ہیں کہ میں ہر بات کیفیت دیکھ کر ہی سمجھ جاتا ہوں البتہ ان کے آنے سے ٹل میں اپنی امی (ساس) کو سب کچھ بتا چکی تھی لیکن اس شرط پر کہ وہ اپنے بیٹے سے کوئی تذکرہ نہیں کریں گی۔

آدمے پونے گھنٹے میں ان کی واپسی ہوئی تو وہ مٹھائی کے ڈبوں کے ساتھ ہوئی۔

میں شرما کے کمرے میں جانے والی تھی کہ انھوں نے ہاتھ پکڑ لیا۔ ”غصہ ہو..... مجھے معلوم ہے تم مجھے ایک سر پرانز دینے والی ہو..... لیکن..... میں آج تم کو بھی ایک سر پرانز دینا چاہتا ہوں۔“

میرے ذہن میں ایک نئی زندگی کے علاوہ اور کوئی تصور ابھری نہیں رہا تھا۔

”کیسا سر پرانز؟“ میں نے شرمائے شرمائے لہجے میں کہا۔

”سن کر انھوں نے مٹھائی کا ڈبہ کھولا..... اس میں مٹھائی تو مٹی ہی لیکن کارڈ بھی تھا جس پر درج تھا۔

”تمہیں تمہاری بچپن کی دوست سے ملنا مبارک۔“

”آپ کو کیسے پتا چلا؟“ اس مرتبہ تو میں چیخ ہی پڑی۔ اندر جانے والی کیفیت کچھ اور بھی اور باہر آنے والا سراپا کچھ اور..... نام کا علم تو وہی چکا تھا، ڈاکٹر قرۃ العین۔

جو لفظ ایک مرتبہ میرے دل میں ٹھنکانا..... بن کر گونج کر رہ گیا تھا اس مرتبہ بہت بلند آواز کے ساتھ..... گھٹنے سے سے..... بن کر چھوٹ بھا..... اور..... اس بے تکلفی پر میری گردن اور آنکھیں شرمندگی کے ساتھ ٹکوں ہوئی چلی گئیں۔

جو لوگ محنت کرتے ہیں کامیابی انہی کا مقدر ہوتی ہے۔ اگر محنت کر لے انسان تو زندگی کا بدلنا کوئی مشکل نہیں۔



دل والا

محترم ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم

میں پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہوں۔ اسپتال میں ہر روز مریض آیا کرتے ہیں، ہر مریض کی ایک کہانی ہوتی ہے، ہر کہانی خود میں ایک جذبیت رکھتی ہے لیکن جو کہانی میں سناتے جارہی ہوں یہ رفاقت حیات کی کہانی ہے۔ بہت دلچسپ اور بہت انوکھی، امید ہے پسند آئے گی۔

ڈاکٹر عظمیٰ

(فیصل آباد)

بس ایک آدھ پکروار ڈکا اور ایک آدھ پکروار یڈور کا لنگا

لیا۔

وہ ایک معصوم آدمی تھا۔ اس کی باتیں بہت معصومانہ
ہوا کرتیں وہ ابھی مکرو فریب اور جھوٹ وغیرہ سے بہت دور

کھٹ.....کھٹ.....کھٹ۔

اسپتال کے وارڈ اور کوریڈور میں اس کی بیساکھی کی
آواز گونجا کرتی۔ وہ اب تندرست ہو چکا تھا۔ صرف اتنا تھا
کہ وہ اب بیساکھی پر چلا کرتا اور وہ بھی زیادہ دیر تک نہیں۔

تھاکم از کم یہی ہمیں محسوس ہوتا۔

ایک ایکسڈنٹ کے نتیجے میں اسے اسپتال لایا گیا تھا۔ اس وقت میں ہی ڈیوٹی پر تھی۔ جب مجھے بتایا گیا۔ ”میڈم ایک امیجریسی ہے۔ کئی جگہ سے فریجر ہو گیا ہے بے چارے کا۔ بے ہوش ہے۔“

میں اپنے کمرے سے نکل کر ادنیٰ ڈی میں پہنچ گئی۔ اس کی ایک ٹانگ کی ہڈی کئی جگہ سے بری طرح ٹوٹی ہوئی تھی۔ یہ کیس میرا نہیں ڈاکٹر باسط کا تھا لیکن چونکہ میں اسپتال کی انچارج تھی اس لیے سارے واقعات ابتدائی طور پر مجھے ہی دیکھنے پڑتے تھے۔

یہ ایک چھوٹا سا اسپتال تھا۔

شہر سے اندر ایک پڑھنا مقام پر یہ اسپتال ایک این جی او چلا رہی تھی اور مجھے فخر ہے کہ یہ ملک کے بہترین اسپتالوں میں سے ایک تھا۔

ہر طرح کے آلات، ڈاکٹر سب کچھ تھے۔ یہ بہت بڑے احاطے میں تھا۔ احاطے کے ساتھ ایک طرف ڈاکٹر کی رہائش کے لیے کوارٹرز بھی بنائے گئے تھے۔ کہنے کو تو یہ کوارٹرز تھے لیکن ان میں ہر قسم کی آسائش تھی۔

یہ اسپتال چونکہ شہر سے بہت دور تھا۔ اس لیے اضافہ کور بنے کی سہولت بھی فراہم کر دی گئی تھی۔ اسپتال کی اپنی شاندار فارمیسی تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ علاج سے لے کر دوائیں تک مفت ملتی تھیں۔ اس لیے یہ اسپتال مریضوں سے بھرا رہتا تھا۔

ایک بہت بڑی این جی او اسے چلا رہی تھی۔ کروڑوں کا بجٹ تھا اس کا اور سارے اخراجات مختیر حضرات کے تعاون سے پورے ہوا کرتے۔

مجھے یہاں بہت اچھی آفر ہوئی تھی۔ اس لیے میں شہر چھوڑ کر یہاں آ گئی تھی۔ یہ بھی اعزاز ہو گیا تھا کہ یہاں کی سکیورٹی کے انتظامات بھی بہت اچھے ہیں۔ اس لیے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوا کرتی۔

پندرہ دنوں میں ایک بار میں شہر اپنے گھر آتی تھی جس کا فاصلہ اسپتال سے سو کلومیٹر کے قریب تھا۔ میرے پاس اپنی گاڑی تھی اس لیے آنے جانے میں آسانی رہتی۔

میں تقریباً دوسرے یا تیسرے دن شام کے وقت قصبے کے بازاروں کی طرف چلی جایا کرتی۔ جہاں ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں مل جاتی تھیں۔

اسپتال کے حوالے سے تقریباً ہر شخص مجھے اور اسپتال کے پورے عملے کو جانتا تھا۔

ایک بار میں قصبے کے بازار میں آئی تو ایک لڑکی دکھائی دے گئی۔ دیے تو وہاں دکانوں پر اور سڑک پر عورتیں اور لڑکیاں دکھائی ہی دیتی تھیں لیکن میں نے اس کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ وہ ذرا مختلف لڑکی تھی۔ قصبے اور گاؤں کی دوسری لڑکیوں سے بالکل مختلف۔

اس کے چلنے کا انداز اور اس کی ڈریسنگ یہ بتا رہی تھی کہ اس کا تعلق شہر سے ہے، وہ خوب صورت اور ماسٹر بھی تھی۔

میرا اس کے بارے میں اندازہ اس طرح درست لگتا کہ مجھے دیکھ کر وہ خود میرے پاس آ گئی تھی۔

”ہیلو۔“ اس نے مجھے مخاطب کیا اور یہ انداز شہری کی لڑکی کا ہو سکتا تھا۔

”ہیلو۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”آپ اسپتال میں ڈاکٹر ہیں نا؟“ اس نے پوچھا۔ ”تمہیں کس نے بتایا؟“

”سب ہی بتا رہے ہیں۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”ویسے میرا نام شازیہ ہے۔“ میں ایم بی اے کر رہی ہوں۔ اس لیے میرا

یہاں رہنا نہیں ہوتا۔ شہر میں رہتی ہوں۔ اپنے اکل اور آنتی کے ساتھ۔ کبھی کبھی یہاں بھی آ جاتی ہوں۔“

”اور میں ڈاکٹر تھی ہوں۔“ میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

”جی ہاں۔“ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ”لوگوں نے آپ کا نام بھی بتا دیا تھا۔“

”میں یہاں ہر دوسرے تیسرے دن کچھ نہ کچھ خریدنے کے لیے آ جاتی ہوں۔“ میں نے بتایا۔ ”اس

بھانے میری آؤٹنگ بھی ہو جاتی ہے۔“

”ڈاکٹر! اگر یہ شہر ہوتا تو میں آپ کو آفر کرتی کہ چلیں سامنے والے رستوران میں چل کر بیٹھ جاتے ہیں لیکن

یہاں چونکہ ایسی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس لیے آپ کو میرے گھر چلنا ہوگا۔ یہاں سے قریب ہی ہے۔“

”بہت بہت شکریہ شازیہ! لیکن اس وقت نہیں پھر کبھی آؤں گی۔“ میں نے معذرت کر لی۔

”اوہ کے کوئی بات نہیں لیکن میں آپ کو تنگ کرنے کے لیے آپ کے اسپتال آتی رہوں گی۔ اجازت تو ہے

”؟“

”کیوں نہیں۔ جب چاہو۔ میں چار بجے کے بعد فری ہو جاتی ہوں۔“

وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر ایک طرف چل دی۔ جب کہ میں اپنی گاڑی کی طرف آگئی۔ شازیہ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

☆.....☆

کھٹ کھٹ کی آواز گونجی اور میں اپنے کمرے سے باہر آگئی۔

وہ سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ اب وہ پوری طرح صحت یاب ہو چکا تھا ورنہ جس وقت اسے اسپتال میں لایا گیا تھا اس کی حالت بہت خراب تھی۔

ایک ٹانگ کی ہڈی کئی جگہ سے ٹوٹی تھی۔ ڈاکٹر باسط نے بہت ہوشیاری اور مہارت کے ساتھ اس کا علاج کیا تھا۔ کئی آپریشن کرنے پڑے تھے۔

اگر یہی سب کچھ شہر کے کسی اسپتال میں ہوتا تو لاکھوں خرچ ہو چکے ہوتے لیکن ہمارے اسپتال میں اس کا علاج بالکل مفت ہوا تھا۔

اس کا نام حیات تھا۔ حیات بخش۔ ایک انتہائی سیدھا سادہ معصوم سا انسان۔ اس کو دیکھنے کے لیے اسپتال میں اس کے گھر والے آتے رہتے تھے۔ اس کے ماں باپ اور اس کی دونوں بہنیں۔ وہ سب ہی اس کی طرح سیدھے سادے تھے۔

اس کا ایک یونٹ قصبے میں ہوا تھا۔ فوری طور پر اسے شہر کے کسی اسپتال میں لے جانے کی بجائے ہمارے ہی اسپتال میں لایا گیا تھا اور خدا کا شکر ہے کہ کامیابی سے علاج بھی ہو گیا تھا۔

وہ کبھی کبھی مجھ سے گپ لڑانے کے لیے میرے کمرے میں آکر بیٹھ جاتا تھا۔

ایک دن اس نے مجھ سے ایک عجیب بات کی۔ ”ڈاکٹر صاحب! آپ کو معلوم ہے کہ میں بھی بہت پڑھا لکھا آدمی ہوں۔“

”اچھا بھائی وہ کیسے!“

”ڈاکٹر صاحب! میرا علم ذرا الگ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کون سی مٹی کس فصل کے لیے اچھی ہوتی ہے۔ کون سا پودا پروان چڑھے گا اور کون سا مرغی جائے گا۔ کون سا بچہ اچھا ہے اور کون سا خراب ہے۔ کیا آپ یہ بات جانتی ہیں؟“

”نہیں میں یہ سب نہیں جانتی۔“ میں نے اعتراف

کیا۔

”تو پھر میں اپنے میدان کا پڑھا لکھا ہونا۔“ اس نے کہا۔ ”آپ اپنے میدان کی پڑھی لکھی ہیں۔“ میں چونک گئی۔ اس نے بہت ہی دانش مندانہ بات کی تھی۔ اس نے ایک پروفیسر ڈراسی دیر میں سلجھا دیا تھا اور سچائی بھی یہی ہے کہ جو شخص بھی اپنی فیلڈ میں ماہر ہے وہ اپنی فیلڈ کا پڑھا لکھا انسان ہے۔

”واہ حیات بخش۔“ میں نے اس کی تعریف کی۔ ”یہ بتاؤ تم نے یہ بات کہاں سے سیکھی ہے۔“

”میں نے بھی دنیا دیکھ کر سیکھی ہے ڈاکٹر صاحب۔“ وہ فخر سے بولا۔

”اچھا۔“ میری دلچسپی بڑھ چکی تھی۔ ”کون کون سی دنیا دیکھی ہے۔“

”پورا گاؤں دیکھا ہوا ہے۔ ایک ایک گلی، یہی نہیں بلکہ آس پاس کے سارے گاؤں اور سارے قصبے میرے دیکھے ہوئے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ چار پانچ بار شہر بھی ہوا ہوں۔“

مجھے اس کی سادگی پر بہت ترس آیا۔ بے چارہ اس کو پوری دنیا بھجھ رہا تھا۔

بہر حال اسپتال میں آنے کے کچھ دنوں کے بعد وہ بیسائی کے سہارے آہستہ آہستہ چلنے کے قابل ہو سکا تھا۔ اب اس نے ایک دوسرا مشغلہ اپنالیا تھا۔ وہ ایک وارڈ سے دوسرے وارڈ کے چکر لگاتا رہتا اور مریضوں کے چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتا۔

اگر کوئی بیمار بچہ ہے تو اس کے پاس پہنچ کر اسے اپنی سیدھی کہانیاں سناتے لگتا اگر کوئی عورت بوڑھی ہے تو اماں اماں کہہ کر اس کی دل جوئی کرتا رہتا۔ یہ سب اس کی عجیب خوبیاں تھیں۔

ایک بار اسپتال کی ایک نرس نے مجھے بتایا۔ ”میڈم! آپ نے کبھی حیات بخش کو سنا ہے؟“

”سننے سے کیا مراد ہے تمہاری؟“

”میڈم! اس کی آواز بہت خوب صورت ہے۔ بہت درد بھری آواز ہے اس کی۔ کیا گھایا ہے اس نے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں اگر آپ بھی سن لیں نا تو واہ وا کرنے لگیں۔“

”تم نے کہاں سے سن لیا؟“

”کل رات ہی کو سنا ہے میڈم۔ کل میری ڈیوٹی

”میں مہینے دو مہینے میں گاؤں آتی رہتی ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”یہاں میرے والدین ہیں ناں۔“
 ”اور کون کون ہے؟“

”دو بھائی اور ایک بہن۔“ اس نے بتایا۔ ”ان سبھوں نے تعلیم حاصل کر رکھی ہے لیکن میرے چچنی نہیں کیونکہ مجھے ہمیشہ سے پڑھنے کا شوق رہا ہے۔“
 ”تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔
 ”زمیندار ہیں میڈم۔ سکندر علی نام ہے ان کا۔“
 ”اوہ۔“ میں چونک اٹھی۔ ”میں تو شاید ان کو جانتی ہوں اس اسپتال کی مدد کرنے والوں میں ان کا بھی نام ہے۔“

”جی ہاں یہ وہی سکندر علی ہیں۔“ اس نے بتایا۔
 ”خوشی ہوئی سن کر، اچھا یہ بتاؤ کہیں کوئی رشتہ وغیرہ۔“
 ”وہ ہنس پڑی۔“ نہیں میڈم باقاعدہ تو کوئی رشتہ نہیں ہوا۔“

”تو چلو بے قاعدہ رشتہ بتا دو۔“
 ”ہے ایک دوست۔“ اس نے بتایا۔ ”شہر میں ہی رہتا ہے۔ ویسے میرے والدین سے ملنے دو تین بار یہاں بھی آچکا ہے۔ گھر والے بھی اسے پسند کرتے ہیں۔“
 ”چلو پھر تو اچھی بات ہے۔ تو کب تک اچھی نیوز مل رہی ہے؟“

”یہ میرا ایم بی اے کا آخری سال ہے۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی ہے۔ اس سے فارغ ہو جائیں تو پھر بات آگے جائے گی۔“

اس دوران حیات بخش کمرے میں داخل ہوا، وہ چونکہ دو چار دنوں سے بیساکھی کے بغیر چلنے کی مشق کر رہا تھا۔ اس لیے اس کے آنے کی خبر نہیں ہوئی۔ ویسے بھی وہ فی الحال بہت آہستہ آہستہ ایک ایک قدم اٹھا کر چلتا تھا۔

وہ کھلے ہوئے دروازے سے اندر آ گیا۔ شازیہ اسے نہیں دیکھ پائی تھی کیونکہ دروازہ اس کی کرسی کے پیچھے تھا۔ حیات بخش کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے شازیہ کی ایک جھلک دیکھی اور اٹلے قدموں واپس چلا گیا۔

میں نے بھی اس وقت اسے آواز دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

شازیہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھ کر خدا حافظ کہہ کر چلی

رات کی تھی۔ میں یوں ہی کوریڈور میں ٹہل رہی تھی کہ میں نے سنا کوئی ہیرا گارہا تھا۔ آپ تو جانتی ہیں میڈم کہ اگر ہیرا کوئی اچھا گانے والا ہو تو کیا اثر ہوتا ہے۔“
 ”ہاں جانتی ہوں میں۔“

”تو میں آواز کی طرف بڑھ گئی۔ وہ حیات بخش تھا میڈم، کوریڈور سے نیچے اتر کر جو درخت ہے اس کے پاس جو چوڑا بنا ہوا ہے وہ اس چوڑے پر بیٹھا ہوا اپنی دھن میں گائے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ کسی اور ہی دنیا میں تھا۔ آپ بھی ایک بار اگر اس کو سن لیں تو آپ کو مزہ آجائے۔“

”ٹھیک ہے میں اس سے کہوں گی کہ وہ کسی دن مجھے بھی ہیرا بنائے۔“

دو دنوں کے بعد میں نے حیات بخش سے کہا۔ ”حیات بخش! میں نے سنا ہے کہ تمہاری آواز بہت اچھی ہے۔“

”ارے نہیں میڈم! میں کیا اور میری آواز کیا۔ کبھی کبھی اپنے آپ کو بہلانے کے لیے کچھ گالیتا ہوں۔“
 ”اور یہ بھی سنا ہے کہ تم ہیرا بہت اچھا گاتے ہو۔“
 ”ہاں میڈم یہ بات تو ہے۔“ اس نے گردن ہلائی۔
 ”تو پھر سناؤ کسی دن۔“
 ”جو حکم میڈم۔“

اس نے ایک شام کوریڈور کے نیچے اس چوڑے پر بیٹھ کر ہمیں ہیرا سنا دیا۔ اس وقت میرے علاوہ اور بھی نرسیں اور ڈاکٹرز تھے۔ حیات بخش کی آواز نے ایک ساں بانہہ دیا تھا۔ اوہ خدا! کیا خوب صورت آواز تھی اس کی، وہ ہیرا کی گانگی اور اس کے بولوں میں ڈوب کر رہ گیا تھا۔

وہ ایسی شخصیت تھا کہ دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسپتال چھوڑ کر جائے لیکن جانا تو تھا۔ ایک دن چلا ہی جاتا۔

اس دن میں اپنے کمرے میں گئی کہ شازیہ مجھ سے ملنے آگئی۔ یہ وہی شازیہ تھی جو قصبے کے بازار میں ملی تھی۔ میں اس وقت تقریباً فارغ بی بی تھی۔ اسے دیکھ کر خوش ہوئی تھی۔ ”آؤ آؤ کافی دنوں کے بعد آئیں۔“

”بس میڈم۔“ وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”کل میں شہر واپس جا رہی ہوں تو میں نے سوچا کہ آپ سے ملتی چلوں۔“

”بہت اچھا کیا، پھر کب آنا ہوگا؟“

”تو پہلی بار تم نے اس کو دیکھنے کے بعد گانا شروع کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں میڈم، میں تو شروع سے گاتا آیا تھا۔ قصبے والے اس لیے بھی مجھے پسند کرتے تھے کہ میں بھی ابھی ان کو ہیر سنا دیا کرتا۔ لیکن آواز میں سرشاری، لہک اور درد اس لڑکی کو دیکھنے کے بعد آیا تھا۔ جب میں گارہا تھا تو ایسا لگا کہ وہ لڑکی میرے سامنے ہی کھڑی ہوئی ہے اور میرے ہر بول پر جھوم رہی ہے اور میں صرف اسی کی خاطر گائے جا رہا ہوں۔ ایسا لگا تھا مجھے۔“

میں مسکرا دی۔ وہ کتنی سادگی اور سچائی کے ساتھ اپنے دل کی کیفیت بیان کیے جا رہا تھا۔

”میڈم! نہ جانے کس طرح مجھے احساس ہو جاتا کہ آج وہ لڑکی بازار کی طرف آنے والی ہے۔ میں اس کے لیے بازار پہنچ جاتا۔ اس کا انتظار کرنے لگتا اور وہ واقعی کسی طرف سے آ جاتی۔“

”اے کہتے ہیں دل سے دل کوراہ ہوتا۔“

”نہا نہیں میڈم۔ لیکن اس کے لیے میرے اندازے ہمیشہ صحیح ہوتے تھے۔ ایسا کیوں ہوتا تھا میڈم؟“ اس نے سوال کیا۔

”اس لیے کہ تم کو اس سے عجیب محبت تھی۔“ میں نے کہا۔ ”اس میں محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے کا پتا چل جاتا ہے۔“

”ہاں میڈم! ایسا ہی ہوتا تھا۔ ایک بار بہت زردی بارش ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسے دیکھوں۔ اتنے اچھے موسم میں اسے دیکھوں اور وہ دکھائی دے گی۔ حالانکہ ایسی بارش میں کون گھر سے نکلتا ہے۔ لیکن وہ نکل آئی۔“

”وہ بھی بے قرار ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”ہو سکتا ہے میڈم! لیکن میں تو بھی کھل کر اس کے سامنے بھی نہیں آیا۔ بس اس کو دور سے دیکھا کرتا یا اس کے سامنے سے گزر جاتا۔ ویسے ایک بات تو ضرور ہوئی تھی میڈم۔“

”وہ کیا؟“

”اس کے کچھ لینے کے بعد میں نے اپنے آپ پر دھیان دینا شروع کر دیا تھا۔ پہلے میں یوں ہی سے کپڑے پہنا کرتا تھا پھر بازار سے دو سوٹ لے آیا جھپٹتے ہوئے لٹش کرتے ہوئے۔ میں جب اس کو دیکھنے کی امید میں بازار

گئی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ اگلے مہینے پھر آ رہی ہے۔

اس شام حیات بخش میرے پاس آیا۔ وہ بہت اداس سا دکھائی دے رہا تھا۔ ”میڈم! اب مجھے اجازت دیں مجھے یہاں سے جانا ہے۔ ویسے بھی آپ لوگوں کی مہربانی اور توجہ سے تھوڑا تھوڑا چلنے لگا ہوں۔“

”ارے حیات بخش تم تو کہتے تھے کہ جہیں یہاں سے بہت دنوں تک نہیں جاتا ہے۔“

”بس میڈم اب دل نہیں لگ رہا۔“

”کوئی شادی وادی کا پروگرام تو نہیں ہے؟“

”شادی!“ اس کے ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ آ گئی۔ ”ارے نہیں میڈم! ابھی ایسی کوئی بات نہیں ہے اور ویسے بھی دل ٹوٹ چکا ہے۔“

”اوہو۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”حیات بخش لگتا ہے کہ تم نے کہیں دکھا ٹھہرایا ہے۔“

”ہاں میڈم بہت بڑا دکھ۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”لیکن میں پھر بھی خوش اور مطمئن ہوں۔“

”نہیں تم خوش نہیں ہو۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تم یہ کہانی نہیں سناؤ گے؟“

”کیوں نہیں میڈم۔ آپ اتنی مہربان ہیں آپ کو تو ضرور بتاؤں گا۔“

☆.....☆

”میں ایک سیدھا سادہ آدمی ہوں میڈم۔“ اس نے بولنا شروع کیا۔ ”ایک سیدھے سادے کسان کا بیٹا۔ مٹی سے محبت کرتا رہا۔ باپ کے ساتھ مل کر فصلوں کا مزاج سمجھتا رہا۔ قصبے کا ہر آدمی میرا دوست تھا کیونکہ میں کسی سے لڑتا جھگڑتا نہیں تھا۔ ہر ایک کے کام آنے کی کوشش کرتا۔ زندگی اسی طرح گزر رہی تھی کہ ایک تبدیلی آ گئی۔ اس تبدیلی نے میرے اندر پچھلے بچادی تھی میڈم۔“

”اوہ تو اتنی بڑی تبدیلی تھی۔“ میں نے کہا۔

”ہاں میڈم، بہت بڑی۔ پہلی دفعہ سینے میں کچھ ہوا تھا۔ دھڑکنیں تیز ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں ایک چمک آئی تھی۔ وہ ایک لڑکی ہے میڈم۔ اس کو دیکھ کر ایسا احساس ہوا تھا جیسے اصل خوشی تو کہیں اور ہوتی ہے۔ کوئی مل جائے تو پھر زندگی خوب صورت معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کو میں نے جب پہلی بار دیکھا تو میں دیکھتا رہ گیا۔ وہ اتنی اچھی ہے میڈم۔ جس دن میں نے اسے پہلی بار دیکھا۔ اس شام میں بہت دیر لہک لہک کر ہیر کا تار ہا تھا۔“

کی طرف جاتا تو وہی کپڑے پہن لیتا۔ میری اماں کہیں کرتو بہت اچھا لگ رہا ہے۔ ہے ناں میڈم جب میں اماں کو اچھا لگ سکتا تھا تو اس کو کیوں نہیں لگتا۔“

میں بے ساختہ مسکرا دی۔ کیسی بچی مصومت تھی۔ ”حیات بخش! یہ بتاؤ تم نے کیا اس لڑکی سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا؟“

”نہیں میڈم! اتنی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔“ حیات نے کہا۔ ”جب سوچ کر جاتا اور اسے دیکھ لیتا تو ہمت جواب دے جاتی لیکن ایک دن میں نے سوچ لیا کہ آج ہر حال میں اس سے بات کروں گا۔ کم از کم بات ہی کر لوں۔ دل کی بے چینی ذرا کم ہو جائے گی۔ اس دن میں نے وہی نیا جوڑا پہنا۔ بال سلیقے سے بنائے اور بازار پہنچ گیا اور اس دن وہ تبدیلی آگئی۔ جو پہلے بھی نہیں آئی تھی۔“

”تم نے اظہار کر دیا؟“

”نہیں میڈم! اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ بازار تو آئی لیکن اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ بہت خوب صورت سا نوجوان بہت اچھے کپڑے پہنے ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہنس مٹس کر رہے تھے۔ صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں ایسے انداز اور ایسا رشتہ چھپتا تو نہیں ہے نا میڈم؟“

”نہیں بالکل بھی نہیں۔ بھینا اس کا اظہار الگ سے ہو جاتا ہے۔“

”تو وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بہت خوش تھے اور محبت تو اس جذبے کا نام ہے میڈم کہ آدمی جس سے پیار کرتا ہے۔ وہ خوش رہے۔ اسے اس کے علاوہ اور کیا چاہیے۔“

وہ سیدھا سادہ آدمی کتنی بڑی حقیقت بیان کر گیا تھا۔ ”اچانک میں نے ایک گاڑی دیکھی جو شاید ڈرائیور کے قابو سے باہر ہو گئی تھی۔ وہ گاڑی ان دونوں کے پیچھے کی طرف سے آ رہی تھی اور اس نوجوان کو لپکنے والی تھی کہ میں نے اچانک اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور اس نوجوان کو زور سے دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا اور خود گاڑی کی لپیٹ میں آ گیا۔ میرے ساتھ جو حادثہ ہوا وہی حادثہ ہے میڈم۔“

”اوہ خدا! یہ آدمی اپنی محبت کے لیے کتنی بڑی قربانی دے گیا تھا۔ ایسی مثال کہاں ملتی ہے۔“ ڈھونڈو اجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی۔ یہ خزانے جیسے ممکن ہے خرابوں میں ملیں۔“

”بس میڈم! یہ ہے میری کہانی۔“ اس نے کہا۔ ”اچھی لیے میں ہیر گاگا پھرتا ہوں۔“

”کیسا اس لڑکی کو معلوم ہے کہ تم نے یہ قربانی کس کے لیے دی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں میڈم! ایسی باتیں بتانے والی نہیں ہوتیں۔ صرف برداشت کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔“

”ویسے وہ لڑکی اب کہاں ہے؟“

”بہیں ہے میڈم! آپ کو یاد ہے پرسوں میں آپ کے کمرے میں آیا تھا تو وہی لڑکی آپ کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس کو دیکھ کر واہیں چلا گیا تھا۔“

”اوہ گاڈ! تم شاز یہ کی بات کر رہے ہو؟ سکندر علی کی بیٹی۔“

”جی ہاں میڈم! میں اسی کی بات کر رہا ہوں لیکن خدا کے لیے اسے کچھ مت بتائیے گا۔ میں نے آپ کو یہ کہانی سنا دی ہے۔ اس کو اپنے ہی تک رکھیے گا۔“

میں عقیدت بھری نگاہوں سے اس آدمی کو دیکھتی رہی۔ گاؤں کے ایک سیدھے سادے نوجوان نے اس دور میں محبت کا مفہوم سمجھا دیا تھا۔

دوسرے دن حیات بخش اسپتال سے فارغ ہو کر چلا گیا۔ اس کے بعد پھر اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ دو مہینوں کے بعد شاز یہ میرے پاس آئی۔ وہ اپنی شادی کا کارڈ لے کر آئی تھی۔ میرا دل چاہا کہ اسے حیات کے بارے میں بتا دوں کہ دیکھو اس دنیا میں ایک ایسا نوجوان بھی ہے جس نے تم سے ٹوٹ کر محبت کی ہے اور اس شخص کو مرنے سے بچایا ہے جو تمہارا شوہر بننے جا رہا ہے۔

لیکن میں خاموش رہ گئی۔ جب اپنی محبت کو خود حیات بخش نے چھپا کر رکھا ہوا تھا تو پھر میں کون ہوتی تھی اس کا راز فاش کرنے والی۔

میرا اب اس اسپتال سے ٹرانسفر ہو گیا ہے۔ میں شہر آگئی ہوں۔ خدا جانے بے چارہ حیات بخش کس حال میں ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ قصبے کی نضاؤں میں اب تک اس کی آواز میں ہیر کو گونج رہی ہو۔

خدا کرے

محترم معراج رسول

السلام علیکم

یہ سچ بیانی میری نہیں ایک دوست کی ہے۔ آپ نے سنا ہوگا بلکہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ لڑکے لڑکیوں سے فلرٹ کرتے ہیں لیکن میرے دوست کے ساتھ الٹا ہوا۔ یہ دلچسپ واقعہ آپ کو بھی پسند آئے گا۔

نصیر اشرف
(کراچی)

دولڑکیاں تھیں۔

دونوں نے بہت اچھی ڈریسنگ کر رکھی تھی۔ میرا ارادہ گزر جانے کا تھا لیکن دونوں نے ہاتھ دے کر میری گاڑی کو روک لیا۔ انسان تو انسان ہی ہوتا ہے۔ کچھ اس قسم کی فطرت

دونوں جوان اور خوب صورت۔ دونوں بس اسٹاپ سے ذرا ہٹ کر رکشایا جیسی کے انتظار میں کھڑی تھیں یا شاید انہیں کسی کا انتظار تھا۔



ہوتی ہے اس کی کلاس کے خیر میں شرکی ایک چنگاری جو رکھ دی گئی ہے وہ ہمیشہ بجھتی ہی رہتی ہے۔

فرصت کا لمحہ، تقریباً ساٹا اور دو جوان اور خوب صورت لڑکیاں جو شاید لفٹ لینا چاہتی تھیں اور کون کم بخت ہوگا جو لفٹ نہیں دیتا۔

شاید ان کا بھی یہی راستہ ہو۔ جس راستے پر میں جا رہا تھا اس لیے میں نے ان کے پاس گاڑی روک دی۔ میرا اندازہ درست نکلا انہیں لفٹ ہی چاہیے تھی۔

ان میں سے ایک لڑکی تیزی سے میرے پاس آگئی۔ ”سر ہمیں گرومنڈر تک جانا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ہم بہت دیر سے کھڑے ہیں رکشا یا ٹیکسی نہیں مل رہی۔ کیا آپ ہمیں لفٹ دے سکیں گے؟“ ”کیوں نہیں آئیں بیٹہ جائیں۔“

میرا خیال تھا کہ دونوں پیچھے ہی بیٹھ جائیں گی لیکن ان میں سے ایک میرے برابر کی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ دوسری دالی سے زیادہ خوب صورت اور اسارت خیز تھی۔

اس نے پرفیوم بھی کوئی مہنگا لگا رکھا تھا۔ میری پوری گاڑی معطر ہو گئی تھی۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ دونوں مجھے کسی اچھے گھرانے کی دکھائی دے رہی تھیں یا پھر کوئی اور بات تھی لیکن ابھی تک تو کوئی اور بات سامنے نہیں آئی تھی۔

لیکن لسیل تک آتے آتے دوسری بات سامنے آئی گئی تھی۔ میرے ساتھ بیٹھ جانے والی لڑکی نے پیچھے مڑ کر دوسری لڑکی سے کہا۔ ”شہلا گرومنڈر اب بہت قریب ہے۔“

”ہاں ہمارا سفر اب ختم ہونے والا ہے۔“ دوسری نے کہا۔

”تو پھر وقت کیسے گزارا جائے۔“

”چلو ان ہی سے پوچھتے ہیں۔ یہ شریف اور معقول آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ہماری پرائیلم سمجھ جائیں گے۔“ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ دونوں لڑکیاں اب آہستہ

آہستہ خود کو ظاہر کرنے لگی ہیں لیکن میں انجان بنا گاڑی چلاتا رہا۔ پھر میرے برابر بیٹھی ہوئی لڑکی نے مجھ سے کہا۔ ”دیکھیں ہمارے ساتھ پرائیلم یہ ہے کہ ہمیں جن سے ملنے

کے لیے جانا ہے ان سے ملنے میں ابھی دیر ہے۔ ہم وقت سے پہلے پہنچ گئے ہیں۔“

”تو پھر کیا کیا جائے؟“

”کچھ باتیں کر لی جائیں۔“

”اب وقت کہاں ہے؟“ ہمانے کہا۔

”ان کو اپنا نمبر دے دو بعد میں یہ کال کر لیں گے۔“ عنذلیب نے کہا تو ہمانے اپنا اور عنذلیب کا نمبر دے دیا۔ پھر سنیل دالی مسجد کے پاس اتر گئیں۔ ان دونوں کی بھی مصیبت نے مجھے گردیدہ کر لیا تھا۔ بعد میں بھی میں انہی کے بارے میں سوچتا رہا۔

تکلف تک تو سارے مشورے، ساری نصیحتیں ایک طرف رہ جاتی ہیں۔

ان کے موبائل نمبر زیرِ مے پاس تھے لیکن میں انہیں خود سے فون نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نہ جانے دوسری طرف سے کوئی فون اٹھالے۔ وہ کیا سوچے وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے خیالات نے روک لیا تھا۔

کئی دنوں کے بعد اچانک عنذلیب کا فون آگیا۔ اس کا فون سن کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ ”کیا حال ہے جناب۔“ اس نے شوخ لہجہ میں پوچھا۔

”یہ مت پوچھو میں تو اب اپنے خواب میں بھی گرومنڈر سے آگے نہیں جاتا۔“ میں نے کہا۔ ”اور جب جاگ رہا ہوتا ہوں تو سارے راستے گرومنڈر کو چلے جاتے ہیں۔“

”ادھو۔“ وہ فس پڑی۔ ”گرومنڈر تو آپ کے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے۔“

”گرومنڈر نہیں گرومنڈر والیاں۔“ میں نے کہا۔ ”اور خاص کر ان میں سے ایک۔“

”اور ان میں سے ایک اتفاق سے اس وقت بھی گرومنڈر پر کھڑی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اور بالکل اکیلی۔“

یہ ایک واضح اشارہ تھا کہ میں اگر چاہوں تو اس سے جا کر مل سکتا ہوں۔ اس وقت میں فارغ ہی تھا۔ لہذا میں نے وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگا لی تھی۔

وہ اس اسٹاپ پر تنہا کھڑی تھی۔ جس اسٹاپ پر میں نے اس دن ڈراپ کیا تھا۔ میں نے اپنی گاڑی اس کے پاس لے جا کر روک دی۔ وہ پہلے کی طرح بڑی بے تکلفی کے ساتھ میرے برابر میں آکر بیٹھ گئی تھی۔

”گلتا ہے کہ اس دن کے بعد سے تم اب تک یہیں کھڑی ہو۔“ میں نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں ایسا ہی سمجھ لیں۔ کسی نہ کسی کا انتظار تو رہتا ہی ہے نا۔“

”اوہوس کا انتظار؟“

”میرا مطلب ہے کسی رکشے نیکی کا۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”کیا تمہارے پاس فرصت ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”فرصت ہی تو ہے کہ آپ کو بلا لیا۔“ اس نے کہا۔

”تو چلو چل کر کہیں پہنچ کر رہیں۔“

”نیکی اور پوچھ پوچھ۔“

ہم ایک ریسٹورنٹ میں آکر بیٹھ گئے۔ اس دن وہ پہلے سے زیادہ دل کش دکھائی دے رہی تھی۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

”عندلیب تم رہتی کہاں ہوں؟ میرا مطلب ہے تمہارا بیک گراؤنڈ وغیرہ۔“

”میرے والد کسی زمانے میں کالج میں پڑھایا کرتے تھے۔“ اس نے بتایا۔

”اوہ یعنی تم ایک استاد کی بیٹی ہو۔“

”ہاں لیکن ان کا استاد ہونا میرے کسی کام نہیں آ رہا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”خیر رہنے دیں، کیا کریں گے میرے بارے میں جان کر۔“

”بس یوں ہی ایک ساتھ مل بیٹھنے والوں کو ایک دوسرے کے بارے میں معلوم بھی ہونا چاہیے۔“

”چلیں جناب تو پھر آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔“

”بہت سادہ سی زندگی ہے میری۔“ میں نے کہا۔

”والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ ایک چھوٹا بھائی ہے جو ملک سے باہر رہتا ہے۔ ایک چھوٹی بیٹی ہے جس کی شادی ہو چکی ہے۔ بس۔“

”اور آپ کی سزا؟“

”ایسی کوئی چیز اب تک میرے حصے میں نہیں آئی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اور تم..... تمہارے ساتھ تو ایسا اتفاق نہیں ہوا ہوگا۔“

”نہیں جناب! ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”ویسے تلاش جاری ہے۔“

”کوئی تلاش کر رہا ہے۔ تم خود؟ یا کوئی اور؟“

”ارے صاحب مجھ سے ایسی مخلوق تلاش نہیں

ہوتی۔ والدہ یہ کارنامہ انجام دے رہی ہیں۔ ماؤں کو تو اس کے علاوہ اور کچھ بھائی ہی نہیں دیتا۔ بس کسی طرح بیٹی کو ٹھکانے لگا دو۔“

”ظاہر ہے یہ ان کا فرض ہے۔“ میں نے کہا۔

اس وقت دل میں آیا تھا کہ میں اس سے یہ کیوں نہ کہہ دوں کہ اپنی والدہ کے سامنے مجھے لے جا کر کھڑا کر دے۔ ہو سکتا تھا کہ میں ان کو پسند آ جاؤں۔

لیکن یہ دوسری ملاقات تھی اور ایسی باتیں اتنی جلدی نہیں کی جاتیں۔ بہر حال ہم بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔

پھر ریسٹورنٹ سے باہر آئے تو ایک بھکارن ہمارے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر عندلیب سے بھبک مانگ رہی تھی۔

نہ جانے کیوں عندلیب کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا۔ ”کیا مصیبت ہے یہ لوگ پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں۔ لاکھ سوچ کرتے رہو لیکن یہ نہیں سننے والے۔“

”اسی بات کا تو ردنا ہے۔“ میں نے بھی اس کی تائید کی۔ ”بہسی کسی میں خود بھی بھلا جاتا ہوں۔“

”چلیں جان چھڑا کر تیزی سے نکل لیتے ہیں۔“ اس نے میرا ہاتھ تمام لیا۔ ”ورنہ یہ اسی طرح پریشان کرتی رہے گی۔“

اس کا اس طرح ہاتھ تمام لیتا مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ اس نے یہ حرکت پوری اپنائیت کے ساتھ کی تھی۔

گاڑی میں آکر ہم بیٹھ گئے۔ ”ہاں اب بتاؤ کہاں ڈراپ کیا جائے۔“

”دبی گرومنڈر۔“ اس نے کہا۔

”خدا کی پناہ کیا ہے گرومنڈر میں۔“ میں نے پوچھا۔

”جناب عالی! اب تک آپ کی سمجھ میں اتنا بھی نہیں آیا کہ میں گرومنڈر کے آس پاس ہی رہتی ہوں۔“ اس نے بتایا۔

”اوہ تو یہ بات ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”چھایہ بتاؤ اب کب ملو گی۔“

”جس جی چاہے میرا نمبر ہے نا آپ کے پاس؟“ اس نے کہا۔ ”مہرباں ہوئے بلا وجہ جی چاہے“

اس کی اس قسم کی باتوں سے اندازہ ہونے لگا تھا کہ وہ واقعی کسی استاد ہی کی بیٹی ہوگی۔ بہت سہری اور دلچسپ

باتیں کیا کرتی۔

بہت پہلے کالج کے زمانے میں ایک لڑکی میری زندگی میں آئی تھی۔ وہ بھی عندلیب ہی جیسی تھی۔ اس کی باتیں ایسی ہی ہوا کرتیں۔ بہت شگفتہ اور ذہانت سے بھری ہوئی باتیں۔

خدا جانے اب وہ کہاں ہوگی لیکن میرے لیے یہ اطمینان کی بات تھی کہ مجھے عندلیب مل گئی تھی اور میں اس کو اپنے وجود اور اپنی زندگی کا حصہ بنا سکتا تھا۔

بس تھوڑی سی ہمت دکھانے اور پہلا قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد تو منزل آسان ہی ہو جاتی۔ جب میں اپنے طور پر خود ہی یہ فیصلہ کر چکا کہ عندلیب کی ماں سے مل کر مجھے اپنے آپ کو عندلیب کے لیے پیش کرنا ہے تو ایک عجیب سی خوشی ہونے لگی۔

ایک اطمینان سا ہونے لگا کہ چلو اب میری بھگتی ہوئی کشتی کو کنارہ ملنے والا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد ہم بھر لے۔

اس دن وہ بہت پریشان اور بکھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا۔
”وہ جو میری دوست ہے ناہما۔“
”ہاں کیا ہوا اس کو؟“

”اس کا فون آیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”اسے آج دس ہزار روپوں کی ضرورت ہے۔ کس لیے یہ اس نے نہیں بتایا۔ مجھ سے مانگ رہی تھی میرے پاس کہاں ہیں جو میں اس کو دے سکوں۔ بس اس لیے پریشان ہو رہی ہوں۔“
”بس اتنی سی بات۔“

”یہ اتنی سی نہیں، میرے لیے تو بہت بڑی بات ہے۔“ اس نے کہا۔
”ارے کوئی بات نہیں۔ دس ہزار مجھ سے لے لو۔“
”کیا بات کرتے ہیں میں آپ سے کیوں لینے لگی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے اپنا نہیں سمجھا۔“

”اوہو، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوا کہ میں آپ سے پیسے لینے لگوں۔“

”اس کا یہی مطلب ہونا چاہیے۔“ میں نے کہا۔
”ہمیں اس طرح ایک دوسرے کے کام آنا ہے۔“
”بھلا میں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں۔“

”تمہاری موجودگی مجھے جینے کا احساس دلاتی رہتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے تمہیں پا کر حوصلہ حاصل کیا ہے۔ مجھے اور کیا چاہیے۔“

بہر حال وہ بڑی مشکلوں سے دس ہزار لینے پر راضی ہوئی تھی۔ میں نے اسے دس ہزار روپے دے دیئے تھے جو اتفاق سے میری سہیلی کی صورت میں میرے پاس موجود تھے۔

ہم پھر ملنے کا وعدہ کر کے الگ ہو گئے۔

اب یہ بات تو ہو چکی تھی کہ ہم ذہنی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے ہیں اور اب صرف اس بات کی دیر ہے کہ مجھے اس کی ماں سے مل کر اپنی درخواست پیش کر دینی تھی۔

میں نے اپنے دوستوں کو بھی اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بری طرح عشق کے جال میں بھنس چکے ہو۔“ ایک نے کہا۔

”ہاں یار! ایسا ہی ہوا ہے میرے ساتھ۔“
”لیکن میری جان یہ محبت وغیرہ سب بے کار کی باتیں ہیں۔“

”تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ تم کو اس کا تجربہ نہیں ہوا اور ہر ایک کو ہو بھی نہیں سکتا۔“

”کیوں نہیں ہو سکتا۔ کیا تم آسمان سے اترے ہو؟“

”میری جان۔ محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں۔ یہ وہ نسخہ ہے جو ہر ساز پر گانا نہیں جاتا۔“

”لیکن یہ بھی سن لو کہ اگر تم نے اس سے شادی کر لی تو شادی کے بعد یہ محبت وغیرہ سب ہوا ہو جائے گی۔“

”کوئی بات نہیں۔ وہ زندگی بھر کے لیے میرے قریب تو آجائے گی نا۔“

دوست خاموش ہو گئے۔ ظاہر ہے وہ مجھے کیا سمجھا سکتے تھے۔

دو چار دنوں کے بعد اس کا فون آیا۔ ”مجھے مبارکباد نہیں دیں گے۔ آج میری برتھ ڈے ہے۔“

”ارے بہت بہت مبارک ہو۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“

”اس میں بتانے والی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ آج یاد آیا تو آپ کو بتا دیا۔“

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں



جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ جاری کر دیں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول جسر ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

ہر پاکستانیلا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیمت ایک سال کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یاد رکھیں! صرف اپنے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھیج سکتے ہیں

یہ دونوں ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مانی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیروز آباد سٹیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی میں کوئٹہ روڈ کراچی

فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

”پھر تو آج تمہارا ڈر میری طرف ڈیو ہو گیا۔“ میں نے کہا۔ ”تم شام کو مل لینا۔“

اس شام ہم بہت خوش تھے۔ ڈنر سے پہلے میں نے اسے شاپنگ بھی کرائی تھی۔

وہ بار بار میرا شکریہ ادا کرتی رہی تھی اور میں اس سے بھی کہتا رہا تھا کہ یہ سب تمہارا حق ہے۔ کیونکہ میں نے تم سے محبت کی ہے اور محبت کرنے والوں کے ساتھ تکلف نہیں کیا کرتے۔

شاپنگ کے بعد ہم ایک اچھے سے ہوٹل میں چلے گئے۔ اس شام میرے لیے زندگی بہت خوب صورت ہو گئی تھی۔ عندلیب نے اس شام اپنی ڈرینک اور میک اپ پر بھی توجہ دی تھی۔ اس لیے وہ عام دنوں سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔

اس شام میں نے اس سے کہہ ہی دیا۔ ”بس عندلیب اب مجھ سے انتظار نہیں ہو سکتا۔ تم مجھے اپنی ای سے ملو ا دو۔“

”ہوں۔“ وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔

”کیا سوچنے لگیں؟“ میں نے پوچھا۔

”تم دو چار دن رک جاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”پہلے میں بات چھیڑتی ہوں۔ اس کے بعد تم سے ملاقات کروا دوں گی۔“

”بس یہ کام اسی ہفتے ہو جانا چاہیے۔“

لیکن اس ہفتے کے ختم ہونے سے پہلے ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے مجھے سخت بد دل اور مایوس کر دیا تھا۔ مجھے عندلیب کسی کے ساتھ دکھائی دے گئی تھی۔ کسی نوجوان کے ساتھ۔ دونوں شاپنگ کر کے واپس آ رہے تھے۔ دونوں کے پاس شاپرز تھے۔

میں ان دونوں کو دیکھ کر جلدی سے ایک آٹو میں ہو گیا تھا۔ دونوں میرے برابر سے گزرتے چلے گئے۔ اس وقت میرے دل کا عجیب حال ہو رہا تھا۔

اس قسم کے تجربوں کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنی محبت میں رقابت وغیرہ کے مرحلوں سے گزر رہے ہوں کہ اس وقت دل کی کیا حالت ہوتی ہے۔

میں گھر واپس آ کر جیسے کانٹوں کے بستر پر گر گیا تھا۔ ایسی کوفت ہو رہی تھی کہ جس کا اظہار مشکل ہے۔

اب دورا سنے تھے۔ یا تو میں خاموش رہ کر اس سے علیحدگی اختیار کر لوں یا اس سے بات کر لوں۔ پھر میں نے

بات لریا تا زیادہ مناسب سمجھا۔

صبح ہوتے ہی اسے فون کیا۔ اس نے بہت حیران ہو کر فون اٹینڈ کیا تھا۔ ”خیریت تو ہے۔ آج صبح کیسے یاد آگئی۔“

”تم سے ایک بہت ضروری کام ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں فوری طور پر ملنا چاہتا ہوں۔“

”لیکن اس وقت تو میں یونیورسٹی جا رہی ہوں۔“ اس نے بتایا۔

”بعد میں چلی جانا۔ یا کل چلی جانا۔ آج مجھ سے مل لو۔“ میں نے اصرار کیا۔

”ٹھیک ہے میں ایسا کرتی ہوں۔ ابھی یونیورسٹی جاتی ہوں۔ صرف ایک کلاس اٹینڈ کر کے واپس آ جاؤں گی۔ آپ مجھ سے مارکیٹ کے مین گیٹ پر مل لیں۔ ٹھیک بارہ بجے۔“

”ارے میں آ جاؤں گا۔“

میں شاید دس منٹ دیر سے مارکیٹ پہنچا تھا۔ عندلیب وہاں موجود تھی لیکن وہ اس بھکارن سے الجھی ہوئی تھی جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ جو ڈیمل چیز پر بیٹھی رہتی تھی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ بھکارن اس کے پیچھے پڑ گئی ہوگی اور عندلیب اس سے جان چمڑانے کی کوشش کر رہی ہوگی۔ میں ان دونوں کے پاس پہنچ گیا۔ ”کیا ہو رہا ہے یہ۔“ میں نے بھکارن کو ڈانٹا۔ ”کیا کہہ رہی ہو اس سے۔“ عندلیب نے چونک کر میری طرف دیکھا اور جلدی سے آگے بڑھ گئی۔

”میں اس کو سمجھا رہی تھی کہ اپنے آپ کو برباد نہ کرے۔“ بھکارن نے کہا۔ ”ادھر ادھر گھومتی نہ پھرے۔“

”تم کون ہوتی ہو اس کو سمجھانے والی۔“

”اس لیے کہ میں اس کی ماں ہوں۔“ بھکارن نے بتایا۔

”ماں!“ مجھے تو ایسا جھٹکا لگا کہ میں بل کر رہ گیا۔

”تم عندلیب کی ماں ہو؟“

”ہاں ماں ہوں اس کی۔ اس کے لیے بیک بائٹی ہوں تاکہ وہ پڑھ لکھ کر کسی قابل ہو جائے۔ اپنے عیروں پر کھڑی ہو جائے۔ اس کی اپنی اچھی زندگی ہو لیکن یہ ہو کیا رہا ہے۔ اس نے تم جیسے بابوؤں سے دوستی شروع کر دی

ہے۔ اپنی ایک دوست کے بہکاوے میں آ کر اس نے الٹی سیدھی حرکتیں شروع کر دی ہیں۔ گاڑی والوں سے دوستی کرتی ہے۔ ان سے پیسے لیتی ہے اور بھتی ہے کہ اس کا کچھ نہیں ہوگا۔ وہ سب کو بے وقوف بنا سکتی ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ اس چکر میں اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے بڑی مشکلوں سے بیک ماگ ماگ کر اسے یہاں تک پہنچا دیا ہے، اس کو اچھا برا سمجھا رہتی ہوں۔ وہ اگر ابھی بھی نہ مانے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔“

وہ بھکارن بول رہی تھی اور روئے جا رہی تھی اور میں اس کی طرف عقیدت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت ایک بھکارن نہیں ایک ماں تھی اور ماں بھی ایسی جس کی مثال نہیں ہو سکتی۔

اس کے کرب کا صرف اندازہ ہی ہو سکتا ہے۔ اس نے کس طرح لوگوں کے سامنے ہاتھوں کو پھیلا پھیلا کر پیسے اکٹھے کیے ہوں گے اور اپنی اولاد کے لیے بہتر زندگی کے خواب دیکھے ہوں گے۔

وہ اپنی کرسی دھکیلتی ہوئی اس طرف چلی گئی جس طرف عندلیب گئی تھی۔

اس کے بعد میں نے عندلیب سے ملاقات نہیں کی۔ اس لیے نہیں کی کہ وہ میرے دل سے اتر چکی تھی یا میں اس سے نفرت کرنے لگا ہوں۔

”میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

میں اس سے مل کر اس کی شرمندہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں یہ دیکھوں کہ اس کے چہرے پر شرمندگی کے کتنے رنگ ہیں۔

اس کے بعد میں نے اسے کئی بار دیکھا بھی۔ لیکن تنہا خاموشی سے سر جھکا کر آتے جاتے ہوئے۔ لیکن ابھی اسے آواز نہیں دی۔ ابھی اس کے سامنے منہ نہیں کیا۔ اسے فون نہیں کیا۔

خدا کرے ماں کے خوابوں کے مطابق اسے اچھی زندگی مل سکے اور جہاں تک اس کی ماں کا تعلق ہے تو وہ آج بھی علاقے میں دکھائی دیتی ہے۔

اور میں ہمیشہ اسے کچھ نہ کچھ دے کر آگے بڑھ جاتا ہوں۔ خدا کرے کہ عندلیب کو زندگی کی وہ خوشیاں مل جائیں جن کے لیے اس کی ماں محنت کر رہی ہے۔



زن زر زمین

مکرمی مدیر
السلام علیکم

ایک ایسی سچ بیانی ارسال کر رہی ہوں جو آپ کو ضرور پسند آئے گی۔ یہ زندگی کے کلہ کو عیاں کر رہی ہے۔ دنیا میں ہر فساد کی جڑ زن، زر، زمین ہے۔ اسی کے گرد پوری سچ بیانی گھوم رہی ہے۔

ثمینہ طاہر بٹ

میر ہاشم ایک مخفی اور ایماندار نوجوان تھا۔ باپ اور بڑے بھائی روشن کے سوا دنیا میں کوئی اس کا نہ تھا۔ ماں کا سایہ تو بچپن میں ہی اٹھ گیا تھا اور بہن کوئی بھی نہیں۔ سو یہ تین مرد اپنی زندگی ویسے ہی گزار رہے تھے، جیسے کہ چھڑے چھانٹوں کی گذر کرتی ہے۔ روشن نے اباجی کے مشورے سے حلوائیوں کا کام سیکھنا شروع کیا اور جلد ہی اس میں طاق ہو گیا۔ ہاشم بھی بھائی کے ساتھ ساتھ ہی تھا مگر دکان پر بولڈ روشن بھائی کا ہی تھا۔ ہاشم نے کبھی اس بات کو محسوس ہی نہیں کیا تھا، وہ تو بھائی

بٹی تھی رقیہ باجی، اور اس سے آپ کی شادی ہوگئی، اب میں
خس سے شادی کروں گا؟“

پچیس سالہ بھائی کے منہ سے پانچ سالہ بچے جیسے بات
سن کر میر روشن ہکا بکا رہ گیا۔ بھائی کی مصیبت پر پیار بھی آیا
اور اس کی ساواکی پر ہنسی بھی۔

”ارے بھو۔ دنیا میں کیا صرف ایک ہی لڑکی تھی، کیا
اس دنیا میں لڑکیوں کا کال پڑ گیا ہے جو تم اتنے پریشان ہو
رہے ہو؟“ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تو ہاشم بھنب گیا۔

”نہیں بھائی، میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ مگر پھر بھی!“ وہ
شرماتے ہوئے بولا۔

”ہنگ۔ تم پریشان مت ہو۔ ہم تمہارے لیے رقیہ سے
بھی اچھی دہن لائیں گے۔ جسے دیکھتے ہی تم دیوانے ہو جاؤ
گے۔ سمجھو۔“ میر روشن نے محبت سے کہا۔

☆.....☆

کہتے ہیں کہ مرد کی زندگی میں دولت اس کی بیوی کے
نصیب سے آتی ہے اور اولاد خود اس مرد کی قسمت سے۔ اگر
عورت کا ستارہ مرد کے ستارے سے مل جائے، تو پھر اس مرد کی
زندگی میں شامل ہونے والی یہ پہلا، ”ز“ یعنی زن دوسرے
دونوں ”ز“ یعنی زر و زرین کو خورد و ذی کھینچ لاتی ہے۔ میر
ہاشم کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ ناہیدان کی زندگی میں کیا آئی،
زر اور زرین کو اپنے ساتھ کھینچ لائی۔ ہاشم تو پہلے ہی مختی اور
ایماندار جوان تھا۔ اب تو اس کی محنت کا مالم ہی جدا تھا۔ قسمت
کی دیوی بھی ان پر مہربان تھی، سوئی کو باجھ لگاتے تو وہ سونا بن
جاتی۔ بھائی کے مشورے پر اس نے دکان جہاں کھولی تھی وہ
خوب چلنے لگی تھی۔ ناہید بھی ہاشم کی طرح بہت مختی اور جفاکش
خاتون تھی۔ اس نے گھر کی ہر ذمہ داری سے ہاشم کو بے فکر کر دیا
تھا۔ ہاشم خوب محنت سے کماتا تو ناہید اسے کفایت شعاری اور
سلیقہ مندی سے استعمال کرتی۔ وقت گزرتا گیا اور اس گھر سے
وقت میں کافی کچھ بدل گیا۔ اب وہ دونیں رہے تھے۔ ان کی
فیملی بڑھ رہی تھی۔ روشن بھائی اور رقیہ بھائی کی فیملی بھی بڑھ
چکی تھی۔ اباجی انہیں داغ مفارقت دے کر راہی ملک عدم ہو
چکے تھے۔

اس چارمرلے کے گھر میں اب دو فیلیاں مقیم تھیں۔
دو دوزنیاں، اور دونوں ہی اپنے آپ میں بہت کچھ تھیں۔
ان کی آپس میں ٹھن بھی جاتی، اور پھر خود بخود بن بھی جاتی۔
بچوں کا بھی یہی حالی تھا۔ روشن اور رقیہ کے چھ بچے ہو چکے
تھے۔ سب ہی پڑھتے تھے اور مونغ ملنے ہی چچا کے بچوں سے

کے امرو کے اشارے پر جان دینے کو تیار رہتے تھے۔ روشن بھی
ان کا بہت خیال رکھتا۔ یہ تینوں مرد بڑی پرسکون زندگی گزار
رہے تھے۔ اپنا کماتے، خود پکاتے اور جی بھر کے کھاتے۔ کل
کیا ہوگا بکل کے لیے کچھ بچانا ہے یا نہیں، یہ ان تینوں نے بھی
سوچا ہی نہیں تھا۔ ان دونوں کو لگتا تھا کہ زندگی یوں ہی سکون سے
گزر جائے گی۔ مگر باجی کا یہاں کچھ اور ہی تھا۔ سو، جیسے ہی
میر روشن کا کام چل لگلا انہوں نے اس کے پیروں میں زنجیر
ڈال دی۔

رقیہ ان کی بھتیجی تھی۔ زبان کی تیز مگر بہت بھرتلی۔
اباجی کو اپنے آگن کا سونا بن کھلنے لگا تو رقیہ کو ہونا لائے۔ مگر
میں ایک عورت کیا آئی، گھر کا تو نقشہ ہی بدل گیا۔ وہ ایک
مخصوص قسم کی ویرانی اور اداسی جو درود پور سے لپٹی رہتی تھی،
اس کی جگہ شوخ ہنسی کی جلتھک نے لے لی۔ رقیہ بھائی کی
چوڑیاں نہیں تو گھر کے درود پور اس جھکار کے ساتھ مل کر
نچنے لگتے ہوئے محسوس ہوتے۔ میر روشن تو خوش تھا ہی، میر
ہاشم کی دلی مراد بھی پوری ہوگئی تھی۔ اب نہ تو اسے سب کے
کپڑے دھوئے پڑتے اور نہ ہی کھانا پنا پڑتا۔ رقیہ بھائی
منہوں میں سب کر ڈالتی۔ ہاں، البتہ مزاج کی تیز چڑی اور کچھ تیا
پر بیان بھی تھا۔ اس لیے بعض اوقات ضرورت سے زیادہ بول
جاتی۔ میر روشن، تو اس کا مظر ایک کان سے سن کر دوسرے سے
نکال دیتے۔ کا عادی تھا، مگر میر ہاشم اکثر غصہ کر جاتا۔ ایسے میں
اباجی اسے پیار سے رام کر لیا کرتے۔ دن اسی طرح گزرتے
گئے اور میر روشن دو بچوں کا باپ بن گیا۔

اب رقیہ بیوی سے ماں بن چکی تھی۔ اسے اپنے بچوں
کے مستقبل کی فکر ہر چیز سے زیادہ تھی، اسی لیے اس نے میر
ہاشم کے کاموں سے ہاتھ کھینچنا شروع کر دیا۔ اباجی تو شروع
سے ہی اپنے کام خود کرنے کے عادی تھے، یہ میر ہاشم ہی تھا
جس نے بھائی کا سہارا پر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ مگر اب
بھائی بیکم نے ان کی بھی غٹائیں مچھ دیں۔ پہلے کھل تو وہ
بوکھلایا، پھر پٹا کر بھائی سے گلہ کر بیٹھا تو بھائی نے کہا:

”ہاشم! رقیہ اب تھک جاتی ہے۔ اس اکیلی سے
سارے گھر کا کام نہیں سنہالا جاتا۔ میں اور اور اباجی سوچ
رہے ہیں کہ تمہاری بھی شادی کر دی جائے۔ تمہاری دہن
آجائے گی تو وہ خود ہی تمہارے سب کام کر دیا کرے گی۔
کیوں، ٹھیک ہے نا؟“ میر روشن نے پیار سے بھائی کی پیٹھ
تھپکتے ہوئے کہا تو وہ منہ کھولے انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔
”میری شادی؟ لیکن کس سے؟ چاچا جی کی تو ایک ہی

لڑبھی جاتے تھے۔ ہاشم اور ناہید بھی ان سے پیچھے نہیں رہے۔ بلکہ دو ہاتھ آگے ہی۔ رقیہ کے بچوں میں دو دو سال کا وقفہ تھا، مگر ناہید بچاری ہر سال تھکن کے کمل سے گزرتی تھی۔ اگر کوئی نوک دیتا تو ہاشم اور ناہید کے ساتھ ساتھ روشن اور رقیہ کو بھی آگ لگ جاتی۔

”لو بھلا۔ لوگوں کو کیا تکلیف ہے۔ ہمارے دس بچے ہوں یاد۔ اللہ کی دین ہے؟ اللہ کا حکم ہے کہ رزق کی وجہ سے اولاد کو کھل مت کرو۔ اور اللہ تو ہمیں کھلا رزق دے رہا ہے۔ شکر ہے مالک کا۔ پھر ہم ناشکری کیوں کریں۔ وہ دے گا تو ہم خوشی خوشی لیں گے۔ کسی کو کوئی اعتراض ہے تو اپنے گھر بیٹھے مت ملا کرے ہم سے۔“

”بیٹا کہہ لیا۔ اب ہمیں یہ جگہ بہت کم پڑنے لگی ہے۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں اور دو کمروں میں ہمارا گذارنا نہیں ہو رہا۔ روشن بھائی اور رقیہ بھائی بھی دو کمروں میں بہت تنگی سے گذار کر رہے ہیں۔ آپ اس بارے میں کچھ سوچتے کیوں نہیں۔“

احد سال بھر کا ہو چکا تھا۔ اس کے بڑے بھائی بہنیں سب اسکول چلے جاتے تھے، بس وہ اور اس سے بڑے دو بھائی زید اور شاہد ہی گھر ہوتے تھے۔ جب تک بڑے بچے گھر سے باہر رہتے گھر میں سکون سا رہتا، مگر جیسے ہی سارے بچے اسکول سے واپس آتے، گھر میں ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو جاتا۔ ناہید لاکھ انہیں منہ کرتی، ڈانٹتی مگر بچے تو پھر بچے ہی تھے، کہاں سنتے کسی کی۔ پھر رات کو سونے کا بھی بڑا مسئلہ ہوتا، ایک ایک چار پائی پر دو دو بچوں کو ڈالا جاتا، جگہ پھر بھی کم پڑ جاتی۔ ناہید اس صورت حال سے پریشان ہو گئی تو ہاشم سے اچھ پڑی۔

”تم تباہی میں کیا سوچو۔ میرا تو سارا دھیان کام میں ہی لگا رہتا ہے۔ گھر میں کیا ہوتا ہے، مجھے نہیں پتا۔“ ہاشم نے پریشانی سے کہا تو ناہید بھڑک اٹھی۔

”اچھا۔ اب یہ بھی آپ کو میں ہی بتاؤں؟ آپ کوئی اور جگہ کیوں نہیں لے لیتے۔ دور نہیں جاسکتے تو اسی محلے میں کوئی اور بڑا گھر لیں۔ جہاں کم از کم بچے آرام و سکون سے سو تو سکیں۔ یہاں تو ایک ایک چار پائی پر پین تین پڑے ہوتے ہیں۔ نہ ڈھنگ کی نیند نہ چین اور نہ سکون۔“

”اچھا۔ میں بات کرتا ہوں بھائی سے۔ دیکھتا ہوں وہ کیا کہتے ہیں۔“ ہاشم نے کروش بدلتے ہوئے جیسے بات ختم کی اور اگلے ہی بل اس کے خزانے کو منہ رہے۔

☆.....☆

میر ہاشم نے اسی محلے میں دس مرلہ کا پلاٹ خریدا اور کنسٹرکشن شروع کروادی۔ انہوں نے بھائی سے اپنا حصہ مانگا تو بھائی نے سر جھکا لیا لیکن رقیہ سے خاموش نہ رہا لیا۔

”ہم تمہیں حصہ کہاں سے دیں۔ تم دیکھتے نہیں ہو دوکان کھائے میں جا رہی ہے اور اس پر لڑکیوں کی پوری کھپ۔ اب اگر یہ گھر بیچ کر تم دونوں بھائی اپنا اپنا حصہ لے بھی لیتے ہو تو کسی کے پیٹے کیا پڑے گا؟ تم تو پھر بھی کچھ نہ کچھ کر لو گے۔ تمہارا کام بھی اچھا چل رہا ہے اور ناہید نے کافی جوڑ جمع بھی کر رکھا ہے۔ مگر ہم تو سرسبز پر آ جا سکیں گے۔“

”بس بھائی! اس سے زیادہ کچھ مت کہیں۔ کوئی بات نہیں۔ آپ اس گھر میں آرام سے رہیں۔ میں اپنا حصہ بھی اپنے بھائی پر وار دوں گا مگر انہی بھتیجیوں کو رکتا نہیں دیکھ سکوں گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ مجھے بس دو ماہ کا وقت دے دیں۔ میں اپنے بچے لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔“ ہاشم نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا تو ان کے ساتھ بیٹھا ان کا بڑا بیٹا حیرت سے باپ کو دیکھنے لگا۔

”ابو جی! ہم تباہی تے، کرور ہیں کیا؟ ان سے اپنا حصہ نہیں لے سکتے، جو آپ نے انہیں دادا کا گھر پورے کا پورا دے دیا۔ اسی تو کبھی نہیں بٹیں گی۔“ وہ بولا۔ ہاشم کی رگوں میں بھائی کی محبت جوش بڑھ کر دوڑ رہی تھی۔

”عامم بیٹا! میری ایک بات یاد رکھنا۔ بھائی بھائیوں کی طاقت ہوتے ہیں۔ باز ہوتے ہیں۔ ان پر مان کیا جاتا ہے ان سے لڑا نہیں جاتا اور رسی بات تمہاری ماں کی، تو وہ عورت ہے۔ اسے پیار سے سمجھاؤ گا تو سمجھ جائے گی۔ عامم نے باپ کی باتوں کو غور سے سنا، سمجھا اور پھر دل میں ایسے اتار لیا کہ ایک ایک لفظ نقش ہو کر رہ گیا۔

”امی! ابو نے چوک کے پاس والی گلی میں پلاٹ خرید لیا ہے۔ اس پر کام بھی شروع کر دیا ہے۔ اب ہم جلد ہی اپنے نئے گھر میں چلے جائیں گے۔ کتنا مزہ آئے گا ناں۔“ زید نے ناہید کے شانے سے لٹکتے ہوئے مزے سے کہا تو وہ بھی خوش دلی سے مسکرا دی۔

”ہاں، اب تم لوگ خوب کھلے ڈلے ہو کر کھلا کرنا۔ کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں ہوگا۔“ ناہید نے بیٹے کو پیار سے گلے لگاتے ہوئے کہا تو پاس بیٹھی بیٹا جمل بھن کر رہ گئی۔ یہ سب بہن بھائیوں سے بڑی تھی۔ ہاشم کی بہت لاڈلی تھی۔ عامم اور بیٹا دونوں ہی ہاشم کو بہت پیارے تھے۔ عامم کا مزاج باپ جیسا تھا، مگر بیٹا الگ مزاج

رکتی تھی۔ اسی لیے باپ کا فیصلہ اسے ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

”ای! ہم تو نئے گھر میں چلے جائیں گے، مگر یہاں کون رہے گا؟ ہمارے کمرے کس کے استعمال میں آئیں گے؟“

”کون رہے گا؟ تمہارے تایا تائی جان رہیں گی۔ ہمیں تو اللہ نے اپنا گھر دے دیا ہے۔ اس سے کہیں بڑا اور کشادہ۔ اب بھائی بھالی جائیں اور ان کا کام۔“ ناہید نے سلائی کشین کی سوئی میں دھماکا ڈالتے ہوئے نرمی سے کہا تو بیٹا کا منہ پھول گیا۔

”ای! یہ گھر دادا کا ہے۔ اس میں ہمارا بھی حصہ ہے اور ہم اپنا حصہ ایسے کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ ہم اپنے کمروں کو تالا لگا کر جائیں گے۔ جب تک تایا جان ہمیں پیسے نہیں دیں گے، ہم انہیں کمرے نہیں دیں گے۔“ وہ ہاتھ پر پل ڈالے ماں کو نیا سبق دے رہی تھی۔ ناہید نے حیرت سے اپنی بیٹی کو دیکھا اور پھر اس کی بات پر غور کرنے لگی۔

”ہاں، بیٹا کہہ تو ٹھیک رہی ہے۔ ہم کیوں اپنا حصہ چھوڑیں۔ آخر میرے سر کا گھر ہے۔ بھالی رقیہ کون سا جھجر میں لاتی تھیں۔ جو انہیں پورے گھر کی مالکن بنا دیا جائے۔ ہوں، آئیں آج بیٹا کے ابا۔ بات کرتی ہوں ان سے۔“ لویہ کوئی بات ہوئی بھلا۔ مجھ سے زیادہ عقل مند تو میری بیٹی ہو گئی ہے۔ کیسے بچے کی بات بتاتی اس نے۔“ ناہید کا ذہن اسی ٹریک پر چل نکلا تھا۔ وہ سارا دن اسی ادھیڑ بین میں جانے کیا کیا اسکیمیں بناتی رہی۔ ایک بار بھی اس نے یہ نہ سوچا کہ اگر رقیہ جارے لے کی مالکن بن رہی ہے تو اللہ نے اسے دس مرلے کی مالکن بنا دیا ہے، مگر پھر وہی، زرہ، زین زمین۔

”بیٹا کی ماں۔ تمہیں یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔ تم ماں ہو، بجائے بیٹی کو سمجھانے کے، اس کی اپنی بات پلے سے باندھ کر بیٹھ گئیں۔ شکر ادا کرو اللہ کا کہ اس نے تمہیں اتنے بڑے گھر کی مالکن بنا دیا ہے۔ رقیہ بھالی کے پاس کیا ہے، چار مرلے زمین اور چار ہی کمرے، اور تم خود کو دیکھو۔ دس مرلے کا کھلا ڈالا گھر۔ ایک منزل تیار ہو گئی، اب چاہے اوپر دو منزلیں اور ڈالوا لیتا۔ تمہارا ہاتھ روکنے والا کون ہے۔“ ناہید نے جیسے ہی بیٹی کی تجویز ہاشم کے سامنے رکھی، وہ الٹا اسے سمجھانے بیٹھ گئے۔ ان کی باتیں ناہید کے دل کو لگ رہی تھیں۔ وہ شرمندہ ہی ہو گئی۔ واقعی، کل کی بیٹی کے غلط مشورے کی وجہ سے وہ برسوں پرانے رشتے ٹھونسنے جا رہی تھی۔ ہاشم نے چہرے کی شرمندگی

پڑھ چکی تھی۔ اس لیے انہیں دلاسا دیا اور بیٹا کو بھی سمجھایا کہ اپنی توانائیاں فضول باتوں میں ضائع کرنے کی بجائے گھر کے کاموں میں دھیان لگائے۔

وہ لوگ اپنے گھر میں شفٹ ہو گئے۔ میر روشن اور رقیہ بھی سکون سے باہی گھر میں رہنے لگے۔ وقت کا یہی اپنی مخصوص رفتار سے چلا رہا۔ بچے جوان ہو گئے اور ہاشم و روشن بوڑھے۔ روشن نے اپنی تین بیٹیوں کی شادیاں کر دیں۔ ہاشم اور ناہید نے شادیوں میں بھرپور تعاون کیا تھا۔ انہی دنوں بیٹا کارشہ بھی اچھی جگہ سے آ گیا، ہاشم اور عاصم نے اچھی طرح چھان بین کے بعد اس کو بھی رخصت کر دیا۔ بیٹا کی شادی کو اچھی چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ چھوٹی کا بھی رشتہ آ گیا۔ لوگ اچھے تھے، لڑکا شریف اور نیک تھا، سو اللہ کا نام لے کر اس کی نیا بھی پار لگا دی گئی۔ اسی طرح انہوں نے ایک ایک کر کے سارے بچے بیاہ دیئے۔ عاصم کی شادی ہاشم نے اپنے دوست کی بیٹی سے کر دی۔ زید کو تایا کی چھوٹی بیٹی ہما پسند تھی، ناہید خوشی خوشی اسے بہو بنالائی۔

یوں تو ہاشم نے سب بیٹوں کو الگ الگ دکان دلا دی تھے مگر شہد کو عاصم اپنے ساتھ قیڈی لگائے ہوئے تھا کیونکہ وہ غصے کا بے حد تیز اور بدتمیز کی حد تک منہ پھٹ تھا۔ بات بات پر لڑنے مرنے کو تیار اور گالیوں میں تو جیسے اس نے P.H.D گھر رکھا تھا۔ ہاشم اور ناہید اسے سمجھا سمجھا کر عاجز آ چکے تھے۔ ان کی ساری اولادوں میں یہ واحد بچہ تھا، جو سب سے زیادہ مجاز تھا مگر خود کو سب سے زیادہ محمد ابراہور نیک سمجھتا تھا۔

”بیٹا کی ماں، میں تو اس لڑکے کی وجہ سے کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا۔ محلے میں ہر کسی کو اس سے شکایت ہے۔ بازار میں ہر کسی کی اس سے لڑائی ہے۔ میں جدھر سے گذرتا ہوں، اس کی شکایتیں ملتی ہیں۔ مجھے بتاؤ اس کا کوئی تو حل ہوگا۔ کیا کریں اس لڑکے کا۔“ ہاشم ابھی ابھی گھر آئے تھے، اور راستے میں کوئی دس لوگوں نے انہیں روک کر شہد نامہ سنایا تھا۔

”ابو بی! اس کی شادی کر دیں۔ دیکھ لیجئے گا۔ دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا۔“ بیٹا حسب معمول میکے آئی ہوئی تھی، سو اپنا قیمتی مشورہ لیے فوراً گفتگو میں چھلانگ لگا دی۔

”شادی کریں؟ مگر کس سے؟ اس بدتمیز ادارہ کو کون لڑکی دے گا اپنی؟ حد کرتی ہو تم بھی۔ ہر مسئلے کا حل شادی تھوڑی ہوتا ہے۔ شادی کر دیں انہیں۔“ ناہید کو تو بیٹا کا بیچ میں

کیا آپ

لبوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدا را۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ اک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارلحکمت (جرڈ)

(دھکی طینی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

کو دنیا ہی کھلا تھا کہ اس پر اس کا مشورہ انہیں تو جیسے آگ ہی لگ گئی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہوں امی۔ ہر مسئلے کا حل شادی ہو یا نہ ہو، مگر شاہد کے مسئلے کا حل صرف شادی ہی ہے، اور شادی بھی کسی ایسی لڑکی سے جو اسے قابو کر سکے۔“ بیٹا اپنی بات پر قائم تھی۔ ہاشم بھی سوچ میں پڑ گئے تھے۔

”ارے لڑکی، ہوش کی دوا کر جا کے۔ ہم سے تو قابو ہو نہیں رہا تو کس طرح بیوی کے قابو آ جائے گا۔“

”آئے گا امی، آئے گا۔ آپ ایک بار سوچیں تو۔ اور لڑکی کا کیا ہے، چچا کریم کی چھوٹی بیٹی نادیہ کیسی رہے گی؟“ آپ چچا سے بات کریں۔ وہ مان جائیں گے۔“ بیٹا نے پرانے محلے میں رہنے والے ہاشم کے عزیز دوست کا حوالہ دیا تو نادیہ بھی سوچ میں پڑ گئی۔ کریم انتہائی شریف انسان تھے۔ خود بھی پڑھے لکھے تھے اور بچوں کو بھی پڑھا رہے تھے۔ مگر کا ماحول الجھا ہوا تھا۔ نادیہ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ ان کے دل کو بیٹا کی بات لگی۔ انہوں نے ہاشم کی سمت دیکھا۔ وہ بھی انہیں ہی دیکھ رہے تھے۔ بس، پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال خواب ہوئے اور اگلے چند روز میں یہ معرکہ بھی سر کر لیا گیا۔

شاہد اور نادیہ کی شادی خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ نادیہ بالکل ایسی نہیں تھی، جیسی بیٹا نے اندازہ لگایا تھا، وہ تو اس سے بھی کئی ہاتھ آگے تھی۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے ایسا جادو چلایا کہ شاہد کو اپنا دیوانہ بنا لیا۔ وہ سارے گھر میں سب کے سامنے ناؤ، ناؤ کے نعرے لگاتا، اس کے آگے پیچھے پھرتا رہتا اور ناؤ بی بی اس اڑیل ٹوکرو اپنی ابرو کے اشارے پر نچاتی رہتی۔ بات یہاں تک ہی رہتی تو ٹھیک تھا مگر اب اس نے گھر کے معاملات کو قابو کرنا شروع کیا اور اس میں بیٹا نے اس کا پورا پورا ساتھ دیا۔ دودو بڑی، بہوؤں کے ہوتے ہوئے ساس کی جگہ نادیہ بی بی بننے لے لی اور کسی کو پتا بھی نہ چلا۔ اس کا طریقہ واردات بڑا انوکھا اور نرالا تھا۔ مکمل جوائنٹ فیملی سسٹم تھا۔ بڑی بھائی کے بچے بڑے تھے، اسکول جاتے تھے، اس لیے وہ زیادہ وقت بچی کو نہیں دے سکتی تھی مگر پھر بھی اپنی ذمہ داری پوری ایمانداری سے نبھانے کی کوشش کرتی۔ ہا بھی اپنا کام پورا کرتی تھی مگر نادیہ کا انداز جدا تھا۔ صبح تڑکے اوپر ساس کے کمرے میں آ جاتی۔ ساس امی نماز اور تلاوت کے بعد آرام کر رہی ہوتیں۔ یہ ان کے پیروں میں بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگتی۔ امی کی آنکھ کھلتی تو ناؤ فوراً ان کے پیروں پر دبانے لگتی۔

”لو، یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ جب ہم سب اکٹھے رہے ہیں۔ سب کچھ اکٹھا ہے تو پھر تم دونوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ کیوں بنارہے ہو؟ اب تم دونوں جاؤ گے۔ چچی جان پھر جاپیوں کو ہماری طرف سے بھی آس لگ جائے گی۔ چچی جان سمجھائیں ناں انہیں۔“ ہما کو بھی سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا، گو کہ اس کی شادی کو بھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا مگر چچا زاد ہونے کی وجہ سے وہ سب کو پہلے سے جانتی تھی۔

”تو آپ کو کس نے کہا ہے کہ آپ بھی ہماری نقل کریں۔ آپ مت جائے گا۔ جیسے پہلے..... دن سب کو پیسے دیتے ہیں۔ دنے دیتے گا، مگر ہمیں کیوں روک رہی ہیں آپ۔ ہماری مرضی، ہم جو چاہے کریں۔ اور دیے بھی ہم کچھ برائیاں کرو رہے۔ اچھا ہی کر رہے ہیں۔ اس سے ہمارے گھر کی عزت بڑھے گی، گھٹنے کی نہیں۔ تمہیں آپ۔“ ہا کی بات کاغص سے میرا جواب آیا تھا۔ ہا بھی کچھ کہنے کوئی، مگر ناہید نے اشارے سے اسے روک دیا۔

”ٹھیک ہے۔ تم لوگ جانا چاہتے ہو تو ضرور جاؤ۔ لیکن اگر پہلے سے ہمیں بتا دیتے تو ہم کچھ اور پروگرام بنا لیتے۔“ ناہید نے ہوا کا بدلتا رخ محسوس کرتے ہوئے انہیں اجازت دے دی تھی۔ ”ہاں تو ٹھیک ہے ناں۔ یہ دونوں بیٹھی ہیں ناں آپ کی لاڈلی بیٹیوں، بنا لیں ان کے ساتھ جو بھی پروگرام بنانا ہے۔ ہمارا ٹائم کیوں ویسٹ کر رہی ہیں۔ چلو ناو۔ ہمیں پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔ میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ رہنے دو، خرچ بھی بڑھے گا اور برے بھی ہم نہیں گھر، مگر تمہیں بھی باجیوں کی محبت کا بخار چڑھا رہا ہے۔ چلو اب۔ راستے سے ابھی ٹیک بھی لینے ہیں سب کے لیے۔“ شاہد نے ایک سانس میں ماں کو دس باتیں سنائیں اور پوری کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں اتر گیا۔

”ای! آپ پریشان مت ہوں۔ اگر آپ کہتی ہیں تو ہم بھی کل اپنی طرف سے عید بجاوا دیں گے۔ کوئی بات نہیں سال بعد تو عید آتی ہے۔ نادیہ ٹھیک کہتی ہے۔ بیٹیوں کو سسرال میں سیکے کاغذ تو مان ہوتا ہے۔“ عائشہ نے ساس کو پریشان دیکھا تو نرمی سے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”ہاں بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انہیں دکھری بھی۔“

”میں اس لیے پریشان نہیں ہوں جیٹا کہ شاہد اور نادیہ بہنوں کی طرف اکیلے چلے گئے۔ بلکہ میں اس لیے پریشان ہو رہی ہوں کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ یہ ہمارے گھر میں دراڑ

ان کے لیے چائے پتلاتی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی اور باتوں
 بی باتوں میں سارے راز اگلا لیتی۔ اسی اس سے بہت خوش
 تھیں۔ ہر آئے گئے کے سامنے اس کی خوب تفریض کرتیں۔
 پہلے یہ تفریض بڑی بھائی عاشق کی ہوتی تھی کئی سال تک تو وہ
 ہی ان کے ساتھ ہر دکھ سکھ کی سامی بنی شانے سے شانے ملائے
 کھڑی تھی۔ ہمارے ایک نام و نشان ہی نہیں تھا، ایک تو
 زید کی پسند تھی، دوسرے تے یا زار یعنی کمر کی مرغی وال برابر اور
 پھر اس پر وہ مجب مست مولیٰ طبیعت کی مالک تھی۔ دل کرتا تو
 سب کے درمیان آکر بیٹھ جاتی، دل نہ چاہتا تو اپنے کمرے
 سے بھی باہر نہ نکلتی۔ نادیدہ اس کا بھی خوب فائدہ اٹھاتی۔ ہمارے
 خلاف سب کے کان بھرتی رہتی۔ حتیٰ کہ سب ہندیں ہمارے
 متفرق ہو گئیں۔ ناہید بھی ہمارا کہو ہونا کچھ جتنا نکلیں، مگر پھر بیٹے
 کو خوش و میٹیں تو نظر انداز کر دیتیں۔

”تائی جان! ہم باجیوں کو عیدی دینے جا رہے ہیں۔ آپ نے کچھ بھجوانا ہے تو ہمیں ہی دے دیں۔ ہم انہیں دے آئیں گے۔“ ناہیدہ دونوں بڑی بھہوؤں کے ساتھ چٹھی محرمی کا مینوسیٹ کروا رہی تھیں کہ ناہیدہ سب سے تیار، شانے پر بیک لٹکائے شاہد کے ساتھ لہرائی تل لٹکائی ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔

اس کی بات سن کر جہاں ناہید کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، وہیں دونوں بہوؤں کو حیرت کا شندید دورہ پڑا تھا۔ کیونکہ یہاں مشترکہ خاندانی نظام تھا، وہاں ہر مشترکہ کیا جاتا تھا۔ بیٹیوں کو میکے سے عید کی ضرورت جاتی تھی، مگر ایک ہی جگہ ناہید اور عائشہ ساری تیاری مل کر کرتی تھیں۔ رمضان سے پہلے ہی خریداری کر لی جاتی اور آخری عشرے میں کوئی نہ کوئی بھائی جا کر ساری بہنوں کو عید کی سوغاتیں دے آتا۔ پھر عید کے دوسرے دن سب بہنوں کی دعوت ہوتی تھی، اور اس دن سب بچوں کو نقد عیدی دے دی جاتی۔ اللہ اللہ خیر صلی۔ مگر یہ نادیہ تو کوئی نئی اسکیم شروع کر رہی تھی۔

”یاجیوں کو عیدی۔ مگر وہ تو امی نے پرسوں ہی بھجوا دی تھی۔ پھر تم کس عیدی کی بات کر رہی ہو۔“ عائشہ نے نرمی سے پوچھا تو وہ منہ بنا کر شاد بد کو دیکھنے لگی۔

”ارے بھائی! وہ عیدی تو امی ابو کی طرف سے تھی ناں۔ اور یہ عیدی تو ایک بھائی اپنی بہنوں کو دینے جا رہا ہے۔ آخر بہنوں کو بھی تو ارمان ہوتا ہو گا ناں کہ ان کے بھائی اور بھابھیاں ان کے سسرال آکر انہیں اور ان کے بچوں کو عیدی دے۔“ نازیہ کا اشارہ سمجھتے ہوئے شاید اس کی زبان میں

ہو گئے۔ ایک جگہ بیٹھ کر نہ فیصلہ کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی کام۔ یہ اچھا نہیں ہوا بیٹا۔ اب تم دیکھنا، اس گھر میں نئی نئی باتیں ہوں گی۔ سنے سنے کام سر انجام دینے جائیں گے اور میرا گھر ٹوٹنا شروع ہو جائے گا۔“ ناہید بے حد پریشان تھیں۔ عاتشہ اور ہا بھی ان کی پریشانی سے پریشان ہو گئی تھیں اور پھر وقت نے ثابت کر دیا کہ ناہید کی پریشانی بیجا نہ تھی۔ ناہید نے شاید کو مکمل طور پر اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ اس نے جب سے بہنوں کو علیحدہ عید کی اور مختلف مواقع پر گفتگو دینے کا سلسلہ شروع کیا تو بہنوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہو چکی تھیں۔ اب ناہید اگر ان سے کوئی بات کرنا بھی چاہتیں تو وہ الٹا ماں کو سمجھانے بیٹھ جاتیں کہ ناہید ہی آپ کی بیسٹ چوائس ہے۔ آہستہ آہستہ گھر میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں جنم لینے لگیں۔ انہی دنوں شاید نے عاتشہ کا ساتھ چھوڑ کے زید اور احد کو جو ان پر کر لیا۔ عاتشہ کی دکان کے برابر میں مزید دو دکانیں کھل گئی تھیں اس لیے خریدار کم ہو گئے تھے۔ سو شاید نے اپنا حصہ وصول کیا اور احد اور زید کے ساتھ آ گیا۔ اب ایک نئی جنگ کا آغاز ہوا۔ یوں لگنے لگا جیسے گھر کی لڑائی کاروبار تک جا پہنچی ہے۔ جب تک زید اور احد اکٹھے تھے، دونوں بڑے سکون سے کام کر رہے تھے، شاید کے وہاں قدم بڑتے ہی ایک فتنہ سا کھڑا ہو گیا۔ ناہید نے اس دوران پورے گھر کو قابو کر لیا تھا۔ ناہید اور ہاشم پر تو جیسے کوئی جادو کر ڈالا تھا۔ اور اس جادو میں زیادہ کر دار بیٹا کا ہی تھا۔ وہ ہر بات میں شاید اور ناہید کی حمایت کرتی۔ ماں کو جانے کیا کیا پٹیاں بڑھاتی کہ وہ کبھی طور پر ناہید کے گن گانے لگیں۔ ادھر کاروبار کا جھگڑا بڑھا تو یہ لڑائی گھر تک آ گئی۔ تب ناہید نے دل پر پتھر رکھ کر فیصلہ کیا کہ تینوں بیٹوں کو الگ کر دیں۔ احد تو ابھی کونوارہ تھا اور اس نے لا محالہ ماں باپ کے ساتھ ہی رہنا تھا۔ ناہید اور ہاشم نے عاتشہ کو دکان سے بلوایا۔ اس کے سامنے سارا معاملہ رکھا گیا۔ وہ خود بھی روز روز کی اس دانتا کل کل سے تنگ آیا ہوا تھا۔ اس نے بھی ماں کے فیصلے پر سر جھکا دیا، مگر دل میں کہیں ارمان سا تھا کہ امی اسے ساتھ رکھیں۔ اس کی شادی کو بارہ سال بیت چکے تھے۔ اس کے بچے بھی بڑے تھے اور دادا دادی کے بغیر رہ بھی نہیں سکتے تھے، پھر عاتشہ سے آج تک ساس ساندوں کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی بہنوں نے بظاہر کوئی بات نہ کی ہو، مگر اب ان کے دل وہ نہیں رہے تھے، ان کے دلوں میں بغض بھرا جا چکا تھا، اور یہ کام ناہید نے اتنی ہوشیاری سے کیا تھا کہ خود کو بہت چالاک اور ہوشیار سمجھنے والی

اس کی بہنیں بھی نہیں جان پائی تھیں۔
 ”امی! آپ کس کو ساتھ رکھیں گی یہ بھی بتادیں۔ تینوں بہنوں کو ایک ساتھ تو الگ نہیں کیا جاسکتا نا، کسی ایک کو تو ساتھ رکھنا ہی پڑے گا آپ کو۔“ عاتشہ نے اپنے ڈوبتے دل کی دھڑکنوں کو بخشتل سنبھالتے ہوئے پوچھا تو ناہید بے اختیار شاید کو دیکھنے لگیں۔

”میں ناہید کو ساتھ رکھوں گی۔ تم اور زید اپنا چولہا چوکا علیحدہ کر لو۔“ ناہید نے بیٹا اور ناہید کا پڑھایا ہوا سبق دہرایا اور ایک ہی سانس میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”بیٹا کی ماں! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ تمہیں عاتشہ کو ساتھ رکھنا چاہیے تھا۔ اس کا حق پہلے بننا تھا۔ اور پھر اس کا مزاج بھی ایسا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ اچھی طرح رہ سکتی ہے۔ مگر تم نے ناہید کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ پوچھ سکتا ہوں کیوں؟“

”بتا نہیں بیٹا کے ابا۔ مجھے خود نہیں پتا کہ میں نے کیا کہہ دیا۔ میں تو خود عاتشہ کے بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی مگر جانے کیوں میرے منہ سے ناہید کا نام نکل گیا۔“ وہ خود بھی پریشان تھیں۔ شاید پچھتا بھی رہی تھیں۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

ناہید کی پلاننگ میں یہ سب شامل نہیں تھا۔ وہ تو انکسیر بڑوں کے مشہور معقولے ”ڈو اینڈ ایڈ رول“ پر پوری طرح عمل پیرا تھی، مگر یہاں تو ایسی آنتیں گلے ہی پڑ گئیں۔ وہ تو بھابیوں کو سب کی نگاہوں میں نیا دکھا کر خود اچھی بننے کے چکر میں تھی، اور یہاں تو سارے گھر کا بوجھ ہی اس کے شانوں پر آ گیا۔ ماشاء اللہ بھرپور گھر تھا اور نندوں کو ہر ہفتے میکے کا ہڑک اٹھا رہتا تھا۔ پھر جیسے ہی پٹھیاں شروع ہوتیں۔ ساری نندیں مل کر دھاوا بول دیتیں اور ایسے میں پہلے تو وہ تینوں مل کر سب سنبھال لیتیں تھیں، مگر اب اسے ایسی کوئی سب کرنا تھا۔ اس نے پہلے تو چند دن جیسے تیسے ساری ذمہ داری سنبھالی، پھر ناہید کی برین واشنگ شروع کر دی۔ ہاشم کی برین واشنگ کا کام شاید نے سنبھالا اور چند ہی ہفتوں کے بعد عاتشہ ایک بار پھر واپس ان کے ساتھ مل چکی تھی۔

☆.....☆

احد کی شادی طے ہو گئی۔ گھر کا سب سے چھوٹا اور لاڈلا بیٹا ہونے کی وجہ سے ہر کوئی پُر جوش ہو رہا تھا۔ ناہید اور شاید نے یہاں بھی اپنی ڈیز ہائیٹ کی مسجد بنا کر سب کو حیران کر دیا۔ ایسے ایسے ٹھکان ایجاد کیے کہ بیٹا تک نے دانتوں تلے

انگلیاں دبائیں۔ سنبل دلہن بن کر گھر آگئی۔ یہاں ایک بار پھر تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا۔ سنبل احد کے لیے ایسا پارس ثابت ہوئی جس کے ساتھ لکتے ہی احد سونا بن گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا بڑا بس پھیلنا چلا گیا۔ ایک کے بعد ایک اس نے کئی وکانیں کھول لیں۔ زید اور شاہد بھی اس کے ساتھ تھے مگر احد کا شیر سب سے زیادہ تھا۔ شادی کے بعد اس کے پرافٹ میں اضافہ ہی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پھر یہ سنبل کی قسمت تھی کہ احد اسے ہنی مون کے لیے سویٹرز لینڈ بھی لے گیا۔ یہ اعزاز گھر تو کیا خاندان میں کسی کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ بظاہر سب خوش تھے، مگر کچھ دل ایسے بھی تھے جن میں حسد کی آگ بجڑک اٹھی تھی۔ سویٹرز لینڈ سے واپسی کے بعد روٹین لائف شروع ہوئی اور پھر وہی روز کی جج جج۔ تینوں بھائی اپنی اپنی آمدن کے مطابق گذر بسر کر رہے تھے مگر شاہد کو اب زید کا ساتھ چھٹکنے لگا تھا۔ آئے روز کسی نہ کسی بات کا ایٹو بننا اور پھر تینوں میں جھگڑا شروع ہو جاتا۔ ایسے ہی ایک جھگڑے میں بات احد اور زید کی رخ کلائی ہوئے بڑے بڑے ہاتھ پائی تک پہنچی اور شاہد نے گلدان پھینک کر زید کا سر بھاڑ دیا۔ زید کا پھنسا سر دیکھ کر ہاشم کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ حاسم کو خبر ملی وہ بھی سب چھوڑ چھاڑ بھاگا چلا آیا۔ اور بھائی کو خونم خون دیکھ کر رو دیا۔

”شاہد! یہ کیا کیا تم نے۔ بھائی تو بھائیوں کا بازو ہوتے ہیں۔ مان ہوتے ہیں۔ اور تم نے اپنے بھائی کا خون بہا دیا۔ یہ تم نے اچھا نہیں کیا شاہد۔“ حاسم کا صدمے کے مارے برا حال تھا۔

”میں نے جو کیا بالکل ٹھیک کیا۔ یہ خبیث اسی قابل تھا۔ بوی کی زبان بولتا ہے۔ جب دیکھو اُنکی بات ہی کرتا ہے۔ اُنکی کھوپڑی کا انسان۔“ شاہد اپنی غلطی ماننے کی بجائے انشاشر کی طرح دھاڑتا پھر رہا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر ہما سے بھی نہ رہا گیا اور وہ بھی میدان میں کود پڑی۔ شاہد کو جانے اس سے کیا پیر تھا، اس کی بات پوری ہی سنی نہیں اور اس پر چڑھ دوڑا۔ اگرچہ ہاشم اور احد بیچ بچاؤ نہ کراتے تو شاید زید کی طرح ہما بھی پھنسا لیے کسی کو نے میں پڑی ہوتی۔

”تم لوگ آخر جا چے کیا ہو؟ اس طرح لڑ بھڑ کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟ آرام سے میرے سامنے بیٹھو، اور کھل کر دل کی بات بتاؤ مجھے تاکہ اس روز روز کے لڑائی جھگڑے کا کوئی مستقل حل نکالا جاسکے۔“ ہاشم نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”ہم سے کیا پوچھتے ہیں آپ! یہ سب کیا دھرا تو آپ کا

ہی ہے۔ نہ آپ تایا، تائی پر اتنی مہربانی کرتے، نہ انہیں اپنا آبائی حصہ دان کرتے تو نہ ہی آج ان کی لاڈلی زید کی آنکھ کا تارابن کر ہم پر حکومت کرنے کی جسارت کرتی۔ یہ سب آپ کی غلطی ہے۔ آپ قصور وار ہیں اس سب کے۔“ شاہد کسی ہم کی طرح پھنسا تھا۔

”یہ کیا کواں کر رہے ہو تم۔ لڑائی تم تینوں کی ہے۔ اس میں تایا، تائی کہاں سے آگئے؟ اور یہ خناس تمہارے دماغ میں بھرا کس نے ہے کہ.....!“

”بچ نہیں ہوں میں۔ سب جانتا ہوں، سمجھتا ہوں اچھی طرح سے۔ تایا، تائی کی نظریں آبائی گھر کے بعد اب ہمارے اس گھر پر ہیں۔ اسی لیے انہوں نے اپنی بیٹی کو زید کے پیچھے لگایا۔ اس ہاڑیل نے جان بوجھ کر زید کو اپنی اداؤں کے جال میں پھنسا اور اس سے شادی کی تاکہ ہمارے گھر، ہماری پر اپنی میں حصہ دار بن سکے۔ مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ ایک تنکا بھی اب تایا، تائی کو نہیں ملے گا یہاں سے۔ اگر کسی میں ہمت ہے تو ایسا کر کے دکھائے، پھر وہ ہوگا اور اس کا برا انجام۔ سن لیں کان کھول کر سب۔ میں اب کسی کو بخشے والا نہیں۔“ ناہید سے جیٹھ، جیٹھانی کی انسٹل برداشت نہیں ہوئی تو وہ شاہد کو ماں کے حق سے ڈانٹنے لگیں، مگر بھول گئیں کہ وہ اب صرف ان کا بیٹا نہیں رہا تھا۔ وہ النان کی بات پر بری طرح سے ہاتھ نچا نچا کر چلانے لگا تھا۔ اس کی باتوں سے عداوت اور بغاوت کی ایسی بو آ رہی تھی کہ سب کے سانس رکنے لگے۔

ہما سے برداشت نہ ہوا تو وہ رونے لگی۔ اس کے آنسو ناہید اور ہاشم کے دل پر گر رہے تھے، زید تو پہلے ہی خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے بڑھ حال پڑا تھا، ورنہ ایک معرکہ اور ہو جانا تھا۔

”شاہد! ہوش کے ناخن لو۔ یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کون تمہیں اتنی غلط افکار میں ڈالتا رہتا ہے؟ تمہیں کیا پتا کہ ابونے تایا تائی کو کیا دیا اور کیا نہیں؟ تم تو اس وقت بہت چھوٹے تھے اور اتنے چھوٹے بچے کو کچھ یاد نہیں رہتا جب تک کہ اسے ہار بار یاد دہانی نہ کروائی جائے۔ اور جہاں تک مجھے یاد ہے، ہمارے گھر میں تو ایسی بات کبھی کسی نے ہی نہیں۔ نہ امی نے نہ ابو نے۔ تو پھر تمہیں یہ سب کون بتاتا ہے؟“ حاسم ضبط کے کڑے مراحل سے گزرتا ہوا بولا۔

”اور کون بتائے گا بھائی جان۔ یہ سب بیٹا باجی کے کارنامے ہیں۔ وہ آج تک نہ خود بھولی ہیں، اور نہ ہی ہمیں بھولنے دیتی ہیں۔ جب بھی موقع ملتا ہے باقی باجیوں کے ساتھ مل کر تایا تائی کا خوب مذاق اڑاتی ہیں۔“ احد نے مجھے

کی ہر طرح سے مدد کی ہے، اس کا حساب بھی پورا پورا وصول کروں گا۔“

”تو اور کیا؟ پیسے کیا درختوں پر لگتے ہیں تایا جان جو بغیر سوچے سمجھے ہر کسی پر وارد دیں۔ آپ تو ہیں سیدھے بندے، آپ کو کیا پتا دنیا کی جالا کیوں کا۔“ شاہد کی بوچھیں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ نادیہ اس کی مومل اسپورٹ کے لیے بولی اٹھی۔

”تم سچ میں مت بولو۔ یہ ہم بھائیوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ بھائیاں اس سے دور ہی رہیں تو.....!“

”نادیہ بولے گی۔ ضرور بولے گی۔ میں دیکھتا ہوں کہ اسے کون روکتا ہے۔ یہ اس گھر کا حصہ ہے۔ بیوی ہے میری اور اسے پورا حق حاصل ہے بولنے کا۔“ عامر نے نادیہ کو لڑائی جھگڑے سے دور رکھنے کے لیے روکنا چاہا تھا، مگر شاید جو جیسے آگ ہی لگ گئی۔ وہ بڑے بھائی کا ادب لحاظ بھول کر اسے کاٹ کھانے کو دوڑا تھا۔ اس کے ماتھے کی رگ غصے سے پھڑک رہی تھی۔

”شاہد! امت بھولو، نادیہ اس گھر کی بہو ہے تو عائشہ، ہما اور سنبل بھی اسی گھر کی بہوئیں ہیں۔ اگر وہ بھائیوں کے کسی معاملے میں نہیں پوچھیں تو نادیہ کو بھی خاموش رہنا چاہیے۔ خاموشی ہی ان کے لیے بہتر ہے۔“ عامر نے سرد انداز سے شاہد کو دیکھتے ہوئے کہا تو سب کی نگاہیں ایک ساتھ نادیہ اور شاہد کی طرف اٹھ گئیں۔ نادیہ نے جو سب کو اپنی طرف اس طرح دیکھتے پایا تو منہ پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔ اسے روتا دیکھ کر شاہد کے حواس معطل ہو گئے۔

”بھائی جان! میں برداشت نہیں کروں گا کہ کوئی میری بیوی کی طرف میزھی آنکھ سے دیکھے۔ میں نادو کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتا، اور وہ بھی آپ میں سے کسی کی وجہ سے؟ ہرگز نہیں۔ جان سے مار دوں گا سب کو۔“ وہ پورے کمرے میں اشتعال کے عالم میں اچھلتا پھرتا تھا، نادیہ کے رونے کی آواز اس کے اشتعال کو بڑھا رہی تھی اور سب دم سادھے بیٹھے یہ نیا تماشا دیکھ رہے تھے۔

☆.....☆

شاہد اور احد باپ کی پرائیویٹ میں سے اپنا اپنا حصہ لے کر الگ ہو گئے۔ ان کی اس لڑائی میں بیٹانے باقی بہنوں کے ساتھ مل کر خوب فائدہ اٹھایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہاشم کے بچے دو پارٹیوں میں تبدیل ہو گئے۔ بچے تو پارٹی بازی کا شکار ہوئے ہی تھے، والدین کو بھی زبردستی اس میں ملوث کر لیا گیا اور اس

میں بھی بیٹا کا ہاتھ سب سے زیادہ تھا۔ ہاشم اپنے بیٹوں سے عشق کرتے تھے۔ انہوں نے آدھی عمر اکیلے، اور تنہا گذاری تھی۔ شادی کے بعد اللہ نے انہیں اولاد کی نعمت دی تھی اور دل کھول کر دی تھی۔ وہ اللہ کا شکر ادا کرتے نہیں جھکتے تھے۔ مگر اب یہ نعمت ان کے لیے زحمت بنی جا رہی تھی۔ شاہد اور زید کی لڑائی میں سارا گھر بر باد ہو گیا۔ بہنوں نے بھائیوں کو ملانے کی بجائے انہیں لڑانے کا کام کیا۔ اس جلتی آگ پر تیل اس ہوشیاری سے ڈالا کہ کسی کو غم بھی نہ ہوا اور گھر کا شیرازہ بکھر گیا۔ بیٹانے سب سے زیادہ ہوشیاری دکھائی۔ اس نے دونوں پارٹیوں کا ساتھ دیا۔ بی جوا کی طرح گھر گھر پھرتی اور سب کے دل میں بغض کے بیج بونتی اور پھر ان بیجوں کو پانی دینے کا کام شاہد اور نادیہ سر انجام دیتے۔

شاہد اور احد کو اس گھر سے گئے چار سال ہو چکے تھے۔ ناہیدہ اسی گھر میں تھی مگر اب ان کی حیثیت محض عضو معطل سے کم نہ تھی۔ ہاشم تو بیٹوں اور بیٹیوں کی پارٹیشن برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے اور ان لوگوں کے گھر چھوڑنے اور پر اپری سے حصہ مانگنے کا فیصلہ سننے ہی ہمت پار بیٹھے تھے۔ انہیں ہارٹ ایک ہوا، اور پہلا ایک ہی ایسا غلام ثابت ہوا کہ ان کی جان لے کر ہی ملا۔ ان کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تو سب غم میں ڈوبے رہے، مگر پھر آہستہ آہستہ اپنے اپنے مفاد کی خاطر سر اٹھانے لگے۔ اب ایک ایک کی ماں کا وجود سب کو بھاری لگنے لگا اور شاید وہ اس بوچھے سے چھٹکارا پانے کو کچھ بھی کر جائے اگر ہاشم نے اپنی پر اپری کا کافی بڑا حصہ ناہیدہ کے نام نہ کر دیا ہوتا۔ بازار میں دکانیں تھیں، مکان تھے جو کرائے پر چڑھے تھے۔ ناہیدہ کو ہر ماہ ایک اچھی خاصی رقم کرائے کی مدد مل جاتی جس سے

شاہد اکتوبر 2017ء کی منتخب جج بنائیاں

ہماری پیشکش.....آپ کا انتخاب

☆ اول: ٹھکرانی ہوئی لڑکی.....سیما (فیصل آباد)

☆ دوم: مگدھ.....دیس بن اشرف (ملتان)

☆ سوم: فرشتہ انکل.....شرجیل (ملتان)

پہلے دھرمے اور پھرے انعام کے لیے آپ اپنی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

وہ اپنا گذار تو کر ہی لیتی تھی، بیٹیوں کے کئی مسائل بھی اسی رقم سے حل ہوتے تھے۔ مگر میرا ایک بار پھر لڑائی جھگڑے سر اٹھانے لگے۔ تاہم یہی برداشت اب ختم ہو چکی تھی۔ ہمارا اور عائشہ خاموش تماشائی تھیں، جبکہ نادیا نے ہمدردی کا جال پھینک کر سنبل اور احد کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ احد اسے ماں کی جگہ دیتا تو سنبل ساس کی۔ عاصم بیوی بچوں کو لے کر پہلے ہی الگ ہو چکا تھا، اور اسے ہاشم نے اپنی زندگی میں ہی قریبی گھر میں خود شفٹ کر دیا تھا۔ اب شاید احد نے بھی اپنے حصے وصول کیے اور ایک دم منزلہ گھر کرائے پر لے کر وہاں سے دور چلے گئے۔

”احد! مجھے کچھ پیسے چاہیں۔ بچوں کے کپڑے بنانے ہیں۔ موسم بدل رہا ہے اور ان کے سارے کپڑے چھوٹے ہو گئے ہیں۔“ سنبل نے احد کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے نری سے کہا۔

”ہاں تو تم نادیا بھائی سے مانگ لو۔ وہ دے دیں گی تمہیں۔“ احد نے بے پروائی سے ٹرے اپنے سامنے کرتے ہوئے کہا تو سنبل اس کا منہ دیکھنے لگی۔

”نادیا بھائی سے کیوں مانگوں؟ میرے شوہر آپ ہیں، نادیا بھائی نہیں۔ مجھے جس چیز کی ضرورت ہوگی میں آپ سے ہی کہوں گی ناں۔“

”تم پاگل عورت۔ تمہیں ایک بات سمجھ نہیں آتی کیا؟“ نادیا بھائی اس گھر کی بڑی ہیں۔ میری ماں کی جگہ ہیں اور میں سارے پیسے انہیں ہی تو دیتا ہوں۔ تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ اس چھوٹی انا کے چکر میں مت پڑو اور چھوٹی ہو تو چھوٹی بن کر رہو۔ وہ بڑی ہیں، ان کی عزت کیا کرو۔ وہ جیسا کہتیں ہیں، بس ویسے ہی کیا کرو، سمجھیں۔“

”احد! وہ آپ کی ماں جیسی ہو سکتی ہیں، ماں نہیں۔ اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس طرح اپنی ضرورتوں کے لیے تو کبھی میں نے اپنی ساس کے سامنے بھی ہاتھ نہیں پھیلایا تھا، جس طرح آپ مجھے چھٹائی کے سامنے لیٹ ڈاؤن کرواتے ہیں۔“

سنبل پہلے تو خاموشی سے اس کی تقریر سنتی رہی پھر نہ نہ سکی تو بول پڑی تھی اور اسے یہ بولنا بہت مہنگا پڑا تھا۔ احد پر جانے کون سا جنون سوار ہوا کہ اس نے سنبل پر ہاتھ اٹھا دیا۔ یہ ان دونوں کے مابین پہلی لڑائی تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ کبھی کبھار آپس میں الجھ جایا کرتے تھے مگر نوبت کبھی مار پیٹ تک نہیں آئی تھی۔ باتوں کے گولے دونوں طرف سے داغے جاتے اور پھر سنبل خود ہی خاموش ہو جاتی۔ احد بولتا بولتا باہر

نکل جایا کرتا اور بات آتی گئی ہو جاتی۔

”احد! سنبل کی زبان کچھ زیادہ ہی تیز نہیں ہوتی جاری۔ وہ تو تمہاری کوئی عزت نہیں کرتی، تو ہماری کیا کرے گی؟ اسے کچھ سمجھاؤ یا۔“ گھر اس طرح نہیں چلا کرتے۔“

شاہد دکان میں بیٹھا اس کی برین واشنگ کر رہا تھا۔

”کیوں؟ کیا ہوا؟ اس نے کچھ کہا ہے آپ سے؟“

احد کے کان کھڑے ہو گئے۔ ابھی کل والی لڑائی کا غصہ اس کے دل سے گیا نہیں تھا کہ اب بھائی کوئی نئی داستان سامنے بیٹھ گیا تھا۔

”نہیں، مجھ سے تو کچھ نہیں کہا اس نے۔ مگر نادو کے ساتھ اس کا رویہ ٹھیک نہیں۔ بہت چھٹی کھتی رہنے لگی ہے۔ بچوں کو بھی اوپر نہیں آنے دیتی اور اگر نادو کوئی بات اس کے بھلے کوئی کہہ دے تو الٹا لڑنے بیٹھ جاتی ہے۔ طعنے دینے لگتی ہے کہ میرے میاں کی کمائی کھاتا ہے ہو اور مجھے ہی آنکھیں دکھاتے ہو۔“ شاہد تاک تاک کر وار کر رہا تھا، احد کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”دیکھو یا۔ تم میرے چھوٹے بھائی ہو اور تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ سب ”شرکیوں“ کی نظریں تمہاری دولت پر گڑی ہیں۔ چاہے وہ بیٹیں ہوں یا بھائی۔ میں تمہاری حفاظت کے خیال سے تمہارے ساتھ گھرا رہا ہوں بھائی چھوڑ کر چلا آیا، ورنہ میری اپنی ذوق ذاتی دشمنی کسی کے ساتھ بھی نہیں تھی۔ اب ہم نے تمہارے لیے اتنی بڑی قربانی دی اور بدلے میں تمہاری بیوی کے طعنے سنیں، یہ تو ٹھیک بات نہیں ہے یا۔ تم خود سوچو۔“ وہ آنکھوں میں آنسو بھر لایا، اور وہ ساری باتیں جو اسے نادو نے رات کو نوٹوٹے کی طرح یاد کروائی تھیں، سب کی سب بھائی کے سامنے کر دیں۔

احد اس وقت تو کچھ نہیں بولا۔ اس کا تو سری شرم سے جبک گیا تھا کہ اس کی کم گو اور خوش اخلاق بیوی اس کی پیٹھ پیچھے یہ سب بھی کر سکتی ہے؟ اسے یقین تو نہیں آ رہا تھا، مگر بھائی کے آنسو بھی سچے لگ رہے تھے۔ اور پھر احد اور سنبل کی خوشگوار ازدواجی زندگی کا سکون تہہ وبالا ہو کر رہ گیا۔ احد کو نادیا منہ سے کچھ نہیں کہتی تھی، بس اس کے سامنے رونے والی صورت بنا کر شکایتی انداز سے سنبل کو دیکھتے ہوئے گزر جاتی اور احد کا بازو سوائیزے پر جا پکچتا۔ ادھر دکان میں شاید اس کی خوب برین واشنگ کرتا، جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا ایٹھو بنا کر سنبل سے لڑنے لگتا۔ وہ پہلے تو خاموشی سے سنتی رہتی، جب برداشت ختم ہو جاتی تو جواب دے بیٹھتی اور

اس کے منہ کھولتے ہی احد کا ہاتھ کھل جاتا۔ یہ تماشا اب ہفتے میں دو، چار بار ہونے لگا۔ جب ان کی لڑائی شروع ہوتی، نادو شاید کوفون کر دیتی کہ ابھی گھر مت آنا، وہ لڑ رہے ہیں اور جب احد سنبل کو مارنے لگتا اس کے پیچے رو تے ہوئے تائی کے پاس مدد کو بھاگتے، تب وہ پھر شاید کوفون کرتی کہ اب آ جاؤ، کام ہو گیا ہے۔ شاید اس کوفون سنتے ہی بھاگا آتا۔ بھائی کو برا بھلا کہتا، بھانوج سے ہمدردی جتا تا اور پھر بھائی کو ڈانٹ ڈپٹ کر گاڑی نکالتا اور سنبل کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔ اس دوران رو تے بیٹھے بیٹھے تائی کے پاس پناہ گزین ہو جاتے۔ شاید، احد اور سنبل کے گھر سے نکلے ہی نادو بچوں کو سنبل کے خلاف بھڑکانے لگتی۔ وہ انہیں باور کروانے میں تقریباً کامیاب ہو ہی جاتی کہ ساری غلطی سنبل کی تھی۔ اسے شوہر کے سامنے بولنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ پھر اپنی مثالیں دینے لگتی۔ اپنی تعریفیں کرتی، بچوں کو ماں سے خوب متنفر کرتی۔

”احد! بس، بہت ہو گئی یار۔ تمہارا ہی حوصلہ ہے جو ایسی پاگل بیوی کے ساتھ گزار کر رہے ہو۔ میری بیوی اگر ایسی ہوتی تو ایک منٹ نہ لگتا۔ تین حرف بھیج کے کب کا اپنی زندگی سے نکال چکا ہوتا ہے۔“

”تو اور کیا کروں، بیوی کو چھوڑ دوں، مگر بچوں کی ماں کو کیسے چھوڑوں؟ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، اور وہ ابھی ماں کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بس، اسی لیے برداشت کیے جا رہا ہوں۔“ شاید کسی نئے مشن پر تھا۔ احد کا کاروبار بہت بھل چکا تھا۔ شاید کے شیر پچیس فیصد تھے، مگر صرف کھاتے میں۔ ورنہ وہ مراعات ایسے ہی وصول کرتا تھا جیسے نفی نفی کا یارنر ہو۔ احد اس کے نادیہ احسانوں کے بوجھ تلے دبا، اسے کچھ نہ کہتا اور بڑا بھائی سمجھ کر اس کی ہر بات ماننا چلا جاتا۔ مگر اب سنبل ان کے راستے کی رکاوٹ بنی جا رہی تھی۔ اس نے آرام سے بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے تجربہ کیا تو سب حقیقت کھل کر اس کے سامنے آ گئی۔ وہ احد کو سمجھانے کی کوشش کرتی مگر جواب میں ہمیشہ چار چوٹ کی کھائی۔ اب اس نے کچھ بھی کہنا چھوڑ دیا تھا۔ سب کچھ برداشت کرتے رہنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ڈپریشن کی مریضہ بن گئی۔ مائیکرین اور ڈپریشن نے اس کی رہی سہی ہمت بھی نچوڑ ڈالی تو اس نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔

شاید اور نادیہ کی بھرپور کوشش کے باوجود بھی جب احد نے سنبل کو نہیں چھوڑا تو انہوں نے اسے خاندان میں بدنام کرنا شروع کر دیا۔ اس کے رابطے سب بہنوں سے بحال

تھے۔ وہ ماں سے ملنے بھی جاتا اور نادو ہمیشہ اس کے ہمراہ ہوتی۔ وہ جہاں بھی جاتے، سنبل اور احد کے خلاف ایسی ایسی باتیں کرتے کہ دشمن خوش ہو جاتے اور دوستوں کے دل غم سے بھاری ہو جاتے۔ شاید نے یہی بات عام اور عائشہ کے سامنے کی تو عائشہ سے رونا لپکا۔

”یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو شاید؟ احد بھائی ہے تمہارا اور سنبل بھائی۔ تم ان کا گھر توڑنے کی باتیں کر رہے ہو۔ بجائے اس کے کہ انہیں سمجھاؤ، انہیں اور لڑا رہے ہو؟ اور چلو، فرض کیا، اگر احد سنبل کو چھوڑ بھی دیتا ہے تو پھر بچوں کا کیا ہوگا؟ وہ کس کے پاس رہیں گے؟ ماں کے پاس یا باپ کے پاس؟ یہ بھی سوچا ہے تم نے بھی؟“

”چھوڑیں بھائی۔ آپ کس زمانے کی باتیں کرتی ہیں۔ بچے تو خود ماں سے تنگ آئے ہوئے ہیں۔ وہ پاگل عورت تو اب بچوں کے بھی کسی کام کی نہیں، شوہر کے کیا کام آئے گی۔ اور رہی یہ بات کہ بچے کس کے پاس رہیں گے تو ظاہر ہے، ابھی جس کے پاس رہتے ہیں، بعد میں بھی اسی کے پاس رہیں گے۔ وہ ماں سے زیادہ تائی سے اچھے ہیں۔ رہ لیں گے ہمارے ساتھ۔۔۔ کیوں نادو۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

شاید کا اطمینان دیدی تھا، تو نادو کا سر بھی خسر سے بلند تھا۔ آخر کو دیور کی جاہد اور کی اکیلی مالکن بننے کا خواب پورا ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ سنبل نفسیاتی مریضہ کے طور پر خاندان بھر میں بدنام ہو چکی تھی اور نادو کی فہم و فراست کا علم پہلے سے بھی زیادہ بلند ہو چکا تھا۔ عام اور عائشان کی باتیں سن کر سخت پریشان ہو چکے تھے۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور پھر ایک دن کھانے پر احد اور بچوں سمیت مدعو کیا۔ سوئے اتفاق نادیہ اپنے میکے گئی ہوئی تھی، ورنہ احد کی کہاں مجال تھی کہ بیوی بچوں کے ساتھ اکیلا ہی بھائی کے گھر چلا جاتا۔ کھانے کے بعد بچے اپنے کھیل میں لگ گئے تو عام نے ان دونوں کو سمجھایا۔ احد کو اس کی غلطیوں کا احساس دلایا، اور دے الفاظ میں شاید اور نادو کی سوچ سے بھی روشناس کروایا۔ سنبل اس دوران خاموش بیٹھی سب کو دیکھتی رہی۔ عام نے جب اس سے اس کی مرضی پوچھی تو اس نے ایسا جواب دیا کہ احد کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ ایک ٹک سنبل کو دیکھتا چلا گیا۔ اتنا معقول اور ناپستلا جواب کوئی پاگل نہیں ہو سکتا تھا، تو کیا اس کی بیوی کے بارے میں جو باتیں خاندان میں مشہور ہو چکی تھیں، وہ سب کسی سازش کا نتیجہ تھیں؟

”احد! ابھی بھی وقت ہے میرے بھائی۔ اپنی عقل کا

استعمال کرنا نیکھو۔ کاروبار کے معاملے میں تو تم بڑے ہوشیار ہو۔ اڑتی چڑیا کے پر کن لیے ہو، تو پھر گھر کی طرف سے اتنے غافل کیوں ہو؟ یہ تمہاری بیوی ہے۔ تمہاری ذمہ داری۔ روزِ حشر اس کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے؟ سوچو میرے بھائی، تمہاری بیوی کو تو شاہد نے بدنام کر کے رکھ دیا، اور اپنی بیوی کے قصیدے وہ ایسے پڑھتا ہے کہ جیسے اس سے بڑھ کر اس دنیا میں کوئی اور ہے ہی نہیں۔ نادو کا کوئی نام بھی لے لے تو اسے آگ لگ جاتی ہے، تو پھر تم کیوں اس کے منہ سے اپنی بیوی کی برائیاں سنتے ہو، جبکہ وہ برائیاں اس میں ہیں بھی نہیں۔“ عاصم نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگا لی تو ٹھک نشا نے پر ہی لگی۔ سنبلی کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور احد کی آنکھوں پر پڑی پٹی کلٹنا شروع ہو گئی۔ اب اس نے ہر بات پر غور کرنا شروع کیا تو ساری بات اس کی سمجھ میں آتی چلی گئی۔ اس دوران براہِ ہوا کہ ان دونوں نے ایک مشترکہ پلاٹ خرید کر اس پر ڈبل اسٹوری گھر بنالیا تھا اور اس میں شفٹ بھی ہو چکے تھے۔ اب احد کو چھتاوے تنگ کرنے لگے کہ کاش وہ اپنا گھر تو علیحدہ بنالیتا۔ حالانکہ سنبلی اور عاصم نے اسے کہا بھی تھا، مگر اس وقت بھائی کی محبت کا بخار سر چڑھ کر بول رہا تھا، اس لیے اس نے کوئی توجہ ہی نہیں دی تھی۔

☆.....☆

”شاہد! بس! بہت ہو گیا۔ احد اگر سنبلی کو چھوڑنے کو تیار نہیں تو اسے کہیں، فیصلہ کر لے۔ ہمارا حصہ ہمیں دے دے اور اپنی لاڈلو کو لے جائے یہاں سے۔ میں جب اس کی شکل دیکھتی ہوں آگ لگتی ہے میرے سینے میں۔ کم بخت سنبلی ہو کر چٹ گئی ہے جان ہی نہیں چھوڑ رہی۔ ہمارا سارا منصوبہ جو پٹ کر کے رکھ دیا اس ڈائن نے۔“

کہتے ہیں جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے اور نادو بی بی کی جو شامت آتی تو شاہد کو اپنی پٹیاں پڑھانے بیٹھ گئی۔

”بس بھائی جان! بہت ہو گیا۔ اب میرا احد کے ساتھ گھر گزارنا نہیں ہو سکتا۔ آپ ہمارا فیصلہ کروا دیں۔“ شاہد اگلے دن ہی عاصم کے پاس جا پہنچا اور اس کے سامنے اپنے نادیدہ دکھڑے رونے کے بعد فیصلہ کن انداز میں بولا۔

”ٹھیک ہے۔ میں بات کرتا ہوں احد سے۔ تم بھی اپنی طرف سے حساب لگا کر کھو کر تمہارا کیا شیئر بنتا ہے۔ تاکہ میں وقت پر کوئی جھگڑا نہ کھڑا ہو سکے۔“ عاصم اس کی عادت سے

اچھی طرح واقف تھا، اسی لیے صبر سے اس کی ساری باتیں سن کر اپنے ہمیں اسے حوصلہ افزا جواب دیا تھا۔

”حساب؟ کون سا حساب؟ میرا ہر چیز میں برابر کا حصہ ہے بھائی جان۔ اور میں ایک باقی بھی چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ سمجھے آپ۔“ اسے حسبِ توقع آگ لگ چکی تھی۔

”دیکھو شاہد! سب جانتے ہیں کہ کاروبار میں احد 75% کا مالک ہے اور تمہارے شیئرز صرف 25% ہیں۔ رہی گھر اور پلاٹس کی بات تو وہ احد کی مہربانی ہے کہ اس نے ہر چیز میں تمہارا 25% شیئر رکھا ہے، ورنہ یہ تو تم بھی اچھی طرح سے جانتے ہو کہ ہر چیز کا اصل مالک تو احد ہی ہے۔ بزنس میں اس کا پیسا زیادہ لگا تھا، سو شیئرز بھی اس کے ہی زیادہ بنے۔۔۔۔۔!“

”اچھا؟ اور میں نے جو اس کے لیے قربانیاں دیں، ان کا کیا؟ میں نے اپنی زندگی کے بارہ سال اس کے اور اس کے بچوں کے لیے برباد کیے۔ ان کا حساب کون دے گا؟ بدلے میں مجھے کیا ملا؟ صرف 25% شیئر؟ نہیں بھائی جان۔ اب تو حساب برابری کی سطح پر ہی ہوگا۔ گھر ہو یا پلاٹس یا پھر کاروبار۔ ہر چیز میں سے فتنی فتنی کا حصہ وصول کروں گا۔ دیکھتا ہوں مجھے کون روکتا ہے۔“ وہ بدتمیزی سے بھائی کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”شاہد! تم نے احد کے لیے قربانیاں نہیں دیں۔ بلکہ سر کے ساتھ انکشاف کیا تو ہاشم اور ناہید کے منہ کھلے کے کھلے ہی رہ گئے۔“

”چینا؟ یہ آگ بیٹا کی لگائی ہوئی ہے، اور ہم کیسے ماں باپ ہیں کہ ہمیں اپنی ہی اولاد کے کروڑ کی خبر نہیں۔ نف ہے ایسی بیٹی ہر جو ماں باپ کی نینکوں کو برباد کر دے۔ اپنے حسد اور انا کی آگ میں اپنی ماں جانیں کو جھوک کر ان کی دنیا بھی خراب کر دے اور آخرت بھی۔“ ناہید سے تو کچھ بولا ہی نہیں گیا، مگر ہاشم گھر سے صدے میں بھی بول اٹھتے تھے۔

”رہنے دیں ابو آپ۔ باجی نے کچھ ایسا غلط بھی نہیں کیا۔ ہم اب بڑے ہو گئے ہیں اور ہمیں بھی سب باتوں کا علم ہونا چاہیے۔ باجی نے تو ہمیں حقیقت بتا کر ہمارے حق میں اچھا ہی کیا ہے۔ اب تو میں تایا، تاتی سے اپنے دادا کے گھر کا حصہ بھی لوں گا اور آپ نے اور بھائی جان نے جو آج تک ان

شرافت سے کہیں دور جا کر اپنی دنیا الگ بسالے تاکہ ایک دوسرے کی محبت دل میں زندہ رہے۔ تم بھی میری بات پر غور کرنا۔ اچھی لگے تو عمل بھی کر ڈالنا۔“ عائشہ نے نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا تو شاہد بس ہلکا کر رہ گیا۔

”اور ایک بات اور۔ جو بھی بات کرنی ہے آئے سانسے بیٹھ کر کرنا۔ تم دونوں بھائی ہو۔ سکے بھائی۔ اور بھائی بھائیوں کے بازو ہوتے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے اپنا بازو کاٹ کر دنیا کے سامنے تماشا مت بن جانا۔“ عاصم نے بھی نرم لہجے سے کہا تو شاہد بس ان دونوں کو دیکھ کر رہ گیا۔

☆.....☆

تاریخ نے ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرایا۔ مگر اس بار واقعات کا تسلسل بری طرح مجرد ہوا تھا۔ نادیہ کو عاصم اور عائشہ کی کسی بات سے بھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ وہ تو ان کی دی گئی تجاویز سنتے ہی تھکے سے ہی اکھڑ گئی تھی۔

”کیا؟ یہ سب بھائی جان نے کہا آپ سے، اور آپ چپ چاپ ان کی باتیں سن کر چلے آئے؟ کمال ہے شاہد۔ میں تو آپ کو بڑا اہل اور محنتی سمجھتی تھی مگر آپ تو نرمے بزدل ہی نکلے۔“

”تو؟ کیا کرتا؟ بڑے بھائی بھائی ہیں دیر میرے۔ میں ان کے سامنے کیسے.....!“

”اچھا؟ وہ بڑے بھائی بھائی ہیں، تو میں اور آپ کون ہیں؟ میں بڑی بھائی نہیں ہوں احد اور سہیل کی؟ آپ بڑے بھائی نہیں ہیں ان کے؟ جب ہماری کوئی عزت نہیں ان کی نگاہ میں تو ہم کسی کی عزت کیوں کریں۔“ ایشٹ کا جواب پتھر سے دینے والے انداز میں وہ چلا اٹھی تھی۔

”لیکن احد اور سہیل نے بھی میرے ساتھ تو کوئی بدتمیزی.....!“

”ہاں! ان کی بدتمیزی یاں آپ کو کیوں دکھائی دینے لگیں۔ آپ کے تو سکے ہیں ناں وہ؟ وہ کیسے جھوٹ بول سکتے ہیں۔ ایک جھوٹی تو میں ہی رہ گئی ہوں سارے زمانے کی۔ بے غیرت کہیں کے۔ سب ایک ہی تھیلی کے چنے بنے ہیں۔ اسی الو نے بھی جانے کیا دیکھ کر میرا نصیب ان جاہلوں کے خاندان میں پھونک دیا۔“ وہ اپنی آلی پر آ جھکی تھی، اور اب اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ سارے خاندان کو آگے لگا کر رکھنے والا شاہد بھی نہیں۔ وہ بھی سر جھکائے اس کی گالیاں سن رہا تھا۔

”میں آپ کو آخری وار تک دے رہی ہوں شاہد۔ ایک ہفتے کے اندر اندر مجھے یہ گھر خالی چاہیے اور ساری پراریٹی میں برابر کا حصہ۔ اب آپ یہ سب کیسے کرتے ہیں۔ مجھے کچھ نہیں

اپنا مفاد دیکھا۔ زید کی طرح اگر تم بھی اکیلے بزنس کر رہے ہوئے تو آج تک اسی آبائی گھر میں بیٹھے ہوئے۔ نہ تمہارے نام کوئی پلاٹ ہوتا اور نہ ہی تم اپنے گھر کے مالک ہوئے۔ یہ بات اچھی طرح سے جانتے ہو لیکن ماننا نہیں چاہتے۔ کیونکہ تم احسان فرماؤ ہو۔ تمہارے بھائی نے تم پر احسان کیا اور تم اس کا بدلہ اسے پورے خاندان میں بدنام کر کے دے رہے ہو۔ نہیں شاہد، نہیں۔ تم کوئی اور ہی گیم کھیل رہے ہو اور میں تمہیں بتا دوں۔ میں اب تمہاری کوئی چال کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔“ عاصم کا صبر بھی جواب دے گیا۔ ان کا خاندانی جلال خود کرایا تھا، اور اس جلال کو شاہد بھی جانتا تھا، سو غصے کو ضبط کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”ٹھیک ہے بھائی جان۔ لگتا ہے آپ کو میری بات سمجھ ہی نہیں آئی۔ ابھی میں چلتا ہوں۔ پھر کسی دن آؤں گا تو آپ کو تفصیل سے سمجھاؤں گا۔“ اس نے میز سے بایک کی چابیاں اٹھاتے ہوئے کہا۔

”بیٹھ جاؤ شاہد۔ بات ہوگی اور آج ہی ہوگی۔ آج میں یہ روز روڑ کی کل بن کر تم ہی کروں گا۔ ابھی پلاٹا ہوں احد کو اور ابھی ہو جائے گا سب فیصلہ۔“ عاصم نے دنگ انداز سے کہا تو شاہد پریشان ہو گیا۔

”بیٹھ جاؤ شاہد! کھانا کھا کر جانا۔ ابھی احد بھی آتا ہوگا، پھر میں کھانا لگا دوں گی۔ پہلے کچھ کھا پی لینا، پھر آرام سے ٹھنڈے دل کے ساتھ اپنے مسائل کا حل تلاش کرنا۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ عائشہ نے نرمی سے کہا تو وہ منہ بناتا ہوا بیٹھ گیا۔

”شاہد! تم بڑے ہو، احد چھوٹا ہے۔ میں اس سے بات کروں گا۔ تم بس، اپنے غصے پر قابو رکھنا۔ کوئی ایسی ویسی بات نہ کرنا کہ مزید بد مزگی ہو جائے۔ میں احد سے کہوں گا کہ تمہیں % 25 کی بجائے % 35 شیئرز دے دے۔ بلکہ تم ایسا کرنا کہ سارے شیئرز احد کو ہی بیچ دینا، اس سے نقد رقم لے کر اپنا خود کا بزنس اسٹارٹ کر لینا اور گھر بھی اپنی پسند کا لے لینا۔ اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔“ احد کو کسی ضروری کام سے کہیں اور جانا تھا، سو اس نے آنے سے معذرت کر لی۔ عاصم اور عائشہ نے شاہد کو کھانا کھا کر بغیر انٹھے ہی نہیں دیا۔ اس دوران وہ پیار سے، نرمی سے اسے سمجھاتے رہے۔ بات معقول تھی اس کی سمجھ میں بھی آ گئی۔ اس لیے وہ بھی دھیمبا پڑ گیا۔

”میں تو یہ کہتی ہوں کہ اگر اس طرح لڑ بھڑ کر ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ہے تو اس سے کہیں بہتر ہے کہ انسان

پریشان تھی کہ کیا کریں۔ اور عاصم کو جیسے ہی موقع ملا، وہ شاہد کو ایک کونے میں لے گیا اور لگا اس کی کلاس لینے۔

”مجھے نہیں پتا کہ مجھے کیا ہوا تھا۔ میرے پاس صرف ایک ہفتے کا وقت تھا بھائی جان، اور احد میری بات سننے کو ہی تیار نہیں تھا۔ میں نے اسے کہا بھی تھا کہ سب کچھ نادو کے نام لگا دے۔ مگر.....!“

”نادو کے نام؟ لیکن کیوں؟ یہ تم دونوں بھائیوں کے بیچ نادو کہاں سے آگئی؟ اور یہ ہفتے کا وقت تمہیں کس نے دیا۔“ عاصم حیرت سے اس کی بات کاٹنے ہوئے بولا تو شاہد نے جھکا کر اٹھا کر بھائی کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا کہ عاصم کو اپنے سانس رکتا محسوس ہوا۔

”تو یہ سب تم سے تمہاری بیوی نے کروایا۔ وہ احد کا گھر توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تو اس نے احد کو ہی توڑ ڈالا۔ اور تم نے ایک مرد کو کراہی غسل ایک عورت کے ہاتھ میں دے دی؟“ تف ہے تم پر شاہد۔ تف ہے۔ میری نگاہوں سے دور ہو جاؤ۔ میں اب تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔“ عاصم کا بارہ پرستہاں جا رہا تھا۔ شاہد چپ چاپ اٹھ کر وہاں سے باہر چلا گیا اور عاصم شمدیدہ صدمہ سے اور دکھ کی حالت میں وہیں بیٹھا رہ گیا۔

☆.....☆

”کاش شاہد۔ آپ عقل سے کام لے لیتے، اس قدر جذباتی نہ ہوتے، تو آج یہ کھر، ہمارا ہوتا۔ میں کسی نہ کسی طرح غسل کو احد کی زندگی سے نکال ہی دیتی، مگر آپ کی جلد بازی نے سارا اکھیل ہی بگاڑ دیا۔ آپ کی اس گھٹیا حرکت کے بعد اب مجھے بھی آپ کے ساتھ رہنا پڑے گا۔ کہاں تو میں پوری کے خواب دیکھ رہی تھی اور کہاں اب آدمی بھی ہاتھ سے جاتی نظر آ رہی ہے۔ اور وہ بھی صرف آپ کی وجہ سے۔“ نادو کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ شاہد بھائیوں کی نگاہوں میں تو ذلیل ہوا ہی تھا، بیوی کی نگاہوں میں بھی اپنے لیے غصہ اور نفرت دیکھ کر کم مہم بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس ”زن“ کو کیا جواب دے جس کی وجہ سے وہ ان حالوں کو پہنچا تھا۔ اور وہ بھی کہ انہی تک اس کے گلے شکوے ہی نہیں ختم ہو رہے تھے۔ اور تب..... جب اس نے ایک نیا فیصلہ کیا۔ اس نے تین حرف کہے اور کمرے سے نکل گیا۔

جو دوسروں کا حق غصب کرنا چاہتی تھی وہ آج اپنی ہی لگا لگی ہوئی آگ میں جل رہی ہے۔

پتا۔ مگر مجھے میرا حق چاہیے۔ سمجھے آپ۔“

”ایک ہفتہ؟ اتنے کم وقت میں تو شاید کچھ بھی نہ ہو سکے۔ میری تو ابھی احد سے اس موضوع پر بات ہی نہیں ہو پائی؟“

”میں کچھ نہیں جانتی۔ میں نے آپ کو ایک ہفتے کا ٹائم دیا ہے اور ایک ہفتے کا مطلب ایک ہفتہ ہی ہے سمجھے آپ۔ ورنہ۔“

”ورنہ کیا۔“ نادو کے اعزاز نے شاہد کو کڑا کر دیا تھا۔

”ورنہ خود بھی مر جاؤ گی اور آپ کے بچوں کو بھی مار دوں گی۔ پھر ساری عمر سیدھی کرتے رہنا بھائی بھائیوں کی جوتیاں۔ کیونکہ پھر تو آپ ہمیشہ کے لیے ویلے ہی ہو جائیں گے ناں۔ نہ کوئی بیوی ہوگی اور نہ ہی بچہ۔ سارا ایسا ہی ختم۔“

اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے زہر بھرے اعزاز میں کہہ رہی تھیں۔

شیطان نے ایک بار پھر ایک زن کے دماغ پر قبضہ کیا اور اس کے ذریعے ایک ہنستے ہنستے گھر کو اجاڑنے کی بھرپور کوشش کر ڈالی۔

☆.....☆

”ابو! شاہد چاچو نے احد چاچو کو گولی ماری۔ جلدی چلنے۔“

انہیں اسپتال لے گئے ہیں۔“ عاصم کا پیٹا گھبراہٹا ہوا گھر میں داخل ہوا اور روتے ہوئے باپ کو یہ روح فرسا خبر سنائی۔ عاصم کی ہوائیاں اڑ گئیں۔ عائشہ رونے لگی کہ یہ کیا ہو گیا۔ اسد عاصم کو بائیک پر بٹھائے اڑتا ہوا اسپتال پہنچا تھا۔ گولی احد کی ٹانگ میں لگی تھی۔ اس حادثے کی خبر ملتے ہی پورا خاندان وہاں اکٹھا ہو چکا تھا۔ شاہد بھی ان میں شامل تھا۔ جذبات کی رو میں بہہ کر وہ بھائی کو زخمی تو کر چکا تھا مگر اب بچھتاؤں کے ناگ اسے ڈس رہے تھے۔ اس پر یہ خوف کہ اگر احد یا عاصم نے اس کے خلاف پرچہ کڑوا دیا تو اس کا کیا بچے گا؟

”اسپیکٹر صاحب! میں اپنی من صاف کر رہا تھا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا، گولی جیمبر میں پھنسی ہوئی تھی، بس میری انگلی کے دباؤ سے ٹریگر دب گیا اور گولی میری ٹانگ میں مھس گئی۔“

عاصم کی التجا بھری نگاہوں کو دیکھتے ہوئے احد نے اپنا بیان حلفی ریکارڈ کر دیا اور شاہد کے سر پر ایک اور احسان رکھ دیا۔

”شاہد! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ بھائی سے لڑنا مت۔ زمانے کو اپنا تمام شامت دکھانا، مگر تم نے میری ایک نہیں سنی اور اپنی کر کے رہے۔ اب بتاؤ مجھے۔ مل گیا تمہیں تمہارا حصہ؟ بن گئے فٹنی فٹنی کے پارٹنر؟ کچھ تو بولو۔ اس طرح سر جھکا کے کیوں بیٹھے ہو اب؟“ احد کا آپریشن چل رہا تھا۔ اس کی ٹانگ کی ہڈی کی حالت دیکھ کر ڈاکٹر ز بھی